انٹرویو



ناول



ناولٹ



مکمل ناول



افسانے



نظمیں غزلیں




زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے








مستقل سلسلے




دسمبر 2013
جلد 28 شمارہ 4
قیمت 50 روپے



خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔



رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: پی ای سی ایچ ایس، کراچی



Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وقت تیزی سے بھاگتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ منظر بھی بدلتے جا رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ تبدیلی لازمی امر ہے اور یہ نہ ہو تو زندگی بھی جیسے رُک جاتی ہے مگر اسے کیا کہیں کہ وطنِ عزیز میں ایک ہی منظر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ سانحہ راولپنڈی نے ایک بار پھر کراچی کے سانحہ بولٹن مارکیٹ کی یاد تازہ کر دی۔ طریقۂ واردات بھی مختلف نہیں۔ شاید ہماری سادہ لوحی پر کچھ زیادہ ہی یقین ہے اور غلط بھی نہیں۔ نہ اعداء کے حربے بدلتے ہیں نہ ہم ہی خوابِ غفلت سے جاگتے ہیں۔ ہم جو اس گمان میں ہیں کہ ہم محفوظ رہیں گے۔ کاش! ہم ان لوگوں کو پہچان سکیں جو نفرتوں کی فصل کاشت کر رہے ہیں۔ اپنے جوہرِ خطابت سے، اپنی زبان کی طراری سے، آزادیٔ اظہار کے نام پر تفریق و تعصب کا یہ عمل، تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔

## سالِ نو نمبر۔ سروے

جنوری کا شمارہ سالِ نو نمبر ہے۔ سالِ نو نمبر میں قارئین کی شمولیت کے لیے حسبِ روایت سروے شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ جاتے سال کے آخری چند دن بہت بوجھل ہوتے ہیں۔ چار سُو پھیلی دُھند میں تنہائی کا گہرا ہوتا احساس، بے نام سی اداسی، کچھ گم گشتہ مسکراہٹیں۔ کچھ گم گشتہ دن۔ ماضی کی بکھری تصویریں۔ خواب۔ تعبیریں۔ زندگی کے نگارخانے میں رنگا رنگی کا یہ طلسم دل پہ دستک دیتا ہے اور بہت ساری یادیں جگا دیتا ہے۔ سال کے اختتام پر آپ کے ذہن میں کون سی یادیں جاگتی ہیں؟ آپ کے محسوسات کیا ہوتے ہیں؟

2۔ اس سال آپ کے مشاغل اور مصروفیات کیا رہیں۔؟ کوئی نیا احساس، سوچ اور فکر ملی؟

3۔ 2013ء میں شائع ہونے والی کون سی تحریریں آپ کو پسند آئیں؟ مصنف کا نام؟

4۔ 2013ء میں کن شماروں کے ٹائٹل اچھے لگے؟ اور وہ کون سا ٹائٹل تھا جو بالکل پسند نہیں آیا؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 20 دسمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

## اس شمارے میں،

- زودِ پشیماں۔ آسیہ رزاقی کا مکمل ناول،
- محبت من محرم۔ سمیرا حمید کے ناول کی آخری قسط،
- عشق دُعا ہے۔ لبنیٰ جدون کا مکمل ناول،
- تم مان جاؤ گی۔ نزہت شبانہ حیدر کا ناولٹ،
- دیمک زدہ محبت۔ صائمہ اکرم کے ناولٹ کی آخری قسط،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- فیمہ ناز، شیریں ملک اور نورین کے افسانے،
- باصلاحیت فنکارہ مدیحہ افتخار سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شاعری سچ بولتی ہے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کے بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔



مجھے تُو نے جو بھی ہُنر دیا، یہ کمالِ حسن عطا دیا
میرے دل کو حُبِ رسولؐ دی، مرے لب کو ذوقِ نوا دیا

تری جلوہ گاہِ جمال میں، مرا ذوقِ دید نکھر گیا
تری ضوفشانیٔ حسن نے مری حیرتوں کو سجا دیا

میں مدارِ جاں سے گزر سکا تو تری کشش کے طفیل سے
یہ ترے کرم کا کمال تھا کہ حصارِ ذات کو ڈھا دیا

میں ہمیشہ اپنے سوالِ شوق کی کمتری پہ خجل رہا
کہ تری نوازشِ بے کراں نے مری طلب سے سوا دیا

جو مجھے دیا ہے مجھے اسی کا حساب دینے کی فکر ہو
مجھے اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ اسے کیا دیا، اُسے کیا دیا

عنایت علی خان

اُنؐ کے دامن کی بات کی جائے
کوئی شکلِ نجات کی جائے

مُنہ میں جب تک زبان ہے باقی
آپؐ ہی کی صفات کی جائے

ذکرِ احمدؐ کی ایک ایک ساعت
حاصلِ کائنات کی جائے

آپؐ کے سایۂ عطا میں بسر
زندگی کی یہ رات کی جائے

آپؐ سے آگہی کی شرط ہے یہ
پہلے تسخیرِ ذات کی جائے

سائے جس سمت بھی بڑھیں امجد
روشنی ساتھ ساتھ کی جائے

امجد اسلام امجد

ادارہ

## ظاہری حسن

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے نکاح نہ کرو ممکن ہے ان کا حسن انہیں (تکبر میں مبتلا کر کے) تباہ کر دے۔ ان سے ان کے مال کی وجہ سے نکاح نہ کرو' ممکن ہے ان کا مال انہیں سرکش بنا (کر گناہوں میں مبتلا کر) دے۔ البتہ ان کے دین کو پیش نظر رکھتے ہوئے نکاح کیا کرو۔ ایک سیاہ فام' ناک کٹی' دین دار لونڈی (خوب صورت' بے دین آزاد عورت سے) افضل ہے۔"

## کنواری لڑکی سے نکاح کرنا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں میں نے ایک خاتون سے نکاح کیا۔ (اس کے بعد جب) میری ملاقات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جابر! کیا آپ نے شادی کرلی؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کنواری سے یا بیوہ سے؟"

میں نے کہا "بیوہ سے" فرمایا "کنواری سے کیوں نہ کی جس سے تم دل بہلاتے؟"

میں نے کہا۔ "میری کئی بہنیں تھیں۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ وہ میرے اور ان کے درمیان حائل نہ ہو جائے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تب یہ بات (درست ہے۔"

**فوائد و مسائل :** 1۔ نکاح کے وقت تمام دوستوں اور رشتے داروں کا اجتماع ضروری نہیں۔

2۔ اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کے حالات معلوم کرنا اور ان کی ضرورتیں ممکن حد تک پوری کرنا اچھی عادت ہے۔

3۔ بیوہ یا مطلقہ سے نکاح کرنا عیب نہیں۔ حدیث میں (ثیب) کا لفظ ہے جو بیوہ اور طلاق یافتہ عورت دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

4۔ جوان آدمی کے لیے جوان عورت سے شادی کرنا بہتر ہے کیونکہ اس میں زیادہ ذہنی ہم آہنگی ہونے کی امید ہوتی ہے۔

5۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہنوں کی تربیت کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی عمر کی خاتون سے نکاح کیا' اس لیے دوسروں کے فائدے کو سامنے رکھ کر اپنی پسند سے کم ترچیز پر اکتفا کرنا بہت اچھی خوبی ہے۔

6۔ کنبے کے سربراہ کو گھر کے افراد کا مفاد مقدم رکھنا چاہیے۔

## آزاد عورت سے نکاح کرنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ صلی علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

"جو شخص پاک صاف ہو کر اللہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے' اسے چاہیے کہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے۔"



## کثرت اولاد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نکاح کرو میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔"

**فوائد و مسائل :**

1۔ نکاح اسلام کے اہم احکام میں سے ہے' اس لیے بلاوجہ کنوارا رہنا درست نہیں۔

2۔ کثرت اولاد شرعاً" مطلوب ہے کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خوشی کا باعث ہے۔ اس مفہوم کی ایک حدیث حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں "خوب محبت کرنے والی' زیادہ بچے جننے والی سے نکاح کرو میں دوسری امتوں سے تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔"

3۔ کسی عورت کی ماں اور بہنوں وغیرہ کے حالات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ اس عورت کی اولاد زیادہ ہوگی۔

## نکاح سے پہلے ایک نظر دیکھ لینا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ایک خاتون سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔

"جا کر اسے دیکھ لو' امید ہے کہ تم دونوں میں موافقت پیدا ہو جائے گی۔" انہوں نے ایسے ہی کیا' پھر اس سے شادی کرلی۔ اس کے بعد انہوں نے اس سے موافقت کا ذکر فرمایا۔

**فوائد و مسائل :**

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کرنے میں بڑی برکت ہے۔

2۔ نکاح سے پہلے جائز حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ لینے سے ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جاتا ہے' جس کے نتیجے میں نکاح کے بعد باہم ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

3۔ جواز صرف ایک نظر دیکھ لینے کا ہے۔ تنہائی میں ایک دوسرے سے ملاقات کرنا اور طویل بات چیت' یا اکٹھے سیر کو جانا وغیرہ یہ سب کام دین کے صریح خلاف ہیں۔ اس حدیث سے ایسے کاموں کا جواز نہیں نکلتا۔

## تعمیل حکم

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک خاتون کا ذکر کیا کہ میں اس سے نکاح کے لیے پیغام بھیجنے والا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جا کر اسے دیکھ لو' امید ہے تمہارے درمیان محبت پیدا ہو جائے گی۔" چنانچہ میں انصاری خاتون کے ہاں گیا اور اس کے والدین سے اس کا رشتہ طلب کیا اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی سنایا۔ یوں محسوس ہوا کہ اس کے والدین نے اس چیز کو پسند نہیں کیا (کہ یہ مرد اس لڑکی کو دیکھے۔) لڑکی پردے میں تھی' اس نے یہ بات چیت سن لی' چنانچہ اس نے کہا۔

"اگر تجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھنے کا حکم دیا ہے تو دیکھ لے' ورنہ میں تجھے قسم دیتی ہوں" (کہ جھوٹا بہانہ بنا کر مجھے نہ دیکھنا)

اس نے گویا اس بات کو بہت بڑا سمجھا (سنتے ہی اعتبار نہ آیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو گا)

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (میں سچ کہہ رہا تھا اس لیے) میں نے اسے دیکھ لیا' پھر میں نے اس سے شادی کرلی۔ پھر حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے

اس سے ہم آہنگی پیدا ہو جانے کا ذکر فرمایا۔ (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ والدین نے حدیث نبوی کو ناپسند نہیں کیا بلکہ انہیں یہ بات پسند نہ آئی کہ ایک اجنبی مرد ان کی جوان بچی پر نگاہ ڈالے۔

2۔ کنواری جوان بچی کو پردے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

3۔ لڑکے کو چاہیے کہ صرف اسی لڑکی کو دیکھے جس سے وہ واقعی نکاح کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس بہانے سے لوگوں کی بچیوں کو دیکھتے پھرنا بہت بری بات ہے۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے خیالات سے باخبر ہے' اس سے کسی کی خیانت پوشیدہ نہیں۔

4۔ صحابہ اور صحابیات کے دل میں حدیث نبوی کا احترام بہت زیادہ تھا' چنانچہ لڑکی کو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بتایا گیا تو وہ فوراً" راضی ہو گئی' حالانکہ طبعی طور پر یہ چیز اس کے لیے ناپسندیدہ تھی۔

5۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے ذہنوں میں فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی زیادہ اہمیت تھی۔

## پیغام نکاح پر پیغام نکاح

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کوئی آدمی اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر نکاح کا پیغام نہ بھیجے۔"

فوائد و مسائل : 1۔ جب کسی عورت کے لیے اس کے گھر والوں سے بات چیت ہو رہی ہو اور رشتہ طے پا جانے کی امید ہو تو دوسرے آدمی کو اس عورت کے لیے بات چیت شروع نہیں کرنی چاہیے۔

2۔ اگر محسوس ہو کہ ابھی عورت نے اس مرد کو قبول کرنے کا فیصلہ نہیں کیا اور اس کی طرف واضح میلان نہیں تو دوسرا آدمی بھی پیغام بھیج سکتا ہے تاکہ عورت فیصلہ کر سکے کہ اس کے لیے ان دونوں میں سے کون سا مرد زیادہ مناسب ہے اور اس کے سرپرست بھی معاملے پر بہتر انداز سے غور کر سکیں۔

3۔ اس ممانعت میں یہ حکمت ہے کہ مسلمانوں کے باہمی معاملات میں بگاڑ پیدا نہ ہو اور آپس میں ناراضی پیدا نہ ہو۔

## اطاعت

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے کہا مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تیری عدت ختم ہو جائے تو مجھے بتانا۔"

عدت ختم ہونے پر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ انہیں حضرت معاویہ' ابو جہم بن صخر اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے نکاح کے لیے پیغام بھیجے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"معاویہ رضی اللہ عنہ تو مفلس آدمی ہیں' ان کے پاس مال نہیں' ابو جہم رضی اللہ عنہ عورتوں کو بہت مارتے ہیں لیکن اسامہ رضی اللہ عنہ بہترین ہیں۔"

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کر کے کہا۔ "اسامہ اسامہ!"

1۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت تیرے لیے بہتر ہے۔"

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا' میں نے ان سے نکاح کر لیا' پھر مجھ پر رشک کیا گیا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ عورت کے کسی مرد کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لینے سے پہلے دوسرا آدمی پیغام بھیج سکتا ہے۔

2۔ اگر کسی کا عیب چھپانے سے کسی مسلمان کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ عیب ظاہر کر دیا جائے۔ یہ صورت ممنوعہ غیبت میں شمار نہیں ہوتی۔ حدیث کے راویوں پر جرح کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ جو حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں' اسے غلطی سے شرعی حکم نہ سمجھ لیا جائے' اس لیے یہ بھی جائز ہے۔

3۔ جب کوئی غلام آزاد ہو جائے تو اسلامی معاشرے میں اس کا مقام و مرتبہ دوسرے آزاد افراد سے کم تر نہیں ہوتا۔

4۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننے میں فائدہ ہے اگرچہ بظاہر ناگوار محسوس ہو۔

5۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اشارے کا مطلب عدم رضا مندی کا اظہار تھا کیونکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہا کے والد محترم حضرت زید رضی اللہ عنہا کچھ عرصہ غلام رہ چکے تھے۔

## کنواری اور شوہر دیدہ سے اجازت لینا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"شوہر دیدہ اپنی ذات پر اپنے والی (سرپرست) سے زیادہ اختیار رکھتی ہے اور کنواری سے اس کی ذات کے بارے میں اجازت لی جائے۔"

عرض کیا گیا' اللہ کے رسول! کنواری بات کرتے ہوئے شرماتی ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ یہاں ۔۔۔ مراد وہ عورت ہے' جس کا پہلے نکاح ہوا تھا' پھر خاوند سے جدائی ہو گئی' خواہ خاوند کی وفات کی وجہ سے ہو یا طلاق کی وجہ سے' یعنی اس لفظ سے بیوہ اور طلاق یافتہ دونوں مراد ہیں۔ دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

2۔ نکاح میں لڑکی کی رضا مندی بھی ملحوظ رکھی جائے اور سرپرست کی اجازت بھی ضروری ہے۔

3۔ کنواری لڑکی اگر شرم و حیا کی وجہ سے بول کر رضا مندی ظاہر نہ کر سکے تو اس کی خاموشی کو رضا مندی تصور کر لیا جائے گا' بشرطیکہ دوسرے قرائن سے یہ محسوس نہ ہو کہ یہ خاموشی ناراضی کی وجہ سے ہے۔

4۔ بیوہ یا مطلقہ کی اجازت واضح طور پر کلام کے ذریعے سے ہونا ضروری ہے' اس کی خاموشی کو رضا سمجھ لینا کافی نہیں۔

5۔ بیوہ یا طلاق یافتہ عورت کو چاہیے کہ عدت گزرنے کے بعد دوبارہ کسی مناسب جگہ نکاح کر لے۔ اس کے سرپرست کو بھی چاہیے کہ دوسرا نکاح کرنے میں اس سے تعاون کرے۔ بے نکاح بیٹھا رہنا درست نہیں' الا یہ کہ عمر اتنی زیادہ ہو گئی ہو کہ دوسرا نکاح کرنا مشکل ہو ۔۔۔ یا کوئی اور رکاوٹ ہو۔

## بیٹی کی ناراضی کے باوجود اس کا نکاح کر دینا

حضرت عبدالرحمٰن بن یزید انصاری اور حضرت مجمع بن یزید انصاری رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کے خاندان کے ایک شخص حضرت خذام رضی اللہ عنہا نے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔ اس نے اپنے والد کے کیے ہوئے نکاح کو پسند نہ کیا' چنانچہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا۔ آپ نے اس کے والد کا کیا ہوا نکاح کالعدم قرار دے دیا۔ تب اس نے حضرت ابو لبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔

حضرت یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ یہ لڑکی ثیبہ (بیوہ یا طلاق یافتہ) تھی۔

فوائد و مسائل :

1۔ ثیبہ کا نکاح اگر اس کی مرضی کے خلاف کر دیا جائے' تب بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے' تاہم وہ عدالت کے ذریعے سے یہ نکاح ختم کرا سکتی ہے۔

2۔ اس ناخوش گوار نتیجے سے بچنے کے لیے پہلے ہی افہام و تفہیم سے کسی متفقہ رائے پر پہنچ جانا بہتر ہے' یعنی نکاح وہاں کیا جائے جہاں عورت بھی راضی ہو اور

سرپرست کو بھی اعتراض نہ ہو۔

## عورت کی مرضی

حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہا اپنے والد حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا۔ ایک نوجوان لڑکی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

میرے والد نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے کردیا ہے تاکہ میرے ذریعے سے اس کا مقام بلند ہو جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکی کو (نکاح فسخ کرنے کا) اختیار دے دیا۔ اس نے کہا۔

"میں اپنے والد کے کیے ہوئے نکاح کو قبول کرتی ہوں لیکن میں چاہتی تھی کہ عورتوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے باپوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔"

**فوائد و مسائل :**

1۔ تاکہ میرے ذریعے سے اس کا مقام بلند ہو جائے۔" اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ میرے والد نادار ہیں اور ان کا بھتیجا خوشحال ہے' وہ چاہتے ہیں کہ اس رشتے کی وجہ سے انہیں بھی مالی فوائد حاصل ہو جائیں اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ بھتیجا نادار ہے' والد صاحب میرا رشتہ دے کر اس کا مقام بلند کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھ کر اس کی عزت کریں کہ یہ فلاں صاحب کا داماد ہے۔

2۔ والدین کو بھی لڑکی کی رضامندی کے بغیر بالجبر ایسی جگہ نکاح کردینے کی اجازت نہیں ہے جو اسے پسند نہ ہو۔

3۔ ایسی صورت میں لڑکی کو نکاح فسخ کرانے کی اجازت ہے۔

## سرپرست کی اجازت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس عورت کا نکاح سرپرست نے نہیں کیا' اس کا نکاح باطل ہے' اس کا نکاح باطل ہے' اس کا نکاح باطل (کالعدم) ہے۔ اگر مرد اس سے مقاربت کرلے تو اس کی مقاربت کی وجہ سے اس عورت کو حق مہر ادا کیا جائے گا۔ اگر ان (سرپرستوں) میں باہم اختلاف ہو جائے تو جس کا کوئی ولی (سرپرست) نہ ہو بادشاہ اس کا ولی (سرپرست) ہے۔" (ابوداؤد)

**فوائد و مسائل :**

1۔ نکاح میں جس طرح لڑکی کی رضامندی ضروری ہے' اسی طرح اس کے سرپرست کی اجازت بھی ضروری ہے۔

2۔ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح شرعاً غیر قانونی ہے' لہٰذا اگر سرپرست اجازت دینے سے انکار کردے تو میاں بیوی میں جدائی کرادی جائے گی۔

3۔ مقاربت کے بعد جدائی ہونے کی صورت میں مرد کے ذمے پورا حق مہر ادا کرنا لازمی ہو گا۔

4۔ اسلامی سلطنت میں بادشاہ کو نکاح کے معاملات میں مداخلت کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح بادشاہ کے نائب مقامی حکام بھی یہ حق رکھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اس قسم کے فیصلے عدالتیں کرتی ہیں۔ پنچایت میں بھی یہ معاملہ حل کیا جاسکتا ہے۔

5۔ اگر کوئی بچی لاوارث ہو اور اس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ ہو جو سرپرست کے طور پر اس کے مفادات کا خیال کرسکے تو اس صورت میں بھی اسلامی سلطنت کو سرپرست کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ مسئلہ ولایت نکاح کی مزید تحقیق و تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "مفرور لڑکیوں کا نکاح اور ہماری عدالتیں" از حافظ صلاح الدین یوسف۔

# گڈریا

## بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا

مصنف : اشفاق احمد

تبصرہ : آمنہ زریں

کہانی ذہن' زندگی اور فرد سے جڑی ہوئی ہے گویا یہ ازل سے ابد تک دنیا کا حصہ ہے۔ مگر ہر کہانی کو کہنے والا نہیں ملتا اور ہر کہانی کہنے والا طلسم نگار بھی نہیں ہوتا کہ پڑھنے والا خود کو کہانی کے جام جم میں دیکھ سکے۔ اشفاق احمد کی داستان گوئی کو ایک زمانہ تسلیم کرتا ہے اور افسانوں میں ان کی اس صفت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

کہانی کو جب افسانے کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے تو رہتی تو وہ کہانی ہی ہے' مگر پڑھنے والے کو بہت سارے سوالوں کا جواب خود تلاشنے کے لیے' حیرت زدہ چھوڑ جانا اس کا اوجِ کمال کہلاتا ہے۔ گڈریا اشفاق احمد کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے "گڈریا" کا مرکزی کردار داؤ جی ہیں۔

"یہ سردیوں کی ایک نخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم بستر میں سردھانے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیا۔ "کون ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی۔ "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کرلیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔

"کیا ہے؟" اور تاریکی کا بھوت بولا۔ "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کرلیا۔ اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

"داؤ جی کے بچے۔" میں نے روانسے ہو کر کہا۔

"آدھی رات کو تنگ کرتے ہیں۔ دفع ہو جاؤ۔ میں نہیں آپ کے گھر میں رہتا۔ میں نہیں پڑھتا۔ داؤ جی کے بچے کہتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا۔ "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہو گا؟ پاس نہیں ہو گا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا۔ پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی۔ آپ کو جاننے والے بھی۔ اور میں۔ میں بھی۔ میں بھی۔" اپنی جوان مرگی پر میں ایسا رویا کہ وہ ہی لحموں میں گھگھی بندھ گئی۔"

یہ گڈریا کی ابتدائی سطریں ہیں۔ جنہیں پہلی بار پڑھتے ہوئے دل دھک سے رہ جاتا ہے اور پھر بے ساختہ خوشگوار سی حیرت' قدم قدم پر اسی طرح کے رنگ برنگ محسوسات کے میدان میں نت نئے تجربے۔ اوپر نیچے ڈولتے ہوئے احساسات اور تجسس بھری حیرت۔

داؤ جی کے کردار کے ساتھ شفقت' رواداری' بے پناہ وابستگی' عجز اور انکساری منسلک ہے۔

"بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم بی ہائی اسکول پہنچی۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھ لڑکوں میں شامل کردیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔"

میٹرک پاس کرنے کی غرض سے ان کو داؤ جی کے سپرد کردیا گیا۔ یوں کہ بستر بھی ادھر پہنچا دیا گیا۔

"میرا امتحان قریب آرہا تھا اور داؤ جی سخت ہوتے جارہے تھے۔ انہوں نے میرے فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا

تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھے جاتے۔ ایک دن میں اسکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ ہاؤس کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آکر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بدزبان بھی ہو گیا تھا۔ "داؤ کے بچے" گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں کتے کمینے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اسی قدر کہتے۔ "دیکھ لے ڈومنی! تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جان پدر! یہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کتا تھا۔"

"میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انہیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا' نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصل نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔

سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا ہے۔ پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آجائے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا۔ لمبی سیر اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً" روز سورج نکلنے سے کوئی دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے۔ "اٹھ گولو موٹا ہو گیا بیٹا۔" دنیا جہان کے والدین صبح جگانے کے لیے کہا کرتے ہیں کہ اٹھ بیٹا' صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا۔ مگر وہ موٹا ہو گیا۔ کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے۔ میں منمناتا تو چمکار کر کہتے۔ "بھدا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا؟"

داؤ جی نام سے ہندو اور کردار سے مسلمان تھے۔ نعت پڑھنا' فارسی' عربی پر عبور' قرآن شریف اور درود شریف محبت سے پڑھنا' صوفیانہ کلام پڑھنا۔ یہ سب ہم پر دھیرے دھیرے واضح ہوتا ہے۔

"آقائے نامدار کا لفظ اور کو نہ قسمت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤ جی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انہوں نے کتنی ہی دیر لگا دی۔ کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔"

داؤ جی کی استادی کی طرح ان کی شاگردی کے واقعات بھی حیران کر دینے والے اور دلچسپ ہیں۔ ایک عدد بد مزاج بیوی' جو گالیاں دینے اور مارنے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔ داؤ جی کی زندگی میں آزمائش کی طرح شامل تھی۔

داؤ جی سے چائے چھیننے کا واقعہ تاثر انگیز ہے۔

"تیرے بھاؤیں میں کل کی مرتی آج مروں' کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا۔ تجھے موت نہیں آتی۔ اوں ہوں۔ تجھے کیوں آئے گی۔" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھٹنی کی طرح چوکے پر چڑھی' کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤ جی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "او تیرا بھلا ہو جائے۔ او تیرا بھلا ہو جائے۔" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔

کہانی کا زمانہ قبل از تقسیم کا ہے۔ اور پھر کہانی کا انجام تقسیم کے بعد کا۔ اور افسانے میں ڈھلی کہانی کا پیکر۔ ہمیں کچھ رنجیدہ' حیران اور پریشان چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔

حال و ماضی کا ربط۔ واقعات کا تسلسل۔ پہلا جملہ اور آخری منظر۔ جدا جدا احساسات۔ نکتہ نکتہ بنتی تصویر اور پھر۔ وہی حیرت کدہ!

ماحول' رسم و رواج سے نسبت اور سادگی آپ کو جلد ہی کہانی سے مانوس کر دیتی ہے اور جس کہانی میں آپ قہقہہ مار کر ہنس پڑتے ہیں اسی کے کسی منظر میں آنکھیں نم بھی ملتی ہیں۔ رواں دواں چلتے چلتے کہانی کی طرح آپ کبھی دم سادھ لیتے ہیں۔

"پھپھی پریتم بالکل گدھا آدمی تھا۔ اللہ میاں نے تو اسے محض بیلوں کی دم موڑنے اور ہل چلانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ مگر والدین کی ستم ظریفی کہ اسے مدرسے بھجوا کر ہماری جانوں کے لیے مستقل عذاب بنا دیا تھا۔ پھپھی ہر شرارت میں حصہ لیتا اور ضرور پکڑا جاتا۔ معمولی سے معمولی ماسٹر کی ہلکی سے ہلکی گھرکی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا اور ہم سب کو پکڑوا دیتا۔ ہم نے منتیں کیں' ہاتھ جوڑے' پر پھپھی نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا اور حسب توفیق ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہی کرتا رہا۔ برکت مہاشا' انور طوطا اور رمدن بھی کئی مرتبہ اس سے دست و گریباں ہوئے۔ اس کی اچھی خاصی مرمت بھی کی' لیکن اس نے پارٹی کی خدمت کو عین سعادت سمجھا اور ہمارے ساتھ چپکا رہا۔"

اسکول کے طلبا کی گروہ بندی' اساتذہ سے مخاصمت اور موافقت کے پس منظر میں لکھی گئی اس کہانی کا زمانہ بھی قبل از تقسیم کا ہے۔ "صفدر ٹھیلا" کے نام سے معنون اس کہانی کا مرکزی کردار صفدر ٹھیلا ہی ہے جو "جب میں دسویں میں آیا تو وہ میٹرک کا امتحان تیسری مرتبہ دینے والا تھا۔ ریاضی میں صفر اور انگریزی میں دس' پندرہ نمبر سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا۔ اردو' فارسی میں پاس ہو جاتا اور تاریخ کے پرچے میں ہمیشہ اول آتا رہا۔ سارا اسکول اس سے خوف کھاتا تھا۔"

کہانی میں لفظوں کی بنت کاری سے ایک ان کہی جان کاری تخلیق کرنا بھی کہانی کہنے کے فن کی ندرت ہے اور یہ ندرت آپ کو اس کتاب کے ہر افسانے میں ملے گی۔ "صفدر ٹھیلا" کی ان کہی جان کاری یہ رہی کہ اسکول کا ہر ماسٹر' حتیٰ کہ ہیڈ ماسٹر بھی اس سے خائف تھا۔ لیکن کوئی مولوی صاحب تھے جن سے وہ ہر بار سعادت مندی سے بید کھا لیتا تھا اور معافیاں مانگ کر ان کے کہنے پر ناک سے لکیریں بھی نکال لیتا تھا۔

"ٹھیلا ہنسا اور ماسٹر ایشر داس کو ادھر آتے دیکھ کر بولا۔ "میں تو ماسٹر ایشر داس سے بہت ڈرتا ہوں۔" اور جب ماسٹر جی ہمارے محاذ میں آ گئے تو ٹھیلا نے کہا۔ "کیوں ماسٹر گڑ بچھ! میں تجھ سے بھی ڈرتا ہوں نا؟" ماسٹر جی نے تیوری چڑھائی اور منہ ہی منہ میں گالیاں دیتے ایک طرف نکل گئے۔

"پھپھی پریتم ایک جاٹ اوپر سے عورتوں کی سی مت' جس ماسٹر سے ملتا بڑی بے تکلفی سے پیش آتا۔ اکثر کلاس میں ایسی بے ہودہ بات کرتا کہ سارے لڑکے کھلکھلا کر ہنس دیتے اور ماسٹر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ ایک دن دوپہر کے وقت وہ پگڑی بغل میں دبائے ممنوعہ گراس پلاٹ میں اتر کر پھول توڑ رہا تھا کہ پنڈت جی آ گئے۔ انہوں نے کڑک کے پکارا۔ تو اپنے جوڑے میں پھول ٹانکتے ہوئے بولا۔ "آیا بادشاہو!" چند لڑکے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر تماشا دیکھنے لگے۔ پھر ماسٹر صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' جاتے ہی اس کی خبر لینی شروع کر دی۔ پھپھی کا جوڑا کھل گیا۔ پگڑی پرے جا گری اور وہ بڑے اکھڑے لہجے میں "ٹھہر جاؤ بادشاہو' صبر کرو بادشاہو؟" کے نعرے لگاتا گیا۔ پنڈت جی چڑ گئے اور انہوں نے تابڑ توڑ بید برسانے شروع کر دیے۔ ہم میں سے کسی کی جرات نہ تھی کہ پھپھی کی مدد کرتا۔ ہر ایک اسی کو برا بھلا کہہ کر اپنی جگہ پر دبک گیا۔ صفدر ٹھیلے نے جب یہ چیخ و پکار سنی تو بگولے کی طرح کلاس سے نکلا اور جا کر پنڈت جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور سرخ آنکھوں سے ٹھیلے کو گھورتے ہوئے دفتر میں چلے گئے۔ صفدر نے زمین سے پھپھی کی پگڑی اٹھائی اور پلاٹ میں بکھرے ہوئے پھول چنے اور پریتم کی کمر میں ہاتھ ڈال کر باہر لے گیا۔

اس واقعے کے بعد پنڈت جی سے' جو اسکول کے پرنسپل تھے' دشمنی کا کھلم کھلا اظہار ہونے لگا۔

"صفدر ٹھیلا نل پر بیٹھا دانت صاف کر رہا ہوتا اور پنڈت جی ادھر آ نکلتے تو وہ کسی نہ کسی کو مخاطب کر کے کہتا۔ "اس کی موت میرے ہاتھوں آئے گی۔ پھانسی لگ جاؤں گا پر اس کا خون کر کے رہوں گا۔ بھلا اس نے پھپھی کو کیا سمجھ کے مارا۔"

اسی طرح کا نیا معرکہ جلد ہی پیش آگیا جب ماسٹر گز پنکھ نے حبیب پٹنی کے ساتھ آئے ہوئے چھوٹے بھائی کو کلاس سے نکل جانے کا حکم دیا۔ تب پھر ٹھیلا ہی راستے کی دیوار بنا اور اسکول میں ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ اسی ہنگامے میں پنڈت جی ٹھیلے کی کمر پر بید برسانے میں کامیاب ہوگئے اور لڑکوں کی واہ واہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پنڈت جی نے پولیس بلانے کی دھمکی دے کر اسے اسکول سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

ان کہی کی طرح۔ انہونی بھی کہانی کا ایک وصف ہوا کرتی ہے۔ جس کی بدولت کہانی موڑ مڑتی ہے۔ اس کہانی کی انہونی پڑھنے والے کا سانس روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

جب ٹھیلے کے گروپ نے پنڈت جی کو ہلاک کردینے کی منصوبہ بندی کی۔ بگھی کی سواری کرتے پنڈت جی کی گھوڑی کو خوف زدہ کرنے کی ترکیب۔

"گھوڑی کا ایک سم اس کے ماتھے پر اور دوسرا چھاتی پر پڑا۔ پل بھر کو اس کی روشن آنکھیں اپنی پوری بے تابی سے چمکیں اور بند ہوگئیں۔ گھوڑی نے ایک مرتبہ پھر بے قابو ہو کر سنگین سموں سے چھاتی اور پیٹ کو کچل ڈالا۔ سڑک پر خون کی ست روندی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ٹھیلا کے ماتھے پر خون تھا۔ گھٹے ہوئے سر پر خون تھا اور گھوڑی کے سموں پر خون تھا۔" اور پڑھتے پڑھتے ہمیں کہانی کا پہلا جملہ یاد آتا ہے۔

"صفدر ٹھیلا مر گیا اور مجھے مرنا ہے، لیکن کوئی چاہے مجھے تھوتھے تیروں سے اڑا دے۔ سچی بات میں کہوں گا اور مجھے ڈر بھی کس بات کا۔"

لیکن آخری سطروں میں ایک ان کہی اور بھی ہے۔ جو کہانی کے ۔۔ کو باقیوں سے ممتاز کرتی ہے۔

کہانیوں کی اس کتاب میں کل نو کہانیاں ہیں اور ان نو کہانیوں میں زندگی، کردار، مناظر، احساسات ہمارے تخیل کو آسانی ہنڈولے میں بٹھا کر کبھی اوپر اور کبھی نیچے کے تجربے سے گزارنے کا وصف رکھتے ہیں۔ گھر میں پالتو کتے کی آمد، دیکھ بھال، محبت، شوق اور گم ہوجانے پر دیوانہ ہوجانے کی داستان "ناکام محبت پر بھی" منطبق ہوسکتی ہے۔ اس کا تجربہ آپ "گل ڑیا" پڑھ کر کرسکتے ہیں۔ شمع اور پروانے کے اساطیری قصے سے شروع ہو کر کہانی "فانی العشق" پروانے جیسی دیوانگی اور شمع جیسی بے نیازی کو کس طرح زندگی کے اصل کرداروں پر لاگو کرتی ہے۔ کہ دل قطرہ قطرہ پگھلتا ہوا شمع سے خفا خفا اور پروانے کے لیے رنجیدگی محسوس کرتا ہے۔

مرد کی بے وفائی اور تسلیم کے بجائے جواز پیش کرنے کی نفسیاتی کیفیت سے بھرپور۔ ایک ضعیف العمر کی خود ساختہ منظر میں خود کلامی پر مشتمل کہانی "حقیقت نیوش" پڑھ کر آپ سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ جمیل کون تھا؟ کیا یہی شخص جو کہانی سنا رہا تھا یا پھر؟ نوعمری کے نوخیز احساسات "ادھ کھلی کلیاں" جو اکثر کھلے بغیر ہی مسلی جاتی ہیں۔

میٹرک کے امتحان سے فارغ دو سہیلیوں کی کہانی "برکھا" پڑھ کر نوعمری کے دھندلے فہم اور معصومیت پر پیار آجاتا ہے۔ ترس تو خیر آتا ہی ہے۔ رائی کا پہاڑ بننے کی تصویر اور پھر۔۔ کھودا پہاڑ۔۔

اشفاق صاحب کے اٹلی میں گزرے وقت نے بڑی دلچسپ حکایات اور کہانیوں کو جنم دیا۔ دیسی سے ولایتی کا ذکر اور وہ بھی اپنی زمین سے جڑے رہ کر۔

"ایل وریرا" کا آغاز جہاز کے بندرگاہ سے الوداع ہونے کا منظر ہے۔ بارش کی بوندوں کے پیچھے بندرگاہ کی روشنیاں آنسو بن کر پگھلتی جارہی تھیں اور ان کی کرنوں کو مینہ کے اندھے شیشے نے کلٹ کاٹ کر دھندلا دیا تھا اور ساتھ ہی روما میں گزرے ڈیڑھ برس کا دلچسپ احوال شروع ہوجاتا ہے۔

ایل وریرا ایک طوائف تھی۔ جس کے ساتھ پیش آنے والی ملاقات حادثاتی تو نہیں تھی۔ مگر انجام حادثاتی تھا۔ پہلی ملاقات اگلی ملاقاتوں کا سبب بنی اور ایل وریرا خاموشی سے معمولات میں شامل ہوتی گئی۔

اس کہانی کی خوبی وہ کیفیت ہے جو پیش کی گئی صورت حال، بیان کیے گئے خیالات کے برعکس اپنے آپ میں ابھرتی اور ڈوبتی ہے۔



کہانی بیان کرنے والا کردار "میں" نئی نئی چالاکیاں استعمال کرکے اٹلی میں تعلقات بنانے کی جستجو کررہا ہے اور پردیس میں بیٹھ کر دیس کو لکھے جانے والے خطوں میں ان کوششوں کو بڑھا چڑھا کر اپنے گھر والوں کے لیے ڈینگیں مارنے کی دل بستگی کا سامان بھی کرتا ہے۔ اپنی سادگی کو بھی ترک نہیں کرسکتا اور کامیاں ہونے کا ارمان بھی پورا کرتا ہے۔ کہ۔۔ جڑوں سے پیوستہ روایات کا امین ہے۔ مگر موقع پرست بھی ہے۔

"میں جلد آنے کی کوشش تو اس وقت کرتا جب ماریا میری محبت کا جواب سرد مہری سے دیتی۔ وہ میرے تبحر علمی پر مٹی ہوئی تھی اور میں پاکٹ انسائیکلوپیڈیا لمحہ بھر کو اپنے پہلو سے جدا نہ کرتا تھا۔"

"اپنے کمرے کے کونے میں سہنو ڑائے میں ریڈیو اسکرپٹ لکھ رہا ہوں۔ ایل وریرا دیوان پر بیٹھی جرابیں رفو کررہی ہے کہ اچانک اس نے سوئی روک کر پوچھا۔

"ایشے فک دنیا گول ہے نا؟"

"ہوں۔" میں نے ویسے ہی لکھتے لکھتے جواب دیا۔

"تو پھر جو لوگ نیچے رہتے ہیں، وہ گر کیوں نہیں جاتے؟"

میں نے چڑ کر کہا۔ "تم کوئی دو ہزار لیرے کی بات کرو، کوئی تھانے، تحصیل کی دھمکی دو، یہ باتیں تمہارے سمجھنے کی نہیں۔"

خالص ایشیائی انداز کا طنز اور طعنہ۔۔ وہ خاموشی سے رفو کرنے لگی۔

"مجھے ماریا کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اگر کوئی تحفہ خریدتا بھی تو ایل وریرا ہی اس کا پارسل بناتی۔ ایل وریرا ہی سے میں نے ایک رومال پر جالے رنگی پتیوں کا پھول کڑھوا کر ماریا کو دیا کہ یہ ہمارے ملک کی صنعت کا نادر نمونہ ہے۔ کچھ پیسے ایل وریرا سے لے کر اور کچھ اپنی جیب سے ڈال کر میں نے پرانی اشیاء فروخت کرنے والے سے تانبے کی صد سالہ ایک چھوٹی سی ڈبیا خریدی تھی اور اسے ماریا کی خدمت میں یہ کہہ کر گزارا تھا کہ موہنجو داڑو کی کھدائی سے نکلی تھی اور ہمارے خاندان میں اس وقت سے چلی آرہی تھی۔ جب میرے اجداد سندھ کے حاکم تھے۔"

امیر زادی سے تعلقات کی بیل منڈھے نہ چڑھ پائی۔ ایل وریرا کا طوائف ہونا اس کے دل میں دیوار نہ کھڑی کرسکا۔ مگر اس معاملے میں حقیقت ہمیشہ تلخ ہی رہی ہے۔ سو اس کہانی کی ندرت یہ رہی کہ کہنے والے نے کہی سے ان کہی کیفیت تخلیق کی۔ جس کی ہمدردی ایل وریرا کے ساتھ ساتھ رہی اور کسی کے درد کا درماں نہ کرسکنے کی خلش جیسی محسوس کی جانے والی کسک بھی۔

آخری پیراگراف سے کچھ سطریں مجھے بہت پسند ہیں۔ جو بظاہر سادہ ہیں، مگر بہت گہری۔

"جہاز نیپلز کے گھاٹ سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔ نیچے شیڈ میں، میں نے ماریا کی کار کا ہارن سنا۔ مجھے یقین ہے وہ ماریا ہی کی کار تھی۔ مگر اب جہاز دھیرے دھیرے رخ بدل رہا تھا۔"

بارش کی بوندوں کے پیچھے بندرگاہوں کی روشنیاں آنسو بن کر گلتی جارہی تھیں۔ سامنے کرین کی اوٹ میں سے ایک سایہ آگے بڑھا اور ان بوندوں کے درمیان ایستادہ ہوگیا۔ شوخ بسنتی رنگ کی برساتی۔ اسی رنگ اور کپڑے کے چھوٹے کناروں والی ٹوپی اور ہاتھ میں سیاہ آبنوس کے لمبے دستے والی سلیٹی چھتری۔

کہانی پڑھنے والا جان لیتا ہے کہ یہ سایہ کس کا تھا۔

زندگی کے سب ہی رنگ زندگی کی بدولت ہوتے ہیں۔ آسمان زندگی کبھی چمکتا نیلا۔۔ اور کبھی نارنجی گلابی، کبھی سرمئی اور کبھی اودا نیلا۔۔ کبھی سیاہ راتوں سے بھرا اور کبھی جگنوؤں سے بھرا۔۔ اس کے سارے رنگوں سے لطف اندوز ہونا زندگی کی بدولت ہے، سو۔۔ رنگ اکٹھے کیجئے۔ کچھ مطالعہ سے۔۔ کچھ اپنے اور کچھ دوسروں کے تجربے سے۔۔ کبھی کسی وسیع النظر کے شاندار مشاہدے سے۔

کتاب اس کا بہترین ذریعہ ہے۔

☆

باصلاحیت فنکارہ

# مدیحہ افتخار سے ملاقات

شاہین رشید

نہایت سوبر اور سلجھی ہوئی مدیحہ افتخار نے بہت کم عرصے میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ اب اس کا نام کامیابی کی ضمانت بن گیا ہے۔

"کیسی ہو مدیحہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"مارننگ شو کا تجربہ کیسا رہا؟"

"بہت اچھا رہا۔ بہت مزہ آیا۔ بہت سے نئے لوگوں سے ملاقات رہی۔"

"پھر چھوڑ کیوں دیا؟"

"پوری طرح نہیں چھوڑا، کبھی کبھی کر بھی لیتی ہوں۔"

"آج کل ڈراموں میں کم نظر آرہی ہو؟"

"بس اچھا رول ہوتا ہے تو فوراً "لیس" کرتی ہوں۔ ورنہ انکار کردیتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ کم کام کروں مگر اچھا کروں۔ بس یہی میری پہلی ترجیح ہے۔ ورنہ کام تو آپ کو پتا ہی ہے بہت ہوتا ہے۔ جتنے چینلز اتنے ڈرامے۔ کام کی کمی نہیں ہے بس میں اچھا کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"مدیحہ! میں کافی دنوں کے بعد تمہارا انٹرویو کررہی ہوں اس لیے تمہیں ذرا شروع سے اپنے بارے میں بتانا پڑے گا کہ کب کیسے اس فیلڈ میں آئیں۔ میرا مطلب ہے نئے پڑھنے والوں کے لیے؟"

"اوکے جی۔ میں اس فیلڈ میں اس طرح آئی کہ میرے والدین کے بارے میں تو آپ سب جانتے ہی ہیں کہ پی ٹی وی کے زمانے میں "وہ اشاروں کی زبان" پروگرام کیا کرتے تھے تو وہ جب اسٹوڈیو جاتے تھے تو میں چونکہ اس وقت بہت چھوٹی تھی، تو میں بھی ان کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ سو جانتے تو مجھے سب ہی تھے پھر جب تھوڑی بڑی ہوئی اور تھوڑی سی عقل سمجھ آئی تو میرا بھی دل چاہا کہ میں بھی اس فیلڈ میں آؤں اور کام کروں۔ اپنی خواہش کا اظہار جب والدین سے کیا تو وہ بالکل بھی خوش نہیں ہوئے۔ بلکہ تھوڑا ناراض ہوئے کہ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"کیوں؟"

"بہت آسان سی بات ہے جو پڑھے لکھے لوگ یا والدین ہوتے ہیں انہیں ہر حال میں اپنی اولاد کی تعلیم عزیز ہوتی ہے چنانچہ سختی سے منع کردیا گیا کہ جب تک تمہاری پڑھائی مکمل نہیں ہوجاتی۔ اس فیلڈ میں آنے کا سوچنا بھی نہیں۔ چنانچہ گریجویشن کے بعد میں نے آرٹ اکیڈمی "تراش" میں داخلہ لے لیا۔ خود سے کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ جی مجھے اداکاری کا شوق ہے اور نہ ہی والدین چاہتے تھے کہ میں ان کے حوالے سے جاؤں۔"

"پھر مشکل تو ہوئی ہوگی؟"

"نہیں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ میرے لیے خود ہی راستہ بن گیا۔ جب میں نے آرٹ اکیڈمی تراش میں داخلہ لیا تو وہاں میری ملاقات رعنا شیخ صاحبہ سے ہوئی۔ ان دنوں وہ ایک نئی ڈرامہ سیریل "پارٹیشن ایک سفر" بنانے کا سوچ رہی تھیں۔ ہندوستان پاکستان کی تقسیم پر مبنی ڈرامے کے لیے انہیں نئے چہروں کی ضرورت تھی۔ نظر انتخاب مجھ پر پڑی تو مجھے بھی آڈیشن دینے کے لیے کہا گیا۔ میں نے آڈیشن دے دیا



اور کامیاب ہوگئی اور یوں مجھے پہلی دفعہ میں ہی ایک بڑے سیریل میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔"

"اور کردار بھی کافی پاورفل تھا؟"

"جی بالکل۔ میں نے اپنے پہلے ہی سیریل میں "ینگ ٹو اولڈ" کردار کیا۔ شاید ایسا بہت کم لوگوں نے کیا ہوگا۔"

"پہلے ہی ڈرامے میں اتنا بڑا تجربہ کیسا رہا؟"

"بہت اچھا۔ پہلے ہی سیریل میں قسمت نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پہلے ہی سیریل میں مجھے اتنا اہم رول مل جائے گا۔ میں نے اٹھارہ سال سے لے کر پچاس سال کی خاتون کا رول کیا تھا۔"

"کیسے کرلیا۔ کس کی محنت زیادہ تھی تمہاری یا رعنا شیخ صاحبہ کی؟"

"رعنا شیخ صاحبہ جنہیں میں آنٹی کہتی ہوں ان کی محنت زیادہ تھی کیونکہ میں تو بالکل نئی تھی لیکن چونکہ مجھے اداکاری کا شوق تھا تو اولڈ کردار کے لیے تو مجھے مشاہدہ کرنا پڑا اور میری نانی دادی کے علاوہ بھلا کون میرے لیے بہترین ثابت ہوسکتا تھا تو جب مجھے یہ رول ملا تو میں نے خاص طور پر ان کا جائزہ لیا۔ پھر مجھے مشکل پیش نہیں آئی۔ یہ مریم اصفہر کا رول تھا جو تحریک پاکستان کی ایک اہم کارکن تھیں۔"

"اولڈ گیٹ اپ میں اپنے آپ کو دیکھ کر کیسا لگا؟"

ہنستے ہوئے۔ "اندازہ ہوگیا کہ میں بھی جب بڑی ہوجاؤں گی تو اتنی گریس فل لگوں گی۔ یعنی بڑھاپا اچھا ہوگا۔"

"اس رول کے بعد تو کافی آفرز آئی ہوں گی؟"

"لکی وکی۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ میں کام ان کے ڈراموں میں کام کروں، مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔"

"کیوں ممکن نہیں تھا؟"

"اس لیے کہ میں اپنے پہلے سیریل میں ہی جو اپنا امیج بنا چکی تھی وہ ہر طرح کے کردار لے کر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے جو بھی کردار لیے بڑی احتیاط اور سوچ بچار کے بعد لیے۔"

"مثلاً "کیا احتیاط اور سوچ بچار ہوتی ہے؟"

"یہی کہ کہانی اسٹرونگ ہو، ڈائریکٹر اچھا ہو اور میرا کردار پاورفل ہو۔ اپنے کردار کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتی ہوں۔ اچھا لگتا ہے تو ٹھیک، ورنہ انکار کردیتی ہوں۔"

"مروت میں اگر کوئی کردار لیا؟"

"ارے نہیں۔ یہ تو کام ہے اس میں مروت کیسی۔ مگر احترام اور عزت سب کی کرتی ہوں اور اس انداز میں منع کرتی ہوں کہ کسی کو برا بھی نہ لگے۔"

"تمہیں اس فیلڈ میں تقریباً سات سال ہو گئے ہیں۔ کافی کام کر چکی ہو۔ کوئی کردار ابھی بھی ایسا ہے کہ جو تم نے نہ کیا ہو؟"

"ویسے تو خیر کئی کردار ہیں لیکن پھر بھی میری خواہش ہے کہ میں ایک معذور لڑکی کا کردار کروں۔ معذور دو طرح کے ہوتے ہیں ذہنی اور جسمانی۔ اور میں یہ دونوں کردار کرنا چاہتی ہوں۔"

"مگر تم تو گونگی بہری لڑکی کا رول بھی بخوبی کر سکتی ہو' ایسا رول آفر ہوا؟"

"رول تو آفر نہیں ہوا البتہ ایک کمرشل میں جو کہ موبائل کا تھا اس میں بہری لڑکی کا کردار پرفارم کیا تھا اور مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کیونکہ آپ کو پتا ہی ہے کہ میں اس کی ماہر ہوں۔"

"لوگ ابھی تک شوبز کے ماحول کی باتیں کرتے ہیں۔ کیا ماحول واقعی خراب ہے؟"

"نہیں۔ مجھے تو ایسی کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ فیملی ماحول ہے۔ سب بہت اچھی طرح ملتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ وہی پرانی بات کہوں گی کہ اگر آپ اچھے ہیں تو سب اچھے ہیں اور آپ اچھے نہیں ہیں تو کوئی بھی اچھا نہیں ہے۔"

"اور میں بھی اپنا ایک پرانا سوال کرنا چاہوں گی کہ کس کردار نے شہرت دی اور ذاتی طور پر کون سا کردار پسند آیا؟"

"میں تو کرتی ہی وہ کردار ہوں' جو مجھے پسند آتے ہیں۔ اب لوگ کس کو پسند کرتے ہیں' یہ لوگوں پر منحصر ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں نے ایک سیریل کیا تھا "میری بہن میری دیورانی" یہ سوپ تھا۔ اسے لوگوں نے بہت پسند کیا تھا اور میرے کردار کو بھی اور مجھے خود بھی یہ کردار کرنے میں مزہ آیا تھا کیونکہ یہ میری فطرت سے ہٹ کر ایک کردار تھا جو گھر میں نفاق ڈالنے کی ماہر ہوتی ہے۔ ایک اور سیریل "دل' درد اور دھواں" یہ بھی بہت مقبول ہوا تھا اور اس میں بھی میرا کردار بہت عمدہ تھا۔"

"اپنی ساتھی فنکاروں کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں اور ڈائریکٹرز کے ساتھ؟"

"سب سے ماشاء اللہ بہت اچھے تعلقات ہیں۔ سب سے میری دوستی ہے اور ڈائریکٹرز کے ساتھ بھی میری بہت اچھی دوستی ہے۔"

"کس کے ساتھ زیادہ کام کیا اور کس کے ساتھ کام کر کے مزہ آیا؟"

"مزہ تو سب کے ساتھ ہی آتا ہے کیونکہ جب تک ایک دوسرے کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو گی کام کیسے ہو گا اس لیے ہم فیملی کی طرح کام کرتے ہیں۔ عمران عباس اور فہد مصطفیٰ کے ساتھ میں نے زیادہ کام کیا ہے۔ دیگر کے ساتھ بھی کام کیا ہے مگر ذرا کم کیا ہے۔"

"گزشتہ دنوں بھارت گئی تھیں۔ کیوں؟ اور کیسا رہا تجربہ؟"

"ہاں بھارت۔ ایک ریالٹی شو کرنے کے لیے مجھے بلایا گیا تھا۔ مہم جوئی پر مبنی شو تھا۔ مشکل تھا مگر کرنے میں مزہ آیا۔ اس لیے کہ وہاں کام بہت پروفیشنل طریقے سے ہوتا ہے جبکہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔"

"وہاں کا ماحول کیسا لگا؟"

"اچھا ہے۔ سب کچھ پاکستان جیسا ہے' مگر پاکستان تو نہیں ہے نا۔ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہاں جا کر مجھے اپنے ملک سے زیادہ محبت ہو گئی۔ اپنا گھر' اپنا ملک اور اپنے لوگ بہت یاد آتے تھے۔"

"بچپن اور طالب علمی کا دور اسلام آباد میں گزارا۔ کراچی آنا کیسا لگا؟ یہاں کے لوگ یہاں کا ماحول؟"

"کراچی آنا اچھا لگا۔ بہت ہنگامہ خیز زندگی ہے مگر سکون اسلام آباد میں ہے۔ جب بھی کام کاج سے تھک جاتی ہوں اور ریلیکس ہونا چاہتی ہوں تو پھر اسلام آباد چلی جاتی ہوں۔"

"پروفیشنل باتیں تو بہت ہو گئیں۔ اب کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہو جائیں۔ کیا خیال ہے؟"

"جی جی بالکل۔"

"یہ مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ چار بہنیں ہیں۔ تین بہنوں کی شادیاں ہو گئی ہیں مگر تم فارغ ہو۔ کیوں؟"

"کیوں۔ ؟ کیوں کا تو کوئی جواب نہیں ہے۔ بس میرا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ویسے بھی جب مقدر میں ہوتا ہے' ہو جاتی ہے۔"

"بہنوں کو شوق نہیں ہوا اس فیلڈ میں آنے کا؟"

"نہیں۔ یہ لت مجھے ہی لگی ہے۔ میری تینوں بہنوں میں یہ جراثیم نہیں ہیں۔ میری ایک بہن پروفیسر ہیں۔ دوسری ڈاکٹر ہیں اور تیسری بینکر ہیں۔"

"پسند سے کرو گی شادی۔ کوئی آئیڈیل ہے؟"

"آئیڈیل کا زمانہ نہیں رہا اور پسند ناپسند کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ویسے ایمان دار ہو اور بے انتہا مخلص ہو اور جو میری اور مجھ سے تعلق رکھنے والوں کی پرابلمز کو سمجھ سکے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہو؟"

"امی ابو کے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔ گھومتی پھرتی ہوں یا پھر ان کے پاس بیٹھ کر گپیں مارتی ہوں۔ بہت سکون ملتا ہے ابو امی کے پاس بیٹھ کر۔"

"اپنی کن خامیوں سے نجات چاہتی ہو؟"

"ایک تو یہ کہ مجھ میں اگر کسی کام کو کرنے کی ضد سوار ہو جائے تو بس پھر جب تک وہ کام میں کر نہ لوں مجھے چین نہیں آتا۔"

"یہ تو خامی نہ ہوئی؟"

"ہے جی۔ مشکل میں بھی تو پڑ جاتی ہوں۔ مگر جو سوار کر لیتی ہوں گھر والے بھی کہتے ہیں کہ چھوڑ دو مگر نہیں جی۔ میں نے تو کرنا ہی ہوتا ہے۔"

"گھرداری سے لگاؤ ہے؟"

"ہاں ہے۔ مگر بہت زیادہ نہیں' سر پر پڑے تو کر بھی لیتی ہوں' لیکن جب کھانا پکانا پڑے یا گھر کی صفائی ستھرائی کرنی پڑے تو پھر بہت بور بھی ہو جاتی ہوں اور غصہ بھی آتا ہے۔"

"کن باتوں پر غصہ آتا ہے؟"

"جب بلاوجہ کوئی تنقید کرے میری شخصیت پر یا میرے کام پر تو بس پھر برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔"

"کھانے میں کیا پسند ہے اور گھر سے باہر کھانا پسند ہے یا گھر کا پکا ہوا پسند ہے؟"

"بھنڈی اور آلو کی بھجیا مجھے بہت پسند ہے اور کھانے میں' میں نے کبھی نخرے نہیں دکھائے سب اللہ کی نعمتیں ہیں۔ زیادہ تر گھر کے ہی کھانے پسند ہیں لیکن کبھی کبھی دل چاہتا ہے تو گھر سے باہر بھی کھا لیتی ہوں۔"

"فیشن سے لگاؤ ہے؟"

"جب میں اس فیلڈ میں نہیں تھی تو بڑا شوق تھا ہر طرح کے فیشن کرنے کا۔ میک اپ کرنے کا' جیولری پہننے کا۔ مگر فیلڈ میں آ کر یہ سب اتنا ملا کہ میرے شوق ہی ختم ہو گئے۔"

"مرد حضرات کی کن باتوں سے بہت چڑ ہوتی ہے؟"

"اف مرد حضرات کے نخرے۔ تو خواتین سے بھی زیادہ نخرے ہوتے ہیں ان میں اور جو نوجوان ہوتے ہیں ان میں ایک تو "میں" بہت ہوتی ہے پھر لڑکیوں کے سامنے تو ایسے شو آف کرتے ہیں جیسے ان جیسا اچھا تو کوئی ہے ہی نہیں۔"

"ملک میں کون سا قانون بنا کر سرخرو ہونا چاہتی ہو؟"

"ملک میں بہت سی خرابیاں خامیاں ہیں۔ پورے ملک کو ہی اچھا دیکھنا چاہتی ہوں مگر ہمارے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی اگر قدرت مجھے کچھ موقع دے تو میں ایک ایسا قانون بنانا چاہتی ہوں' جس کے تحت کوئی بچہ اور کوئی بڑا بھیک نہ مانگے۔ یہ ہمارے لیے بہت بے عزتی کی بات ہے کہ ہمارے لوگ بھیک مانگ کر گزارہ کریں۔

عزت نفس کو مجروح کر کے روٹی کھانا بہت ہی ذلت کا باعث ہے۔ اگر کوئی قانون بن جائے تو لوگ محنت کر کے کمائیں گے اور محنت کے عادی بھی ہوں گے۔"

☆

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ امان میں رکھے اور جو لوگ اس کے لیے مذموم ارادے رکھتے ہیں، انہیں ان کے ارادوں میں ناکام کرے۔ آمین۔

پہلا خط کراچی سے مسرت الطاف کا ہے، لکھتی ہیں۔

"ایک تھی مثال" پڑھ کر دل بہت دیر تک بوجھل رہا، عدیل پر بھی بھر کر غصہ آیا۔

"رقص بسمل" کی یہ قسط فارہ کے لیے خوشیوں کا پیغام لے آئی۔ اسٹوری نہایت دلکشی و خوبصورتی سے آگے کی جانب رواں دواں ہے۔ "جب ہم ملے" ٹاپک بہت ہی جان دار تھا اس ناول نے ہنسایا بھی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے متعارف بھی کروایا ذات، برادری اور روایات جیسے سنجیدہ موضوع کو سائرہ رضا نے بہت ہی ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا پڑھ کر مزہ آیا۔ "ترن" عفت سحر طاہر نے تو کمال کر دیا اتنا زبردست، شاندار اور بے مثال ناول پڑھ کر دل خوشی سے ہمکنار ہو گیا۔ عافیہ جیسی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے جو گھر جیسی مضبوط پناہ گاہ کو چھوڑ کر اوروں میں تحفظ ڈھونڈتی ہیں۔ "دیمک زدہ محبت" کی یہ قسط دھماکہ دار تھی یہ انکشاف علی ہی ڈاکٹر خاور ہے پڑھ کر شدید حیرت کا جھٹکا لگا، لیکن سکینہ کے لیے بہت برا لگا۔ "محبت من محرم" یہ قسط سب سے زیادہ انٹرسٹنگ تھی افق کی عدن کے لیے نرم دلی، تجسس اور بے وقوفی اس کی اچھی بھلی ہنستی مسکراتی زندگی کو لے ڈوبی۔ پلیز سمیرا حمید جی ہیپی اینڈ کریں۔

افسانوں میں سب سے زیادہ مصباح علی کے افسانے "اے جنون" نے بہت متاثر کیا۔ بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ "طاق نسیاں" حقیقت کے بہت قریب تر محسوس ہوئی اس تحریر کے اینڈ نے رونگٹے کھڑے کر دیے، زبردست تحریر تھی۔

ج۔ پیاری مسرت! آپ کا خط شامل اشاعت ہے لیجیے گلے شکوے دور کریں۔ ہمیں احساس ہے کہ خط نہ دیکھ کر آپ کو کوفت ہوتی ہوگی۔ خط شائع نہ ہونے کی وجہ عموماً تاخیر سے موصول ہونا ہے۔ صفحات کی کمی بھی آڑے آتی ہے آپ تو ہمیں بہت عزیز ہیں ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے خط لکھتی ہیں اور مختلف سلسلوں میں شرکت کرتی ہیں۔ شعاع کے ساتھ ساتھ سلسلہ شامل ہو جائے گا۔ تھوڑا انتظار کریں۔

افسانہ میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ ہمیں اندازہ ہے کہ آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں بس تھوڑی محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر دلی خوشی ہوئی۔ تفصیلی تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

افق آتش نے چیچہ وطنی سے لکھا ہے۔

دو سال سے لکھ رہی ہوں مگر افسوس صد افسوس کسی نے نہ تو تعریف کی نہ حوصلہ افزائی "سوائے میری دوستوں اور ٹیچرز" کے۔

اب کی بار شعاع پہ نظر آ کر ٹھہری ہے معلوم نہیں ہے کہ اس بار کیا ہوتا ہے؟ رو ہوتی ہوں یا...!

حمد اور نعت سے فیض یاب ہوئے سبحان اللہ اور بے شک کے لفظ ہی نکل سکے منہ سے۔ پھر خطوط پر آئے اور بہترین تبصرہ فوزیہ اور طیبہ کا لگا اور آپ کا بہترین جواب جو افراء کو دیا آپ نے، عمدہ تھا کتنی نرمی سے اور محبت سے جواب دیا ہم تو اس مہنگائی میں بھی آپ سے محبت کر بیٹھے "محبت من محرم" سمیرا جی کمال کر دیا آپ نے افق اور فرزام دونوں اچھے ہیں پر یہ کم بخت محبت مرتی نہیں، مار دیتی ہے۔ سائرہ رضا کی طرف آئے لفظوں کا انتخاب کمال کا تھا، چمن چمن کے ایک ایک پھول سے بنایا ہوا گلدستہ۔ کہانی کے شروع میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے، لیکن پھر بھی اچھی لگی۔

ج۔ پیاری افق! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں ہے۔

صبا گل نے ڈی آئی خان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

شعاع کی سات سال سے خاموش قاری ہوں، مگر پہلی بار قلم اٹھایا ہے۔ کیونکہ میں قارئین کی ایک غلط فہمی دور کرنا چاہتی ہوں۔ سب سے پہلے سمیرا حمید کے ناول "محبت من محرم" کی بات کروں گی۔ لگتا ہی نہیں کہ کسی نئی مصنفہ نے لکھا ہے ویڈن سمیرا۔ اور اس کے بعد جس ناول نے مجھے خط لکھنے پہ مجبور کیا وہ سائرہ رضا کا "جب ہم ملے" ہے۔ سائرہ پٹھان معاشرے کی اتنی غلط عکاسی؟ یقین نہیں آیا۔ کوئی نئی رائٹر ایسا لکھتی تب بھی کوئی بات تھی، لیکن پٹھان معاشرے اور روایات اور مزاج کو جانے بغیر ایسا لکھنا آپ کو قطعاً "زیب" نہیں دیتا تھا۔ میں خود ایک پٹھان لڑکی ہوں۔ مروت ہوں۔ لکی مروت سے میرا تعلق ہے۔ اپنے معاشرے اور لوگوں کو میں بخوبی جانتی ہوں۔ آپ نے لکھا کہ پٹھان کے فیصلے میں ترمیم کی گنجائش "نشتہ" (نہیں)۔ پٹھان کے فیصلے میں ترمیم کی گنجائش بالکل "شتا" (ہے)۔ آپ نے لکھا کہ روایتی قبائل کی تعلیم نے صرف اس کے ظاہر کو بدلا۔ وہ تمام لوگ جو پٹھانوں کے بارے میں اس قسم کی سوچ رکھتے ہیں، ان سب سے میں کہوں گی کہ ایک بار پشاور اور K.P.K ضرور دیکھیں اور پٹھانوں کو آزمائیں کریں۔ غیر برادری کا رشتہ پٹھان کے لیے بالکل بھی ایک گالی نہیں ہے۔ خود میری امی مغل ہیں۔ میری دو کزنز کی شادیاں پنجاب اور سندھ میں ہوئی ہیں۔ سائرہ نے لکھا کہ پختون دوست نے اعتبار کرنے میں بہت عرصہ لگایا۔ آج کے دور میں اگر کوئی شخص اپنے دوستوں کو مہمان خانے میں بٹھاتا ہے اور اپنے گھر کی خواتین سے نہیں ملواتا تو کیا یہ بری بات ہے؟ یہ تعلیم تو ہمارے آفاقی مذہب کی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسی قوم سے ہوں جس نے ابھی تک اسلام کو زندہ رکھا ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ تعصب؟ مجھے ابھی تک اپنے کیمسٹری کے پروفیسر کے الفاظ یاد ہیں جو انہوں نے پٹھانوں کے بارے میں کہے۔ میں نے ذرا "آغا" ان سے کہا کہ سر آپ کے ڈی آئی خان پہ تو ہم پٹھانوں نے قبضہ کر لیا ہے تو انہوں نے بڑا خوب صورت جواب دیا کہ "بیٹا! ہم گھروں میں لان کیوں لگاتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ خوب صورتی کے لیے" انہوں نے کہا کہ "بس یہی سمجھیں کہ ہم نے بھی پٹھانوں کو خوب صورتی کے لیے ڈی آئی خان میں رکھا ہے۔" جیسے ان بے لوث لوگوں کا ظاہر خوب صورت ہوتا ہے ویسے ہی ان کا باطن بھی۔ تعلیم ان کے باطن کو بھی نکھارتی ہے۔ بے اثر نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ پٹھانوں کی اردو کا جو مذاق اڑایا جاتا ہے، ٹی وی ڈراموں میں یہ بھی بالکل غلط ہے۔ اعلا تعلیم یافتہ پٹھانوں کی اردو بہت شستہ ہوتی ہے۔ مادری زبان کے علاوہ کوئی زبان سیکھنا اور لب و لہجے کو اپنانا بھی بڑی بات ہے۔ انگریزوں کی اردو تو آپ سب نے سنی ہوگی (ہاہا) چند ماہ پہلے سحر ساجد نے اپنے ناول میں پٹھان معاشرے کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا تھا۔ امید ہے سائرہ رضا مائنڈ کیے بغیر سخت گیر اور روایتی پختون کا تصور بدل لیں گی۔

ج۔ پیاری صبا! انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ہم کسی بھی بات کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ اس میں قصور ہمارا نہیں بلکہ اس تعصب کا ہے جو شعوری کوشش سے پیدا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے درمیان پھوٹ ڈلوانے کے لیے کچھ ملک دشمن عناصر تعصب اور تفرقہ پیدا کر رہے ہیں۔ اسے ہوا دے رہے ہیں اور اب ہم اتنے حساس ہو گئے ہیں کہ معمولی سے معمولی بات کو بھی اسی عینک سے دیکھتے ہیں بلاشبہ پٹھان بہت ذہین، مخلص، دیانت دار اور غیور اور محنتی قوم ہے۔ ہم اپنے پٹھان بھائیوں پر فخر کرتے ہیں۔ وہ محنت کر کے حلال روزی کماتے ہیں شدید گرمی و سردی میں سخت محنت کے کام پٹھان ہی سرانجام دیتے

ہیں۔ کسی دوسری زبان کو سیکھنا دوسرے علاقوں میں جاکر ایڈجسٹ آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے غیر معمولی ذہانت درکار ہوتی ہے جبکہ پٹھان ہر جگہ جاکر ایڈجسٹ ہوجاتے ہیں۔ یہ ان کی ذہانت کی دلیل ہے۔ معذرت کے ساتھ آپ نے سائرہ رضا کے ناول کو سمجھنے میں غلطی کی۔ کسی کردار کو لکھتے ہوئے اس کی خصوصیات بیان کرنا کسی قوم کی تضحیک نہیں۔ سائرہ رضا کے ناول میں ایسا کچھ بھی نہ تھا جو آپ نے محسوس کیا۔ اس سلسلے میں ہم خود بہت احتیاط کرتے ہیں اگر ہمیں ایسا کچھ محسوس ہوتا تو ہم شائع ہی نہ کرتے پھر بھی اگر آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے تو ہم معذرت خواہ ہیں۔ اور جہاں تک غیر برادری میں رشتہ کرنے کی بات ہے تو یہ صرف ایک قوم کی بات نہیں یہ مسئلہ تو ہر جگہ ہے۔

صبا آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ آپ ہمیں کچھ لکھ کر بھجوائیں سات سال بعد آپ نے خط لکھا اب اس سلسلے کو جاری رکھیے گا۔

آمنہ اجالا نے ڈہرکی سے لکھا ہے۔

چلے ہو ساتھ تو ہمت نہ ہارنا واصف کہ
منزلوں کا تصور میرے سفر میں نہیں

ٹائٹل پسند آیا فہرست اس بار تو کافی جگمگا رہی ہے۔ عفت سحر طاہر اور سائرہ رضا کے جگمگاتے ناموں کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ پڑھیں تو پہلے کس کو پڑھیں کہ دونوں ہماری فیورٹ رائٹرز جو ٹھہریں۔ عفت آپی کی از میرٹ اور روبکاکل والی سیریز تو بہت بہت پسند ہے اسی وجہ سے تو ہماری فیورٹ ہیں اور اس سے پہلے کہ ہم فیصلہ کرپاتے ہماری چھوٹی سسٹر صاحبہ نے ہمارے ہاتھ سے شعاع اچک لیا کہ اسے سلسلے وار ناول کی قسط پڑھنا تھی۔ پھر دو گھنٹے بعد جب شعاع ہمارے ہاتھوں میں آیا تو سب سے پہلے عفت سحر طاہر کی تحریر "تاوان" پڑھی۔ خود غرض لوگ کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ دوسروں کے محلات دیکھ کر اپنی جھونپڑی ڈھا دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ زینی کی سادگی اور معصومیت پسند آئی۔ نہایت تیزی کے ساتھ اختتام کی جانب رواں صائمہ آپی کا ناولٹ "دیمک زدہ محبت" میں دلچسپی عروج پر ہے۔

کو کہانی تو نہیں ڈہرکی کی شائنہ بلوچ کے بارے میں انہوں نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ وہ روزانہ ڈاکٹروں سے ایک ہی سوال کرتی ہے کہ جب قرآن پاک میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے تو پھر اس کا علاج کیوں نہیں ہوسکتا۔ نبیلہ آپی کا سلسلہ وار ناول "رقص بسمل" شاندار طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے 'لیکن افسوس کہ یہاں بھی کم صفحات کی بیماری لاحق ہے۔ انشا جی کی خوب صورت نظم "سب مایا ہے" بہت بہت پسند آئی۔ اشعار میں شبنم شمشاد' سونیا ربانی اور رمشہ عظمت کے اشعار پسند آئے "باتوں میں خوشبو آئے" میں مسرت الطاف احمد کراچی کا انتخاب پسند آیا۔

شائستہ اکبر اور مشعل جمانی اب شعاع کے سلسلوں میں شامل نہیں ہوتیں۔ کہاں ہو بھئی آپ دونوں؟ جلدی سے شعاع میں حاضری لگواؤ۔

ج۔ پیاری آمنہ! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کے خط شامل اشاعت نہ ہوسکے۔ "دیمک زدہ" میں محبت میں سکینہ کا کردار کہاں سے لیا گیا ہے یہ تو صائمہ ہی بتا سکتی ہیں' لیکن مصنف اپنے اردگرد لوگوں سے متاثر ہوکر ہی لکھتا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

صفیہ کوکب گوندل نے اسلام آباد سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

سرورق کوئی خاص پسند نہیں آیا۔ سب سے پہلے اپنا پسندیدہ سلسلے وار ناول "ایک تھی مثال" پڑھا۔ بشریٰ کی اپنی بیٹی کے لیے تڑپ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ صائمہ اکرم کا ناولٹ "دیمک زدہ محبت" کی یہ قسط بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر خاور کو علی کے روپ میں دیکھ کر حیرت ہوئی اور ماہم جیسے خود پسند لوگوں کے ساتھ ایسے ہی ہونا چاہیے۔ اس دفعہ نبیلہ عزیز کے سلسلے وار ناول "رقص بسمل" کی قسط کوئی خاص نہ تھی۔

سائرہ رضا کے مکمل ناول "جب ہم ملے" میں نوال نے اس حقیقت کو منوالیا کہ زندہ لوگوں کی جائز خواہشات روایات سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ باقی تمام افسانے اور ناول اچھے تھے۔ دستک دستک میں مایا علی' دعا شبہ اور صنم بلوچ سے ملاقات اچھی رہی۔ تینوں ہی میری پسندیدہ اداکارائیں ہیں۔ باقی تمام سلسلے اچھے تھے۔

ج۔ صفیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی



جاری ہے۔

جڑانوالہ سے کوثر خالد کا خط' لکھتی ہیں۔

خالد بزمی کی حمد نہ صرف ہمیشہ کی طرح پسند آئی بلکہ اس بار خاص رشک محسوس ہوا کہ اک خالد کامیاب دوسرا۔ احمد ندیم قاسمی تو رشک سے بھی آگے کے شاعر ہیں۔ کہاں ہم کہاں وہ۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ نکاح کے بارے میں سب جانتی ہوں مگر پڑھ کر جو خوشی ہوئی بیان سے باہر۔ میں کبھی بھول نہیں سکتی جب میری شادی یعنی نکاح کو کسی نے عجیب شادی کے لقب سے نوازا۔ (کہ میرے ابو نے میری سسرال والوں کو منع کردیا باجے وغیرہ سے۔ ڈھولکی بھی نہ بجائی گئی) تو میں نے اس سے کہا کہ اگر سادہ شادی عجیب ہے تو تم بھلے شادی پر نہ آؤ۔ آپی مگر اس سادہ نکاح سے مجھے شوہر کا ایسا پیار نصیب ہوا کہ شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ میرا بس چلے تو کسی کی شادی دھوم دھڑکے اور فضول خرچی سے نہ ہونے دوں اور کوئی لڑکی لڑکا نکاح کے لیے تڑپنے نہ دوں۔ بالکل اسی طرح بنیادی ضرورت روٹی' کپڑا اور مکان کے علاوہ سب آسائشیں ترک کروا دوں اگر ہم مل بانٹ کر کھائیں تو کوئی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ بساط بھر کوشش کرتی رہتی ہوں۔

"خط آپ کے" نیلم شہزادی کا نام پڑھ کر مرحوم والد یاد آگئے۔ کیونکہ وہ میری چھوٹی بہن کا نام نیلم شہزادی رکھنا چاہتے تھے مگر ان نے عالیہ رکھا۔ سارہ' مریم' طوبیٰ' کرن' شرح آپ کے نام اچھے پیارے۔ واقعی آپ پر غصہ بجا نہیں۔ فوزیہ ثمر آپ کو سالگرہ مبارک۔ میں نے آپ کو اپنی بیٹی مان لیا ہے۔ ثمینہ اکرم لیاری۔ کیا آپ کو اپنا بیٹا خواب میں نظر نہیں آتا۔ میں تو خواب میں اپنے مرحوم شوہر سے ملتی رہتی ہوں بڑی تسلی رہتی ہے۔ اللہ کرے آپ کا بیٹا خوابوں میں ملے۔ آئینہ بچہ مشعل بچہ۔ آئینہ نام پسند آیا۔ خط بہت لگا اور آپ نے حق دار کو حق دے دیا۔ اس کے لیے مبارک باد قبول کریں۔ رابعہ تحسین کی طرح میرا دل بھی آپ کو سیلوٹ کرنے کو چاہتا ہے اور ساتھ میں اپنی بیٹی کو جس نے شعاع سے میرا رابطہ بحال کرانے میں مدد کی مگر خود پڑھنے کا بیچاری کے پاس وقت ہی نہیں۔ خاوند کی وفات کے بعد وہ اور چھوٹا بیٹا ہی کفالت کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں میں خود بھی کامیاب ٹیوٹر ہوں۔

اقراء نے "ستاروں" کی فرمائش کی ہے۔ پیش گوئی وغیرہ تو میں بھی حرام سمجھتی ہوں۔ لیکن اسٹار' عادات کے حوالے سے دلچسپ ہوتے ہیں علم نجوم میں بھی بہت دلچسپی رکھتی ہوں۔ میرا خیال ہے ایک بار صرف بارہ بروجوں کے بارے میں شائع کردیں تو مضائقہ نہیں۔

چک 108 ہما شیراز۔ آپ کے گاؤں والے جیلہ مائی جیسی باتیں نہیں کرتے تو کیا ہوا ہم تو ایسی باتیں کرلیتے ہیں۔ کوئی بھی قاری اچھی باتوں والے کردار کو منع نہ کیا کرے۔

"ایک تھی مثال" کا بہت جملہ۔
"یہ زندگی ہے اور مشکلات مسائل اس کا حصہ۔"

نجانے کون لوگ ہیں جو مثال ایسی کہانیوں سے بور ہوجاتے ہیں حالانکہ یہ ہمارے معاشرے کا بدترین المیہ ہے۔ اب چلتے ہیں آخری رائٹر رانی صاحبہ' سائرہ رضا۔

"جب ہم ملے" فہرست میں نام پڑھا تو جسم و جاں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ پھر آخر میں اسے خوب خوب انجوائے کیا۔ زندگی سے بھرپور کردار' نوال ضمیر۔ میری آرزو' میری خواہش۔ سائرہ جی' میرا ظاہری حال گو تو آپ کی نوال جیسا نہیں مگر اندرونی۔ ہم نے بھی سماج کی بڑی رسمیں توڑی ہیں جس میں ذات پات اونچ نیچ۔ امیری غریبی۔ سائرہ جی اپنا انٹرویو دیجیے نا۔

"شاعری سچ بولتی ہے" "اے روشنیوں کے شہر ہم عاجز کرسکتے ہیں۔ اس "مایا" نے سب اجاڑا ہے تب ہی تو ہم اس کے سخت خلاف ہیں۔ اسی لیے تمام عمر جوانی میں بھی ہم نے ایک لپ اسٹک بھی خریدنا پسند نہ کی۔ اپنے شوہر کو اپنا ہمنوا بنالیا۔

آپی ضرور بتائیے گا۔ شاعری سچ میں اگر حصہ لوں اور صرف نعتیہ انتخاب لکھوں تو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ شائع کریں گی نا؟

"تاریخ کے جھروکے" "کاش حضرت زینبؓ کے بارے تفصیل سے ہوتا" پیاس نہیں بجھی۔ اور خوب صورت بننے کے لیے تو ہم نے نہ کچھ کیا نہ کرنے کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو کردار کا ایسا حسن عطا کرے کہ روز محشر نور کا میک اپ میسر ہو۔ آمین ثم آمین۔

ج۔ کوثر جی کردار کا حسن تو ابدی ہے۔ لیکن ظاہری خوب صورتی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا' بننا سنورنا' خوب صورت نظر آنا بھی ایک عورت کا حق ہے اور اس کے لیے ضروری بھی ہے کہ شوہر اسے دیکھے تو

خوش ہو جائے۔ ہمارے مذہب میں عورتوں کو بناؤ سنگھار کے لیے ممانعت نہیں ہے۔ شاعری سچ بولتی ہے کے سلسلے میں نعتیہ کلام کا انتخاب بھجوا دیں' اگر آپ نے اچھے شعراء کا کلام منتخب کیا تو شائع ہو جائے گا۔ شعاع جن گھروں میں جاتا ہے' وہاں بچے بھی ہوتے ہیں اگر آپ بچوں کے لیے کچھ لکھنا چاہتی ہیں تو ضرور لکھیں۔

کوثر آپ کا خط اچھا لگا۔ آپ کے خط کی انفرادیت یہ ہے کہ آپ نے ہر سلسلے پر بھرپور تبصرہ کیا ہے جبکہ زیادہ تر خطوط میں صرف کہانیوں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

## 100 کوارٹر کراچی سے زارا انصاری نے لکھا ہے

"دیمک زدہ محبت" بہت بہت زبردست۔ خاور ہی علی ہے یہ جان کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ صائمہ جی پلیز سکینہ کو ٹھیک کر دیجیے گا۔ پلیز مریم ساجد سے کچھ لکھوائیں۔

ج۔ زارا شعاع کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ مریم ساجد نے کافی عرصہ سے کچھ نہیں لکھا' ہمیں بھی ان کی تحریروں کا انتظار ہے۔

سکینہ ٹھیک ہو جائے یہ ہماری بیشتر قارئین کی خواہش ہے۔ صائمہ اکرم تو اپنے قلم کی جنبش سے سکینہ کو ٹھیک کر سکتی ہیں' لیکن کہانی حقیقت سے بہت دور ہو جائے گی۔ سکینہ کا مرض لاعلاج ہے اور وہ خود بھی دل شکستہ ہے۔

یہ بات عجیب ہے کہ سکینہ ایک سچی محبت کو کمتر جان کر ٹھکرا رہی ہے' لیکن ہماری قارئین کی تمام تر ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں جبکہ ماہم کو اس کی ظاہر پرستی کی وجہ سے شدید ناپسند کیا جا رہا ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ آپ اس کی وضاحت کس طرح کریں گی۔

## فاطمہ بنت آدم نے شیخوپورہ سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

ٹائٹل نے خوشگوار احساس میں مبتلا کیا۔ سب سے پہلے تو میں محبت من محرم کی طرف بھاگی کہ آخری قسط ہو گی لیکن۔۔۔ اجو بھی ہے سمیرا حمید بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ افق کی حرکت پہ افسوس ہوا۔ ابھی اس کے دل میں عدن کے لیے احساسات تھے اسے ان کو خود پہ حاوی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ عدن کی ذہنیت پہ جی بھر کر افسوس ہوا۔

"اترن" عفت سحر پاشا نے ہلکی پھلکی تحریر لکھی۔ "جب ہم ملے" ابھی پڑھی نہیں ہے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے اے جنون تھک آف انسان اپنے جذباتی پن کے ہاتھوں سب کچھ گنوا دیتا ہے زندگی وہی اچھی جس میں اعتدال ہو۔ طاق نسیاں۔ عید اسپیشل بھی اچھے افسانے تھے۔

ج۔ فاطمہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ خط کچھ ادھورا سا لگا۔ شاید اس لیے کہ پورا شمارہ پڑھ کر نہیں لکھا گیا تھا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔ راحت کاظمی کا انٹرویو پہلے شائع ہو چکا ہے۔ پھر بھی آپ کی فرمائش شاہین تک پہنچا رہے ہیں۔

## جمیلہ شاہ کھکہ کھکھی والا ملتان سے تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں

مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ میں آپ لوگوں کو اپنے جذبات کس طرح سے بیان کروں کہ مجھے شعاع اور خواتین کتنے اچھے لگتے ہیں۔ میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ اس دفعہ بہت اچھا تھا شعاع۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" اس کے بعد "خط آپ کے" مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ثمینہ اکرم میں بہت دعا کروں گی گیارہ نومبر کو اللہ آپ کو حوصلہ دے۔ یار آپ لوگ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی اپنے عزیز رشتہ داروں سے مل کر آتا ہے۔ ثوبیہ جہانگیر اور فرزانہ سہیل بہت یاد آتی ہیں۔ نبیلہ عزیز بہت شکریہ آپ کا ناول بہت اچھا ہے۔ ناول کے سارے کردار بہت اچھے لگے۔ عفت سحر کا ناول "اترن" تھا تو پرانا موضوع مگر اچھا ہلکا پھلکا اور سائرہ رضا بہت اچھا لکھتی ہیں۔ بہت جگہ پر میں اتنی ہنسی بہت دنوں کے بعد۔ خاص کر نوال جب اخفش کو شلوار کے فائدے بتاتی ہے سب سے اچھا افسانہ طاق نسیاں تھا۔ امتل آپ نے اتنی بڑی بات دو صفحوں میں سمجھا دی۔ میرے پاس پرانے رسالوں کے علاوہ 1995 سے لے کر اب تک کے رسالے جمع ہیں۔ شعاع' خواتین' کرن اور اس کے علاوہ 25 ناول بھی میں نے لیے ہیں۔

اب اتنا مزا نہیں آتا رسالوں میں جتنا پہلے آتا تھا یا راہم لوگ پہلے ہی بہت مشکل زندگی گزار رہے ہیں پلیز۔ ہلکا پھلکا لکھا کریں ———— نبیلہ عزیز' سائرہ رضا' بشریٰ احمد' راشدہ رفعت' عفت سحر پلیز باقی تو

بڑے لوگ ہوگئے ہیں ٹی وی پر جا کر ان لوگوں نے ہمیں بھلا دیا۔

ج۔ پیاری جمیلہ! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ تعلیم صرف ڈگری حاصل کرنے کا نام نہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ آپ کو مطالعہ کرنے کا شوق ہے' اس سے علم بڑھتا ہے۔ شعاع میں بیشتر تحریریں ہلکی پھلکی ہی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی سنجیدہ تحریر بھی ہونی چاہیے۔ اتنے عرصہ بعد آپ نے خط لکھ' اب باقاعدگی سے اس سلسلے میں شرکت کرتی رہیے گا۔

سنبل ملک اعوان ونڈالہ دیال شاہ تحصیل فیروز سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے۔

"رقص بسمل" نبیلہ عزیز بہت ہی زبردست تحریر۔ الفاظ کا چناؤ اور کہانی کردار ہر ہر چیز مصنف کی پختہ اور عملی تجربہ کی عکاس ہے۔ "دیمک زدہ محبت" صائمہ اکرم چوہدری کی کہانی بھی اچھی ہے ماہم کی نفسیات کون سمجھے گا۔ رامس ہی علی کا بھائی ہے جب ساری حقیقت کھلے گی تو کیا نظر ملا پائے گی ماہم بی بی۔ کاہے کو بیاہی۔ صوفیہ سرور کی بہت ہی اچھی تحریر مگر میں ایک بات ضرور کہوں گی کہ ہمیشہ ضدی' برے اور ہٹ دھرم' پڑھے لکھے جاہل لوگوں کو اچھی بہوئیں ملتی ہیں جبکہ شریف' نرم خو ہمدردی اور خدا ترس نیک لوگوں کو بری بہوئیں کیوں ملتی ہیں (میری دو بھابھیاں ہیں نہ پڑھی لکھی ہیں نہ گھریلو امور میں ماہر مگر انہوں نے میری ماما' پاپا اور مجھے کھڈے لائن لگایا ہوا ہے جبکہ تیسرے نمبر کے دیور کے ساتھ بالکل ٹھیک بولتی ہیں اس کے ساتھ ان کا رویہ بالکل ٹھیک ہے جبکہ ہم تینوں کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ خط جب شائع کریں تو ساتھ میں بہنوں کی مصروفیت کو بھی تھوڑا سا شامل کریں۔ محفل ہی جم جائے گی اور آپس میں رابطے اور مدد کا باعث بنیں گے دکھ سکھ شیئر ہوں گے؟

میں ڈے کیئر سینٹر بنانا چاہتی ہوں' فری ڈے کیئر سینٹر کیونکہ میرے گھر کے پیچھے قلندر بکھی داس رہتے ہیں مائیں سارا سارا دن انار کلی' بانو بازار' برکت مارکیٹ' مون مارکیٹ وغیرہ میں بھیک مانگتی پھرتی ہیں جبکہ بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات اکثر ہوتے ہیں اس لیے میں فری ڈے کیئر سینٹر بنانا چاہتی ہوں۔ بچوں کو میں پہلے ہی فری ٹیوشن پڑھا رہی ہوں مگر یہ کام بڑا ہے جس کے لیے مجھے اپنے خاندان' رشتے دار اور دوستوں کی مدد درکار ہوگی۔ یہ کام صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے ہے۔

ج۔ پیاری سنبل! آپ کا پچھلا خط تاخیر سے موصول ہوا۔ اس لیے شامل نہ ہو سکا۔ یہ خط بھی لیٹ ملا اس لیے نومبر کے شمارے میں شامل نہ کر سکے۔ اب شائع کر رہے ہیں۔ 12 دسمبر آپ کا جنم دن ہے۔ سب سے پہلے تو سالگرہ کی مبارک باد۔ بہنوں کی دوستی اور شرکت کے لیے شعاع کے ساتھ ساتھ کا سلسلہ ہے' لیکن اگر قارئین نے آپ کی تجویز کی تائید کی تو ہم آپ سب کے مشاغل اور دلچسپیاں ضرور شائع کریں گے۔

ڈے کیئر سینٹر والی بات سمجھ میں نہیں آئی جن لوگوں کے لیے آپ یہ کام کرنا چاہتی ہیں' ان کے بچے تو پوری طرح ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ان کے ساتھ محنت ومشقت میں لگ جاتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو آپ کے ڈے کیئر سینٹر میں کیوں چھوڑیں گے۔ تعلیم دینا بہت اچھی بات ہے۔ کسی کو دو حرف بھی لکھنا پڑھنا سکھا دینا بڑی نیکی ہے' لیکن اس کے لیے رشتہ داروں اور دوستوں سے توقع رکھنے کے بجائے صرف اللہ پر اور اپنی محنت پر بھروسا کریں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آئندہ خط جلد بھجوائیے گا۔

بھابھیوں کا رویہ آپ کو اچھا نہیں لگتا۔ یہ آپ کے لیے سبق ہے کل جب آپ کسی کی بھابھی بنیں تو خیال رکھیے گا۔ اور ایسی کوئی بات نہ کیجیے گا جس سے آپ کے سسرال والوں کو تکلیف پہنچے۔

فریدہ فرید نے پاک پتن شریف سے لکھا ہے۔

عفت سحر جی کی بات کرنا چاہوں تو کیا بات کروں۔ تازہ ترین "اترن" نے ساری مزاج کی تھکان اتار دی' البتہ عنوان منفرد ہونا چاہیے تھا۔ "اترن" نام دیکھتے ہی اول تا آخر ساری اسٹوری دماغ میں آجاتی ہے۔

یونہی جویا و معاذ کی خالق عالیہ بخاری جی کو داد دینا چاہوں تو زور قلم نیست۔ رائٹرز کی تعریف و تحسین تو اقربائے شعاع کرتی ہی ہیں' مگر میں آپ کے خط کی مدلل و مفصل جواب ارسال کرتی شخصیت کے لیے ضرور دعا تحریر کروں گی۔ شعاع کے حوالے سے اکثر قاری بہنوں کی آراء نظر سے گزریں کہ تحاریر میں محبت کے عنصر کو کم اور اصلاحی موضوعات کو زیادہ دکھایا جائے میری عرض یہ ہے کہ محبت کا وجود اب صرف ادبی دنیا میں ہی باقی رہ گیا ہے۔ کیا اسے یہاں سے بھی نیست و نابود کر دیا جائے۔ میرے نزدیک تو محبت سے گندے دلوں سے بڑھ کر اصلاح و اخلاق کہاں میسر آسکتا ہے؟ ایک چھوٹی سی عرض مزید ہے کہ جو خطوط تاخیر سے ملیں وہ خطوط نہیں تو کم از کم نام "تاخیری خطوط" کے عنوان سے ضرور شائع کر دیں۔

ج۔ پیاری فریدہ! آپ نے اتنا عرصہ شعاع کو خاموشی سے پڑھتے رہنے کے بعد قلم کو جنبش دی۔ بہت شکریہ۔ یہ کائنات محبت کے وجود سے ہی قائم ہے' لیکن محبت کا بھی کوئی قرینہ ہونا چاہیے۔ وقتی کشش کو محبت سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے۔ محبت وقتی کشش سے بڑھ کر ایک جذبہ ہے جس کے کچھ آداب ہیں انہیں ملحوظ نہ رکھا جائے تو ہمارا معاشرتی ڈھانچہ قائم نہیں رہ سکتا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

چیچہ وطنی سے مہوش مشتاق شریک محفل ہیں' لکھا ہے

شعاع کے دو بہترین ناولز "محبت من محرم" اور "دیمک زدہ محبت" سب سے پہلے پڑھے۔ "دیمک زدہ محبت" کا ہر کردار اپنی جگہ بہت خوب صورت (سوائے ماہم اور اس کی بہن کے)

میرا حمید کا ناول اس بار تو بہت ہی اچھا لگا۔ افق نے واقعی بہت بڑی غلطی کی۔ ایک ہی جگہ سے بار بار دھوکا کھانا تو نری حماقت ہے نا۔ سائرہ رضا تو شعاع کی جان ہی بنتی جا رہی ہیں۔ بہت خوب صورت ہلکی پھلکی تحریر ایسی تحریریں ہر ماہ شامل ہونی چاہئیں۔

"ایک تھی مثال" کچھ خاص قسط نہیں تھی اس ماہ کچھ خاص آگے نہیں بڑھ رہی کہانی۔ اور "رقص بسمل" پلیز نبیلہ عزیز سے معذرت کے ساتھ کچھ کمی ہے ناول میں۔ آفاق کے کردار پر تو اب غصہ آنے لگا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بلاوجہ کا سسپنس پیدا کیا گیا ہے۔

افسانوں میں طاق نسیاں بہت اچھا لگا دستک اور شادی مبارک میں بشریٰ گوندل کا احوال اچھا لگا۔

ج۔ پیاری مہوش! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔

قسط وار ناولوں میں عموماً" ابتدائی اقساط میں ناول کے مرکزی کرداروں کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ ان کا پس منظر' ان کی نفسیات۔ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ کہانی اور کردار واضح ہوتے جاتے ہیں اور ناول کی دلچسپی بڑھ جاتی ہیں۔ دونوں ناولوں میں ابھی ابتدائی اقساط ہیں۔ آگے چل کر آپ کی یہ شکایت دور ہو جائے گی۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

حرا قریشی بلال کالونی ملتان سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

نعت احمد ندیم قاسمی نے دل موہ لیا' پیارے نبی کی باتوں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ حقیقتاً" "شعاع" ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ جذبات انگیز نغمات سننے اور فلمیں دیکھنے کے تو ہم بھی خلاف ہیں چونکہ ہمیں شاعری سے رغبت ہے سو اب سوچ لیا ہے کہ اس طرح کی شاعری سے بھی احتراز برتنے کی کوشش کریں گے جو دل ناداں کو بھٹکانے کا سبب بنے۔

"خط آپ کے" پڑھے (اتنی ڈھیر ساری محبت اور عقیدت!) جوابات پڑھ کر مجھے بے حد مزہ آتا ہے جیسے لوگوں کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا کیک کھا کر' مسرت ناز جی آپ کے "او نشاں والے" کے لیے تو ہم بھی منتظر رہیں گے۔ "شادی مبارک ہو" بشریٰ گوندل کا جامع مگر مختصر احوال بھی دل کو بھایا۔ قانتہ جی نے "عید اسپیشل" میں آغاز بھی بہت پیارا کیا اور اختتام بھی بہت بہت پیارا کیا۔ "اللہ رسان' توکل' پیار" بہت خوب! امت العزیز شہزاد نے "طاق نسیان" میں مختصر پیرائے میں ایک باریک بات کی۔

عفت سحر جی "اترن" کا عنوان ہی زبردست تھا۔ عمر کے جواب نے تو سرشار ہی کر دیا۔ "مجھے کسی کی اترن کی عادت نہیں ہے۔" (تحریر کا نچوڑ جملہ!)

سحر انگیز' دہلا دینے والی قلب مضطر کو' رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر۔۔۔ (پہچان گئے؟) جی جناب! مصباح علی کی "اے جنون قلب" کچھ ایسی ہی تحریر تھی۔ جو کئی دن تک اپنے اثر سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

سیما بنت عاصم جی "ٹھوکر" سبق آموز من موہنی سی تحریر آپ کی۔۔۔ خالہ زبیدہ جیسے لوگ جب تک ٹھوکر نہ کھائیں نہیں سنبھلتے۔ باقی احمد پوری کی غزل بہت پسند آئی۔

بندھن بھی پڑھ ڈالا۔ صبا فیصل جی پڑھائی کے ساتھ ساتھ مزید کوئی کام کرنا مشکل لگتا ہے لیکن جانے کیوں

لطف آتا ہے "تاریخ کے جھروکوں" کی تو اب کے بات ہی نرالی تھی۔ کربلا کا دل دوز واقعہ المناک باب ہے۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش 'خاتون جنت کی چاہ کہ "جنازے کے وقت چشم فلک بھی ان کے کفن کو نہ دیکھ سکے"۔ ایک ایک لفظ' ایک ایک فقرے نے جھنجوڑ ڈالا۔

سب سے آخر میں "پہلی بار جب ہم ملے" پڑھی۔ جھٹ پٹ نومبر 2012ء کا شمارہ تلاش کیا اور نوال کی خوبیوں کا اعتراف کرتے کرتے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ بلند رہے اقبال سائرہ جی آپ کا بہت اعلیٰ پائے پر ایک اچھی تحریر سے روشناس کروانے پر۔

پیاری حرا! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

### رضوانہ شکیل راولپنڈی سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے۔

نومبر کا سرورق جاذب نظر تھا پیارے نبی کی پیاری باتیں روح کو منور کرتی ہیں۔ علیشبہ اور صنم بلوچ کی باتیں ٹھیک ہی لگیں۔ بشری کو ندل کو نند اور دیور کی شادی کی مبارک باد۔ "امت العزیز شہزاد نیا نام لیکن اچھا کام" اس مختصر افسانے نے تلخ حقائق سے پردہ اٹھانے کی بہت زبردست کوشش کی ہے۔ "محبت من محرم" کی ہر قسط دل کو چھو لینے والی یادوں سے لبریز ہوتی ہے۔ ویل ڈن صائمہ جی۔ "دیمک زدہ محبت" اپنی مثال آپ ہے۔ خاص طور پر جیلہ مائی اور سکینہ اللہ دتا کی منفرد اور خوب صورت گہری باتیں۔ "ایک تھی مثال" کی یہ قسط بھی سابقہ اقساط کی طرح زبردست تھی۔ عدیل پر بہت غصہ آیا۔ بشری کا بچی کے لیے تڑپنا پڑھ کر من اداس ہوگیا۔ "شاعری سچ بولتی ہے" سعدیہ ریاض کا انتخاب اچھا تھا۔ شعاع کے ساتھ ساتھ میں "قصی مریم ملغانی" اپنا تعارف کروائی اچھی لگیں۔ ٹھیک کہا قصی نے شعاع کی روشنی گاؤں اور کچی پکی بستیوں پر بھی ہے۔ اس کی اصل شہرت کی وجہ بھی یہی ہے۔ بند ھن میں صبا فیصل چھا گئیں۔

ج۔ پیاری رضوانہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

### فوزیہ ثمرٹ نے گجرات سے لکھا ہے

سائیڈ پوز میں ماڈل بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ رخسانہ جی کا نیا ناول پڑھا۔ پلیز گزارش ہے اس ناول کو زیادہ طویل مت کیجیے گا۔ دو' دو سال ناول ریگتے رہتے ہیں۔ پھر تحریروں سے دلچسپی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تو اب یہ عالم ہے مزاجوں کا کہ روزانہ کوئی سالن' دال یا سبزی کھاؤں' تو ہر منظر میں وہی چیز نظر آنے لگتی ہے۔ کجا کہ اتنی لمبی لمبی تحریریں۔ سوپ ڈراموں کی طرح اور موسم کے پکوان میں پلیز اگر ہو سکے تو کڑھائی بنانے کی ترکیب بتائیں۔

ج۔ پیاری فوزیہ! ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ رخسانہ کے پچھلے دو ناول "زندگی اک روشنی" اور "محبت' خواب' سفر" طویل ناول تھے۔ یہ ناول زیادہ طویل نہیں ہوگا۔ بلاشبہ بعض ناول زیادہ طویل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات تو آپ تسلیم کریں کہ اب تک شعاع میں جو غیر معمولی طویل ناول شائع ہوئے ہیں۔ ان میں دلچسپی کا عنصر قائم رہا ہے اور کہانی تسلسل سے آگے بڑھی ہے۔ پیاری بہن! آپ نے یہ کیسے سوچا کہ ہم نے آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ آپ سب ہمیں اتنی محبت سے خط لکھتی ہیں۔ ہمیں اتنی عزیز ہیں۔ ہم آپ کا مذاق اڑانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

## نبیلہ عزیز

مادرا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ مادرا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئرپورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا" کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتمیزی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منزہ' ثمینہ اور نیرو کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرو کے بیٹے سے فارہ کی بہن حنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت' تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس کی وصد افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں مادرا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ مادرا' عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔

— ٦ —

### چھٹی قسط اب

"فارہ.....! تم اتنی اداس کیوں ہو؟" تیمور نے چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے اپنے سامنے کرسی پہ سر جھکائے بیٹھی فارہ سے ــ نرمی اور اپنائیت سے استفسار کیا۔

"کیا آپ نہیں جانتے؟" فارہ کا لہجہ شکوہ کناں تھا۔

"شاید.....!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہونہہ.....! مجھے پتا ہے تیمور بھائی! آپ شاید نہیں "یقیناً" جانتے ہیں۔" فارہ کے انداز میں بھرپور یقین تھا اور تیمور اس کے یقین پہ چپ ہو گیا۔

"لیکن اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب تو وہ خوش ہے۔" تیمور نے ذرا توقف سے جواب دیا۔

"لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ اب میں خوش نہیں ہوں۔" فارہ کے دل میں آفاق کی طرف سے اک گرہ سی پڑ گئی تھی اور وہ کوشش کے باوجود اس گرہ کو کھول نہیں پا رہی تھی۔

"یہ تمہارا ری ایکشن ہے۔" تیمور ہنوز نرمی سے بات کر رہا تھا۔

"یہ میرا ری ایکشن نہیں ہے تیمور بھائی! یہ میری فیلنگز ہیں اس کے لیے اور میری فیلنگز کو اس حد تک لانے والا بھی وہ خود ہی ہے' ورنہ میرا دل تو اس کے حوالے سے شیشے کی طرح صاف تھا۔ اتنا صاف کہ میرے گھر والوں کو اور میرے جاننے والوں کو بھی اس کا عکس میرے دل میں صاف نظر آتا تھا۔"

فارہ نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔ تیمور نے اس کے اتنے پُرزور انداز پہ بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

"تو کیا اب اس کا عکس نہیں ہے؟"

"شاید.....!" اس نے عجب انداز میں کہا۔

"ہاں تو یہ محض فیلنگز ہیں نا' جو کبھی ہوتی ہیں' کبھی نہیں ہوتیں جبکہ محبت تو ہمیشہ رہتی ہے اور محبت میں دل پہ نقش ہونے والا عکس کبھی نہیں مٹا کرتا۔ چاہے انسان خود مٹ جائے' چاہے اس کا دل مٹ جائے مگر..... محبت کا عکس نہیں مٹتا۔"

تیمور نے فارہ ـــــ کو ایک اور دلیل دی تھی لیکن اس وقت فارہ کا دل کوئی بھی دلیل ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"دل ٹوٹ جائے تو دل میں موجود عکس بھی ٹوٹ جاتے ہیں تیمور بھائی! آپ کا ابھی دل سے اور دل کے کسی معاملے سے واسطہ نہیں پڑا' جب پڑا تو' پوچھوں گی آپ سے کہ ایسے معاملوں میں دل کی برداشت کتنی کم ہوتی ہے؟" فارہ کا انداز استہزائیہ سا ہوا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میرا دل سے اور دل کے کسی معاملے سے واسطہ نہیں پڑا؟"

تیمور نے مسکراتے ہوئے فارہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"کیا.....؟ کیا کہا آپ نے؟" فارہ بے ساختہ چونکی۔

"فارہ بی بی! وہ آپ کی دوست آئی ہیں' آپ سے ملنے۔" فارہ اور تیمور دونوں لان میں بیٹھے ہوئے تھے جب ملازمہ نے اس کے قریب آکر اسے اطلاع دی تھی اور فارہ ایک بار پھر چونک اٹھی۔

"کون ماورا؟ ماورا آئی ہے؟" فارہ بے یقینی سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"جی بی بی جی! وہی آئی ہیں۔" ملازمہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تو تم نے اسے وہاں کیوں کھڑا کر رکھا ہے؟ اسے اندر لے کر کیوں نہیں آئیں؟" فارہ ملازمہ کو سرزنش کرتی ہوئی تیزی سے گیٹ کی سمت لپکی۔

مجبوراً وہ بھی وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔



"ماورا! تم یہاں؟ مجھے..... مجھے یقین نہیں آرہا۔" فارہ گرمجوشی سے کہتی ہوئی ماورا سے لپٹ گئی۔

"میں ہمیشہ وہی کام کرتی ہوں' جس پہ کسی کو اتنی آسانی سے یقین نہیں آتا۔" تیمور ٹیبل پہ رکھا اپنا موبائل اٹھا کر اندر جانے کے لیے پلٹ ہی رہا تھا' جب وہ اس لڑکی کے پراعتماد لہجے اور آواز پہ ٹھہر گیا۔

"میں جانتی ہوں! یہی تو تمہاری کوالٹی ہے۔" فارہ کا لہجہ خوشی سے کھنک رہا تھا اور تیمور کو حیرت ہوئی تھی کہ فارہ کو اتنی خوشی تو اپنی سسرال سے آنے والے مہمانوں کی نہیں ہوئی' جتنی اپنی دوست کی ہو رہی ہے۔

"میری کوالٹی جانتی بھی ہو پھر بھی مجھ سے مایوس ہو جاتی ہو؟" اس لڑکی نے فارہ پہ خفگی ظاہر کی۔

"جب ہر طرف سے انسان کو نفی کا سائن بورڈ دیکھنے کو ملے تو انسان مایوس ہو ہی جاتا ہے ڈیر!"

فارہ بہت فریش انداز میں بات کر رہی تھی اور تیمور وہیں لان میں کھڑے ان دونوں کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا مگر شام کا ملگجا سا اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ انہیں واضح نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

"لیکن پھر بھی دیکھ لو میں نے اور آفاق یزدانی نے تمہیں مایوس نہیں رہنے دیا۔ آخر کار تمہاری ہی خوشی کا خیال رکھا ہے۔" ماورا نے اسے جتایا۔ فارہ آہستگی سے مسکرا دی۔

"آفاق یزدانی کا تو پتا نہیں..... لیکن تمہارا تھینکس۔" فارہ نے کہا۔

"یو ویلکم! مگر شاید اب مجھے چلنا چاہیے؟" ماورا نے ابھی تک ٹینٹ کے پاس کھڑے ہونے پہ چوٹ کی اور فارہ اپنے سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئی۔

"اوہ سوری یار..... ! تمہارے آنے کی خوشی میں ایسی پاگل ہوئی ہوں کہ سارے مینرز ہی بھول گئی۔ دیکھو! تیمور بھائی بھی میرے انتظار میں وہیں کھڑے ہیں۔ آؤ تمہیں ان سے ملواؤں۔" فارہ تیزی سے کہتی ہوئی اس کا ہاتھ پکڑے لان کی طرف آ گئی۔

"سوری تیمور بھائی! مجھے اپنی دوست کے آنے کا سن کر اتنی خوشی ہوئی تھی کہ میں آپ سے ایکسکیوز کیے بغیر ہی اٹھ گئی۔" فارہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے وضاحت پیش کی۔

"اٹس اوکے مائی ڈیر کزن..... ! تمہاری خوشی کا اندازہ تو مجھے تمہارے اس طرح اٹھ کر جانے سے ہی ہو گیا ہے لیکن کوئی بات نہیں دوست اسپیشل ہو تو فیلنگز بھی اسپیشل ہی ہوتی ہیں۔" تیمور نے مسکرا کر کہا اور فارہ نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی ہاں..... ! دوست تو واقعی بہت اسپیشل ہے اسی لیے تو آپ کو بھی اس سے ملوا رہی ہوں۔ یہ میری اکیلی اور اکلوتی فرینڈ ہے۔ بیسٹ فرینڈ ماورا مرتضیٰ۔"

فارہ نے اپنے دائیں طرف کھڑی ماورا کے گرد اپنا بازو لپیٹتے ہوئے اسے ذرا اور سامنے کیا۔ اور اس کے سامنے آنے پر تیمور کی نظریں اس پہ ٹھہر گئی تھیں اور ان نظروں میں یہ چہرہ اور اس شام کا منظر پوری آب و تاب کے ساتھ گھوم گیا۔

"السلام علیکم..... !" ماورا نے کافی پراعتماد انداز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام..... ! کیسی ہیں آپ؟" جواباً تیمور نے بھی آداب نبھائے۔

"اور ماورا! یہ ہیں میرے ماموں زاد کزن تیمور حیدر..... انکل رضا حیدر کے بیٹے اور حیدر گروپ آف انڈسٹریز کے مالک بھی..... " فارہ نے کافی بھرپور طریقے سے تیمور کا تعارف کروایا تھا۔

اور تیمور حیدر کے اتنے بھرپور تعارف پہ ماورا بھی اسے سر اٹھا کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور اس کی نظریں بھی تیمور کے چہرے پہ جم کے رہ گئی تھیں۔

"تیمور حیدر!" اس کے ہونٹوں پہ تیمور کا نام ذرا سا مچلا تھا لیکن وہ ہونٹ بھینچ گئی۔ اس کے ذہن کے پردے پہ

تیمور کا کچھ دن پہلے والا عکس لہرا گیا تھا جس سے یہ ثابت ہوا تھا کہ ان دونوں کا حافظہ کافی اچھا ہے۔
وہ دونوں ایک دوسرے کی سرسری سی جھلک کو بھی نہیں بھولے تھے۔
"ماورا...!" فارہ نے اسے ٹہوکا دیا تو ماورا چونک گئی۔
"ہوں... ہیلو مسٹر تیمور حیدر... بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر اور یہ جان کر بھی کہ آپ فارہ کے کزن ہیں۔" ماورا کا ازلی اعتماد ہنوز تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ تیمور حیدر اسے بہت گہری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔
"سیم ٹو یو مس ماورا...!" تیمور جواباً بڑی خوش دلی سے بولا۔
"ماورا مرتضیٰ...!" ماورا نے اپنے پورے نام پہ زور دیا۔
"اوہ سوری... ماورا مرتضیٰ۔" تیمور نے فوراً معذرت کی۔
"تمہارے انکل اور آنٹی کہاں ہیں؟ تم نے تیار نہیں ہونا یا اسی طرح کھڑے رہنا ہے؟" دوسرے ہی پل اس نے تیمور حیدر کو یکسر نظر انداز کر ڈالا۔ یوں جیسے وہ ان کے پاس کھڑا ہی نہ ہو۔ اس کی یہ نظر اندازی تیمور کو بھی ایک پل میں ہی کھٹک گئی تھی کیونکہ اسے... آج تک کسی لڑکی نے اس طرح نظر انداز نہیں کیا تھا۔

"انکل اور آنٹی بس آدھے گھنٹے میں پہنچنے ہی والے ہیں۔ انہیں کوئی ضروری کام آن پڑا تھا۔ اس لیے انہوں نے تیمور بھائی، نیو آنٹی اور احمد انکل کو پہلے بھیج دیا ہے وہ خود بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔"
فارہ نے اسے بڑی خوشی اور روانی سے بتایا۔ تیمور بار بار اس کی خوشی دیکھ کر حیران پریشان ہو رہا تھا کہ کیا واقعی یہ تھوڑی دیر پہلے والی فارہ ہے، جو حد سے زیادہ مایوس اور اداس نظر آ رہی تھی اور وہ اسے سمجھانے اور بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"اور تم ابھی تک جوں کی توں کھڑی ہو۔" ماورا نے اسے خفگی سے سر تاپا دیکھا۔
"او کے... او کے ابھی تیار ہو جاتی ہوں۔ تم اندر تو چلو ناں... تیمور بھائی! آپ بھی اندر آ جائیے۔"
فارہ ان دونوں سے مخاطب ہوئی تھی اور تیمور نے اک نظر ماورا کی سمت دیکھتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے اور اس کے پیچھے ماورا اور فارہ نے بھی قدم آگے بڑھا دیے۔

☼ ☼ ☼

"اب دیکھو... کیسی لگ رہی ہوں میں؟" فارہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے آپ پہ ایک آخری تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے ماورا کی سمت پلٹی تھی۔
اس نے بے بی پنک کلر کی فینسی فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا اور باریک سا دوپٹہ گلے میں ڈال رکھا تھا اور اس پہ میچنگ جیولری اور ہلکا سا میک اپ فارہ کو دیکھتے ہی دیکھتے باربی ڈول کے روپ میں بدل گیا تھا۔
ماورا نے بے ساختہ ماشاءاللہ کہا۔
"ماشاءاللہ... ماشاءاللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اتنی پیاری کہ تمہیں دیکھ کر تم پہ پیار آ رہا ہے۔" ماورا میگزین وہیں بیڈ پہ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ قدموں سے چلتی فارہ کے سامنے آ رکی۔ فارہ اس کے اس طرح دیکھنے پہ کنفیوز سی ہوئی۔
"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے اپنا دوپٹا درست کیا۔
"دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت اگر آفاق یزدانی بھی تمہیں دیکھے تو کیا اسے بھی تم اتنی ہی پیاری لگو گی یا اسے کچھ کمی محسوس ہو گی تم میں...؟"



ماورا نے اسے... گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور فارہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
"کمی تو وہ تب محسوس کرے گا جب مجھے دیکھے گا اور مجھے دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس ٹائم ہو جو کہ اس کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے ظاہری سی بات ہے کہ اسے مجھ پہ پیار نہیں آئے گا۔" فارہ نے فوراً ہی خود کو کمپوز کرتے ہوئے کندھے اچکائے۔
"کاش...! آج تمہارے کزن تیمور حیدر کے بجائے آفاق یزدانی یہاں آیا ہوتا اور میری ملاقات اس سے ہوتی۔" ماورا نے اپنی خواہش بیان کی۔
"تو پھر کیا ہوتا...؟" فارہ نے اگلا سوال کیا۔
"تو پھر وہی ہوتا جو تم کبھی نہیں کر سکتیں۔" اس نے آہ بھری۔
"ایسا بہت کچھ ہے جو میں نہیں کر سکتی مگر تم کر سکتی ہو... کیونکہ تم ماورا مرتضیٰ ہو اور میں فارہ رحیم...۔" فارہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"فارہ بیٹا! آ جاؤ نیچے... تمہارے انکل اور آنٹی آ چکے ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔" منزہ رحیم نے دروازے پہ دستک دے کر فارہ کو اطلاع دی۔
"او کے ممی... ہم آ رہے ہیں۔" فارہ دروازے کی دستک پہ دروازے کی طرف مڑی۔
"ماورا کو بھی ساتھ لے آؤ۔" انہوں نے ماورا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ظاہر ہے ماورا بھی ساتھ ہی آئے گی۔" فارہ نے خوش دلی سے کہا۔
"او کے تو پھر جلدی سے آ جاؤ...۔" وہ کہہ کے پلٹ گئیں۔
فارہ اسے لے کر آگے بڑھی اور اس کے پیچھے ماورا نے قدم بڑھاتے ہوئے سوچا۔ اب ایک بار پھر تیمور حیدر کی نظروں کے سامنے جانا پڑے گا بلکہ اب تو صرف اسی کے سامنے ہی نہیں باقی سب کے سامنے بھی جانا ہے۔ جس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہر طرح سے کمپوز کر لیتی اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔
"ماورا! مجھے بہت شرم آ رہی ہے۔" سیڑھیاں اترتے اترتے فارہ اچانک رک گئی۔
"کیوں... آفاق یزدانی تو یہاں نہیں ہے۔" وہ بہت نارمل سے لہجے میں بولی۔
"لیکن باقی سب تو ہیں نا؟"
"تو پھر... یہ باقی سب تو ہمیشہ ہی ہوتے ہیں؟" ماورا نے کندھے اچکائے۔
"مگر آج کی بات اور ہے یار! آج میری شادی کی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے۔ آج تو موضوع ہی میں ہوں۔" فارہ نے خفگی سے اپنی شرم کی وجہ بتائی۔
"ٹھیک ہے! تم نہ جاؤ میں ہی چلی جاتی ہوں۔ جو بھی طے ہوا تمہیں بتا دوں گی۔" ماورا بہت لاپروا سے انداز میں بولی اور فارہ دانت کچکچا کے رہ گئی۔
"ماورا...!" وہ جھنجلا کے بولی۔
"اف...! تو اور کیا کروں یار...؟ تمہیں جانے میں مشکل پیش آ رہی ہے تو میں تمہاری مشکل حل کر دیتی ہوں، آخر میں یہاں آئی کس لیے ہوں، تمہاری ہیلپ کے لیے نا؟" ماورا نے بھی جھنجلا کر جواب دیا۔
"یہ ہیلپ ہے تمہاری؟" فارہ گھور کے بولی۔
"تو اور کیا ہے...؟" ماورا اب بھی لاپروا تھی۔
"یہ جھنجلاہٹ ہے تمہاری ورنہ تم نے میری ہیلپ کرنی ہو تو مجھے تسلی اور دلاسا بھی دے سکتی ہو۔ میری ہمت بھی بندھا سکتی ہو۔ میری حوصلہ افزائی بھی کر سکتی ہو لیکن نہیں... تم بس وہ کام کرو گی جو کبھی کسی نے نہ کیا ہو

ہے نا؟"

فارہ آج اس کے آنے پہ اتنی خوش تھی کہ اس سے بات بھی بڑے دعوے سے کر رہی تھی۔

"جب یہاں سے بیاہ کر کراچی جاؤ گی تو تب کون ہمت اور حوصلہ بندھائے گا تمہارا؟" ماورا نے اسے آنے والے وقت کا حوالہ دیا۔

"کاش...! میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتی۔" فارہ نے سرد آہ بھری۔

"اتنی سرد آہیں نہ بھرو اللہ سن بھی لیتا ہے۔" ماورا نے اسے آہیں بھرنے سے روکا تھا۔

"اللہ سنتا تو سب کی ہے لیکن قبول کسی کسی کی کرتا ہے۔ کاش! میری سنے اور قبول بھی کرے۔"

"آمین...!" ماورا نے اس کی آہ اور اس کی دعا کے فوراً بعد آمین کہا تھا۔

"فارہ...! ثمینہ آنٹی کتنی دفعہ تمہارا پوچھ چکی ہیں۔ اب آ بھی جاؤ۔" حماد اچانک ڈرائنگ روم سے باہر نکلا اور فارہ اور ماورا کو سیڑھیوں پہ کھڑے دیکھ کر خفا بھی ہوا۔

"سوری بھائی...! ہم بس آ ہی رہے تھے۔" فارہ نے معذرت کی۔

"تو راستے میں ایک دوسرے کو کون سی کہانیاں سنانے کے لیے رک گئی ہو؟" حماد کی خفگی ہنوز تھی اور اس کی خفگی پہ وہ دونوں بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

"اوکے... اب کوئی کہانی نہیں سناتے، چلیے اندر چلتے ہیں۔"

فارہ کہتی ہوئی ماورا کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

✡ ✡ ✡

"ماورا... ماورا مرتضیٰ... ماورا... ماورا مرتضیٰ... ماورا... ماورا مرتضیٰ۔"

تیمور حیدر کے ذہن میں بس ایک ہی نام کی تکرار ہو رہی تھی اور اس تکرار کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور پہ دل کی ہر دھڑکن میں ماورا مرتضیٰ کو دوبارہ دیکھنے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

ہر دھڑکتی دھڑکن اس کے ڈرائنگ روم میں آنے کا انتظار کر رہی تھی... اور انتظار بھی ایسا جو رگ رگ میں بے چینی سی بھر رہا تھا وہ غائب دماغی سے سب بڑوں کی گفتگو میں بس ہوں ہاں سے ہی کام چلا رہا تھا۔

"لیجیے ثمینہ آنٹی! آپ کی فارہ آگئی ہے..." حماد نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اونچی آواز میں اطلاع دی۔ تیمور یکدم چونک کر متوجہ ہوا۔ اس کی نظریں فارہ اور حماد پہ نہیں بلکہ فارہ اور حماد کے درمیان کھڑی ماورا مرتضیٰ پہ اٹھی تھیں۔

اور پھر جھکنا اور جھپکنا بھول گئی تھیں۔ کیونکہ اس وقت وہ پہلی بار اسے اتنا واضح دیکھ پایا تھا ورنہ اس روز بھی ملگجی سی شام تھی اور تھوڑی دیر پہلے بھی ملگجا سا اندھیرا تھا۔

لیکن اس وقت تو ڈرائنگ روم کی تمام فینسی لائٹس بھی روشن تھیں اور اب اس کا اک اک نقش بہت صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔

"السلام علیکم...!" ماورا کے ٹہوکے پہ ہی فارہ حواسوں میں آئی اور اس نے وہاں موجود سب کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! آؤ آؤ میری جان! تمہارا ہی تو انتظار تھا۔ تمہیں دیکھنے کے لیے تو آنکھیں ترس گئی ہیں۔"

ثمینہ یزدانی بے تابی سے اٹھ کر اس کی سمت بڑھیں اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" فارہ جو اتنے دنوں سے کھنچی سی ہو رہی تھی ان کے اتنی محبت اور اتنے چاؤ سے گلے سے لگانے پہ پل میں نرم پڑ گئی تھی۔

"بس تمہیں دیکھ لیا ہے تو سمجھو ٹھیک ہو گئی ہوں' بلکہ جوان ہو گئی ہوں... روح میں تازگی آگئی ہے۔" ثمینہ یزدانی فارہ کو دیکھ کر حقیقتاً" بہت خوش ہوئی تھیں اور ان کی خوشی اشتیاق یزدانی کے علاوہ باقی سب سے بھی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" فارہ مسکرائی۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے کہتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری تھی۔

"تھینک یو آنٹی... !اس سے ملیے یہ ہے میری اکلوتی بیسٹ فرینڈ ماورا مرتضیٰ۔ میں نے اسے اسپیشلی آپ لوگوں سے ملنے کے لیے یہاں بلایا ہے اور ماورا! یہ ہیں ثمینہ آنٹی۔ ان کے بارے میں تو تم اچھی طرح جانتی ہو۔" فارہ نے ان دونوں کا آپس میں تعارف کروایا۔

"السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" ماورا نے بھی سلام کرتے ہوئے ان سے حال پوچھ لیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا... !میں بالکل ٹھیک ہوں' ماشاء اللہ جتنی فارہ پیاری ہے' اس کی دوست بھی اتنی ہی پیاری ہے۔" انہوں نے ماورا کو بھی گلے لگا کر پیار کیا اور ماورا چاہ کر بھی ان سے دور نہیں ہٹ سکی تھی۔

"تھینکس آنٹی... !" آخر اسے بھی تو جواباً" کچھ کہنا ہی تھا۔

"آؤ بیٹا! اندر آؤ میرے ساتھ آکر بیٹھو۔" ثمینہ یزدانی کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔ لیکن ماورا نے حماد اور فارہ کے ہمراہ قدم آگے نہیں بڑھائے تھے بلکہ آگے بڑھتی فارہ کا بازو تھام کر اسے بھی ذرا سا رکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"پلیز یار... یہ ایک خالصتاً" فیملی میٹنگ ہے۔ میں یہاں ریلیکس فیل نہیں کروں گی' اس لیے تم فی الحال اپنے انکل اور آنٹی کے پاس بیٹھو میں تب تک لان میں انجوائے کرتی ہوں... او کے بائے۔" ماورا آہستہ آواز میں کہتی تیزی سے باہر آگئی اور فارہ اسے روک ہی نہ سکی۔

"ماورا... !" حماد نے پلٹ کر اسے آواز دی تھی۔

"سوری! آپ لوگ باتیں کریں۔ میں کچھ دیر باہر بیٹھتی ہوں۔" اس نے حماد سے بھی معذرت کر لی تو وہ بھی اصرار نہیں کر سکا تھا جبکہ تیمور حیدر کا وہاں بیٹھنا بھی محال ہو گیا تھا۔ محض یہ سوچ کر کہ شاید وہ واپس اپنے گھر جا رہی ہے وہ بڑی بے اختیاری سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ایکسکیوزمی! میں ایک ضروری کال کر لوں' تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔" وہ عجلت میں کہتا ہوا باہر نکل آیا تھا اور اس کے پیچھے حماد اس کا انداز نوٹ کرتا رہ گیا۔

کافی دیر سے اسے کچھ کچھ غائب دماغ سا لگ رہا تھا۔ اور اب اچانک ہی بیٹھے بیٹھے اس میں پھرتی سی آگئی۔

"کمال ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتا کندھے اچکا کر احمد انکل کے برابر میں صوفے پہ بیٹھ گیا۔

ادھر تیمور بڑی تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا راہداری عبور کر کے باہر آیا۔ اس کی نظریں گیٹ اور ڈرائیو وے کی سمت جمی تھیں۔

"کیا بات ہے صاحب... ؟ کس کو دیکھ رہے ہیں۔" دائیں طرف سے مرکزی حصے کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی ملازمہ اس کے سامنے آئی۔

"نن... نہیں! کسی کو نہیں دیکھ رہا۔" اس نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا! تو کیا چوکیدار کو بلانا ہے؟" ملازمہ اس کی متلاشی نظریں گیٹ کی طرف بھٹکتے ہوئے دیکھ کر یہی سمجھی تھی کہ وہ چوکیدار کو دیکھ رہا ہے اور بلانا چاہ رہا ہے۔

"نہیں! میں نے کسی کو بھی نہیں بلانا' تم جاؤ اپنا کام کرو۔" تیمور خفگی سے کہتا مرکزی حصے کی سیڑھیاں اتر آیا



اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ڈرائیو وے کی طرف بڑھا تھا اور یونہی آگے بڑھتے ہوئے اس کی نظر بائیں طرف والے لان کی طرف اٹھی اور پھر وہیں ٹھہر گئی۔

کیونکہ ماورا مرتضیٰ وہاں لان چیئر پہ بیٹھی اپنے موبائل کی طرف متوجہ تھی۔ موبائل کی مدھم سی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

تیمور حیدر کے ڈرائیو وے اور گیٹ کی طرف بڑھتے قدم رک گئے تھے۔ اس نے بے ساختہ اک سکون بھری سانس کھینچتے ہوئے اپنے قدموں کا رخ اس کی سمت موڑا۔

اور جیسے جیسے وہ اس کی سمت قدم بڑھا رہا تھا اس کا... دل اک عجیب سے احساس کے تحت دھڑک رہا تھا مگر کیا کرتا اس کے سامنے جا کر کچھ تو کہنا ہی تھا۔ کچھ کہے بغیر تو چارہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے اسے اس کے سامنے آنا ہی پڑا۔

"ہیلو... !" اس نے ماورا کے بالکل سامنے آتے ہوئے اسے متوجہ کیا اور اپنے دھیان میں مصروف ماورا چونک کر متوجہ ہوئی۔

"ہائے... !" مجبوراً" اسے بھی اس کے ہیلو کا جواب دینا پڑا اور اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔

"کیا کر رہی ہیں آپ... ؟" تیمور نے بات کو بڑھائی۔

"دیکھ لیں... ! کیا کر رہی ہوں؟" اس نے کندھے اچکائے۔

"مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ بور ہو رہی ہیں۔" تیمور نے اندازاً" کہا۔

"اس میں لگنے کی کیا بات ہے بھلا؟" وہ استہزائیہ سا بولی۔

"اوہ... !یعنی آپ سچ مچ بور ہو رہی ہیں؟" تیمور دلچسپی سے مسکرایا۔

"آف کورس... !" وہ بات کو گھمانے پھرانے کی عادی نہیں تھی۔

"تو پھر آپ کی بوریت کیسے دور ہو سکتی ہے؟" تیمور نے حل پوچھنا چاہا۔

"اپنے گھر جا کر... " اس نے بھی فوراً" حل بتایا۔

"اوہ سیڈ... !یہ کام تو صرف فارہ ہی کر سکتی ہے' وہی آپ کو اپنے گھر چھوڑنے جا سکتی ہے۔" اب کی بار تیمور نے کندھے اچکائے۔

"ہونہہ... !اب ایسی بات بھی نہیں ہے کہ میں یہ انتظار کروں کہ فارہ مجھے میرے گھر چھوڑ کے آئے گی۔ مجھے جانا ہو تو میں اکیلی بھی جا سکتی ہوں۔"

ماورا نے بڑی خود اعتمادی سے جواب دیا تھا اور تیمور نے اس کے اعتماد کو بڑی گہرائی سے نوٹ کیا تھا۔ جو اسے اس کی شخصیت میں پہلے روز پہلی جھلک اور پہلی نظر میں ہی محسوس ہو گیا تھا۔ اور یہی وہ چیز تھی جس نے تیمور کو متاثر بھی کیا تھا۔

"ہوں! یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ آپ کو جانا ہو تو آپ اکیلی بھی جا سکتی ہیں' مگر میرا خیال ہے کہ آپ جانے کے بجائے اگر تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیں گی تو آپ کو مزید بوریت کا شکار نہیں ہونا پڑے گا۔" تیمور نے اسے وہ مشورہ دیا تھا جو اس کا اپنا دل چاہ رہا تھا۔

"وہ کیسے؟" ماورا اس کی بات کا مطلب سمجھ چکی تھی مگر پھر بھی انجان بن گئی۔ تیمور نے بڑے اطمینان سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"لیکن... !" ماورا نے کچھ کہنا چاہا۔

"پلیز مس ماورا مرتضیٰ! تھوڑی دیر بیٹھ جانے سے اور بات کر لینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" تیمور نے

اصرار کیا تھا اور ماورا نے اب کی بار پلکیں اٹھ کر بغور اسے دیکھا اور چند سیکنڈز کے لیے اپنے ذہن میں کچھ سوچا اور پھر چپ چاپ دوبارہ اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔
"آپ بھی بیٹھیے۔" اب اس نے اسے بیٹھنے کی پیشکش کی تھی۔ جس پر تیمور حیدر کو بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔
"تھینک یو۔" تیمور بخوشی آگے بڑھا اور اس کے مقابل والی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔
"کراچی کے رہنے والے ہیں آپ؟" سوال تیمور کرنا چاہ رہا تھا مگر پہل ماورا نے کر ڈالی تھی۔
"بالکل کراچی کا ہی رہنے والا ہوں۔" اس نے نارمل سے انداز میں جواب دیا۔
"کیسا شہر ہے کراچی؟"
"جیسے اس شہر کے لوگ ہیں۔" تیمور مزید دلچسپی سے گویا ہوا۔
"اور اس شہر کے لوگ کیسے ہیں؟" ماورا نے بڑے تیکھے اور بڑے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
"آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ دیکھ لیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔
"تو کیا شہر کے سارے لوگ آپ جیسے ہیں؟" ماورا نے تیمور کو جانچتی ہوئی نظر سے دیکھا۔
"سارے نہ سہی کوئی ایک آدھ تو ہوگا ہی۔" تیمور کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ کا عکس لہرا رہا تھا۔
"اوہ! یعنی اتنے عام ہیں آپ؟" ماورا نے ابرو اچکا کر کہا۔
"عام؟" تیمور کو اس کی بات پہ اچنبھا ہوا۔
"آف کورس۔ خاص ہوتے تو صرف ایک ہی ہوتے۔ ایک شہر میں صرف ایک ہی شخص خاص ہونا چاہیے' جیسے یہی سوال کوئی مجھ سے کرے تو میرا جواب یہی ہوگا کہ فیصل آباد میں صرف میں ہی ہوں جو خاص ہوں' میرے جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔"
اس کے ایسے پر اعتماد جواب پہ تیمور کو ایک بار پھر اس کی طرف غور سے دیکھنا پڑا تھا اور اسے دیکھ کر دل ہی دل میں سراہا بھی تھا۔
"آپ کی اس بات میں کوئی شک نہیں ہے۔" تیمور نے برملا اعتراف کیا۔
"آپ کو کیسے پتا؟" ماورا نے تیکھے چتون سے پوچھا۔
"میں بہت عام سہی لیکن اللہ کے کرم سے صاحب نظر بھی ہوں اور صاحب عقل بھی' دیکھ بھی سکتا ہوں اور سمجھ بھی سکتا ہوں۔" تیمور نے بڑے سکون سے کہا تھا۔
"لیکن یوں ہی کسی کو دیکھ کر اسے سمجھ لینے کا دعوا نہیں کرنا چاہیے۔ ظاہر اور باطن میں بہت فرق ہوتا ہے مسٹر تیمور حیدر!" ماورا نے اسے سمجھانا چاہا۔
"لیکن کچھ لوگوں کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہی ہوتا ہے' اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" تیمور نے اسے اپنی دلیل دی۔
"وہ کچھ لوگ جو ہوتے ہیں نا' وہ ولی اور پیغمبر ہوتے ہیں' جن کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہوتا ہے اور آج کل کا دور ولی اور پیغمبروں کا نہیں ہے۔ یہ محض انسانوں کا دور ہے' جہاں ہزاروں ظاہر اور ہزاروں باطن پائے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر مجھے سمجھنے کا دعوا نہ کریں میں اندر سے کچھ اور ہوں۔ اپنے ظاہر سے بھی زیادہ گہری۔"
ماورا نے اسے ڈگمگانا چاہا۔
"یعنی آپ کے اندر کچھ پوشیدہ ہے؟" تیمور نے اسے سرتاپا گہری نظر سے دیکھا۔
"بہت کچھ؟" اس نے لاپروائی سے کہا۔
اور اس سے پہلے کہ تیمور مزید کچھ کہتا فارہ اسے ڈھونڈتی ہوئی باہر آگئی۔



"اف ماورا! تم یہاں بیٹھی ہو' وہاں میں اکیلی سب کی باتیں سن رہی تھی۔" فارہ نے چھوٹتے ہی خفگی کا اظہار کیا اور ماورا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"صرف باتیں ہی سنی ہیں یا کچھ اور بھی سنا ہے؟"
"مطلب۔ کچھ اور؟" فارہ نے اسے گھورا۔
"شادی کی ڈیٹ وغیرہ اور کیا بھلا۔؟" وہ ہنوز لاپروا تھی۔
"ہوں۔ ہو گئی فکس۔" فارہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔
"اچھا! کون سی ڈیٹ فکس ہوئی ہے؟" اب اسے ذرا تجسس ہوا تھا۔
"اس مہینے کی بیس تاریخ۔" فارہ کو تیمور کے سامنے بتاتے ہوئے کافی شرم محسوس ہوئی تھی مگر کیا کرتی بتانا تو تھا ہی۔
"بہت بہت مبارک ہو پھر تو۔" ماورا نے اسے گلے لگا کر مبارک دی تھی۔ تیمور بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
ایسی ہی ایک مبارک باد میری طرف سے بھی۔" اس نے آگے بڑھ کے فارہ کے سر پہ ہاتھ رکھا۔
"تھینک یو سو مچ تیمور بھائی!" فارہ نے بڑے خوش باش لہجے میں اس کا شکریہ ادا کیا۔
"یو ویلکم۔" وہ مسکرایا۔
"آپ کو حماد بھائی اندر بلا رہے ہیں اور وہاں اشتیاق انکل بھی آپ کا پوچھ رہے تھے' کہہ رہے تھے کہ کچھ اور ڈسکشن بھی باقی ہے' جس میں آپ کا شامل ہونا ضروری ہے۔" فارہ نے اسے پیغام دیا تھا۔
"اوکے۔ آپ لوگ ایک دوسرے کی کمپنی انجوائے کریں' میں اندر چلتا ہوں۔"
تیمور بظاہر اچٹتی سی نظر ماورا کی سمت دیکھتے ہوئے اندر کی سمت بڑھ گیا۔
"چلو یار! تم کیوں باہر بیٹھی ہو' تم بھی اندر چلو' سب کے ساتھ مل کر بیٹھو۔" تیمور کے اندر جاتے ہی فارہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
"سوری یار! اب اتنا ٹائم نہیں ہے کہ میں اندر جا کر بیٹھوں۔ میں کافی لیٹ ہو چکی ہوں۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی' پلیز مجھے اجازت دو۔ میں چلتی ہوں اب۔"
ماورا نے اس سے اجازت چاہی تھی۔ جس پہ فارہ تو حقیقتاً اچھل پڑی۔
"واٹ؟ تم اتنی جلدی جانے کی تیاری میں ہو' کسی سے ملیں بھی نہیں' بلکہ کھانا بھی نہیں کھایا اور کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ میں چلتی ہوں اب۔ فارہ تو جل بھن گئی تھی۔
"فارہ پلیز یار! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اگر مزید لیٹ ہوئی تو امی کا پریشانی سے برا حال ہو جائے گا اور وہ آئندہ کبھی کہیں آنے جانے کی اجازت بھی نہیں دیں گی مجھے۔ اس لیے اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری شادی میں شریک ہو سکوں تو پھر فی الحال مجھے جانے دو' ابھی تو تمہاری شادی کے بہت سارے فنکشنز باقی ہیں جو میں نے اٹینڈ کرنے ہیں' اس لیے پلیز ابھی رکاوٹ مت ڈالو۔ ابھی مجھے جانے دو۔" ماورا نے جو بات کہی تھی وہ واقعی فارہ کے دل کو لگی تھی' اس لیے مجبوراً اسے چپ ہونا ہی پڑا تھا۔
"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں رکنے پہ مجبور نہیں کرتی مگر صرف اس شرط پہ کہ تم شادی کے باقی فنکشنز میں بھی شریک ہو گی۔ تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا۔" فارہ نے اسے یقین چاہا۔
"فارہ! تم جانتی ہو میرا صرف کہہ دینا ہی وعدہ ہوتا ہے۔" ماورا نے اسے اپنے مزاج کے بارے میں یاد دلایا۔
اسی لیے فارہ کو اثبات میں سر ہلانا پڑا تھا۔

"او کے! میں ڈرائیور سے کہتی ہوں' تمہیں گھر ڈراپ کر آئے۔" فارہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائیوے کی طرف آگئی پھر ماورا کو ملازمہ اور ڈرائیور کے ساتھ رخصت کر کے اس نے اندر کا رخ کیا۔

تب تک اندر کھانا لگ چکا تھا اور سب ڈائننگ روم کا رخ کر رہے تھے۔

"فارہ! تمہاری فرینڈ کہاں ہے بیٹا! اسے بھی بلا لو۔" منزہ رحیم نے فارہ کو آواز دی۔

"وہ چلی گئی ہے ممی! اسے دیر ہو رہی تھی۔"

"وہ چلی گئی؟" تیمور اپنے لیے کرسی کھینچتے ہوئے بے ساختہ رک گیا تھا۔ اسے تو جیسے اندر سے دھچکا لگا تھا۔

"تم نے اسے روکنا تھا' اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔؟" منزہ رحیم نے خفگی سے کہا۔

"میں نے روکا تھا اسے مگر وہ اپنی امی کی طرف سے پریشان تھی۔ وہ لوگ گھر میں اکیلی ہوتی ہیں اور رات کو گھر سے نکلنے کی وجہ سے کافی پریشانی ہو جاتی ہے ان کو۔"

فارہ سنجیدگی سے بتاتے ہوئے خود بھی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی' لیکن تیمور کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ اسے تاسف ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ماورا نے گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ کر بڑے ست سے انداز میں دروازے پہ دستک دی تھی لیکن جتنی اس نے دروازے پر دستک دینے میں سستی دکھائی تھی دوسری طرف سے دروازہ کھولنے میں اتنی ہی پھرتی دکھائی گئی تھی۔ بی گل کہیں دروازے کے بالکل پاس ہی ٹہل رہی تھیں اور دستک ہوتے ہی جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

"السلام علیکم!" ماورا انہیں سلام کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم السلام! کیا کوئی اور بھی ہے پیچھے؟" بی گل نے دروازہ بند کرنے سے پہلے پوچھا۔

"نہیں! کوئی بھی نہیں ہے۔ بس فارہ کی ملازمہ اور ڈرائیور تھے ساتھ' دروازے تک چھوڑ کر چلے گئے۔" ماورا کہتے ہوئے برآمدے تک آچکی تھی اور بی گل سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آرہی تھیں۔

"امی کہاں ہیں؟" ماورا جانتی بھی تھی پھر بھی عادتاً پوچھ لیا۔

"جہاں چھوڑ کر گئی تھیں۔" بی گل کا اشارہ کمرے کی طرف تھا۔

"ان سے کہیں' میں آگئی ہوں اور میرے ساتھ میرے اعضا بھی پورے ہیں اور دل و دماغ بھی ٹھکانے پر ہیں۔" ماورا نے ان کے لیے پیغام دیا۔

"عافیہ! باہر آؤ اور دیکھ لو۔ بچی میں کوئی کمی بیشی تو نہیں آئی ہوئی۔ تسلی کر لو اپنی' ورنہ مجھے ہی الزام دو گی ——— کہ میں نے اسے بھیجا تھا اور میں نے ہی شہہ دی تھی۔" بی گل بھی سیر کو سوا سیر تھیں۔ انہوں نے بھی اونچی آواز میں عافیہ بیگم کو مخاطب کیا۔ لیکن افسوس انہوں نے پھر بھی کوئی نوٹس نہیں لیا تھا وہ جوں کی توں منہ سر لپیٹے پڑی رہی تھیں اس لیے مجبوراً ماورا کو ہی اٹھ کر ان کے پاس جانا پڑا تھا۔ اس نے ان کے چہرے پہ رکھی ان کی کلائی پیچھے ہٹائی۔

"امی! میں جانتی ہوں آپ سو نہیں رہیں' بلکہ رو رہی ہیں مگر پلیز! اس طرح رونے سے پہلے مجھے یہ تو بتا دیں کہ آخر آپ کو مجھ پہ یقین کیوں نہیں ہے؟" ماورا بڑی تکلیف اور بڑی اذیت سے بولی تھی جس پہ عافیہ بیگم تڑپ کے اٹھ بیٹھی تھیں۔

"کون کہتا ہے کہ مجھے تم پہ یقین نہیں ہے؟ کون کہتا ہے کہ مجھے تم پہ بھروسا نہیں ہے؟ کون کہتا ہے کہ مجھے تم پہ



مان نہیں ہے؟ میری زندگی کی ساری امیدیں اور سارے خواب صرف تم سے ہی تو جڑے ہوئے ہیں بس میں ڈرتی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس ——— اس ظالم معاشرے سے۔ اس اندھی دنیا سے۔ اس اندھیر نگری سے۔ مجھے خوف آتا ہے۔ میں سوچ سوچ کر ہی مرنے لگتی ہوں' مجھے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی تمہیں مجھ سے چھین لے گا اور میں۔ خالی ہاتھ ہو جاؤں گی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا' میرے پاس ایک بار پھر مفلسی کے سوا اور کچھ نہیں رہے گا۔ میں پھر سے فقیر ہو جاؤں گی ——— میں پھر سے فقیر ہو جاؤں گی۔"

وہ کہتے کہتے دھواں دھار رو پڑی تھیں اور ماورا ان کی ایسی حالت پہ ششدر سی رہ گئی۔ ان کا ڈر اور ان کا خوف ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ جس کی شدت کا ماورا کو پہلے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔

"امی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کیوں ایسا سوچتی ہیں؟ اس طرح تو آپ کبھی بھی سکون کی زندگی نہیں جی سکیں گی۔ جبکہ ادھر میں ہوں' جب بھی' جو بھی سوچتی ہوں' ہمیشہ آپ کی زندگی اور آپ کے دلی سکون کے لیے ہی سوچتی ہوں۔ میں نے ہمیشہ جو بھی کرنا چاہا ہے آپ کے لیے ہی کرنا چاہا ہے لیکن اگر آپ اس طرح ڈر اور خوف کا شکار رہیں گی تو میں کبھی کچھ بھی نہیں کر سکوں گی۔ میں آپ کی طرح بس کمپنی کروں گی اور زندگی گزار دوں گی۔ اس کے علاوہ زندگی میں اور رکھا بھی کیا ہے ہمارے لیے۔ بس یہ دو کمروں کا گھر اور اس گھر کی یہ چار دیواری اگر آپ چاہتی ہیں کہ ہم اس چار دیواری میں مر جائیں تو کوئی بات نہیں یہی سہی۔ آپ کو کوئی ڈر خوف تو نہیں رہے گا نا۔ ہم چاہے رہیں یا نہ رہیں۔" اس نے کہتے ہوئے تیزی سے ہاتھ جھٹکے اور باہر نکل گئی۔

"ماورا۔" عافیہ بیگم نے اسے پیچھے سے آواز دی تھی مگر وہ تب تک اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

"اف میرے اللہ! میری مشکل آسان کر دے یا میرے دل سے خوف نکال دے یا ان لوگوں کو میرے خوف کا احساس دلا دے تاکہ یہ مجھے سمجھ سکیں۔"

عافیہ بیگم نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بی گل ان دونوں ماں بیٹی کی خفگیاں اور ناراضیاں سنتے ہوئے چپ چاپ برآمدے میں ہی اپنے بستر پہ لیٹ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"عزت! یہ ولید رحمان کون ہے؟" ساشا کافی دیر سے عزت کے موبائل فون پہ بزی تھی لیکن جیسے ہی اس کی نظر ڈائلڈ نمبرز پہ پڑی وہ چونک گئی۔ جبکہ عزت اس کا سوال سن کر بھی بڑے ریلیکس سے انداز میں بیٹھی رہی۔ جواب پھر بھی نہیں دیا۔

"عزت! میں کیا پوچھ رہی ہوں تم سے؟ یہ ولید رحمان کون ہے آخر؟" ساشا نے کال کا ٹائم دیکھا تھا اور رات کے ایک بجے کا ٹائم دیکھ کر اس کے ذہن میں خود بخود ہی خطرے کا الارم بج اٹھا تھا۔

"ولید رحمان کون ہے؟ یہی تو میں اپنے دل سے بار بار پوچھتی پھر رہی ہوں مگر وہ ہے کہ بتا ہی نہیں رہا۔ بس اس نام پہ دھڑکے جا رہا ہے۔" عزت بڑے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

ساشا کو جھٹکا لگا تھا کیونکہ عزت ہمیشہ ہی لڑکوں کے نام سے بھی دور ہی رہی تھی اور اب اچانک اس کے پاس کسی کا نام اور نمبر دیکھ کر اسے شدید ترین حیرت ہوئی تھی لیکن دوسری طرف لاپروائی کی حد تھی۔

"ساشا! اک بات تو بتاؤ' آخر محبت کیسے ہوتی ہے۔ کوئی نشانی بتاؤ۔" عزت کا اگلا سوال ساشا کو جیسے چپ لگا گیا۔

"محبت۔؟" ساشا کے دل سے یہ لفظ ابھرا تھا مگر وہ زبان تک نہیں لا سکی تھی۔

"بتاؤ نا ساشا! تمہاری تو بڑی دعا سلام ہے محبت سے۔ تمہیں تو پہچان ہو گی اس کی۔" عزت نے مزید سوال کیا۔

"تو کیا تم اس ولید رحمان سے محبت کرتی ہو؟" ساشا کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔
"محسوس تو یہی ہو رہا ہے۔" عزت خاصے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بتا رہی تھی۔
"کہاں ملا؟" ساشا کے سوال جاری تھے۔
"جہاں دل ملا۔" اس کے جواب عجیب سے عجیب تر تھے۔
"مطلب؟"
"مطلب یہ کہ میں اپنے ہی دل سے بے خبر تھی' نا آشنا تھی' جب وہ ملا تو میں اپنے دل سے ملنے پہ مجبور ہو گئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ دل کیا ہوتا ہے اور اس کی طلب اور خواہش کیا ہوتی ہے؟ میرا دل اور وہ دونوں مجھے ایک ہی جگہ پہ ملے اور ایک دوسرے کے ہی ہو گئے۔"
"دیکھنے میں کیسا ہے؟" اس نے ایک بار پھر پوچھا۔
"دل میں اترنے والا۔" وہ موڈ میں آچکی تھی۔
"اور دل میں اترنے والے کیسے ہوتے ہیں؟" ساشا جھنجلائی۔
"ولید رحمان جیسے۔" وہ پر سکون تھی۔
"اوکے! میں چلتی ہوں۔" ساشا اس کا موبائل فون اس کی گود میں پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر عزت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"رکو یار! بتاتی ہوں۔" عزت کا انداز ایسا تھا کہ ساشا کو مجبوراً رکنا پڑا۔
"جلدی جلدی بتاؤ۔" اس کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔
"کیا بتاؤں؟"
"اف! عزت میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔" ساشا چیخ اٹھی۔
"اوکے اوکے۔ بتا رہی ہوں' بتا رہی ہوں' ویٹ... سب کچھ بتا رہی ہوں۔" عزت بے ساختہ اس کے انداز پہ مسکرا اٹھی تھی۔
"ولید رحمان تیمور بھائی کا دوست ہے۔ اس نے بم بلاسٹ والے دن میری ہیلپ کی تھی' اور اسی نے تیمور بھائی کو یونیورسٹی بلایا تھا۔" عزت نے بڑے پُرسکون لہجے میں بتایا۔
"اوہ! تو وہ آدمی ولید رحمان تھا؟" ساشا کا انداز پر سوچ سا ہوا۔
"ہاں! وہ آدمی ولید رحمان ہی تھا۔" اس کا جواب ایک بار پھر اثبات میں تھا۔
"تو تم اتنی سی بات پہ فدا ہو گئیں اس پر؟" ساشا ذرا تیکھے لہجے میں بولی۔
"کسی پہ فدا ہونے کے لیے "اتنی سی بات" ہی چاہیے ہوتی ہے' جو مجھے ولید رحمان میں نظر آگئی اور میں فدا ہو گئی۔ انسان کی زندگی کا بس ایک لمحہ ہی اس کی پوری زندگی کا سودا کر ڈالتا ہے اور اس سودے میں کیا نفع ہے اور کیا نقصان' یہ کوئی بھی نہیں سوچتا۔ میں نے بھی نہیں سوچا۔ میرے لیے اب پوری زندگی ایک طرف اور جس لمحے میں ولید رحمان ملا' وہ لمحہ ایک طرف۔ وہ لمحہ میری پوری زندگی پہ بھاری ہے۔ اب تم سوچ لو کہ اگر ولید رحمان سے ملنے کا لمحہ میرے لیے اتنا اہم ہے تو ولید رحمان خود کتنا اہم ہو گا۔؟" عزت واقعی اس ایک لمحے کے بدلے اپنی پوری زندگی کا سودا کر چکی تھی۔
"یعنی واپسی کا کوئی ارادہ نہیں؟" اب ساشا کا انداز اور لہجہ دھیما پڑ چکا تھا۔
"ہرگز نہیں۔ ممکن ہی نہیں۔" عزت نے نفی میں گردن ہلائی۔
"کیا شادی ہو پائے گی اس سے؟"

"اس سے نہ ہوئی تو کسی سے بھی نہیں ہوگی۔" اس نے لاپروائی سے اپنے جنون کی جھلک دکھائی۔
"یہ کیا طریقہ ہے بھلا۔" ساشا بدک گئی تھی۔
"یہ جو بھی طریقہ ہے وقت آنے پہ تمہیں اچھی طرح پتا چل جائے گا' ابھی کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔"
پھر ساشا نے اس سے مزید کوئی بات نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

تیمور بہت دیر سے اپنی کرسی سے ٹیک لگائے سامنے دیوار پہ نظریں جمائے مسلسل ماورا مرتضیٰ کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا جب اچانک اس کی پی اے سحرش زمان کی دستک اسے چونکا گئی۔
"مے آئی کم ان سر!" اس نے پروفیشنل لہجے میں اجازت طلب کی۔
"یس۔" وہ چونک گیا تھا۔
"سر! یہ فائل چیک۔۔۔"
"پلیز مس سحرش! مجھے کچھ دیر ڈسٹرب نہ کریں' میرا مائنڈ سیٹ ہوا تو میں خود ہی آپ کو کال کرلوں گا۔ فی الحال مجھے فری رہنے دیں۔ پلیز!" اس نے الٹا التجا کی۔ سحرش زمان حیران رہ گئی۔
"اینی پرابلم سر؟"
"نو! اٹس آل رائٹ۔ ڈونٹ وری۔" اس نے جواب دیا۔
"بٹ۔ آپ کی طبیعت۔۔۔" اس نے کچھ ڈرتے ڈرتے اور جھجکتے ہوئے سوال کیا اور ادھورا بھی چھوڑ دیا۔
"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے' بس ذہنی طور پہ تھوڑا غیر حاضر ہوں۔" وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا پین ٹیبل پہ ڈالتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"تو پھر حاضر کہاں ہیں؟" سحرش زمان کا سوال انسانی فطرت کے عین مطابق بے ساختہ تھا۔
اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "فیصل آباد میں؟"
تیمور اس کے اتنے حیرت سے کیے سوال پہ ٹھٹک گیا۔
"سوری سر! میں پرسنل ہونے لگی ہوں' بے شک آپ میرے سامنے کچھ نہ کہیں مگر آپ کے دل میں یا آپ کے دماغ میں جو بھی ہے' وہ اپنے کسی دوست یا کسی بہت اپنے سے ضرور شیئر کریں۔ اس سے آپ ذہنی طور پر غیر حاضر نہیں رہیں گے۔ میں چلتی ہوں۔"
سحرش زمان مسکراتی ہوئی کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی اور تیمور اس کی بات پہ سوچ میں پڑ گیا۔
"کتنے دن ہوگئے ہیں میں ولید سے نہیں ملا۔" اسے "فورا" سے بھی پیشتر ولید کا خیال آیا تھا۔
"اور اس ذلیل نے خود بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔" تیمور اسے دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے پلٹا اور اپنا موبائل اٹھا کر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف رنگ جارہی تھی۔
"ہیلو!" ولید شاید اس وقت بائیک پہ تھا اسی لیے کال میں بہت زیادہ شور سنائی دے رہا تھا۔
"زندہ ہو؟" تیمور ذرا غصے سے بولا۔
"تمہاری دعائیں ہیں یار! ورنہ کب کا گزر گیا ہوتا۔" وہ بھلا کیوں پیچھے رہتا۔

"باز آجاؤ ورنہ۔۔۔" تیمور نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"ورنہ تم باز آجاؤ گے۔؟" ولید جان بوجھ کر اسے ستا رہا تھا۔



"میں باز آوں یا نہیں۔ لیکن تم اگلے دس منٹ میں میرے آفس ضرور آجاؤ۔ اوکے؟" تیمور نے آرڈر جاری کیا۔
"کس خوشی میں؟" ولید نے وجہ جاننا چاہی۔
"تمہاری صورت دیکھنی ہے؟" اس نے چبا کر کہا۔
"ہاہا! میری صورت دیکھنی ہے تو مجھے اپنے آفس میں مت بلاؤ' بلکہ خود اپنے آفس سے باہر آؤ' پھر دکھاتا ہوں تمہیں اپنی صورت۔" ولید نے شرط رکھی۔
"لیکن یہاں۔۔۔"
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آنا ہے تو تم نے آنا ہے' میں تمہارے در پہ حاضری دینے نہیں آرہا۔ اوکے؟" ولید نے کہہ کر فون بند کردیا تھا اور مجبوراً تیمور نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور گاڑی کی چابی لے کر آفس سے باہر نکل آیا نیچے پارکنگ میں پہنچ کر اسے شدید ترین جھٹکا لگا۔ ولید وہاں پہلے سے اپنی شان دار سی بائیک سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔
"تم یہاں؟" تیمور اتنا بھی بمشکل کہہ سکا تھا۔
"جی ہاں! میں یہاں۔ تمہیں لینے آیا ہوں۔ بیٹھو پیچھے۔" ولید نے بڑی سنجیدگی سے اپنی بائیک کی طرف اشارہ کیا۔
"کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے یار؟" تیمور نے افسوس کا اظہار کیا۔
"اور میرے پاس جو بھی ہے وہ ان لمیٹڈ ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"تم یہاں پہنچ کر بھی اوپر آفس میں نہیں آئے اور مجھے یہاں بلالیا۔" تیمور سلگ اٹھا تھا۔
"تمہاری شان میں کوئی کمی آگئی ہے کیا؟ اور ویسے بھی مروڑ تمہارے پیٹ میں اٹھ رہے ہیں باتیں کرنے کے لیے' ورنہ میرا کیا ہے؟ میں تو آل ریڈی ہلکا پھلکا ہوں۔" اس نے لاپروائی سے بازو پھیلا کر کہا اور تیمور ٹھٹک گیا۔
"باتیں۔۔ کیا مطلب؟"
"تم خود سمجھ دار ہو میرے دوست! آخر فیصل آباد بھی تو تم ہی گئے ہوئے تھے نا؟"
"اوہ! تو تم باخبر تھے؟" تیمور اس کے اتنے ناز نخرے اور اکڑنے کی وجہ سمجھ گیا۔
"وہ تم ہی ہو جو بے خبر رہتے ہو' ورنہ ہم تو ایک پل بھی غافل نہیں ہوتے۔" اس نے بتایا تھا۔
"اوکے اوکے! میں گاڑی نکالتا ہوں' بائیک لاک کرکے آجاؤ۔" تیمور گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔
"لیکن تمہیں لینے تو میں آیا تھا۔" ولید کا اشارہ اپنی بائیک کی طرف تھا۔
"بکواس مت کرو۔ اب میں تمہارے پیچھے بائیک پہ بیٹھا اچھا لگوں گا کیا۔ وہ بھی اس ڈریسنگ میں۔" اس نے اپنے سوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"بس! یہی دیکھتے رہنا تم امیر لوگ اسی اچھے برے کو سوچتے ہوئے ہی مرجاؤ گے۔ یہ اچھا لگے گا' یہ برا لگے گا' یہ ایسا لگے گا' یہ ویسا لگے گا۔ ہونہہ! دولت کے ستائے ہوئے لوگ۔"
ولید خفگی سے بڑبڑاتا ہوا بائیک لاک کرکے اس کی گاڑی میں آبیٹھا۔ تیمور اس کی باتوں کا نوٹس لیے بغیر گاڑی روڈ پر نکال لایا۔

☼ ☼ ☼

ماورا آج کل یونیورسٹی سے ایگزامز کے بعد فارغ ہوچکی تھی۔ اس لیے اس کے پاس فی الحال کرنے کے لیے

کچھ بھی نہیں تھا۔ صبح فجر کے وقت اٹھی تھی اور ناشتے کے وقت تک وہ گھر کے سارے کام نبٹا کر فارغ ہو چکی تھی اور اب بیٹھی سوچ رہی تھی کہ فی الحال ٹائم پاس کے لیے وہ کوئی جاب تلاش کرنا شروع کر دے مگر عافیہ بیگم نے اسے منع کر دیا تھا۔

"کیوں منع کر رہی ہیں آپ؟" ماورا ناشتا کرتے کرتے رک گئی۔

"بس! ابھی ریسٹ کرو۔ پوری زندگی پڑی ہے جاب کرنے کے لیے۔ ہو تا رہے گا سب کچھ۔" اس نے ان کی بات پر سر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مگر میں فارغ نہیں رہ سکتی مجھ سے ٹائم ہی نہیں گزر رہا۔" ماورا واقعی بور ہو چکی تھی۔

"ٹھیک ہے کوئی اچھی جاب ملے تو کر لینا مگر ابھی نہیں۔ بلکہ ہو سکا تو میں اپنے اسکول میں تمہارے لیے بات کروں گی۔" عافیہ بیگم ناشتا ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں ٹیچنگ نہیں کر سکتی ایم سوری! بس جن بچوں کو ٹیوشن دے رہی ہوں' وہی کافی ہے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"تو پھر کیا کرو گی تم؟" وہ باہر نکلتے ہوئے رک گئیں۔

"کراچی میں کہیں جاب اپلائی کروں گی۔" ماورا کی وہی پرانی ہٹ دھرمی تھی۔

"کراچی میں؟" عافیہ بیگم کے دل پہ ایک بار پھر ہاتھ پڑا تھا۔

"جی ہاں کراچی میں ... اور یہ بات میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔" ماورا کا انداز اور لہجہ دو ٹوک اور بے لچک تھا۔ عافیہ بیگم چند سیکنڈز اسے یونہی کھڑی دیکھتی رہیں اور پھر خاموشی سے پلٹ کر اپنا بیگ اٹھا کر اسکول کے لیے نکل گئیں۔

"بی گل!" ماورا نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"ہوں۔" بی گل بھی کچھ چپ چپ سی تھیں۔

"میں نے کچھ پوچھنا تھا آپ سے؟" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"پوچھو۔" بی گل اس سے بھی زیادہ آہستہ آواز میں بولیں۔

"رضا حیدر کے بیٹے کا کیا نام تھا؟" اس کا سوال لرزش لیے ہوئے تھا۔

"کیوں تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" بی گل چونکیں۔

"پلیز! پوچھیے مت۔ بتائیے!" وہ بے چین ہوئی۔

"تم اس کا نام جانتی ہو میں نے بتایا تھا تمہیں۔" بی گل کو یاد تھا۔

"لیکن میں ایک بار پھر سننا چاہتی ہوں۔ پلیز!" اس نے بی گل کو اکسایا۔

"تیمور۔ تیمور حیدر۔" بی گل نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ایک بار پھر انکشاف کیا تھا اور ماورا گہری سانس کھینچ کے رہ گئی۔ کیونکہ اب انکشاف کی باری اس کی تھی۔

"میں ملی ہوں اس سے۔" اس نے اطمینان سے بم پھوڑا تھا اور بی گل کا دماغ اڑ گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

## شیریں ملک

آج اتوار تھا اور حرا صبح سے ہی صحن کے فرش کو رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ برسات میں بہت زیادہ بارشوں کی وجہ سے صحن میں لگی سرخ اینٹوں پہ سبز کائی سی جم گئی تھی۔ جو ہر بارش کے بعد مزید بڑھ جاتی تھی۔ حرا چونکہ کالج جاتی تھی اور وہاں سے واپسی پر کھانا کھانے اور تھوڑا سا آرام کرنے تک عصر کا وقت ہو جاتا تھا پھر ٹیوشن والے بچے آنا شروع ہو جاتے تو حرا کو صفائی کا موقع نہیں ملتا تھا۔ پچھلے دو ہفتوں سے اتفاقاً" ہر اتوار کو ایسی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی کہ وہ بیٹھی ہی رہ جاتی اور سارا دن یوں ہی گزر جاتا۔

فاخرہ کو جوڑوں کے درد نے ایسا نڈھال کیا تھا کہ کوئی کام نہ ہوتا' دوسرا حرا اپنی امی کو کوئی کام کرنے بھی نہ دیتی تھی۔ حرا کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کالج جانے سے پہلے سارے کام کر کے جائے اور باقی آکر کرے۔ پھر بھی دن کا کھانا فاخرہ خود بناتیں۔

صحن بہت زیادہ کشادہ تھا۔ اس کی صفائی فاخرہ کے بس کا کام نہ تھا۔ باقی رہ گئی ثمن۔ جو گھر کی بہو تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے سستی کے ساتھ گندگی میں بھی ایوارڈ لینے کی ٹھانی ہو۔ اس کے کمرے میں ایسے خوفناک جالے لٹکے ہوئے تھے کہ دیکھ کر لگتا ابھی گلا دبوچ لیں گے۔ کمرے کا ڈسٹ بن یوں فل ہوتا جیسے شاپرز کا چھوٹا سا پہاڑ ہو۔ اوپر سے کنگھی کرنے کے بعد وہ اپنے سر سے اترنے والے بالوں کو بغیر لپیٹے ان ہی شاپرز پر پھینک دیتی۔ اسے دیکھتے ہی اچھے بھلے انسان کی چیخ نکل جاتی تھی۔ لیکن حرا ایک بات پر اکثر حیران ہوتی کہ شام ہوتے ہی ثمن میں جیسے نئی انرجی آجاتی۔ وہ خود نک سک سے تیار احسن کا استقبال کرتی اور حرا کی طرح ہی نفیس طبیعت کا احسن نہ جانے کیسے اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا اور اسے ثمن کے سوا کچھ نہ سوجھتا۔ اس کی ہر بات مانے چلا جاتا۔ اسی وجہ سے ثمن نے اپنی عادات بدلنے کی بھی کوشش نہ کی۔

آج حرا نے ناشتے کے بعد ہی پانی کی بالٹی اور برش اٹھایا اور رگڑ رگڑ کر فرش دھونے لگی۔ ثمن کل سے میکے گئی ہوئی تھی اور آج احسن اسے لینے گیا ہوا تھا۔

جبکہ فاخرہ معمول کے چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے حرا کے ساتھ گپ شپ بھی کر رہی تھیں۔

برش رگڑنے سے حرا کے بازو دکھنے لگے۔ لیکن تقریباً" تین گھنٹوں بعد وہ اپنے مقصد میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کر چکی تھی۔ تین کمروں اور کچن کے سامنے بنا کشادہ صحن کا سرخ اینٹوں کا فرش دھل کر ایسا نکھرا کہ دل خوش ہو گیا۔

اب حرا کا رخ آم کے درخت کی طرف تھا۔ جس کی چھاؤں پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی اور جس کا پھل فاخرہ کے ہاتھوں مختلف صورتوں میں گھر والوں کو کھانے کو ملتا۔

اس پھل میں گھر والوں کے ساتھ ساتھ آس پڑوس اور مسجد کے امام صاحب اور درویشوں کا بھی حصہ نکالا جاتا۔ حرا کو اس درخت سے بڑا پیار تھا۔ جو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی جوان تھا۔ جس کے موٹے سے تنے سے جھولا لٹک رہا تھا۔ جو حرا کے ابو نے بڑے پیار سے اس کے لیے باندھا تھا۔ جھولے کو دیکھتے ہی ابو کی یادیں اس کی آنکھوں کو بھگونے لگیں۔

وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے درخت کے گرد اُگی خودرو گھاس کو صاف کرنے لگی۔ جو برسات کی وجہ سے اگ آئی تھی اور اب بڑی ہونے لگی تھی۔ پھر مٹی کے دونوں کٹوروں کو اٹھا کر اچھی طرح دھویا۔ ایک میں چڑیوں کے لیے صاف پانی اور دوسرے میں باجرا ڈالنے کے بعد وہ اس چھوٹی سی کیاری کی طرف گئی۔ جس میں اس نے مختلف قسم کے گلاب کے پودے لگا رکھے تھے۔ جب بہار کا موسم آتا اور پودوں کے اس چھوٹے سے ہرے بھرے جھنڈ پہ رنگ برنگے گلاب کے پھول کھلتے تو پورے صحن میں مختلف رنگوں کی پتیاں بکھری نظر آتیں۔

حرا کو یہ موسم اور یہ منظر بڑا بھاتا تھا۔ اس کیاری میں بھی کافی جھاڑ جھنکار اور سوکھے پتے پڑے تھے۔ حرا نے اس کو بھی اچھی طرح صاف کر کے پانی دیا تو اسے لگا' صحن کی صفائی مکمل ہو گئی ہو۔ پھر اس نے پلاسٹک کی سفید کرسیاں اور میز اٹھائی اور آم کے درخت کے

نیچے مخصوص جگہ پر رکھ دیں۔ یہاں بیٹھ کر اکثر وہ پڑھا کرتی تھی۔ چاہے وہ نصاب کی کتاب ہو یا ناول اور رسالے وغیرہ ہوں۔ اس کے بعد دونوں چارپائیوں کو اس دیوار کے ساتھ رکھا' جہاں اب سایہ تھا۔

صحن پر تنقیدی نگاہ ڈال کر دل ہی دل میں مطمئن ہوتی وہ برآمدے میں آگئی۔ جو ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا تھا۔ اس کا اور امی کا مشترکہ کمرا اور بیٹھک تو امی ہمیشہ صاف ہی رکھتی تھیں۔ اسی لیے اب اس کا رخ سیدھا بھائی کے کمرے کی طرف تھا۔ چونکہ فاخرہ کچن میں دن کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے حرا کو اس طرف سے اطمینان تھا۔

اس نے سب سے پہلے ڈسٹ بن اٹھایا اور اسے باہر خالی کیا۔ ایک تو ویسے ہی گندا تھا' رہی سہی کسر چیونٹیوں نے پوری کردی' جو چاکلیٹ وغیرہ کے ریپرز پر چمٹی ہوئی تھیں۔

اس نے ڈسٹ بن کو خالی کرکے اچھی طرح دھویا اور دھوپ میں خشک ہونے کے لیے رکھ دیا۔ اسٹول لے کر آئی اور پھول جھاڑو کی مدد سے اور منہ سر لپیٹ کر کمرے کی ساری دیواریں جھاڑیں۔ جالے اتارنے کے بعد سارا فرنیچر صاف کیا۔

"کاش! اللہ میاں ایک بہن ہی دے دیتے۔ اگر بہن نہیں دی تو بھابھی میں ہی بہن جیسی خصوصیات پیدا کردیتے۔"

تھکن کا احساس غالب آتے ہی بہن کی کمی کا احساس شدت سے ہوا۔ وہ فرش پر جھاڑو لگانے لگی۔ اس کے بعد رگڑ رگڑ کے فرش پر پوچا لگایا۔ کمرے کی دونوں کھڑکیاں اور دروازے کھول دیے۔ کمرا خوب جگر جگر کرنے لگا تو وہ مسکرادی۔

اسے یہ سب کچھ کرنے کے لیے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا' لیکن وہ یہ سب کچھ اس لیے کررہی تھی کہ اسے اپنے بھائی سے بہت محبت تھی۔ جس نے ابو کے بعد اس کا ایسے خیال رکھا جیسے ابو رکھتے تھے۔ کسی چیز کی بھی کمی نہ ہونے دی۔ اگر وہ بھابھی سے پیار کرتا تھا اور اس کی مانتا تھا تو امی اور اس کے ساتھ بھی اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ ہاں اگر تھوڑا بہت فرق آیا تھا تو وہ شادی شدہ ہونے کے بعد آہی جاتا ہے۔ ثمن بھی اگر اچھی نہ تھی تو بری بھی نہ تھی۔ وقت گزر ہی رہا تھا۔ صرف ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ اس نے امی سے ثمن کے بارے میں کوئی شکوہ کیا تو امی نے اسے وہیں روک دیا تھا۔

"دیکھو حرا! میری ایک بات یاد رکھنا' دوسروں سے توقعات وابستہ کرنے سے بہتر ہے کہ دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے انسان خود بھی خوش رہتا ہے اور دوسرے بھی خوش رہتے ہیں۔ ثمن اس گھر میں نئی ہے۔ اسے شروع سے جو عادت ہے وہ ویسا ہی کرتی ہے۔ اسے تھوڑا وقت دو۔ ابھی تو اسے یہاں سال بھی نہیں ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی بدل جائے گی۔ سب کچھ سنبھال لے گی۔ یہ گھر اسی کا تو ہے۔ سنبھالنا ہی پڑے گا۔ تم نے کون سا ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔ ایک دن تمہاری شادی ہوگی۔ تم اپنے گھر سدھارو گی۔ رہ گئی میں' تو زندگی کا کیا بھروسا' آج ہوں' کل نہیں۔ کوشش کرنی چاہیے کہ جو وقت گزر رہا ہے وہ اچھے طریقے سے گزرے۔ شکوے' شکایتوں' غیبتوں اور جھگڑوں سے گھر کی برکت اٹھ جاتی ہے۔ اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں اور جگ ہنسائی علیحدہ۔"

امی نے بڑے رسان سے حرا کو سمجھایا تھا۔

"لیکن امی! کیا ہوجائے گا اگر بھابھی کبھی کبھار گھر کے کسی کام میں حصہ لے لیا کریں اور اگر وہ بھی نہیں کرسکتیں تو کم از کم اپنے کمرے کی صفائی ہی کرلیا کریں۔ انسان کو اتنا لاپروا بھی نہیں ہونا چاہیے۔" حرا کی سوئی ابھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"اگر وہ کام نہیں کرتی تو تمہیں بھی تو نہیں کہتی نا۔ تم بھی نہ کیا کرو۔ میں خود کرلوں گی۔ تمہیں سو برائیاں نظر آرہی ہیں۔ اچھائیاں نظر نہیں آرہیں کہ کتنی امن پسند اور نرم مزاج کی ہے وہ۔ ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔ لڑائی جھگڑا نہیں کرتی۔ ہمارے خلاف احسن کے کان نہیں بھرتی۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح آتے ہی الگ ہونے کی فرمائش نہیں کی۔ ذرا سوچو وہ اگر حسن کو لے کر علیحدہ ہوجائے تو کیا کرلیں گے ہم گھر کا سکون اور برکت قائم رہے یہ بڑی بات ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل میلا نہیں کرتے۔"

امی شاید اسے کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں لیکن وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئی۔ "جب دو' دو نوکرانیاں ہیں تو بھابھی نے احسن بھائی کو علیحدہ کرکے اپنا نقصان کروانا ہے۔" وہ کہتی کچھ نہ تھی لیکن کڑھتی ضرور تھی۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی ثمن کے طور طریقوں کی عادی ہوگئی۔

"حرا! اب بس کرو۔ جلدی سے نہاکر آجاؤ۔ میں نے چاولوں کو دم دے دیا ہے۔ تم آؤ تو مل کر کھاتے ہیں۔"

امی کی آواز پر اس نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ جہاں دو بجنے میں چند ہی منٹ بچے تھے۔ "تقریباً" آٹھ بجے میں نے اپنا کام شروع کیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہی ہے حرا بی بی کہ تم مسلسل چھ گھنٹوں سے کام کررہی ہو۔ ہمت ہے تمہاری۔" عادت کے مطابق خود کلامی کرتے ہوئے اس نے خود ہی اپنے کندھے پر تھپکی دی۔

"امی! آپ ظہر کی نماز پڑھ لیں۔ میں بھی نہاکر نماز پڑھوں گی۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ کھانے کے بعد سستی آجاتی ہے تو اٹھنے کو دل ہی نہیں کرتا۔"

امی سے اونچی آواز میں کہتے ہوئے اس نے اپنے کپڑے اٹھائے اور نہانے چل دی۔ نہانے اور نماز پڑھنے کے بعد جب وہ دسترخوان پر آئی تو اپنے پسندیدہ دال چاول دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی۔ ساتھ میں پودینے کی چٹنی' آم کا اچار اور رائتے کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ دونوں ماں بیٹی نے خوب سیر ہوکر کھانا کھایا اور پھر برتن سنبھالنے کے بعد حرا تو یوں بے سدھ ہوکر سوئی کہ مغرب سے تھوڑا پہلے امی کے زبردستی جگانے پر اٹھی۔

"حرا! جلدی سے اٹھو اور نماز پڑھ لو' دیر ہوگئی تو قضا ہوجائے گی۔" ٹائم دیکھتے ہوئے وہ جلدی سے اٹھی اور وضو کرکے عصر کی نماز پڑھی۔

فاخرہ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر رات کے کھانے کے لیے گوبھی کاٹ رہی تھیں۔ احسن کو گوبھی گوشت بہت پسند تھا۔ اسی لیے ہفتے میں دو دفعہ تو ضرور ہی اس کی پسند کا یہ سالن بنتا تھا۔ حرا نے چائے بنائی اور دونوں کپ لیے فاخرہ کے پاس آکر چارپائی پہ بیٹھ گئی۔

"تم نے چائے کیوں بنائی۔ مجھے کہا ہوتا' میں بنادیتی۔ صبح سے کاموں میں لگی ہوئی ہو۔ پڑھا بھی نہیں اور کل تو تمہارا ٹیسٹ بھی تھا۔" فاخرہ نے کپ لے کر پیار سے اپنی بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی! رات کو تیاری کرلوں گی۔" وہ ماں کے یوں فکر کرنے پر مسکرادی۔

ابھی وہ دونوں مغرب کی نماز سے فارغ ہی ہوئی تھیں کہ احسن اور ثمن بھی آگئے۔ ثمن تو ہمیشہ کی طرح سلام کرنے کے بعد سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جبکہ احسن فاخرہ کے پاس بیٹھ گیا جو رات کا کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ حرا نے بھی اپنی کتابیں اٹھائیں اور باہر صحن میں آگئی۔ صحن کی لائٹس آن کیں اور کرسی اٹھاکر ایک لائٹ کے بالکل نیچے آکر بیٹھ گئی۔ دودھیا روشنی میں دھلا دھلایا صحن بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ حرا یہاں بیٹھی تو پڑھنے کے لیے تھی لیکن اس کی ذہنی رو کہیں اور بھٹک رہی تھی۔ وہ ثمن کے رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کوئی اتنا بے حس کیسے ہوسکتا ہے۔

وہ آج کچھ زیادہ ہی حساس ہورہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دو' تین دن پہلے جب اس کی خالہ آئی تھیں' جو کراچی میں رہتی تھیں اور جن کے گھر اس نے بسوبن کر جانا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کریں گی اور حرا کے بی اے سے فارغ ہوتے ہی اسے رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے جائیں گی۔ ان کی بات پر کسی کو اعتراض بھی نہ تھا لیکن حرا کو رہ رہ کر امی کا خیال ستائے جارہا تھا۔

"میرے بعد امی کتنی اکیلی ہوجائیں گی۔ کوئی ان

سے بات کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ انہیں سارے کام اکیلے کرنے پڑیں گے۔ وہ ہر وقت بیمار رہتی ہیں۔ ان کے گھٹنوں کی تکلیف زیادہ کام کرنے سے بڑھ جاتی ہے۔ مجھے پتا ہے انہوں نے تو ایک لفظ بھی شکایت کا زبان تک نہیں لانا اور سب کچھ برداشت کیے جانا ہے۔ کاش! میری شادی اتنی دور نہ ہوتی تو میں ہی امی کا حال احوال پتا کرلیتی۔ کاش بھابھی ہی سدھر جائیں۔"

یوں ہی سوچتے ہوئے اس کی نظر ثمن کے کمرے کی طرف اٹھی۔ دروازہ کھلا تھا اور وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی نظر آرہی تھی۔

"کاش! دنیا میں کوئی ایسا آئینہ بھی ہوتا جہاں انسان کو شکل کے ساتھ ساتھ اعمال بھی نظر آتے تو یقیناً صورت حال مختلف ہوتی۔" اس نے گود میں رکھی کتاب بے دلی سے بند کردی۔ نظر ایک دفعہ پھر سرخ اینٹوں پہ پڑی جو صبح تک کائی سے اٹی ہوئی تھیں اور حرا نے برش سے رگڑ کر ان کی شکل نکھار دی تھی۔

"کاش! میرے پاس ایسا برش آجائے کہ میں بھابھی کے دل و دماغ پر جمی بے حسی اور غرور کی کائی کو بھی صاف کرسکوں تو منظر یوں ہی نکھر جائیں اور سب کچھ میری سوچ کے مطابق ہوجائے۔" وہ اپنی سوچ پہ مسکرائی تھی۔

✿ ✿ ✿

صبح بڑی ہی حیران کن تھی۔ حرا نے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے کمرے میں ہی بیٹھ کر ٹیسٹ کی تیاری کی اور پھر کالج کے لیے تیار ہو کر ہی ناشتے کے لیے کمرے سے باہر آئی۔ لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ کچن میں امی کے ساتھ ثمن بھی تھی۔ جو احسن کو ناشتا پیش کررہی تھی۔ اتنے مہینوں میں آج پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ حرا نے صبح صبح ثمن کی نہ صرف شکل دیکھ لی۔ بلکہ اسے کچن میں کام کرتے بھی دیکھ لیا تھا۔

"حرا! کھڑی کیوں ہو۔ جلدی سے آکر ناشتا کرو۔ تمہاری وین آنے والی ہے۔" امی کی نظر اس پر پڑی تو کہے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ بھی خود پر قابو پاتے اندر آگئی۔ سلام کرتے ہوئے اس کی نظر ثمن سے ملی تو جس طرح اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے نظریں چرائیں، وہ حرا کو ورطۂ حیرت میں ڈال گیا۔

"یا اللہ خیر! یہ آج میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔"

"سی!" بے خیالی میں گرم کپ لبوں سے لگایا اور پہلا ہی گھونٹ یہ باور کروانے کے لیے کافی تھا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔

"دھیان سے بیٹا! آرام سے ناشتا کرو۔" امی اس کی سسکی پہ کہے بنا نہ رہ سکیں۔

✿ ✿ ✿

شام کو حرا چائے کا کپ لے کر آم کے درخت کے نیچے رکھی کرسی پر بڑے آرام سے بیٹھ گئی۔ پاس ہی پڑی چارپائی پر فاخرہ اور ثمن بھی بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ حرا کو بھابھی کا یوں ساتھ بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ جب وہ ثمن کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ثمن بیٹا! میں دیکھ رہی ہوں، تم جب سے میکے سے آئی ہو، پریشان لگ رہی ہو۔ وہاں سب خیریت تو تھی نا۔"

ان کا اتنا پوچھنا تھا کہ ثمن کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے جو فاخرہ اور حرا کے ہاتھ پاؤں پھلانے کے لیے کافی تھے۔

"ثمن! مجھے بتاؤ کیا ہوا؟ احسن نے کچھ کہا ہے یا ہماری کوئی بات بری لگی ہے تو مجھے بتاؤ۔"

فاخرہ نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور حرا نے جب ثمن کو یوں روتے دیکھا تو وہ بھی اپنے آنسوؤں کو بہنے سے نہ روک سکی، پھر فاخرہ کے اشارے پر جلدی سے پانی لے آئی۔ ثمن کو پانی پلا کر اس نے بھی خود کو سنبھال لیا۔

"امی! مجھے معاف کردیں۔ میں بہت بری ہوں۔ آپ کو کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ اپنے اردگرد ساس، نندوں کے ظلم کے قصے سن کر آپ کو بھی ان جیسا سمجھ بیٹھی اور شروع سے ہی اپنے اور آپ کے درمیان فاصلہ رکھا۔ کبھی آپ سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ کبھی کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ لیکن میں غلط تھی۔ میں نا سمجھ تھی جو آپ کے پیار اور خلوص کو سمجھ ہی نہ سکی اور آپ نے بھی تو مجھے کبھی احساس نہیں دلایا کہ میں غلط ہوں۔ کیوں؟" ثمن روتے ہوئے فاخرہ سے پوچھ رہی تھی۔

"میں اپنے اور تمہارے درمیان فاصلوں کو مزید بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ سسرالی رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں، جن میں بدگمانی بڑی جلدی وار کرتی ہے۔ جس سے لغزشیں اور کدورتیں جنم لیتی ہیں۔ جو میں ہرگز نہیں چاہتی تھی لیکن تم یہ بتاؤ کہ ابھی ایسی کیا بات ہوئی ہے۔ جس پہ تمہیں اتنا دکھ ہوا ہے کہ تم اتنا ٹوٹ کر روئی ہو۔" رسان سے اسے سمجھاتے ہوئے آخر میں وہ پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔ حرا بھی بڑے دھیان سے ثمن کی طرف متوجہ تھی۔

"امی! آپ تو جانتی ہیں ہم تین بہنیں ہیں اور وقار بھائی ہمارے اکلوتے بھائی ہیں۔ امی نے بڑے ارمانوں سے ہم دونوں بہن، بھائی کی شادی ایک ساتھ کی تھی اور جویریہ بھابھی کوئی غیر نہیں ہماری خالہ زاد ہیں لیکن ان کا رویہ شروع سے ہی امی اور بہنوں کے ساتھ ٹھیک نہ تھا۔ پہلے یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر تکرار ہوتی اور اب نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ وہ وقار بھائی کو لے کر علیحدہ ہونا چاہتی ہیں۔ مجھے سب جان کر بہت دکھ ہوا۔ لیکن جب امی نے بھابھی کو میری اچھائی کی مثال دی تو مجھے لگا میں اپنی جگہ پر کھڑی نہیں رہ سکوں گی۔ میری امی بھابھی سے کہہ رہی تھیں کہ ثمن بھی تو ہے نا اپنے سسرال میں دیکھو اچھے طریقے سے رہ رہی ہے۔ اپنی ساس اور نند کے ساتھ نباہ کررہی ہے کہ آج تک ان کے درمیان جھگڑا نہیں ہوا۔ لوگ ان کے گھر کے سکون کی مثالیں دیتے ہیں۔ تو مجھے یوں لگا کہ میں گہری نیند سے جاگی ہوں۔ اچھی بہو یہ خطاب مجھے کسی طعنے کی طرح لگا تھا۔ میں اپنی امی کو کیا بتاتی کہ بھابھی سسرال میں میری طرح ہی رہ رہی ہیں۔ میرے ہاں علیحدگی کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ آپ نے کبھی میری ذات پہ کوئی اعتراض نہیں اٹھایا۔ ورنہ میں بھی کب کی احسن کو لے کر علیحدہ ہوچکی ہوتی۔ میں نہیں جانتی کہ میرے میکے میں آگے کیا ہوگا۔ جھگڑا ختم ہوگا یا مزید بڑھے گا لیکن مجھے یہ احساس ضرور ہوگیا ہے کہ میں غلط تھی۔ رشتوں کو بگاڑنا یا سنوارنا ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بھلا پرانے رشتوں کی عمارت مسمار کرکے ہم نئے رشتوں کی بنیاد کیسے مضبوط کرسکتے ہیں"

وہ ابھی اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی اور فاخرہ اسے تسلی دے رہی تھیں لیکن حرا وہاں سے اٹھی اور خالی کپ اٹھا کر کچن میں آگئی۔ سنک میں کپ کو دھوتے ہوئے اس کی سوچ ایک ہی نقطے پر اٹکی ہوئی تھی۔

"تو حرا بی بی! آج تمہیں جواب مل گیا کہ دنیا میں "مکافات عمل" نام کا ایسا آئینہ واقعی ہے۔ جس میں انسان کو اپنی شکل تو نظر نہیں آتی لیکن اپنے اعمال کی بدصورتی ضرور نظر آجاتی ہے۔

تو کیا راہ راست پہ آنے کے لیے ایسے ہی مکافات عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا بھٹکے بغیر ہم منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیا ہم خود کو نفرت، حسد اور بغض جیسے منفی جذبات سے محفوظ نہیں رکھ سکتے جو ہمارے دل کی پاکیزہ سرزمین پر سبز کائی کی طرح پھیلتے جارہے ہیں اور رفتہ رفتہ جمتے ہوئے اس کو بے جان کردیتے ہیں۔ کتنا اچھا ہو کہ ہم قدرت کی طرف سے مکافات عمل کا انتظار کیے بغیر خود ہی دلوں کے آئینوں کو صاف و شفاف رکھیں۔

✿

آسیہ رزاقی

# دو دو کشتیاں

مکمل ناول

خالو جان لاؤنج میں داخل ہوئے۔ "ارے بھئی بیگم صاحب! ایک خوش خبری ہے آپ کے لیے مگر پہلے ایک پیالی چائے ہو جائے۔" کہتے ہوئے انہوں نے اپنا بریف کیس ایک صوفے پر رکھا۔ میز پر ٹوپی سجائی۔ دوسرے صوفے پر بیٹھ کر سر مجلانے لگے۔

نوید نے زوردار طریقے سے سلام کیا۔ "اسلام علیکم خالو جان صاحب بہادر۔"

"وعلیکم اسلام۔ آؤ میاں نوید بہادر اور سناؤ یہ بتاؤ ہمارا یہ ننھا سا قلعہ جسے ہم گھر کہتے ہیں۔ کیسا لگا؟ پسند آیا؟"

"زبردست... خالو جان صاحب بہادر۔ اس قلعے نما گھر میں رونقیں بہت ہیں اور ہم تو اپنے وسیع و عریض محل نما گھر کی تنہائی کے ڈسے ہوئے ہیں۔ اس لیے سب بہت اچھا لگا۔ اچھا۔ وہ خوش خبری بھی لگے ہاتھوں سنا دیں۔"

"ہاں... ہاں' ہاں ابھی چائے آتی ہے۔ تو بتاتے ہیں۔" خالو جان صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر آرام سے بیٹھ چکے تھے۔ نہ انہیں خوش خبری سنانے کی جلدی تھی۔ نہ ہی کسی کو سننے کا شوق۔ خالہ جان جہاں بیٹھی تھیں۔ وہیں اپنی جگہ اپنے سابقہ شغل میں مصروف رہیں۔ یعنی بیٹی کے لتے لیتی رہیں۔

"کتنی بار سمجھایا ہے۔ طاقت نہیں عقل استعمال کیا کرو۔ توڑ دیا میرا گلوبند۔ جب پہننے کی برتنے کی تمیز نہیں تو کیا ضرورت تھی گلے میں ڈالنے کی۔ تمہیں تو ذرا ہوش نہیں۔ کسی بات کا تم پر اثر نہیں ہوتا۔" صبح سے ہی عظمیٰ بے چاری ان کی لعنت ملامت کا ہدف بنی ہوئی تھی۔

"امی! کہہ رہی ہوں۔ میں نے خود نہیں توڑا۔ عافیہ کی امی اسے قریب سے دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ راستہ تنگ تھا۔ میں ان کے پاس نہ جا سکی۔ تو عافیہ اسے اتارنے لگی میرے گلے سے۔ تاکہ اپنی امی کو لے جا کر دکھا دے۔ نہ جانے کیسے کنڈا ٹوٹ گیا۔"

"ہاں۔ اب یہی بہانہ کرو گی۔ ارے عافیہ کے لیے راستہ تنگ نہ تھا۔ تمہارے لیے تنگ ہو گیا۔ کسے

احمق بنا رہی ہو عظمیٰ! جانتی ہوں سب۔" خالہ جان بلاوجہ حجت کر رہی تھیں۔

"امی! عافیہ کا تو وہ گھر تھا۔ کرسیوں پر تمام جگہ اس کے عزیز رشتے دار بیٹھے تھے۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ ان لوگوں کے درمیان آڑ پھنس کر گزرنا۔ کروا دوں گی ٹھیک۔ فکر نہ کریں۔"

"بس بس... کچھ اور خرابی کر دو گی۔ رہنے دو تم۔ تمہارے ابا آگئے ہیں۔ جاؤ چائے دو جا کر انہیں۔"

ایک دن پہلے عظمیٰ اپنی دوست کی بہن کی شادی میں گئی تھی۔ شومئی قسمت۔ ماں کا گلوبند پہن لیا جو کہ دراصل نانی اماں کے جہیز کا تھا۔ جو انہوں نے خالہ جان کو جہیز میں دیا تھا۔ نیلے نگوں کا جڑاؤ گلوبند۔ جو کہ آثار قدیمہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ممکن ہے نانی اماں کی اماں جان نے انہیں اپنے جہیز میں ملا ہوا دے دیا ہو۔ ایسی چیزیں نسل در نسل شانہ بہ شانہ چلا کرتی ہیں۔ میچنگ کی وجہ سے عظمیٰ نے نیلے سوٹ کے ساتھ پہن لیا۔ اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا دھاگوں کا بنا ہوا انگوڑا کنڈا ٹوٹ کر عافیہ کے ہاتھ میں آگیا۔ خالہ جان صبح سے عظمیٰ نصیحتے کر رہی تھیں۔ جس کی جرات (پہن کر جانے کی) اور حماقت (توڑ دینے کی) کی وجہ سے اتنا قیمتی، معزز و محترم گلوبند ٹوٹ کر ہاتھ میں آ گیا۔

صبح سے یہ سلسلہ کئی بار منعقد ہو چکا تھا۔ یعنی الزام خفگی، ڈانٹ اور ہر بار عظمیٰ صفائی دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتی (ناکام)۔

"خالو جان! مبارک ہو۔ چائے آگئی۔ اب لگے ہاتھوں خوش خبری بھی سنا دیں۔" عظمیٰ کے ہاتھ میں پیالی دیکھ کر خالو جان کی باچھیں کھل گئیں۔ نوید نے انہیں یاد دلایا۔

"ہا' ہا' ہاؤ ہو' ہو بھئی خوب۔ یعنی کہ سبحان اللہ کمال ہو گیا۔" پیالی میں جھانک کر بغور معائنہ کرنے لگے۔ گویا مچھلی پر کنڈ کرنا مقصود ہو۔

"جی تو وہ خوش خبری!" نوید کو شدید انتظار اور اشتیاق۔ خالو جان مسرور۔

"خالہ جان آجائیے لگتا ہے خوش خبری کا تعلق آپ سے ہے۔ تب ہی خالو جان چپ ہیں۔"

"ارے جانتی ہوں' ان کی خوش خبری یہی ہو گی کہ بیگم میں آگیا۔"

"خالہ جان۔ آیئے تو سہی۔ وہ کسی اور کو خوش خبری سنانے کے موڈ میں نہیں لگتے۔ چائے پی رہے ہیں۔ میں نے عرصے سے کوئی اچھی خبر نہیں سنی۔" نوید کا اشتیاق عروج پر تھا۔

"لو آگئی۔ یہی کہیں گے کہ بیگم آپ کے لیے یہی خوش خبری ہے کہ میں آگیا یقین نہ ہو تو پوچھ لو۔" خالہ جان گردن ہلا کر تائید کر رہے تھے۔ نوید کو مایوسی ہوئی' حیرانی الگ۔

"نوید بھائی' حیران ہونا چھوڑ دیں۔" عظمیٰ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کو روزانہ یہی ڈائیلاگ سننے ہوں گے۔ ابا کے پاس امی کے لیے یہی خوش خبری ہوتی ہے۔"

نوید منہ بنا کر وہاں سے نکل آیا۔ اب دونوں میاں بیوی میں جھڑپ شروع ہو چکی تھی۔

نانی اماں پاندان کھولے درستی میں مصروف ملیں۔

"نویدو! میرے چاند' میری جان" "آ" ارے کیا تھا جو تو میری بیٹی کو بھی لے آتا۔ اکیلا آگیا۔" شکوہ لبوں پر آ گیا۔

"نانی اماں! اگلی بار آؤں گا۔ تو لے آؤں گا انہیں' ماابھی تو وہ دبئی گئی ہوئی تھیں۔"

"جب سنا یہی سنا کہ دبئی گئی ہے یا جدہ گئی ہے۔ اے بھئی۔ ماں سے ملنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ارے اچھا۔ یہ کون ہے؟ عظمیٰ آپچی۔" نانی اماں ہاتھوں کا چھجا بنا کر دیکھنے لگیں۔ "بٹی! ذرا مرغی کی یخنی تو چڑھا دے۔ آج پھر مجھے سردی لگ رہی ہے۔ نزلے کا خطرہ ہے۔ ارے بابا یہاں کا موسم ہے عجوبہ۔ شام ہوتے ہی سردی جسم سے لپٹ جاتی ہے۔ میں نے کہا عجو۔ آج پھر موئی کوئل کوک رہی ہے۔ کوئی پوچھے اتنا ٹھنڈا موسم نہ یہاں آم کے درخت نہ جامن کے۔ بی بی بھلا تیرا یہاں کیا کام۔ سویرے سے ہی کو ہو۔ کو ہو پکار رہی ہے۔ تو بھلا سنے کون۔ تیرا پیا تو گرم علاقے میں کہیں بیٹھا ہو گا۔"

"نانی اماں! لگتا ہے کوئل راستہ بھٹک کر اڑتی اڑتی یہاں آنکلی ہے۔ نہ سہی آم جامن۔ موسم تو آم کے پکنے کا ہے میدانی علاقوں میں۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ بولے گی ضرور۔ کوئی سنے یا نہ سنے۔ جنگل موجود ہے۔ اسے درختوں کی پناہ حاصل ہے۔ بس پھر وہ کیوں نہ اپنا راگ الاپے۔"

عظمیٰ نے نانی اماں سے وہ کپڑا لے لیا جس سے وہ پاندان کی صفائی کر رہی تھیں اور خود ہی تھالی رگڑنے لگی۔ چمکانے لگی۔

"اور۔ یخنی میں نے چڑھا دی ہے۔ دیسی مرغی منگوائی تھی۔"

نانی اماں نے کمر سیدھی کر لی۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی۔ "اس گھر کا وہی حال ہے۔ اے بھی عظمیٰ نہ ہو تو یہ گھر مرغیوں کا ڈربہ ہو۔"

"نانی اماں۔ کبوتروں کا کابک کہیے۔" عظمیٰ مسکرا دی۔

"اے لو۔ وہ موئی پھر بولنے لگی۔ پتا چل جائے کہاں کس درخت پر بیٹھی ہے۔ تو اسے پکڑ لوں اور پوچھوں۔ اے بی بی۔ کب تک پکارے گی اپنے پیار کو جم جائے گی دسمبر تک تو۔"

"اور وہ کہے گی نانی اماں! آپ بھی تو اس ٹھنڈ میں رہتی ہیں۔ برداشت کرتی ہیں۔ تو میں بھی برداشت کر لوں گی۔ ورنہ آپ میدانی علاقے میں آئیں۔ تو میں بھی وہیں آجاؤں۔" عظمیٰ پاندان صاف کر کے اسے سیٹ کر چکی تو نانی اماں سے باتوں میں لگ گئی۔

"میں کہوں' عجو یہ بے چاری پکارتے پکارتے تھک جاتی ہو گی اور اس کا پیا... آتا نہ ہو گا۔ کیا سوچتی ہو گی کہ بے وفا ہے... ہیں؟"

نوید اس لایعنی گفتگو سے اکتا گیا۔ "نانی اماں! آپ مجھ سے باتیں کیے جا رہی ہیں۔ میں جو اتنی دور سے میدانی علاقے سے آپ سے ملنے آیا ہوں۔ آپ میری پروا بھی نہیں کر رہیں۔ اس کوئل کی طرح۔ جو موسم کو خاطر میں لائے بغیر پی ہو پی ہو کر رہی ہے۔ کیا سمجھوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" شکوہ زبان پر آ گیا۔

"اے میرے چاند! میری جان! میں قربان۔ لو بھلا میں اپنے چاند سے خفا ہو سکتی ہوں؟ آ۔ میرے پاس بیٹھ۔ بس یہ شکایت ہے کہ اکیلا آگیا۔ ماں کو نہ لایا۔ کہ میں اسے دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی۔ اب عمر ایسی رہی نہیں کہ خود جا کر مل آؤں۔"

"میں جو آگیا ہوں۔ آپ مجھ سے مل کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیں۔ آپ کی بیٹی اپنی بیٹی کے پاس گئی ہوئی ہیں اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے۔"

نانی اماں نے سرد آہ بھری۔ "ہاں اللہ اسے اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ آمین۔ وہ دبئی سے آجاتی۔ تو اسے لے کر آتا۔ تب مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔"

"ٹھیک ہے نانی اماں! میں چلا جاتا ہوں۔ جب آپ کی بیٹی صاحبہ اپنی بیٹی سے مل کر واپس آئیں گی میں انہیں لے آؤں گا۔ اگر انہوں نے آپ سے ملنا چاہا۔" نوید نے منہ پھلا لیا بچوں کی طرح۔ عظمیٰ نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔

"اسے ہے کیوں نہ ملنا چاہے گی۔ لو اور سنو۔"

"ویسے پتا نہیں ہمارے خاندان میں بیٹیوں کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔ ان ہی کے لیے تڑپ ہوتی ہے محبت میں۔ بیٹے بچارے کونے میں پڑے رہتے ہیں۔ کمتر اور حقیر۔ معمولی اور ارذل۔" وہ اب منہ پھلائے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور باہر جھانکنے لگا۔

سامنے بلند و بالا سرسبز پہاڑ تھا۔ سبزہ ہی سبزہ۔ درختوں کا جنگل۔ کہیں دھوپ کہیں سایہ۔ بہت دل نواز اور دلکش نظارا تھا۔ ہریالی۔

"آپ تو بہت عجیب بات کر رہے ہیں نوید بھائی!" عظمیٰ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "ہمارے معاشرے میں لڑکی کو کب اہمیت دی جاتی ہے۔ بیٹے البتہ بانس پر چڑھائے جاتے ہیں۔ ساری محبت' ماما' پاپا بیٹوں پر مرکوز ہوتی ہے۔ لڑکیاں تو دو نمبر شہری

ہوتی ہیں بچاریاں۔"
"پتا نہیں یہ تمہارا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہماری امی' وہ تو بیٹیوں کے لیے بہت اعلیٰ خیالات رکھتی ہیں۔ بے انتہا ممتا کا مظاہرہ۔" نوید پلٹ کر سامنے آگیا۔
"صبح ہوتی ہے تو بیٹیوں کے نام کے ساتھ۔ اللہ رسول صلی علیہ وسلم کے کلمے کے بعد بیٹیاں نامہ شروع۔ دوپہر کو نماز کے بعد کی دعائیں بیٹیوں کے نام۔ ان ہی کی خوشیوں' عمروں کے لیے ان کی اولاد کی خوش بختی کے لیے۔ پھر شام سے رات تک ٹھنڈی سانسیں بیٹیوں کی جدائی کے غم میں اور رات گئے تک ان ہی کی تسبیح۔ بیٹا نہ جانے کہاں ہوتا ہے۔ کم از کم ذکر میں نہ فکر میں آس نہ پاس۔ دعا کیسی۔ اس کے نام پر تو تیوری بلوں سے بج جاتی ہے۔"
عظمیٰ کے لب ہی نہیں۔ آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔ نوید کے سرد آہ کے ساتھ جملہ ختم ہونے پر وہ ہنسی سے بے تاب ہو گئی۔ پلنگ پر گر کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ نانی حیرانی سے گال پر انگلی رکھے نواسے اور نواسی کو دیکھ رہی تھیں۔ نواسے کا دکھ۔ نواسی کی ہنسی۔ آخر ضبط نہ ہوا۔ ڈپٹ کر بولیں۔
"اب چپ کر عجو۔ کیا لوٹن کبوتر بنی ہوئی ہے۔ ارے میرے لاڈلے۔ ادھر آ۔ میرے پاس بیٹھ آکر۔ نانی کی جان!" انہوں نے ہتھیلی سے بستر تھپکا۔ وہ ست قدم اٹھاتا عجو کو گھورتا ہوا خفا خفا سا ان کے پاس بیٹھ گیا۔
عظمیٰ ہنسی روکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ وہاں جا کر اب قہقہے لگا رہی تھی کھل کر۔ اف' اف نوید کو مزید غصہ آیا۔ نانی نے اسے اپنے سوکھے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔
"بیٹا۔ ماں سے اتنی شکایتیں۔ سیدھا جن بیٹیوں کے لیے وہ دعا گو رہتی ہے۔ وہ تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں۔ بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ فرماں بردار' غم گسار' ان کے نصیبوں کے لیے مائیں دعائیں ہی کرتی ہیں۔ اس میں کیا برائی ہے بھلا اور بیٹا' بیٹا تو اپنا ہوتا ہے۔ اپنے پاس' اپنے ساتھ' اپنی جان جگر۔"
"اچھا تو جان جگر کی سزا یہ ہے کہ اسے یاد ہی نہ کیا جائے۔ دعا ہی نہ دی جائے۔ نہ کسی اچھے لفظ سے تعریف کی جائے۔ بلکہ اسے مستقل کم درجے کی مخلوق سمجھا جائے۔ اس سے بے اعتنائی برتی جائے۔ اسے اپنی اوقات کا اچھی طرح علم ہو جائے۔"
"ہائیں' ہائیں نوید و! میرے بچے' بیٹے سے بے اعتنائی؟ ارے کیسی بے اعتنائی؟؟"
"ویسے ہی۔۔۔ جیسی آپ نے ماموں کے ساتھ کی۔ ان کو دودھ میں مکھی کی طرح نکال پھینکا۔"
"اچھا تو یہ ماموں کا سکھایا ہوا سبق ہے۔ جب میں کہوں۔ میرا نوید ایسا نہ تھا۔ ہوں ہوں۔" کسی بات پر تنج کرتانی گردن ہلا رہی تھیں۔
"آپ نے ہی تربیت کی ہے امی اور خالہ کی۔ جو آپ نے کیا۔ ویسا ہی امی کر رہی ہیں۔"
"اور میں نے کیا تربیت کی ہے۔ بتانا ذرا۔" خاصے تحمل سے کام لے رہی تھیں۔
"پتا نہیں۔" نوید نے کندھے اچکائے۔ "لگتا ہے کہ جو کچھ ماموں پر گزر رہی ہے۔ مجھے بھی اسی سے گزرنا ہو گا۔ سب سے الگ۔ تنہا اداس بلبل۔" غم کا تاثر بھرپور طاری کیا۔
"اچھا۔ اور کیا کچھ پٹی پڑھا کر بھیجا ہے اس اداس بلبل نے؟ تفصیل بتاؤ۔"
"میں نہیں جانتا نہ انہوں نے کچھ بتایا۔ میں نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا۔ وہی جانتا ہوں۔"
"مثلاً" کیا؟" نانی کا ضبط قابل تعریف تھا' دل نوید عش عش کر رہا تھا۔ امید نہ تھی۔
"کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں
ہزاروں ہی شکوے ہیں کیا کیا بتاؤں"
بہت لہک کر' پورے سُر کے ساتھ نانی کو اداکاری کے ساتھ سنایا۔ ادھر سے حسب توقع وار ہوا۔ خبری میں مارے گئے۔ نوک دار خطرناک سروتہ جھیل چکا تھا۔ پھدک کر ایک چیخ کے ساتھ کھڑے ہوئے۔
باہر سے منہ اندر ڈال کر عظمیٰ نے پوچھا "کیا ہوا؟"



"تشدد۔" بازو سہلا رہے تھے مسٹر نوید۔ ہونٹ دبا کر تکلیف سہی۔ عظمیٰ اندر آگئی۔
"نانی اماں۔ آپ نے نوید بھائی کو مارا؟ ہائے اللہ۔"
"نتیجہ اس کا نتیجہ۔" نانی مختصر جواب کی قائل تھیں۔
"ارے سُر میں گا کر جواب دیا۔ یہ عزت ہے مہمان کی' کیسا استقبال تو اسا ہے یہ اور آلہ قتل دیکھو۔ کس قدر خوف ناک ہے۔ دانتے دار۔ دھاردار۔ عجیب سی وحشت کی اور تیز دھار پن لیے ہوئے۔ جو کہیں گہرا زخم ہو جاتا۔ خون بہنے لگتا۔ سیپٹک ہو جاتا' تو یہاں جنگل میں تو ڈاکٹر بھی نہیں ہوں گے۔ میں تو بن کھلے مرجھا جاتا۔ بقول شاعر حسرت ان غنچوں پہ ہے جو۔۔۔" گانے کی کوشش کی۔ پھر نانی کے غصے کے احترام میں خاموشی اختیار کرلی۔
"ڈاکٹروں کی یہاں کمی نہیں ہے بلکہ زیادتی ہے۔ لیکن آپ کس سلسلے میں مارے گئے ہیں۔"
"ماموں کی حمایت۔ ماموں کی وکالت' ماموں کی رفاقت میرا جرم بن گیا۔"
"لو ہو یہ تو ناقابل معافی جرم ہوئے۔" عظمیٰ نے تاسف کا اظہار کیا۔ "اس کی سزا تو قید بامشقت سے کم نہیں۔ سوچ کر جواب دیں۔ آپ کس قسم کی مشقت بہ آسانی برداشت کر سکتے ہیں۔" عظمیٰ خلاف عادت سنجیدہ تھی۔ کچھ دیر پہلے کا ہنستا ہوا گلاب چہرہ خزاں زدہ ہو رہا تھا۔
"اچھا یہ بھی ہو گا؟" عظمیٰ کے چہرے سے نظر ہٹا کر ناراض نانی کی طرف مڑ کر کہا۔ "چلیں۔ نانی اماں! کوئی بھی سزا سنا دیں۔ قید بامشقت' قید تنہائی۔ قید سخت' قید عرض سچائی۔"
"بند کر اپنی قید کی گردان۔ میرے پاس آکر بیٹھ۔" خود ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ سہولت سے ان کی طرف لڑھک گیا۔ منہ اٹھا کر نانی کے تاثرات جانچنا چاہے۔ مسکرا رہی تھیں۔
"نانی اماں! کیا میری معافی کی درخواست سے پہلے معافی مل گئی؟"

"تو نے مانگی نہ میں نے معاف کیا۔" نانی کا استغنا قابل دید تھا۔

"تو آپ کی مسکراہٹ کس سلسلے کی کڑی ہے؟؟"

"عادت۔ بھئی ہم خوش مزاج لوگ ہیں۔ خوش مذاق بھی۔ پروا نہیں کرتے ذرا سی بات کی' ناموافق بات پر غصہ آتا ہے۔ پھر غصہ تھوک دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد۔"

"شکر ہے۔ ورنہ میں تو آج واپسی کا ارادہ کر رہا تھا۔"

"گھر تیرا خالی پڑا ہے۔ سناٹے سے تنگ آکر یہاں رونق والے گھر آیا تھا۔ تو پھر سناٹے میں جائے گا۔"

"نہیں۔ یہاں سے ماموں کے شور شرابے والے گھر جاؤں گا۔ وہاں بہرحال میری عزت اور قدر ہے۔ بچے ایسے لپٹتے ہیں جیسے میں شہد کا ڈرم ہوں۔ مامی ایسی خاطر کرتی ہیں جیسے ان کا بچپن کا کھویا ہوا بھائی واپس آ گیا ہو۔ ماموں یوں۔"

"پھر تو نے وہی ذکر چھیڑا۔ چل اٹھ یہاں سے اٹھ نہیں تو سروتے سے پھر ایسی خاطر کروں گی کہ نانی بلکہ پرنانی یاد آجائے۔ کرتے رہنا ہائے ہائے۔ اٹھ اب۔" غصہ چڑھ گیا تھا۔

نوید نے بہتر سمجھا کہ اس دھار دار نوک دار پیچیدہ قسم کے خطرناک ہتھیار سے دور ہو جائے۔ انگڑائی لیتے ہوئے کھڑے ہو کر نانی سے کچھ دور ہو کر کہا۔

"مامی چکن کڑاہی اور مٹن بریانی اس قدر لذیذ بناتی ہیں کہ انگلیاں چاٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی۔" کہہ کر پیچھے ہٹا۔ نانی کے پھینکے ہوئے ہتھیار سے بچنے کے لیے جھکنا پڑا۔ ورنہ سر میں دو چار ٹانکے تو ضرور لگتے۔ باہر نکلتے ہوئے سیٹی بجا رہا تھا۔ جان بچ جانے کی خوشی میں۔ خالو جان کے ساتھ شطرنج کی بازی بھی پرلطف رہی۔ خالو کو پتا ہی نہیں چلتا کہ ان کی چلی ہوئی چال کب اور کیسے واپس ہوگی۔

"خالو جان! کیا اس گھر میں مہمانوں کی خاطر تواضع کا رواج نہیں ہے۔ صبح سے ہر طرف سے نصیحتیں سننے کو مل رہے ہیں۔ عظمٰی اور میں دو ہدف ہیں۔ بلکہ نانی نے تو مجھ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا۔ کیا اس گھر کے باقی سارے لوگ بہت ہی مکمل پسندیدہ اور اعلا اقدار کے حامل ہیں۔ اور ہم۔"

"برخوردار! آپ نے میرا نام تو لیا ہی نہیں۔ مگر میں بھی ان لوگوں میں یعنی تم لوگوں میں شامل ہوں۔ جن کو نصیحتوں سے نوازا جاتا ہے۔ نصیحتوں سے لادا جاتا ہے۔"

"اچھا' لیکن آپ کو چائے مل تو جاتی ہے۔ قاتلانہ حملہ نہیں ہوتا۔ میں مہمان ہوں۔ مگر نانی اماں کے حملے۔ اچھا اور عظمٰی پر خالہ جان کا عتاب کس سبب میں ہے۔"

"بڑی بیٹی ہونے کے جرم میں۔" خالو جان اطمینان سے بولے۔

نوید کے ذہن نے انگڑائی لی۔ بڑی بیٹی' چھوٹا بیٹا۔ بھلا یہ کیا جرم ہے۔ بڑی آپا کی شادی ہوگی۔ رخصتی پر امی دو بار بے ہوش ہو ئیں۔ مجھلی سے بھی کم محبت نہ تھی۔ ان کی رخصتی کے بعد امی نے باقاعدہ بستر سنبھال لیا۔ اتنا غم منایا کہ بس۔ تیسری تو سب سے زیادہ لاڈلی دلاری چہیتی تھی۔ اسے رخصتی کی ضرورت نہ پڑی۔ امی نے اپنے یتیم بھتیجے سے شادی کر کے اسے گھر داماد رکھ لیا۔ بھتیجا کم ظرف نکلا۔ آئے دن بہانے کر کے نوکری پر الزام دھر کے کہیں چل دیتا۔ آخر ایک بار جو غائب ہوا تو خاندان میں ساس کے ظلم و جور کی داستانیں مشہور کر دیں اور بیوی سے کہہ دیا۔ "تم ادھر ہم ادھر' یعنی تم اپنی ماں کے پاس۔ میں اپنی ماں کے پاس۔" امی کو شدید غم تھا۔ ہائے دغاباز نے کیسے آنکھیں پھیر لیں۔ بھتیجا ایسا ہوگا' سوچا نہ تھا کئی دن آنکھیں نم رہیں۔ فون پر بات چیت جاری رہی۔ کچھ وعدے کچھ معاہدے۔ پھر اس نے چپکے چپکے کوشش کر کے کینیڈا کا ویزا حاصل کر لیا اور جاب بھی۔

کبھی کبھی آتا کبھی نوشی اس سے ملنے اسلام آباد جاتی۔ اسی معاہدے کے تحت جب نوشی اسلام آباد آنے لگی تو اس نے مری بھوربن' نتھیا گلی ٹھنڈیانی کی سیر کا پروگرام بنایا۔ نوشی گرم کپڑوں کا بکس لے کر ننی میاں کی فرمائش پر۔ مری تو دور تھا۔ بھوربن اور بھی دور۔ اسلام آباد ایرپورٹ نزدیک تھا البتہ۔ لہٰذا ادھر ہی سیر نکل گئے۔ اور نوشی بے چاری بے خبر۔ انجانے میں ایک جہاز پر بٹھا دی گئی۔ شوہر کے ساتھ۔ اسے شاید خبر نہ تھی کہ مری میں کوئی ایرپورٹ نہیں ہوتا۔ بس پھر وہ جہاز اسے کینیڈا لے گیا اور کمبخت بھتیجے نے مہینہ بھر تک پلٹ کر خبر لی نہ دی۔ امی بکی بھجتی رہیں۔ مری' بھوربن' سوات میں سگنل نہیں جاتے۔ غریبی نوشی کہاں کس دنیا میں ہے۔ کچھ پتا نہ تھا۔

نوشی کو بہانوں کی ضرورت نہ تھی۔ سیر تفریح کی دلدادہ۔ نوشی بیگم کینیڈا کا شاپنگ مال۔ نیاگرا فال اور حسین نظاروں میں ایسی گم ہوئیں۔ کہ ماں بھول رہی۔ امی کو اس کی سسرال سے علم تو ہو گیا کہ مہمان بیوی تفریح کے لیے لمبے پروگرام پر گئی ہیں۔ یہ خبر نہ ہو سکی۔ کہ داماد صاحب چالاکی سے ان کی ست رنگی چڑیا لے اڑے۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد جب نوشی کو تفریح سے فرصت ملی تو خوشی سے بے حال ہو کر فون کیا اور بتایا کہ وہ تو کینیڈا پہنچ گئی ہے اور بہت خوش ہے کہ شوہر نے پچھلے رویے کی تلافی بھی کر دی ہے۔ خوب سیریں کرائیں۔ شاپنگ کرائی۔ یہ ملک بہت حسین ہے۔ جنت ہے۔ وہ مناظر جو مری ایبٹ آباد جا کر دیکھنے پڑتے تھے۔ برف باری' جو مری نتھیا گلی کے لمبے سفر کے بعد دیکھنے کو ملتی تھی۔ یہاں گھر بیٹھے کھڑکی سے جھانکو اور مفت میں نظارے کرو۔ ہاہا کیا حسین سین ہوتے ہیں۔ نہ امی کی جدائی میں تڑپنے کا ذکر۔ نہ میاں کے دھوکا دہی پر بگڑنے کا ایک حرف۔ نہ سب سے دور آنے کی فکر۔ امی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ نوشی سے تو کچھ کہہ نہ سکیں۔ بڑی آپا کو گھنٹہ بھر فون پر رو رو کر سناتی رہیں اور پاپا ایک ایک منٹ شمار کرتے رہے کہ کال لاونی کی ہو یا جدہ کی۔ بہت مہنگی پڑتی تھی۔ رقم کے لحاظ سے اور امی کے خراب موڈ کی وجہ سے۔

اب امی بیٹیوں کے سکھ کے لیے ہر وقت دست بہ دعا رہتیں۔ پانچوں وقت کی نماز کے بعد پورا گھنٹہ بیٹیوں کے سکھ۔ ان کے بچوں کی زندگی اور دامادوں کی صحت و ترقی کی دعائیں مانگا کرتیں۔ ان کا اپنا چھوٹا بیٹا کہاں ہے' کیا کر رہا ہے۔ اس نے کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں۔ آرام کیا ہے کہ نہیں۔ انہیں فکر تھی نہ غرض۔ بیمار ہوا تو خود ہی ڈاکٹر سے کہہ کر دوا لے آئے۔ بھئی وہ کوئی ڈاکٹر تو نہیں جو علاج کریں۔ یا دوا بتائیں۔ خانساماں ہیں جو اس کے کھانے کی فکر کریں۔ گھر میں ہر چیز موجود ہے۔ جو مرضی کھالے۔ خانساماں موجود ہے اس سے کہہ کر پسند کی چیز بنوا لے۔ موج کرے نہ جانے وہ کون مائیں ہوتی ہیں۔ جو بیٹوں کی تمنا کرتی ہیں ان کی فکر میں غلطاں رہتی ہیں۔

خیر اب نوید اس ماحول۔ ماں کی عادت کو جان چکا تھا اسے کوئی شکوہ تھا نہ پروا۔ اس کی اپنی ایک زندگی تھی تنہا سوچتے رہنے کی عادت بن گئی تھی۔ مگر کوئی مہربان دوست نہ تھا۔ کوئی پرخلوص ہستی رازدار نہ تھی کہ دل کی بات کہہ کر بوجھ ہلکا کر لے۔ بس دل میں ناراضی پلتی گئی۔ وہ بھی گھر سے لاپروا ہوتا گیا۔ پاپا تو کبھی بات کر لیتے۔ مگر امی۔ وہ بھی اس کی بے رخی کی عادی ہو گئیں عجب عجوبہ خاتون تھیں۔ بیٹیوں پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار۔ ممتا کا خزانہ ان ہی پر خالی ہوتا۔ بہن بھائی پر مہربان۔ لیکن بیٹا۔ وہ انہیں نظر ہی نہ آتا۔

نانی اماں سے کئی بار اپنے رشتے کے بارے میں سوال کیا کہ وہ سوتیلا تو نہیں۔ وہ بہلا دیتیں۔ نوید کی غلط فہمی پر خفا ہوتیں۔ "بھلا ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے۔ بیٹا تو اصل نسل ہوتا ہے۔ آئندہ نسل کا امین۔"

☼ ☼ ☼

ماموں سے نانی اماں ناراض تھیں۔ نوید کو یاد نہ تھا کہ کبھی نانی اماں ماموں سے اتنا ناراض ہوئی ہوں۔ لیکن اب' اب تو لاتعلق تھیں۔ وجہ نامعلوم۔ ماموں جاب کے سلسلے میں اسلام آباد میں تھے۔ نانی' نانا کے بنائے ہوئے مکان میں خالہ جان کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔

اصل میں نانا تو ہیشہ نینی تل بھی بہ غرض ملازمت رہے۔ وہ محکمہ جنگلات میں اعلا عہدے پر تھے۔ پاکستان آکر سرکاری ملازموں کے تبادلے میں نانا بالا کوٹ میں تعینات کیے گئے۔ مگر گھر انہوں نے ایبٹ آباد میں بنایا۔ انہیں یہ علاقہ پسند تھا۔

ماموں تعلیم کے لیے اسلام آباد بلکہ پنڈی میں رہے۔ پھر ملازمت اسلام آباد میں ہو گئی۔ تو وہ نانی اماں سے ملنے آجاتے تھے ہر ہفتے۔ یا نانی اماں ان کے پاس چلی جاتی تھیں۔ لیکن اب ضعیفی کے باعث سفر کرنا مشکل لگتا۔

خالو جان کالج میں پڑھاتے تھے۔ خالہ جان جب کالج میں تھیں۔ ان کو خالو جان کی والدہ نے کالج میں ہی دیکھ کر پسند کرلیا اور بہ سہولت شادی ہو گئی۔ اس لیے خالہ جان 'نانی اماں کے گھر میں ہی رہیں۔

نانا ابا کی وفات کے بعد سے خالہ جان 'خالو جان یہیں آگئے۔ ماموں ٹریننگ کے سلسلے میں انگلینڈ چلے گئے تھے۔ اس لیے یہ لوگ ماموں کی خواہش پر نانی کے ساتھ رہنے آگئے۔

نوید کی امی کی بھی یہی خواہش تھی کہ ایک بیٹی ان کے ساتھ رہے۔ مگر انہیں اس منصوبے میں ناکامی ہوئی۔ نوشی کی حماقت کی وجہ سے۔

خالہ جان کا بیٹا پشاور میں یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ اپنی پھوپھی کے گھر رہتا تھا۔ جب بھی آتا 'خالہ جان اس کی خاطر تواضع میں مصروف ہو جاتیں۔ اسماء سب سے چھوٹی تھی۔ لاڈلی چہیتی۔

بے چاری عظمیٰ نہ کسی کی لاڈلی تھی نہ چہیتی۔ وہ ہر وقت متحرک رہتی۔ کسی نہ کسی کام میں مصروف۔ اس کے باوجود خالہ جان کے زیر عتاب تھی۔ وہ بی اے کر چکی تھی۔ اس نے بھی اسلام آباد کے کالج میں پڑھا تھا۔ ماموں کے گھر رہ کر۔ وہ آگے بھی پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر ماموں کے گھر رہنے کی اجازت نہ ملی۔ نہ ہی ایبٹ آباد کی یونیورسٹی میں پڑھنے کی۔ "یہاں کا ماحول اچھا نہیں ہے۔" یہ وجہ اعتراض تھی۔ وہ گھر کے تمام کام کرتی۔ لیکن اعتراض ہی سننے کو ملتے۔ نانی اماں اس کی معترف تھیں۔ لاڈ بھی کرلیتی تھیں۔ تعریف بھی کچھ ہوائی الفاظ کے ساتھ کہ بچو نہ ہو تو گھر مرغی کا ڈربہ ہو۔ بھلا یہ کیا تعریف تھی۔ مگر تھی۔

اسما روتی شکل کی ہونق سی تھی۔ ہر بات میں نخرے "یہ نہیں کھاتا وہ نہیں کھانا۔ ایسا نہیں پہننا۔ وہاں نہیں جانا۔" اور اس کی فضول فرمائشیں پورا کرنے کی ذمہ داری عظمیٰ کی تھی۔

"یہ کیا پکا دیا ہے۔ اسما نے تو زبان پر نہیں رکھا۔" خالہ جان عظمیٰ پر برس پڑتیں۔ اور برسنے کے لیے انہیں بہانہ چاہیے ہوتا۔

"پتا ہے کہ اسما یہ گھاس پھوس نہیں کھاتی۔ پھر بھی تم نے قیمہ پالک پکالیا۔ آلو کے سالن میں ہرا دھنیا ڈال دیا۔ لو بھلا اب وہ کیا کھائے گی۔ اس کے لیے الگ قیمہ بھون دیتیں۔ یا کباب بنا دیتیں۔"

"عظمیٰ! تمہیں آج تک کچھ پکانا نہ آیا۔ یہ لمبے لمبے پیاز کے لچھے۔ سالن میں کیڑوں کی طرح کلبلا رہے ہیں۔ معلوم بھی ہے کہ اسما کو اچھے نہیں لگتے۔ مگر تمہیں کیا غرض۔ پیاز پیس لیا کرو۔ دس دفعہ سمجھا ہے۔ مگر تمہیں تو اسما کی مرضی کے خلاف ہی کرنا ہے۔"

ریٹائرمنٹ کے بعد خالو جان ایک شاپنگ مال میں اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کرنے لگے۔ دن میں دو بار گھر کا چکر لگا لیتے۔ آتے ہی خوش خبری کا اعلان کرتے اپنی آمد کی اطلاع۔

☼ ☼ ☼

چار دن ہو گئے تھے نوید کو آئے ہوئے۔ موقع ہی نہیں ملا اپنی سفارتی کارکردگی اور کامیابی حاصل کرنے کا۔ ایک ہفتے کی چھٹی پر آنے کا موقع ملا تھا اور ادھر ماموں بے چینی سے منتظر تھے۔ کسی نئی خبر کے۔ نانی اماں بات شروع ہوتے ہی ٹال مٹول کر کے موضوع ہی بدل دیتیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد نوید نے خالہ جان کو ہموار بنانے کا پروگرام بنایا۔ اس وقت اسما اسکول جا چکی تھی۔ عظمیٰ کچن میں مصروف۔ خالہ جان ٹی وی سے دل بہلا رہی تھیں۔ نوید نے اندر جھانکا۔

"خالہ جان! آجاؤں؟" اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

مسکراتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "ہاں ہاں 'آؤ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" موڈ خوشگوار تھا۔

"خالہ جان! ٹی وی پر کون سا پروگرام شوق سے دیکھتی ہیں؟" تمہید ضروری تھی۔

"میں تو ہر پروگرام دیکھ لیتی ہوں۔ شوق نہیں مجبوری ہے۔"

"لیکن جس پابندی سے دیکھتی ہیں۔ لگتا تو ہے کہ شوق سے دیکھتی ہیں ڈرامے۔"

"ہاں مگر ڈرامے پسند نہیں کرتی۔ نہ تو ان میں ہمارا معاشرہ دکھایا جاتا ہے۔ نہ کچھ بتایا جاتا ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔ عجیب سی بے ہودگی۔ نیم عریاں لڑکیاں چیخ چیخ کر بدزبانی کرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ نہ بڑوں کا ادب' نہ چھوٹوں کا لحاظ۔ بے باکی عروج پر۔ اور فضول قسم کی کہانیاں۔ صبح کے ہر پروگرام میں لڑکیاں لڑکے مست ہو کر ناچتے جھومتے گاتے نظر آتے ہیں۔ نہ اللہ کا نام نہ رسول کا کلمہ۔ بس صبح صبح ڈانس دیکھتے جاؤ۔ خواہ کسی کو دلچسپی ہو نہ ہو۔ توبہ استغفار۔ میں تو خبریں دیکھ لیتی ہوں۔ وہاں بھی ڈرامے چل رہے ہوتے ہیں سیاست دانوں کے۔ جھوٹ اور سچ۔ مگر مزے دار۔"

تفصیلی تبصرہ کرکے ہنس رہی تھیں۔ یعنی سب کچھ دیکھتی تھیں۔

"ڈراموں میں یہی دکھایا تو جاتا ہے۔ وہی جو عام زندگی میں ہو رہا ہوتا ہے۔" نوید نے تجزیہ پیش کیا "لڑائی جھگڑا' دنگا فساد' ساس بہو کی چپقلش 'میاں بیوی کی تو تکار ہوتا تو ہے نا ہمارے ہاں۔"

"اے ہے اور وہ بہنوں میں دشمنی۔ توبہ' یہ بھی انڈین ڈراموں کی نقل ہے۔ اللہ نہ کرے ہمارے ہاں بہنوں میں ایسی دشمنی ہو۔ بہن بہنوئی پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ طلاق دلوا کر خود شادی کر رہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہمارے ہاں ہوتا ہو۔ رشتوں کا لحاظ نہ رہے تو دنیا جہنم بن جائے۔"

"ساس بہو اور نند بھاوج کے قصے تو ہمارے گھروں میں رائج ہیں خالہ جان۔" معصوم بن کر کہا۔

"ہاں خیر۔ مگر ڈراموں میں اصلاحی پہلو بھی تو دکھانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آج کی بگڑی ہوئی نسل کو مزید بے راہ ہونے کی ترغیب دی جائے۔ ٹی وی بہت موثر ذریعہ ہے تربیت دینے کے لیے۔ جو دکھایا جائے گا۔ وہی تو سیکھیں گے۔" مختلف ڈراموں کی کہانیاں سنانے لگیں۔

"جی' صحیح کہہ رہی ہیں آپ خیر آپ بتائیں لاہور کب آرہی ہیں۔"

"ارے بیٹا! دیکھ تو رہے ہو۔ میں تو ایسی گرہستی میں بندھی ہوئی ہوں۔ چھٹی کہاں ملتی ہے۔"

"عظمیٰ ہے نا۔ گھر تو اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ آپ نے تو ریٹائرمنٹ لی ہوئی ہے۔ بس نگرانی کرتی ہیں آپ۔"

"سچ ہے۔ پھر بھی ذمے داری میری ہے۔ دیکھنا بھالنا پڑتا ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کو بھلا کیا علم کہ گھر کیسے چلایا جاتا ہے۔ تعلق کیسے نبھائے جاتے ہیں۔ تربیت بہت ضروری ہے۔"

نوید نے چینل بدلا۔ کوئی اشتہار چل رہا تھا۔ ایک پیارا سا بچہ نیا نیا چلنا سیکھ رہا تھا۔ دوڑنے کی کوشش میں گر پڑا۔

"ارے بالکل احمر لگ رہا ہے۔ اتنا ہی پیارا۔"

"کون احمر؟" خالہ جان انجان بن گئیں۔

"ماموں کا چھوٹا بیٹا۔ ابھی کچھ دن پہلے تو چلنا شروع کیا ہے اس نے۔ بہت پیارا ہے۔"

خالہ جان سوچ میں گم ہو گئیں۔ "اچھا اتنا بڑا ہو گیا۔ ابھی چند ماہ پہلے تو سنا تھا کہ پیدا ہوا ہے۔"

"خالہ جان! آپ کب سے اسلام آباد نہیں گئیں۔ ڈر...

"جاتی رہتی ہوں۔ اسما کے چچا کی بیٹی کی شادی میں پنڈی گئے تھے ہم سب پچھلے مہینے۔"

"تو۔ ماموں کے گھر نہیں گئیں؟" انتہائی حیرت ظاہر کی۔

"ارے شادی کے ہنگامے۔ بھلا کہیں آنے جانے کی فرصت ملتی ہے۔" صاف ٹال گئیں۔ مگر نوید کا ایسا ارادہ نہ تھا موضوع کو ٹالنے کا۔ مشکل سے تو راستہ ملا تھا۔

"تو ماموں کو شادی میں نہیں بلایا گیا۔ آپ نے بھی نہیں بلایا۔"

"جن کے گھر شادی تھی۔ انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ تو میں کیوں بلاتی۔"

"اوہو! آپ اپنی طرف سے بلا لیتیں۔ رشتے داروں میں ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ خیر! اچھا یہ نانی اماں ماموں سے کیوں ناراض ہیں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

خالہ نے کندھے اچکائے۔ "بھئی وہ جانیں۔ میں اماں کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتی۔"

"کمال ہے۔ میں نے تو اپنے خاندان میں ہی بیٹوں سے لاتعلقی اور بے رخی دیکھی ہے اور پہلے تو ماموں سے نانی اماں کو کوئی شکایت نہ تھی۔ مامی بھی ان کی پسندیدہ بہو تھیں۔ میں تو لاہور میں رہتا ہوں۔ پہلے پڑھائی۔ اب سروس کے جھیلے۔ کچھ خبر نہیں کہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"بیٹا! مجھے بھی کچھ خبر نہیں۔ اچھا یہ بتاؤ "آپا دوعی" سے کب آ رہی ہیں؟"

"جب ان کے داماد گھر سے نکالیں گے یا جب نواسوں کی تخریب کاری اور دہشت گردی سے خوف زدہ ہو جائیں گی تب۔"

"ارے ہے۔ کیا کہہ رہے ہو نوید۔"

"مطلب یہ کہ مجھے کوئی اطلاع نہیں۔ مجھ سے کوئی رابطہ نہیں۔ جب مرضی جاتی ہیں۔ جب دل چاہتا ہے۔ آجاتی ہیں۔"

"اور تم اور بھائی صاحب؟ گھر داری کیسے چلتی ہے۔"

"نوکر زندہ باد۔ ایک عدد خانساماں مسلط ہے۔ نہ جانے کیا گھول کر پکاتی کھلاتی ہے۔ پتا نہیں چلتا۔ ایک عدد ملازمہ۔ صبح ہی اپنی تیز آواز کا الارم بجاتی تشریف لاتی ہیں۔ صفائی کے نام پر ہنگامہ برپا کر کے۔ احسان جتا کر رخصت ہو جاتی ہیں۔ جو چیز جہاں ہو۔ وہیں پڑی ملتی ہے۔ کرسی میز جمی رکھی ہو۔ وہ ویسی ہی ملے گی۔ بستر جیسا چھوڑ کر جاتا ہوں۔ ویسا ہی رہتا ہے۔ بس ایسی گھر داری ہو رہی ہے۔ آپ کب آئیں گی لاہور۔ امی کے آنے کے بعد یا کوئی شرط ہے؟"

"ارے نہیں شرط کیسی۔ کوئی موقع ہو تو جانے کا پروگرام بناؤں۔"

"موقع؟ یعنی کیسا موقع؟"

"ہاں بھئی۔ تمہاری منگنی۔ شادی کا۔ یا کوئی بھی ایسی تقریب۔ جس میں شرکت ضروری ہو۔"

نوید نے ہاتھ پھیلا کر مضحکہ خیز انداز میں طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "تو بس پھر تو آپ کا ارادہ دور دور تک پورا ہونے والا نہیں۔"

"ہائیں! کیا شادی نہیں کرو گے؟" خالہ جان کی حیرانی۔

"میں تو تیار ہوں۔ وہ میری شادی نہیں کریں گی۔ حیران نہ ہوں ہمارے تعلقات پڑوسی ملک جیسے ہیں۔ آپ کی آپا کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں، تعلق نہیں، میں کیا کرتا ہوں، کہاں جاتا ہوں، کس سے ملتا ہوں، کیا کھاتا ہوں، یا بھوکا ہوں، انہیں فکر نہیں ہوتی تو شادی کا۔ تو امکان نہیں۔"

خالہ کو حیران پریشان چھوڑ کر کھانے کے کمرے میں آگیا۔ دل اداس ہو گیا۔ ہر طرف لاتعلقی۔ ادھر ماموں بے چین اپنی ماں کو منانے کے لیے۔ کرسی پر بیٹھ کر سر کھجانا شروع کر دیا۔ گویا عقل کو کریدا شاید کوئی راہ سجھائی دے۔ کچن میں عظمیٰ حسب معمول متحرک نوید کو دیکھ کر باہر آئی۔

"کیا بات ہے نوید بھائی۔ پریشان لگ رہے ہیں۔"

"ہاں عقل گم ہے۔ اگر ایک پیالی چائے مل جائے تو شاید گم شدہ عقل بازیاب ہو جائے۔"

"ہیں؟ آپ کی عقل۔ کہاں گم ہو گئی؟" لڑکی سمجھ دار ہے۔

"نہ جانے ـــ بے وقت فرمائش کی معافی چاہتا ہوں۔"

عظمیٰ کی کو تک سروس کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوتی ہو منٹ کے اندر چائے آگئی۔ شاباشی دے کر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "اچھا۔ ایک بات تو بتاؤ۔ نانی اماں اور خالہ جان کی ماموں مامی سے ناراضی کی وجہ کیا ہے؟ میں ابھی تک حیران ہوں۔ ماموں پریشان۔"

عظمیٰ دائیں بائیں چہرہ گھما رہی تھی۔ نظر چرا رہی تھی۔ یقیناً "واقف" تھی۔ مگر بتانے سے قاصر۔

"میں؟ ـــ اصل میں نانی اماں اتنی ناراض ہیں نہیں۔ جتنا ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن کچھ شکایتیں ہیں تو۔ کیا اور کتنی۔ میں وضاحت نہیں کر سکتی۔ ان ہی سے پوچھ لیں۔"

"خالہ جان کو تو شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ ماں بیٹے کے معاملے میں بلکہ انہیں تو صلح کی کوشش کرنا چاہیے۔ مگر ـــ لگتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں پہلو تہی کر رہی ہیں۔ تم ہی کچھ بتاؤ۔"

عظمیٰ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"آپ دیکھ تو رہے ہیں۔ میری کیا حیثیت ہے۔ اچھا میں ذرا سالن دیکھ آؤں۔"

وہ گئی تو پھر آئی نہیں۔ نوید پھر نانی اماں کے کمرے میں چلا گیا۔ مگر وہ سو رہی تھیں۔ وہ بھی آرام کرنے پر مجبور ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن عذیر آگیا۔ خالہ جان کی تو عید ہو گئی۔ وہ اس کی خاطر مدارات میں لگ گئیں۔ نانی اماں بھی عذیر کے واری صدقے ہوتی رہیں۔ خود عذیر نوید سے چپک گیا۔ اپنے ساتھ گھسیٹے رہتا۔ کبھی مارکیٹ، کبھی کسی ریسٹوران۔ کبھی یونہی سڑکوں پر ٹھنڈے موسم کا لطف لیتے ہوئے۔ قہقہے لگاتا لطیفے سناتا ہوا۔ لاابالی ہنس مکھ بے خبر۔

"یار! تم کو معلوم ہے ماموں اور نانی اماں میں ناراضی کی وجہ کیا ہے؟ تم آخر ان لوگوں کی صلح کیوں نہیں کرا دیتے۔ پتا تو چلے معاملہ کیا ہے؟"

"بھائی! میں تو ان خاندانی جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے معلوم بھی نہیں کون کس سے ناراض ہے۔"

"مگر میں تو ناراضی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ان کے درمیان مصالحت کی گنجائش کا جائزہ لے کر دونوں کو ملایا جائے۔ یہ رشتے ـــ اتنے کمزور تو نہیں ہوتے کہ ذرا سی بات پر خفگی کا بہانہ کر کے قطع تعلق کر لیا جائے۔ ماموں تو اپنا قصور جاننا چاہتے ہیں اور کوئی بتاتا نہیں۔ پھر وہ صفائی کیسے دیں؟ کیا کریں۔"

یہ تو ہے۔ امی اور نانی دونوں ناراض ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی وجہ تو ضرور ہے۔"

"میں مصالحت کرانا چاہتا ہوں۔ تم میری حمایت میں کچھ مدد کرو گے۔"

"نوید بھائی۔ میں تو کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ سب سے ملتا ہوں۔"

وہ اپنی عمر اور تجربے کی بنا پر ٹھیک کر رہا تھا۔ اس عمر کے بچوں کو واقعی کسی الجھے ہوئے معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

گھر آئے۔ خالہ جان عظمیٰ پر بگڑ رہی تھیں۔

"تمہیں شرم تو آتی نہیں۔ اپنی قمیص پر موتی ستارے لگا لیے۔ بہن کا خیال نہیں آیا۔ اب یہ قمیص اس کو دینا پڑے گی۔ کوئی ضرورت نہیں اپنے لیے یہ چمکتے ستارے سجانے کی۔ ہوش میں رہو۔"

عظمیٰ نے کچھ جواب نہیں دیا تھا۔ یعنی اس کی محنت سے بنائی ہوئی قمیص اسما کو مل گئی۔ یہ معاملہ بھی خاصا الجھا ہوا تھا۔ آخر خالہ جان عظمیٰ سے ناراض کیوں ہیں۔ ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ اس کی بھی کوئی وجہ ہو گی۔ چلو ماں بیٹی کا کچھ اختلاف ہو گا۔

نانی اماں تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ گرم جوشی سے اسے بٹھایا۔

نوید نے بھی بہت دردمندی سے لہجے میں تاثر پیدا کر کے ماموں کے لیل و نہار ان کا ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر رو رو کر ماں سے معافی ملنے کی دعائیں کرتے اس نے دیکھا تھا۔ نانی اماں متاثر تو ہوئیں۔ مگر بولی زبان

سے کہا۔

"کیا کروں بیٹی کے ساتھ رہتی ہوں۔ اس کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔"

"تو کیا۔۔۔ خالہ جان خفا ہیں؟ آپ نہیں؟ مگر وہ کہہ رہی ہیں کہ۔۔۔ وہ تو لاعلمی ظاہر کر رہی ہیں۔ کہ آپ جانیں اور ماموں ان کا کوئی تعلق نہیں۔" وہ حیرت سے نانی اماں کو دیکھ کر رہ گیا۔

نانی لاپروائی سے پاندان کی زیبائش آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ نوید کے بار بار کہنے پر بولیں۔

"اس سے کہو۔ میں راضی میرا خدا راضی۔ بس ایک ذرا سی خلش ہے۔ دنیاداری سمجھ لو۔ نہ اسے بلا سکتی ہوں نہ اس کے پاس جا سکتی ہوں۔"

نوید نے سکھ کا سانس لیا۔ چلو یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا۔ نانی اماں کو لاہور لے جا کر ماموں سے ملاقات کروائی جا سکتی ہے۔ یا اسلام آباد میں ہی کسی اور کے گھر۔۔۔ بہانہ بنانا پڑے گا کوئی۔ خالہ جان سے بات کی وہ ٹیڑھی کھیر نکلیں۔ آئیں بائیں شائیں کر کے ادھر ادھر کے قصے لے بیٹھیں۔

حاصل گفتگو عظمیٰ کی بدتمیزی، نافرمانی، خودسری اور پھوہڑپن لاپروائی ٹھہری۔ سخت مایوسی ہوئی بددل سا اٹھ کر باہر آیا کچن میں عظمیٰ تھی۔

"پلیز عظمیٰ! ایک کپ چائے ملے گی؟" کہہ کر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ عظمیٰ چائے لے آئی۔

"تم قائداعظم کے اقوال کی صحیح تشریح ہو۔ کام، کام اور کام۔"

"میں اتنا کام نہیں کرتی۔ امی کو پسند ہی نہیں آتا میرا کوئی کام اور جب کرنے کو کچھ نہ ملے تو بندہ کیا کرے۔"

"کرنے سے مراد کیا ہے؟"

"یہی پڑھائی یونیورسٹی امتحانوں کی ٹینشن وغیرہ۔"

"تو رکاوٹ کیا ہے۔ یہاں بھی یونیورسٹیاں ہیں یا اسلام آباد میں بھی پڑھ رہی تھیں۔ وہاں سے کیوں آ گئیں۔ بلکہ زیادہ آسانی تھی۔ ماموں کا گھر موجود تھا۔ کیا مجبوری تھی؟"

عظمیٰ کی آنکھیں یکایک لبالب بھر آئیں۔ آنسو اتنی مقدار میں۔ کبھی بھی نوید نے کسی کی آنکھوں میں اتنے آنسو نہیں دیکھے تھے۔ وہ حیرانی سے ان آنسوؤں کو آبشار بنتا دیکھ کر افسردہ ہو گیا۔ اس ہنستی مسکراتی لڑکی کو کیا دکھ ہے آخر۔ عظمیٰ اٹھ کر جانے لگی تو نوید نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"عظمیٰ! رک جاؤ۔ آج بتا ہی دو۔ یہ تم پر عتاب۔ تمہاری بے چارگی مجبوری کا سبب کیا ہے؟"

خالہ جان اسی وقت باہر آئی تھیں۔ انہوں نے کچھ محسوس کیا تھا۔ انتہائی پُرجلال لہجے میں چلّائیں۔

"آخر تم کر کیا رہی ہو کہ اندر آنے کی فرصت نہیں ملی کون سے دکھڑے رو رہی تھیں۔ پتا تو چلے۔" مگر عظمیٰ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

خالہ جان نوید کے سامنے چائے کی پیالی دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"تم چائے بہت پینے لگے ہو۔ کیا پریشانی ہے تمہیں؟"

"پریشانی تو نہیں ہاں الجھن کہہ لیں۔" اس نے موقع دیکھ کر بات بڑھائی۔ "ایک الجھن تو یہ ہے کہ ماموں سے خفگی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی نہ آپ ان کے گھر جاتی ہیں۔ نہ وہ یہاں آتے ہیں۔ نانی اماں بھی ناراض ہیں ماموں سے۔ دوسری الجھن یہ کہ عظمیٰ میں یکایک کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ کہ آپ ہر وقت اسے ڈانٹا کرتی ہیں۔ اس کی عزت نفس کا کچھ تو خیال۔۔۔"

خالہ جان آناً "فاناً" غصے میں آگ بگولہ ہو گئیں۔

"ہاں یہ بھی سچ ہے۔ ان دونوں الجھنوں کا سلسلہ ایک ہی ہے۔ بس اس سے آگے کچھ نہ کہنا، نہ پوچھنا میں بتاؤں گی نہیں اور اگر عظمیٰ سے تم نے پوچھا تو اس کی خیر نہیں۔۔۔ چائے پی لی ہو تو جاؤ عذیر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

نوید شدید حیرت اور تاسف کے عالم میں ان کے سخت لہجے اور کرخت الفاظ برداشت کر رہا تھا۔ جھٹکے سے اٹھا اور نانی اماں کے کمرے میں چلا گیا۔ اپنا بیگ وہاں سے اٹھایا۔ نانی کو خدا حافظ کہہ کر فوراً" نکل آیا۔

گیلری کے راستے سے باغیچے میں آیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔
پیچھے عزیر آواز دے رہا تھا۔ ان سنی کرتا ہوا گیٹ کے باہر آگیا۔ سوزوکی وین ادھر آکر رکی۔ وہ اس میں چڑھ گیا۔ عزیر بھاگتا ہوا پیچھے آیا۔ مگر سوزوکی دور جا چکی تھی۔

"یہ نوید بھائی کو ہوا کیا؟ اچانک چل پڑے۔" ماں سے پوچھا جو ابھی وہیں کھڑی تھیں۔
"اور یہ چائے کس کی ہے۔ آپ کی؟" وہ ماں کے چہرے پر تاسف کی لکیر دیکھ کر حیران ہوا۔ جو چائے سے بھری پیالی دیکھ کر رنجیدہ سی تھیں ہو آئیں۔ پیالی اٹھا کر کچن کی طرف جا رہی تھیں۔ تو ان کی چال متوازن نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

نوید دل برداشتہ تھا۔ ماموں کی طرف جانے کو دل نہ چاہا۔ لاہور ہی روانہ ہو گیا۔
بس کا انتظار کرنے کے بجائے ٹیکسی کر لی تھی۔ جس نے ہیلی کوپٹر کی طرح اڑان بھری اور۔۔۔ "آناً فاناً" گھر پہنچا دیا۔ حواس باختہ نوید نے ٹیکسی سے اتر کر سکھ کا سانس لیا۔ دل تو چاہ رہا تھا پہلے سجدہ شکر ادا کرے گیٹ پر ہی۔ زندہ بچ کر آنے پر مگر ٹیکسی ڈرائیور کی مہارت، عجلت اور حماقت کا خراج ادا کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ کرائے سے کچھ زیادہ رقم ادا کی۔ اور ابھی گیٹ کی جانب مڑا تھا کہ نہ وہاں۔۔۔ ٹیکسی رہی نہ اس کا نشان۔ گھر میں پاپا اکیلے تھے۔ پریشان اور غم زدہ۔ ان کی کہانی سنی۔ خانساماں صبح سویرے چھٹی لے کر چلی گئی۔ کھانا نصیب نہ ہوا۔ ناشتے میں توس اور چائے پی، کچھ دیر بعد بسکٹ کھائے۔ دن ٹی وی کے سامنے گزر گیا۔ اب۔۔۔ رات کے کھانے کی فکر تھی۔
"آپ فون کر دیتے۔ میں کل ہی آجاتا۔" جی بھر کر افسردہ ہوا۔
"کل کیسے فون کرتا۔ وہ گئی تو آج صبح ہے۔ منہ اندھیرے ہی۔۔۔"

بیگ کمرے میں رکھ کر کچن کی راہ لی۔ وہاں کی حالت۔۔۔ طوفان گزرنے کے بعد کی جیسی تھی۔ امی بھی ہمیشہ پاپا کے "مجبوراً" کچن کے چند منٹ دورے کے بعد واویلا کرتی تھیں۔
"ایک دفعہ آپ کچن کے راستے سے بھی گزرتے ہیں تو لگتا ہے طوفان گزر گیا۔ یا قیامت برپا ہوئی ہے۔ پیالی اِدھر، پلیٹ اُدھر۔ چمچہ یہاں، پرچ وہاں۔ برتن ایک جگہ رکھنے کی کوشش تو کیا کریں۔ پیالی کیا خود اڑ کر وہاں چلی گئی۔ پلیٹ میں پہیے لگ گئے۔ چمچے کے پیر نکل آئے۔ خدایا توبہ۔"
اب بھی وہی حال تھا۔ پہلے سب برتن سمیٹے چائے توس کے معصوم ناشتے نے خاصی ہڑبونگ مچائی تھی۔ نہ جانے کس افراتفری میں پاپا نے ناشتہ بنایا تھا۔ ہر طرف عجب کسمپرسی اور افراتفری تھی۔
تلاش کامیاب ہوئی۔ فریزر میں کباب مل گئے۔ فرائنگ پین کی تلاش بھی مشقت طلب تھی۔ ناکامی۔ توے سے ہی کام چلا لیا۔ تین انڈوں کے آملیٹ میں پیاز، ہرا دھنیا، ہری مرچ پنیر ڈال کر فرائی کیا۔ فون کر کے ڈبل روٹی منگوائی۔ ٹرے میں مکھن پنیر۔ آملیٹ اور کباب کا شاہانہ ڈنر لے کر کمرے میں قدم رکھے۔ پاپا مطمئن ہو کر سو چکے تھے۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ نوید کو بھی آرام کی ضرورت تھی۔ بارے خشک کھانسی نے پاپا کو بیدار کر دیا۔ کھانا اور آملیٹ کبابوں کی خوشبو! اور ڈٹ کر کھانا کھایا۔
"نوید! تم کھانا اچھا بنا لیتے ہو۔ کیا خیال ہے؟ اس خانساماں کی چھٹی نہ کر دی جائے؟"
"خیال اچھا ہے۔ مگر روزانہ آملیٹ کباب کھا کر آپ کا معدہ ڈسٹرب ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی مجھے کباب بنانے نہیں آتے۔"
"میں مدد کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ ویسے اب تو ٹی وی پر کھانا پکانا سکھایا جاتا ہے۔"
پاپا کی مدد۔۔۔ وحشت ناک تصور سے جھرجھری لے کر ٹی وی کی جانب نظر ڈالی۔ لیکن۔۔۔ صبر کے ساتھ ٹی وی پر کھانا پکاتے دیکھنا۔۔۔ ایک امتحان تھا۔



"پاپا! آپ امی کو بلوا لیں۔ کب تک رہیں گی وہاں؟" گھر کے سناٹے سے گھبراہٹ ہونے لگی۔
"دن بھر کرتا کیا رہا ہوں؟ جب بھی فون کیا۔ فہد سے یا جواد سے ہی بات ہوئی۔ سو رہی ہیں۔ شاپنگ کے لیے گئی ہیں یا کوئی ملنے والی آئی ہوئی ہیں۔ قسم کے جواب ہیں۔ تمہاری ماں بیٹی کے گھر جا کر مجھے تو بھول ہی گئی ہیں۔ انہیں گھر کا خیال ہے نہ گھر والے کا۔"
"آپ کی اجازت ہو تو اب کال ملاؤں؟"
"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" پاپا بے چین تھے۔ اس نے کال ملائی۔ احد نے فوراً اٹھایا تھا۔
"بیٹا احد! میں ماموں بول رہا ہوں آپ کا۔ نانی کو بلا دو۔ نانا بات کرنا چاہتے ہیں ان سے۔"
"ماموں! آپ السلام علیکم۔ کیوں آپ نانی سے بات کرتے شرماتے ہیں کیا؟"
"یار نانی کو بلاؤ۔ پاپا کو بات کرنی ہے۔"
"کہاں سے بلاؤں۔ میرا مطلب ہے بلاؤں۔ وہ تو ماما پاپا کے ساتھ پکچر دیکھنے گئی ہیں۔"
"دن میں پاپا نے فون کیا تھا۔ آپ نے انہیں بتایا نہیں۔" نوید کو جھنجلاہٹ ہونے لگی۔
"بتایا تھا ماموں۔ کہنے لگیں اب تو میں بہت تھک گئی ہوں۔ آرام کروں گی۔ کل کر لوں گی فون۔"
"کیا کر کے تھک گئی تھیں؟" نوید نے چونک کر کہا۔ امی تو تھکنے کے ذکر پر بہت ناراض ہوتی تھیں۔
"وہ۔۔۔ ماما نے ان سے کباب بنوائے تھے۔ دعوت کے لیے اور قورمہ پکوایا اور خوبانی کا میٹھا بنوایا۔"
نوید نے جھلا کر فون بند کر دیا۔ کباب، قورمہ اور خوبانی کا میٹھا۔ واہ بھئی بیٹی کی فرمائش کیسے رد کرتیں۔ ہونہہ تھک گئیں تو پکچر دیکھنے چلی گئیں۔ خوب چند منٹ بعد پھر کال ملائی۔ اب فہد تھا۔
"بیٹا لبنیٰ سے کہنا۔ یہاں پر خانساماں چھٹی پر چلی گئی ہے۔ بیمار شیمار ہے۔ اور پاپا نے سارا دن کچھ نہیں کھایا۔ رات کو میں نے آملیٹ بنایا تو ہم نے کھانا کھایا۔ سمجھاؤ گے؟"
"جی ماموں۔ اب آپ کل کیا بنائیں گے ماموں۔ مزیدار سی ڈش بنائیے گا۔" فون بند۔
"کیا ہوا؟" پاپا نے مایوسی سے پوچھا۔ سمجھ تو گئے تھے کہ بیگم نہیں ملیں۔ اب وہ کیا بتاتا کہ تھکن سے بے حال ہو کر پکچر دیکھنے گئیں۔ قورمہ، کباب جو بناتی رہیں دن بھر اور خوبانی کا میٹھا واہ۔ صبح کو انڈے توس کا ناشتہ کر کے دونوں اپنے آفس روانہ ہوئے۔ پاپا دو چھٹیاں کر چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

آفس سے آکر کھانے کی فکر ہوئی۔ پنڈی فون کیا۔ ایک اجنبی آواز آئی "ہیلو۔"
"آپ کون؟" شریر آواز کے جواب میں سوال کیا۔ کوئی منچلا کھلنڈرا تھا شاید۔
"میں تبریز۔۔۔" مزید شوخ ہو کر کہا۔ "آپ کی ماں کا بھائی ہوتا ہوں۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے۔"
"ارے آپ مجھے کیسے پہچانے۔ امی سے بات کرا دیں۔"
"کیوں۔ ان کے بھائی کی آواز پسند نہیں آئی کیا؟" مزید شوخی سے کہا گیا۔
"آئی۔ بہت پسند آئی۔ مگر آپ یقیناً" قورمہ، کباب بنانے کی ترکیب نہیں بتا سکیں گے اور مجھے فی الحال یہی مسئلہ درپیش ہے۔ بتا سکتے ہیں تو آپ ہی بتا دیں۔"
"تو اچھا بلاتا ہوں۔" غائب ہو گیا۔
امی نے بے چارگی کی داستان سنی۔
"تم ایبٹ آباد سے لاہور چلے گئے۔ یہاں نہیں آئے۔ تمہارے ماموں انتظار کرتے رہے۔"
شکووں کے بعد کباب بنانے، قورمہ پکانے کی جو ترکیب بتائی۔ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گردن پر ہاتھ پھیر کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچا۔ اب؟
"پاپا! رات کے کھانے کا کیا پروگرام ہے؟" آخر ان ہی سے رائے لی۔ وہ سر کھجانے لگے۔
"بیٹا جی! چلو چائنیز کھا لیتے ہیں۔" معقول مشورہ تھا۔ دونوں باہر جا کر چائنیز سے لطف اندوز ہو کر گھر

آئے۔ بیکری سے کیک پیٹیز بسکٹ ڈبل روٹی انڈے بھی لے آئے۔ دیر تک ٹی وی سے دل بہلایا۔ پھر جا کر سو گئے۔

صبح نوید نے ناشتہ بنایا۔ ناشتہ زبردست تھا۔ مگر کچن سمیٹنا!

رات میں نوید کے سونے کے بعد پاپا نے کافی بنائی تھی اور خوب نوید کی محنت پر پانی پھیرا تھا۔ جی بھر کر ہر سمت کوئی نہ کوئی برتن۔ صفائی کے کپڑے صابن اور اب ناشتے کے برتن دھونے میں کچھ وقت لگا۔ پھر کمرہ درست کرنا پڑا۔ امی نے بھی ایسی ملسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جو ان کے جاتے ہی اڑن چھو ہو گئیں۔ مگر بے چاریاں کتنا کام کرتی ہیں۔ محنتی۔۔۔ مشکل کام ہیں۔

دروازے پر گھنٹی۔۔۔ چلو اب یہ بھی کرنا ہو گا۔ پاپا لاؤنج میں ٹی وی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گیٹ کے باہر۔ ایک خوش شکل کھلنڈرا نوجوان کھڑا تھا۔ بے چین بولی۔ ایک پاؤں اٹھاتا۔ دوسرا رکھتا۔ کبھی اس پیر پر زور دیتا۔ کبھی دوسرے پر۔ بشاش اور چلبلا۔

نوید نے بغور جائزہ لیا۔ "تبریز؟؟"

"جی۔ السلام علیکم نوید بھائی۔ آپ نے پہچان لیا"، ایک پیر سے دوسرے پر زور دینے کا سلسلہ جاری تھا۔

"اچھا۔ اندر تو آؤ خیریت؟" اندر آتے ہوئے پوچھ لیا۔

"جی۔ سب خیریت۔۔۔ مجھے آفس کے کام سے لاہور آنا تھا۔ آپا نے کہا۔ کھانا لے جاؤ۔"

"کھانا؟" نوید کے کان کھڑے ہوئے۔ آج کل سوچ کے پرندے کھانے کے گرد ہی منڈلا رہے تھے۔

"جی کل ہی کچھ پکا کر فریز کر لیا تھا۔ آئس بکس میں اچھی طرح پیک کر کے آپا نے میرے حوالے کیا۔ دیکھ لیں۔ اس کھانے کی خاطر ہی اسلام آباد سے صبح ہی جہاز کی رفتار سے اڑتا ہوا آیا ہوں۔ سنبھال لیں۔ چار دن چل جائے گا۔ پھر آپ کی خانساماں آ ہی جائے گی۔"

"نہیں آئے گی۔ امی کے آنے کے بعد آئے گی۔ خیر تم بیٹھو چائے لاتا ہوں۔"

"مجھے اجازت دیں۔ آفس کا کام ہے۔ آپ کو بھی آفس جانا ہو گا۔"

نوید نے پاپا کو کھانے کی خوش خبری سنائی اور ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر سکون سے خبریں دیکھیں۔ ماہی کو شکریہ کا فون کیا۔ دو دن بخوبی وہ کھانا چلا۔ ابھی کچھ باقی تھا کہ امی آ گئیں۔ ان کے آتے ہی چیخ پکار شروع ہو گئی۔ نوید کی شامت۔

"یہ گھر ہے؟ یا کباڑ خانہ۔ کیا حال بنا رکھا ہے۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں۔ اتنی بے ترتیبی اور یہ اتنا سامان آخر آیا کہاں سے۔ جو ہر طرف بکھرا پڑا ہے۔ ہر کرسی کی پشت سے تولیہ جھاڑن لٹک رہا ہے۔ کرسیوں تک پر پلیٹیں رکھی ہیں۔ غضب خدا کا جوان لڑکا اتنا لاپروا اور یہ ایش ٹرے صوفے پر کیا کر رہی ہے۔ کیا سگریٹ شروع کر دی تم نے؟؟"

امی کو خبر نہ تھی۔ ان کی غیر موجودگی میں پاپا سگریٹ کا شوق بھی پورا کرتے ہیں۔ نوید لاکھ گھر سنوارے بکھرا ہوا ہی نظر آتا۔ پھر خانساماں رکھا گیا۔ ماسی آنے لگی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ مگر امی کا غصہ برقرار تھا۔ ہدف نوید بنا ہوا تھا پاپا نے کہا۔

"نوید! تمہاری ماں کا غصہ کچھ بڑھ نہیں گیا۔"

"پاپا آپ بھول رہے ہیں۔ امی جب بھی دو بجی یا جدے سے آتی ہیں۔ غصے میں رہتی ہیں۔"

"اور اب تو انہیں کینیڈا جانے کی دھن ہے۔ نوشی کا تو آنے کا امکان نہیں۔ اس لیے۔۔۔ کیسے انہیں باز رکھا جائے۔ یار! اتنا خرچا کیسے۔۔۔ میں تو مجبوراً" سروس کر رہا ہوں۔ دل بہلانے کو۔ بینک خالی ہو گیا تو! ابھی تو چلو کچھ رقم ہے۔ مگر کینیڈا جانے کا خرچا تو بہت ہو گا۔"

"آپ آپا کو سمجھائیں۔ امی ان کی مانتی ہیں۔ نوشی کو ہی بلوا لیں۔" آہستہ آواز میں نوید نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ بیٹا بیٹی فرماں بردار ہوتے ہیں۔ ہماری بیگم بیٹیوں کی فرماں بردار اطاعت گزار ہیں۔"

حسب توقع امی نے اندر سے ہی کہا۔ "ہاں۔ آپ کی فرماں برداری تو کر نہیں سکی۔ اب بیٹی کی بھی نہ کروں۔"

"بڑے تیز کان ہیں۔" پاپا نے آنکھیں گھمائیں۔ نوید نے باہر نکل جانا بہتر سمجھا۔

☼ ☼ ☼

امی واقعی نوشی سے ملنے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ نوید ان کی اسکائپ پر نوشی سے بات کرا دیتا۔ وہ دیکھ لینے بات کرنے کے باوجود کینیڈا جانے کے لیے بے چین تھیں اور نوید کو ان کے جانے کے بعد۔ گھر پاپا اور وہ۔۔۔ کیا صورت ہو گی۔ کاش نوشی خود آ جائے۔

نہ جانے کس لمحے کی دعا تھی کہ اچانک ہی پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ امی نے فوراً" سب کو اطلاع دی۔ بہنوں بہنیں فوراً" آ گئیں۔ نوید کی راتیں ہسپتال میں گزرتیں۔

صبح آپا ہسپتال آتیں تو نوید گھر آ کر آفس کے لیے تیار ہوتا۔ ایسی افراتفری سی تھی کہ نہ صبح ناشتے کا موقع ملتا۔ نہ رات کو ہاسپٹل جانے سے پہلے کھانا تیار ہوتا۔ رات کی بے آرامی۔ نیند کی کمی۔ آفس میں بھی کام زیادہ تھا۔

پاپا کی زندگی اور صحت کے لیے گھر میں دعائیں ہو رہی تھیں۔ نوید بھی رات بھر دعائیں کرتا۔ پاپا کی ذات نوید کے لیے بہت اہم تھی۔ وہ اس کے لیے مشعل راہ تھے۔ وہی تو اس کے سب سے زیادہ ہمدرد تھے۔ سچی محبت کرتے تھے۔ بے تکلف دوست تھے۔ انہیں بے حس حرکت لیٹے دیکھنا بھی اذیت کا سبب تھا۔

نوید جب بھی شیشے سے جھانکتا رونا آ جاتا۔

پھر پاپا کومے میں چلے گئے۔ ایک اور اذیت۔ نوید پاگلوں کی طرح ڈاکٹروں کے تعاقب میں پھرتا۔ کوئی ڈاکٹر تو پاپا کی صحت کی امید بن جائے۔ ماموں آ گئے۔ نوید کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

"آپا! نوید کو کیا ہو گیا ہے۔ اس قدر نحیف ہو گیا ہے۔ مجھے تو یہ خود بیمار لگ رہا ہے۔"

انہوں نے دو دن میں ہی اس کا سبب تلاش کر لیا۔ باپ کی پریشانی۔ نیند کی کمی۔۔۔ بے آرامی۔ کھانے پینے کا وقت نہ تھا۔ غذا کی کمی۔ آفس میں کام کی زیادتی، تھکاوٹ امی سے انہوں نے شکوہ کیا۔

"تو کیا کروں میں؟ اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔ کون ہسپتال کی ڈیوٹی کرے گا۔ لڑکیاں باری باری دن میں چلی جاتی ہیں۔ باپ کی خدمت یہ نہیں کرے گا تو کیا پڑوسی کریں گے۔"

"چلیے۔ اب میں آ گیا ہوں۔ رات کی ڈیوٹی میں کر لوں گا۔ مجھے آفس تو جانا نہیں ہے۔ نوید کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے کھانے کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے۔ رات کو ہاسپٹل بغیر کھائے چلا جاتا ہے۔ وہاں جاگے بیٹھا رہتا ہے۔ پوری رات جاگنا پڑتا ہے۔ صبح آفس جاتے وقت ناشتہ بھی نہیں کرتا۔ تم لوگ اسے ناشتہ تو بنا کر دے سکتی ہو روحانہ! اتنی لاپروائی۔"

انہیں بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ چند دن میں ہی وہ سوکھ کر پنجر بن گیا۔ کسی نے توجہ نہ کی۔ ماں نے نہ بہنوں نے۔ باپ کی پریشانی، بے آرامی اور ہسپتال جانے کے وقت کھانا ہی تیار نہ ہوا ہوتا۔ آفس جانے کی جلدی میں ناشتہ بھی ندارد۔ ماموں نے توجہ دلائی۔

"وہ مہمان تو نہیں ہے۔ ماموں! مہمان تو ہم ہیں۔" بہنیں برا مان گئیں۔

"اگر رات سے پہلے کھانا بن جائے۔ تو وہ کھا کر جائے۔ صبح ناشتہ جلدی بن جائے تو ناشتہ بھی کر لے۔ اب تم جو دس گیارہ بجے دن میں سو کر اٹھو گی۔ تو دیر میں ناشتہ کرو گی۔ اسے تو صبح آفس جانا ہوتا ہے۔ تم لوگ خانساماں سے کہو اسے ناشتہ سویرے دیا کرے۔ کیسی بہنیں ہو تم۔ پریشان حال بھائی کی ذرا بھی فکر نہیں۔" ماموں شدید ناراض۔

"ہم بھی ہسپتال سے تھک کر آتے ہیں۔"

"اچھا؟" ماموں طنزاً" مسکرائے۔ "دو گھنٹے کے لیے باری باری جاتی ہو۔ نوید تو بارہ چودہ گھنٹے وہیں گزارتا ہے۔ کچھ احساس ہے تمہیں۔"

ماموں نے ہسپتال کی ڈیوٹی لے لی۔ وہ کھانا سر شام تیار کروا کر نوید کے ساتھ کھاتے۔ صبح ہاسپٹل سے آ کر

نوید کو اپنی نگرانی میں ناشتہ کراتے۔ نوید آفس سے واپسی میں ہسپتال چلا جاتا یا جب بھی موقع ملتا۔

☼ ☼ ☼

مگر چار دن ہی یہ انتظام ہوا۔

پاپا ایمبولینس میں گھر لائے گئے۔ اتنی ہی سانسیں تھیں۔ خالہ جان، خالو جان اور مامی بھی آگئیں۔ تبریز بھی آیا تھا۔ نوید کو اس سے بڑی مدد ملی۔

مامی اور تبریز دو دن رکے پھر چلے گئے۔ خالو جان بھی چلے گئے۔ امی پر ظاہر ہے بہت اثر تھا۔ خالہ جان اور ماموں ان کی دل دہی کرتے۔ خالہ جان کی کوشش ہوتی کہ ماموں کا سامنا نہ ہو۔ مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ ایک ہفتہ ٹھہر کر وہ چلی گئیں۔ نانی اماں آنہ سکیں۔ ماموں امی کا خیال رکھتے۔ دوائیں۔ کھانا پینا۔ تسلیاں۔

آفس کے لوگ بھی باری باری افسوس کے لیے آئے۔ مگر ثوبیہ سب کے ساتھ نہیں آسکی۔ اس کے والد بیمار تھے۔ وہ بعد میں آئی۔ ثوبیہ آفس میں اسٹینو گرافر تھی۔ بہت پرانی نہیں تھی۔ مگر اس کی صلاحیت کے سب معترف تھے۔ غضب کی محنتی۔ کارگزار اور ہمدرد تھی۔ صاف دل اور سچی کھری۔ اس نے کم عرصے میں بہت سے کام کر ڈالے۔ کسی کو خالی بیٹھے دیکھنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ ہر کسی کو ٹوک دیتی۔

"سر....! راشد صاحب کو کچن کا انتظام دے دیں۔ انہیں چائے پینے اور دوسروں کو پلانے کی عادت ہے۔ خود بھی منگواتے رہتے ہیں اور جہاں جس کے پاس کام سے جاتے ہیں۔ ان کے لیے ابھی منگواتے ہیں۔"

"سر! اکبر علی صاحب کو رات میں ڈیوٹی دینی چاہیے۔ دن کو تو انہیں نیند آرہی ہوتی ہے۔"

وہ ہر ورکر کی فطرت پہچان گئی تھی۔ اب لوگ اس سے خائف رہتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کام بھی ہونے لگا۔ بے ترتیبی نہیں رہی۔ نوید کو اس لڑکی کی محنت اور فرض کی ادائیگی نے بہت متاثر کیا۔ خوش شکل تھی اور بااخلاق بھی۔ چونکہ صبح کا وقت تھا۔ نوید آفس جانے کے لیے نکل رہا تھا کہ وہ آگئی۔ اخلاقاً" وہ رکا۔ چند منٹ بعد ثوبیہ آفس جانے کے لیے اٹھی۔ تو نوید نے اسے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ چونکہ اس کے والد بیمار تھے۔ اسے آفس سے سیدھا گھر جانا ہوتا تھا۔ اس لیے اسے صبح ہی آنا پڑا۔ وہ آفس سے آیا تو امی اور بجنیں کچہری لگائے بیٹھی تھیں۔

نوید کو حیرت ہوئی۔ ثوبیہ ایک شریف اور نیک سرشت لڑکی تھی۔ شریف خاندان کی بیٹی کے لیے غلط قسم کے الفاظ سننے گوارا نہ ہوئے۔ وضاحت کرنا مشکل ہو گیا۔ ایک بار ذہن میں خیال آیا تھا کہ اسے ایسی ہی ہمدرد، غم گسار اور رازدار دوست کی ضرورت ہے۔ مگر وہ اس پسند کو انتہا تک نہ لا سکا۔ پاپا کو رازدار بنا کر مشورہ کرنے کا ارادہ ضرور کیا۔ مگر پھر سوچا۔ جلدی کیا ہے۔ لیکن اب بات بگڑ گئی تھی۔ بغیر کسی بنیاد کے۔

امی کو لڑکی چال باز نظر آئی۔ بہنوں کو چلتر، موقع پرست۔ صفائی دینے کی کوشش کی، کسی نے یقین نہ کیا۔ وہ اسے کسی شریف خاندان کی لڑکی ماننے پر تیار نہ تھیں۔ بات بڑھ جانے کے خیال سے نوید نے چپ سادھ لی۔ خواہ مخواہ ایک شریف، پاک دامن لڑکی کی عزت پر رکیک حملے۔ پہلے بھی اس کا کوئی رازدار نہ تھا گھر میں نہ باہر اب وہ تنہا تھا۔

دن میں کئی بار امی نوید کو گھٹیا ذہنیت کے طعنے دیتیں۔ جو اس فقیر خاندان کی غریب غربا لڑکی کو ان کے اعلا ارفع خاندان اور شان دار محل جیسے گھر میں لانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ اس معصوم لڑکی سے دل میں ہی معافی طلب کرتا۔ جسے چند منٹوں کی تعزیت کے جرم میں نہ جانے کیا کیا بنایا جا رہا تھا۔ ماموں بھی جا چکے تھے۔ ورنہ وہ کچھ تو کرتے۔ کم از کم نوید کی حمایت۔ اب وہ ثوبیہ کے لیے کسی بہت اچھے لڑکے سے شادی کی دعا کرتا۔

☼ ☼ ☼

ایک دن تبریز کا فون آیا۔ خیریت کے لیے کر لیتا تھا کبھی کبھار۔ وہ نوید سے متاثر ہوا تھا نوید کو تبریز اچھا لگا تھا ذہن میں کرن چمکی۔ واہ۔ تبریز۔ آفس کی طرف سے پانچ لوگوں کو اسلام آباد بھیجا جا رہا تھا۔ ہوٹل میں قیام کا انتظام تھا۔ ثمینہ کی خالہ اسلام آباد میں تھیں۔ اس لیے اسے تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مگر ثوبیہ۔ وہ بھی ہوٹل کے قیام کے خلاف تھی۔ نوید کو علم ہوا۔ اس نے ماموں کو فون کیا۔ کیا وہ ایک لڑکی کو اپنے گھر میں قیام کی اجازت دے سکتے ہیں؟ ماموں اور نوید کی کسی خواہش کو رد کریں۔ بخوشی اقرار کر لیا۔ بلکہ ثوبیہ سے فون پر بات کر کے اسے تسلی دی۔ ثوبیہ کو بھی نوید پر اعتماد تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ ماموں، مامی خود لے اسٹاپ سے گھر لے گئے اور باقاعدگی سے اسے لاتا لے جانا کرتے رہے۔ جب اسلام آباد سے واپس آکر ثوبیہ نے نوید کا شکریہ ادا کیا۔ نوید کو بہت خوشی ہوئی۔ ادھر ماموں مامی بھی اس بچی سے متاثر ہو گئے۔ نوید نے ماموں کو بتایا۔

"بہت اچھے خاندان کی لڑکی ہے۔ ماموں! کیا یہ تبریز کے لیے مناسب ہو گی؟ آپ مامی سے بات کریں۔"

ماموں کو تجویز پسند آگئی۔ اتفاق سے تبریز بھی ایک دن کے لیے ہری پور سے آگیا تھا۔ اس نے بھی ثوبیہ کو دیکھ لیا تھا۔ نوید کی پر خلوص کوشش کامیاب رہی۔ ادھر گھر میں کوئی اور ڈراما چل رہا تھا۔

اس دن نوید ایک خوش خبری لے کر گھر آیا تھا۔ بے تابی سے گھر میں گھسا۔ ڈرائنگ روم میں امی کسی مہمان کے ساتھ موجود تھیں۔ آپا اور اپیا بھی تھیں۔ سلام کر کے اپنے کمرے میں جانے لگا۔ امی نے تعارف کرایا۔

"نوید! یہ وکیل ارشد چودھری ہیں۔" وہ چند منٹ بیٹھا۔ انہوں نے پاپا کی تعزیت کی۔

نوید معذرت کر کے اپنے کمرے میں آگیا۔ نوشی فون پر مصروف تھی ورنہ اسے ہی خوش خبری سناتا۔

آفس والوں نے اسے اسلام آباد کے مرکزی آفس میں ٹرانسفر کر دیا تھا مع گھر گاڑی کی سہولت بھی۔

نوید کو اپنی محنت کا صلہ مل رہا تھا۔ خوشی نے انگ انگ میں روشنی سی بھر دی۔ "امی کو ساتھ لے جاؤں گا ماموں بھی وہاں ہیں۔ نانی اماں بھی آسکتی ہیں۔ واہ، یہ تو اللہ کی طرف سے اشارہ ہوا ہے۔" وہاں سے آکر اتنی پریشانی میں وقت گزرا کہ کچھ یاد ہی نہ آیا۔ دل اتنا خوش مطمئن تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی نیند آگئی۔ گہری نیند۔

رات میں آنکھ کھلی۔ سب کھانا کھا چکے تھے۔ امی سو چکی تھیں۔ اور آپا، اپیا اور نوشی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی سے دل بہلانے کی کوشش کی پھر بور ہو کر کمرہ سنبھال لیا۔ صبح سب سوئے ہوئے تھے۔ نوید دل پر بوجھ لیے آفس کے لیے روانہ ہوا۔

آفس کے لوگ ٹریٹ مانگ رہے تھے۔ کسی نے وکیل ارشد علی کی آمد کی خبر دی۔

وکیل صاحب کاغذات کا پلندہ ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے جو سنایا۔ جو دکھایا۔ ہوش گم ہونے لگے۔ کیا؟ کیوں؟

قیامت اتنی وحشت ناک ہوتی ہو گی۔ ایسا بھلا کیسے۔ کیونکر ممکن ہے۔ امی نے کس جرم کی سزا دی تھی۔

پاپا کی بنائی وسیع و عریض کوٹھی تینوں بیٹیوں کے نام کر دی گئی۔ چوتھا حصہ خود امی کے نام تھا۔ نوید کا اس جائداد میں۔ کوئی نام نہ تھا۔ جہاں پاپا، پوتے پوتیوں کو کھیلتا کودتا پھاندتا دیکھنا چاہتے تھے۔ پوتوں کے لیے خوب صورت پرندے، پوتیوں کے لیے.... بلی لا کر رکھی تھی۔

"دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔" پاپا کہتے تھے۔ "دیکھنا چند سال بعد نوید کے بچے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے ہوں گے۔"

امی معترض تھیں۔ "کیا جلدی ہے آپ کو۔ کون خیال رکھے گا ان پرندوں کی کامریں گے بچارے۔"

"نوکر کس لیے ہیں۔ نوید بھی ہے اور میں جو ہوں ۔۔۔"

امی کیا سب کچھ بھول گئیں؟ آخر یہ کیسا انصاف ہے؟ کس خطا کے بدلے میں نوید کو بے دخل کیا گیا۔

وہ سر تھام کر بیٹھا رہا۔
کیا میں لے پالک ہوں۔ کیا امی میری ماں نہیں؟ آخر راز کیا ہے؟ گھر فون کیا۔ خاموشی۔ وکیل صاحب تو اس فیصلے کی توثیق کے لیے آئے تھے۔ کہ نوید کو اس فیصلے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟
"اگر آپ چاہیں تو کورٹ میں اپیل کر سکتے ہیں۔ اپنے حق کے لیے۔"
وکیل کے جانے کے بعد نوید گھر آگیا۔ بھرے دل بھری آنکھوں کے ساتھ۔ ڈرائنگ روم میں امی بیٹیوں کے ساتھ کانفرنس میں منہمک تھیں۔ اجازت لے کر اندر آیا۔ انہیں وکیل کی آمد کا بتایا۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ نوید کنپٹی پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھا۔
"آپا پلیز۔ مجھے امی سے بات کرنے دیں۔"
امی چپ تھیں۔ تینوں پھر ساتھ بولنے لگیں۔ "تم یہ کرو گے۔ تم وہ کرو گے۔ ہمارے باپ کی جائیداد اس دو ٹکے کی لڑکی کے حوالے کر کے ہمیں بے دخل کر دو گے۔ تم نے آج تک کیا ہی کیا ہے۔ ہمیں دیا ہی کیا ہے وغیرہ۔"
دل چاہا جواب دے۔ میں آپ جیسا گھٹیا نہیں ہوں۔ حق غصب کرنے والا مگر بولا تو الفاظ دیگر تھے۔
"امی! آپ صرف اتنا مجھے بتا دیں۔ کیا میں آپ کی اولاد نہیں؟"
امی چپ۔
"تم ناخلف، نالائق ایسی اولاد جس سے ماں کو شرم آئے بیٹا کہتے ہوئے۔" بڑی آپا چیخیں۔
"کیا کر دیا ہے آخر میں نے؟ بتائیں تو سہی کون سی نافرمانی، نالائقی۔" دل بھر آیا۔ آنکھیں چھلک گئیں۔
"وہ کیا ہے۔ جو باپ کے مرنے کا باعث ہوا۔ ارے تم نے بتا دیا ہو گا پاپا کو۔ اس لڑکی سے ملوا دیا ہو گا وہ برداشت نہ کر سکے۔ دل پہ لے لیا۔ قاتل ہو تم۔ پھر کہتے ہو کیا کیا؟" یہ نیا الزام۔
روحانہ بھی ثوبیہ کو گالیاں دینے لگی۔
"آپا پلیز! بہتان تراشی بہت بڑا گناہ ہے۔"

امی کی خاموشی کتنی تیز تھی۔ وہ مزید کچھ سنے بغیر کمرے میں آگیا۔ اب وہ اس گھر کے لیے اجنبی تھا۔ پرایا تھا۔ شاید یہاں رہنے کا حق بھی نہ رکھتا تھا۔ ذرا سی بے بنیاد بات کو کس طرح استعمال کیا تھا انہوں نے۔ وہ سوال کرتیں۔ وہ بتاتا ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ ان لوگوں سے ملتے نہیں۔ اپنی سسرال سمجھ کر نہیں۔ امی سے تعزیت کے لیے آئی تھی۔ مگر۔۔۔ یقین کون کرتا اور اگر ایسا ہوتا۔ تب بھی۔ امی کی پسند تو لازمی ہوتی۔ اگر دل میں پسند کا جذبہ تھا۔ تو بھی ضروری نہ تھا کہ وہ ثوبیہ سے شادی کرتا۔ امی اور بہنوں کی مرضی کے بغیر۔ ناممکن۔ اس بات پر اتنا بڑا ظالمانہ فیصلہ کیا۔ ماما محبتیں ختم ہو گئی ہیں۔ جائیداد کے لالچ نے خون سفید کر دیا۔ وہ اگر چاہتیں۔ نوید خود انہیں گھر دے دیتا۔ اپنا حصہ رکھ کر۔ وہ اس گھر کو پاپا کی نشانی سمجھتا تھا۔ یوں بھی دو سال پہلے پاپا نے۔۔۔ اوہ، پاپا کو یقیناً کوئی اشارہ ملا تھا۔ کوئی خدشہ انہوں نے ایک بار اس شبہ کا اظہار کیا تھا۔ ایک داماد، امی کا بھتیجا تھا۔ مگر دو تو غیر تھے۔ لالچی اور خود غرض۔ لیکن نوید نے پاپا کے شبہ کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ مگر پاپا دو کروڑ روپیہ نوید کے اکاؤنٹ میں جمع کروا رہے تھے۔
"یہ میری اپنی ذاتی کمائی ہے۔ دوسرے بینک میں تھی۔ میں اپنا اکاؤنٹ بند کر رہا ہوں۔ اس لیے بہتر سمجھا کہ تم کو دے دوں۔"
"لیکن پاپا! امی کو معلوم ہوا تو۔۔۔ وہ مجھ سے یوں بھی خفا ہیں اور پھر ان کی حق تلفی۔۔۔"
"نہیں، ظلم نہیں ہو سکتا۔ ان کی حق تلفی بھی نہیں ہو گی۔ سب کے حصے کی رقم تمہاری ماں کے اکاؤنٹ میں جمع ہے۔ انہیں بتا دیا ہے۔ کہ گھر تمہارا ہے۔ اس رقم سے تم کاروبار کر لینا۔ پلاٹ لے لینا۔ یا جو چاہو گھر بنا لینا۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"
"پاپا! اتنی بڑی کوٹھی کے ہوتے ہوئے؟" نوید کو ہنسی آگئی۔
"بیٹا جی! وقت کا کچھ پتا نہیں۔ مگر بھی۔۔۔ دیکھو۔"



"کچھ سوچنے لگے۔ آج پاپا کے خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ کئی دن عجب بے چینی میں گزرے۔ پھر وکیل صاحب کا فون آگیا۔
"آپ اپیل کریں گے؟"
نوید خاموش رہا۔
"اچھا تو اپنے کسی عزیز کا نمبر دے دیں۔" نوید نے ماموں کا نمبر دے دیا۔
گھر اب اجنبی لگتا۔ بلکہ اپنا وجود وہاں غیر ضروری لگتا۔ کب کوئی گھر سے نکلنے کا حکم سنا دے۔ وہ مالک لوگ ہیں۔ میں کچھ نہیں ہوں۔

☼ ☼ ☼

ماموں کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔
"ماموں! آپ۔" دوڑ کر ان سے لپٹنے کو بڑھا۔ مگر سب کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ کوئی تلخ گفتگو ہو چکی تھی شاید۔
"تمہارے ساتھ زیادتی ہو۔ حق تلفی ہو۔ میں خاموش رہ سکتا ہوں بھلا۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم نے کچھ نہیں بتایا۔ وکیل ارشد علی کا فون آیا تھا۔ قانونی تقاضے پورے کرتا ہیں انہیں مگر۔۔۔ میں نے ان کی غلط فہمی دور کر دی کہ۔۔۔ تم ان بہنوں کے بھائی نہیں۔ وہ وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ ملکی اور شرعی قانون کے مطابق تو تم مالک ہو۔ جبکہ یہ تو صرف حصے دار۔
وہ وضاحت چاہتے تھے کہ آخر کس وجہ سے تمہیں جائز حق سے محروم کیا گیا ہے۔ میں نے بتا دیا۔ کبھی بھائی خود غرض اور غاصب ہوتے ہیں۔ تو کبھی بہنیں۔ ان کا کہنا تھا مگر یہاں تو نہیں ہوتی۔ تو کوئی وجہ تو ہے جو ماں اس فیصلے پر مصر ہیں۔ وہ تو یہی کہتے رہے کہ قانوناً لے پالک وارث نہیں ہوتا۔ یا بیوی کے پہلے شوہر کی اولاد۔۔۔ میں نے کہا۔ آپ یہی سمجھ لیں۔ مگر میرا جواب انہیں مطمئن نہیں کر سکا۔ اس لیے وہ اپنی ذمہ داری سے معذوری ظاہر کر کے چلے گئے ہیں۔ مگر میں نے کہہ دیا ہے اگر آپا اپنے اس فیصلے پر قائم رہیں۔ میں اپیل کا حق رکھتا ہوں۔" ماموں یقیناً "جنگ لڑنے" آئے تھے۔ وہ رنجیدہ ہو گیا۔
"ماموں! رہنے دیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ میں آپ کو اپنے لیے کسی سے لڑنے نہیں دوں گا۔" کہہ کر اپنے کمرے کی راہ لی۔
وکیل صاحب نے ماموں کو کس الجھن میں ڈال دیا تھا۔ انہیں اپنے اسلام آباد ٹرانسفر کا بھی نہیں بتایا۔ کچھ خوش ہو جاتے۔ رات کو نوشی کھانے کے لیے بلانے آئی۔ چلو ماموں کی ڈانٹ ڈپٹ کا کچھ اثر ہوا۔ یا پھر ان کی موجودگی میں محض دکھلاوا کرنا مقصود ہو۔ میز کے گرد سب ہی بیٹھے تھے ماموں کے سوا۔
"وہ چلے گئے!" حیرت اور تاسف۔ "بغیر کچھ کہے، بغیر بتائے۔" کھانے سے جی اچاٹ ہو گیا۔ بغیر کچھ کھائے اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ امی کے ہاتھ کا لقمہ پلیٹ میں گر گیا۔
"امی! آپ کھائیں۔ آفس میں کھا لیتا ہوں گا۔ کون بھوکا رہ سکتا ہے بھلا۔"
بڑی بیٹی نے دل دہی کی۔ وہ جو ایک خیال دکھ کا تھا کہ صبح سے نہ جانے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔ کئی دن سے یونہی بے دلی سے ناشتہ کر کے جا رہا تھا۔ وہ بیٹی نے ہوا میں اڑا دیا۔ وہ لوگ ماموں پر غصہ کر رہی تھیں جو سپریم کورٹ تک جانے کا کہہ رہے تھے۔
"واہ بھئی ہماری مرضی۔ یہ کون ہوتے ہیں ہمارے خلاف مقدمہ کرنے والے۔"
نوید کو ماموں کے جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں، بہن بھائی میں کیا مذاکرات ہوئے ہوں گے۔ کچھ بتایا نہیں۔
کئی دن ہو گئے۔ ماموں سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اب کچھ تبدیلی تو آئی تھی۔ امی کھانے کا پوچھ لیتیں۔ بڑی آپا کچھ لیے دیے رہتیں۔ چھوٹی دونوں مخاطب ہوتیں، مذاق بھی کر لیتیں۔
نوید بھی سب رنجش بھلا کر ان کے ساتھ تعلق اعتدال پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب وکیل ارشد علی کی جگہ دوسرے وکیل کی خدمات حاصل کی گئیں اور سب کچھ طے ہو گیا۔ نہ نوید نے خود پوچھا نہ کسی

نے بتانے کی زحمت کی۔

☆ ☆ ☆

ابھی تک نوید نے امی کو اسلام آباد ٹرانسفر اور ترقی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ کچھ ایسی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی ذہنوں میں۔ دل کی بات کرنے میں تکلف ہو گا۔ اب آفس والے اس کو چارج لینے پر اصرار کر رہے تھے۔ اس نے دو دن کی مہلت مانگی۔ آخر امی سے کس طرح بات کرے۔ ان کو یہاں چھوڑ کر جانے کا دل نہیں چاہتا تھا۔ آخر بہنیں اپنے اپنے گھر چلی ہی جائیں گی۔ امی اکیلی تو رہ نہیں سکتیں۔ یوں بھی سب عورتیں۔ بغیر کسی ذمہ دار مرد کے۔ خانساماں تو یوں بھی کمزور سا تھا۔

دل میں آیا۔ ٹرانسفر سے انکار کر دے۔ شاید امی کو گھر چھوڑنا گوارا نہ ہو۔ دو دن کی مہلت لی۔ ترقی کو لات مارنے کا مطلب تھا رزق سے انکار۔ اب جبکہ گھر اپنا نہیں کل کوئی کہہ دے ہمارا گھر خالی کر دو۔ پھر کہاں ٹھکانہ ہو گا۔ جانا تو ہو گا۔ گھر آ کر دیکھا۔ آپا کے تینوں بچے لان میں کھیلتے ملے۔ دوڑ کر آ کے لپٹ گئے۔

"ماموں! ہم تینوں اکیلے آ گئے۔ جہاز پر۔" بچوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

"ارے بھئی واہ! تم تینوں اکیلے آ گئے۔" اس نے تینوں کو لپٹا لیا۔ امی بھی خوش تھیں۔ چلو ٹینشن میں کمی ہوئی۔ اب بتانا چاہیے۔

بچوں نے ہی خبر دی کہ رات کی فلائٹ سے جدہ سے راحم، صارم اور ولید بھی آ رہا ہے۔ "ماموں، ہم سب یہاں اسکول میں داخلہ لیں گے۔" "او تو یہ سلسلہ ہے۔"

رات کو رومانہ آپا کے بچے بھی اکیلے آ گئے جہاز پر۔ نوشی کچھ اداس تھی۔

نوید نے کہا "نوشی! تم چپ چپ کیوں ہو!"

"نہیں میں تو..... یہ بچے شور کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ کو لگا ہو گا۔"

"بھئی۔ گم صم سی ہو۔ تم بھی اپنے شہزادے کو بلا لو۔ ہم نے تو دیکھا بھی نہیں۔ بس اسکائپ پر دیکھا تھا۔"

"ہاں۔ سوچ رہی ہوں۔ مگر وہ اپنے ابا سے بہت اٹیچ ہے۔" وہ اب بھی گم صم سی تھی۔

صبح وہ آفس گیا۔ گھر والے سب سو رہے تھے۔ آفس میں اشاروں کنایوں سے ان کے ارادوں کا پوچھا گیا۔

"کل بتاؤں گا۔" مسکراتے ہوئے ٹال دیا۔

شام کو گھر آ کر دیکھا۔ بچے لان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اندھا دھند بھاگ دوڑ۔ کیاریوں میں نئی پنیری لگی تھی اور بعض میں پھول لہلہا رہے تھے۔ کئی پودے زمین بوس ہو گئے تھے۔ رک کر کہا۔

"بیٹا! کھیلو ضرور مگر کیاریوں کا خیال کرو۔ پودے گر کر ٹوٹ رہے ہیں۔ پھول خراب ہو رہے ہیں۔ بے چارے مالی بابا کی محنت۔ سر پکڑ کر رہ جائیں گے بے چارے۔ ایسا کرو، ساتھ والے دوسرے لان میں کھیل لو۔ وہاں کیاریاں نہیں ہیں۔ سو رخت ہیں۔"

"ہم تو وہیں کھیل رہے تھے۔" احد نے بتایا۔ "مگر خالہ نے کہا۔ یہ میری زمین ہے میرا لان ہے۔ میں یہاں کینو کا باغ لگاؤں گی۔ تم اپنے والے لان میں کھیلو۔"

نوید کو ہنسی آ گئی۔ "میرا اور تیرا اولہ بھی۔"

"بیٹا! ابھی باغ لگا تو نہیں۔ جب پودے لگیں گے تو احتیاط کر لینا۔"

بڑی آپا کا بڑا بیٹا لپک کر آگے آیا۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے۔ ہمارا گھر ہے۔ جہاں چاہیں کھیلیں۔"

نوید حیرت زدہ ہو گیا۔ "بیٹا! پھول اچھے لگتے ہیں۔ پاپا نے بڑے شوق سے لگوائے ہیں۔"

کہہ کر مڑ کر اندر آنے لگا۔ پیچھے کسی آواز پر گھوم کر دیکھا۔ بڑی آپا کا بیٹا اپنے بیٹ سے پودوں کو کچل رہا تھا۔ عجیب منظر تھا۔ کمرے کی کھڑکی میں امی اور آپا نظر آئیں۔ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ کمزوری سے پیر تھر تھرانے لگے۔

"یہ کیا ہو رہا تھا۔ یہ بچے ۔۔۔ ہیں یا۔۔۔" رات کو امی نظر آئیں تو کہہ دیا۔

"امی! آپ نے بچوں کو منع نہیں کیا پودے اکھاڑنے سے۔ ابی کتنا رنجیدہ ہو گا۔"

امی نے پرسکون آواز میں کہا۔ "کیا فائدہ۔ ان کی ماں ہی منع نہیں کرتی۔ تم نے منع کر کے دیکھ لیا۔ اب نہ کچھ کہنا۔"

وہ انہیں خاموشی سے تسبیح کے دانے گراتا دیکھتا رہا۔ کچھ اداس تھیں نوید سے بولا نہیں گیا۔ فائدہ اور نقصان۔ امی کو کیا فائدہ نظر آ رہا تھا۔

کھانا خاموشی میں کھایا گیا۔ نوشی اداس نظر آ رہی تھی۔ صبح آفس جاتے وقت گیٹ کی طرف جاتے جاتے رک کر دیکھا۔ رنگین مچھلیوں کے حوض کی منڈیر پر بڑی آپا کے دو بیٹے کلہاڑی اور ہتھوڑی سے ضربیں لگا رہے تھے۔ رنگین مچھلیاں، ننھی منی مچھلیاں پاپا نے کس شوق سے منگوائی تھیں۔ امی خود ان مچھلیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں پاپا یا نوید دیکھ بھال کر لیتے۔

"کیا کر رہے ہو بیٹا۔ سیمنٹ اندر گرا تو مچھلیاں مر جائیں گی۔ پاپا نے بڑے شوق سے کہاں کہاں سے منگوائی ہیں۔" بہت پیار سے سمجھا کر کہا کہ کل جیسا جواب نہ ملے۔

"مچھلیاں۔ مگر اب یہاں کورٹ بنے گا۔ ٹینس کورٹ۔ ابا بھی کھیلیں گے۔ ہم بھی۔"

"او تو بیٹا! اس حوض کو توڑے بغیر بھی کورٹ بن سکتا ہے۔ اتنا بڑا لان ہے۔ گھر خراب کرنے سے کیا فائدہ یا مچھلیوں کے رہنے کا انتظام کرنے کے بعد یہ کام کرتے۔"

"مچھلیوں کا انتظام ہو گیا ہے ماموں۔ وہ کچن میں ہیں۔" احد بے خوفی سے بولا۔ "آج بھون کر کھائیں گے۔"

نوید کی سانس رکنے لگی۔ "احد! فہد! یہ کیا کر رہے ہو بیٹا! ان معصوم ننھی منی مچھلیوں کے پکانے سے کیا ملے گا تمہیں۔"

"ہمارا پیٹ بھرے گا۔"

"پاپا ہوتے۔۔۔ تو دیکھ کر مر جاتے۔"

"تو وہ مر چکے تو ہیں۔ اب یہ گھر ہمارا ہے۔ ہم جو چاہے کریں توڑیں یا جوڑیں۔"

"توڑنا اچھا ہوتا ہے یا جوڑنا۔ ذرا سوچو۔" تحمل سے سمجھانا چاہا۔ دل تو چاہتا تھا ایک ایک تھپڑ لگا کر ہوش میں لائے مگر بچے۔۔۔ ذی ہوش تھے بولے

"سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو اس سے کیا غرض ہے۔"

"کیونکہ یہ گھر میرے پاپا نے بنوایا ہے۔ انہوں نے بہت محنت اور محبت سے بنوایا تھا۔ اسے خراب ہوتا دیکھ کر مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ جیسا کہ پاپا اگر ہوتے۔ ان کو ہوتی۔"

"ہاں۔۔۔ تو۔ لیکن اب یہ گھر آپ کا ہے نہ آپ کے پاپا کا۔ یہ ہمارا ہے۔ آپ کو منع کرنے کا حق بھی نہیں۔" یہ فہد تھا۔

نوید پر شدید جھنجلاہٹ کا دورہ پڑا۔ مگر۔۔۔ بات اس کی بھی درست تھی۔ اس نے آرام سے کہا۔

"فہد بیٹا! آپ اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ سمجھایا جائے کہ بڑوں سے بات کرنے میں تمیز کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ نہ اتنے بڑے ہیں کہ دھونس کے ساتھ بات کریں۔۔۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ میں ہوں تو تمہارا ماموں۔"

"ہمیں بھی بہت افسوس ہے۔ کہ آپ کو نانا کی جائداد میں حصہ نہ ملا۔ آپ ان کی اولاد ہوتے تو ملتا۔ اس کا جی بھر کر افسوس کریں۔ بھلا آپ ماموں کیسے ہوئے؟؟"

امی اور بڑی آپا برآمدے میں کھڑی تھیں۔ امی کو کچھ غصہ آیا۔ نیچے اتر کر آئیں۔ ایک زور کا تھپڑ مار کر کہا۔

"بدتمیز! گستاخ! اوقات بھول گیا اپنی۔ ہوش کر۔" کہہ کر فوراً برآمدے میں گئیں اور اندر چلی گئیں۔ جاتے ہوئے بیٹی پر جلتی نظر بھی ڈالی۔

نوید کے سر سے پسینہ بہتے بہتے گردن تک آ گیا۔ سر نیچا کیے وہ باہر آ گیا۔ اب سب ختم۔ ہر رشتہ، تعلق

۔جب بچے تہذیب کے دائرے سے نکل کر مقابلے پر آجائیں۔ پھر کیا رہ جاتا ہے۔ سمجھانا لاحاصل ۔ سکھانا بے سود۔

امی کی بے بسی نے اسے تڑپا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آفس میں آکر اگلے دن اسلام آباد روانگی کا پروگرام طے کیا۔ آفس سے اپنی فائلیں وغیرہ سمیٹیں اور گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔ کسی سے کچھ کہے بغیر سامان اکٹھا کیا۔ سوٹ کیس میں سامان 'گرم کپڑے' جوتے' کتابیں' تصویریں' نہ جانے کیا کیا جمع کرلیا تھا۔ کمرے کی دیواریں خالی ہوگئی تھیں۔

انسان کس قدر فضول چیزیں جمع کرلیتا ہے۔ سوچے بغیر۔ کاش ضروریات محدود ہوں۔ تو اتنا افسوس نہ ہو۔ کتنی چیزیں پھینکنی پڑیں گی۔ چار سوٹ کیس پیک ہو چکے تھے۔ ضروری کاغذات اور چند چیزیں بیگ میں رکھنی باقی تھیں۔ سوچنے کے لیے پوری رات تھی صورت حال بدل چکی تھی۔ اب ماضی بھولی بسری یاد ہوگی۔

رات کسی نے کھانے کے لیے نہیں بلایا۔ شام کی چائے بھی گئی۔ گویا واقعی رشتے جھوٹے تھے۔ اس بچے نے بڑوں سے سن کر ہی اتنی بڑی بات کی تھی۔ کون راز سے پردہ اٹھائے گا۔ ماموں آئے اور بغیر کچھ کہے چلے گئے۔

رات خاصی ہیبت ناک تھی۔ اندھیری ڈراؤنی مستقبل کا کچھ پتا نہ تھا۔ مگر اب اسلام آباد جانا تھا۔ وہیں رہنا تھا۔ آئندہ بھی ترقی کے امکانات ہیں۔ محنت کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ دل میں ایک فیصلے پر ڈٹ جانے کے بعد نیند بھی خوب آئی۔

صبح کمرے کی صفائی کرکے شکور کو بلایا۔ فالتو سامان اس کو دے کر چاروں سوٹ کیس گیٹ پر لے جانے کا کہا۔ سوزوکی بلانے کا فون کردیا تھا۔ بیگ لے کر نیچے آکر امی کے پاس بیٹھ گیا۔

"امی! میرا ٹرانسفر اسلام آباد ہوگیا ہے۔ میں آج جا رہا ہوں۔"

کہتے کہتے آواز بھرا گئی۔ کچھ قریب ہونے کی کوشش کی۔ شاید امی لپٹالیں۔ پیار کریں۔ سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کریں۔ مگر وہ سامنے بیٹھی بیٹیوں کو دیکھتی رہیں۔

"آپ کو۔ کبھی ضرورت ہو۔ میں آجاؤں گا۔ ایک کال کردیں۔ میں چھٹی پر آ۔"

جملہ ختم ہونے سے پہلے تپا چلائیں۔ "کیوں کیا ہم سب مر گئے ہیں۔ جو تمہیں فون کرکے بلایا جائے گا۔" بڑی تپا کے چہرے پر تلملاہٹ تھی۔ نوید نے امی کو چونکتے دیکھا۔ جھرجھری سی لے کر انہوں نے نوید کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"مگر تم جا کیوں رہے ہو۔ تمہیں کوئی تکلیف ہے۔ اتنا بڑا گھر ہے۔" انہوں نے ایک جذبے سے کہا۔ مگر کندھے سے سر تک ہاتھ نہیں پہنچا۔

"میری جگہ۔ اب اس گھر میں نہیں ہے۔ مجھے یہاں رہنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ میں اس گھر کا بیٹا نہیں ہوں۔ شاید کسی کوڑے کے ڈرم سے اٹھایا ہوا بے ننگ و نام بچہ جسے ترس کھا کر آپ نے بیٹے کے شوق میں پال لیا تھا۔ شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" آنسو چھلک پڑے۔ امی کا سر جھک گیا تھا۔

"اب امی کو بلیک میل تو نہ کرو جذباتی تقریر کرکے۔ جانا ہے تو جاؤ۔ احسان جتانے کی کیا ضرورت ہے۔"

نوید پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ آنسو بہنے لگے۔ امی کے پاس سے اٹھ کر تیزی سے دروازہ پار کرنا چاہا۔ مگر وہاں نوشی کھڑی تھی۔

"بھائی! کیا سچ مچ جا رہے ہو؟" اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ نوید کو بھی قابو نہ رہا۔ اس کے سر پر بوسہ دے کر بولا۔

"ہاں نوشی۔ مجبوری ہے۔"

پیچھے سے تپا کی نوکیلی آواز سنائی دی۔ "اب ہمیں کیا پتا۔ بیگ میں کیا کچھ بھر کرلے جا رہے ہو۔ گھر کے کاغذات یا پاپا کی جائداد کی دستاویزات۔ شاید کوئی پراپرٹی پاپا نے ہم سے چھپا کر دی ہوگی۔"

نوید نے قدم روک لیے۔ بیگ کی زپ کھولی اور شکور کو آواز دی۔ "شکور! سوٹ کیس یہاں لے آؤ۔"

بیگ کھول کر الٹ دیا۔ کاغذات ان کے سامنے رکھ دیے۔ دیگر اشیاء لاؤنج میں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ ٹوتھ پیسٹ کنگھا برش پاش کی ڈبیہ شیونگ کٹ۔

"اب نوکروں کے سامنے تماشا نہ کرو۔ جاؤ جو لے جانا چاہو۔ ہمیں جو لینا تھا۔ ہم لے چکے۔"

نوشی نے بیگ میں بکھری چیزیں سمیٹ کر بھریں۔ کاغذات فائلیں بھی اسی نے رکھیں۔ نوید خود پر ترس کھا رہا تھا۔ آواز پر قابو پا کر کہا۔

"امی! اپنے کمرے سے ہی چیزیں لی ہیں۔ فالتو سامان شکور کو دے دیا۔ جوتے موزے وغیرہ۔۔۔ اور گاڑی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

امی پر ان الفاظ کا کچھ اثر ہوا۔ بے چین ہوگئیں۔

"کیوں چھوڑے جا رہے ہو تمہاری ہے۔ تمہارے پاپا نے تمہارے لیے تمہارے نام سے خریدی تھی۔ اسی پر اسلام آباد جاؤ۔"

"پاپا نے تو۔۔۔ لیکن میرا اس گاڑی پر کوئی حق نہیں ہے۔ سوزوکی منگوائی ہے۔ اسی پر جا رہا ہوں۔"

کہہ کر فوراً" باہر نکلا۔ گیٹ کے باہر سوزوکی کے پاس شکور خانساماں۔ شکور کی بیوی' مالی جابر کھڑے تھے

"صاب جی۔ اب کب آؤ گے؟" محبت اور توقع سے بھرا سوال۔

"نوکری تو کری ہوتی ہے شکور۔"

مبہم سا جواب دے کر سب کو رقوم دیں۔ شکور کو اس کی بچی اور جابر کو اس کی بہن کی شادی کے لیے مزید۔ سوزوکی میں ڈرائیور کے پاس بیٹھتے ہوئے آخری نظر پاپا کے گھر پر ڈالی۔ گھر گیٹ تو کر سب پاپا کے تھے۔ ایک وہی ان کا کچھ نہ تھا۔ سوزوکی اسٹارٹ ہوئی۔ آنکھیں بھر گئیں۔

"شاکر! بچی کی شادی میں مجھے بلانا۔ آؤں گا۔"

شکور شاکر آنسو نہ روک سکے۔ گاڑی سرور نجیب کے گیٹ کے سامنے سے گزری۔ گیٹ بند تھا۔ کرنل صاحب شاید واک کرکے آئے تھے۔ گیٹ پر کھڑے تھے ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔ سیٹ سے گردن ٹکادی۔

بس اب اور کچھ نہیں دیکھنا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ کب گاڑی شہر سے نکلی۔ کب کہاں پہنچی۔ کچھ خبر نہ تھی۔ ایک جگہ ڈرائیور نے چائے لا کر دی۔ شکریے کے ساتھ پی لی۔ نیند آگئی۔ شام ہونے کو تھی۔ ماموں کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ سامان اتارا۔ کرایہ ادا کیا۔ ماموں حیران پریشان سامنے کھڑے دیکھ رہے تھے۔

"ماموں! تین دن یا چار دن آپ کے گھر رہوں گا۔ مجھے گھر اور گاڑی مل جائے گی۔"

ماموں کے سوالوں کا جواب الفاظ میں نہیں تھا۔ ان کے کندھے پر سر ٹکا کر زور زور سے رونے لگا۔ برداشت ختم ہوگئی تھی۔ مامی' بچے جمع ہوگئے۔ تمام دن کچھ کھایا نہ تھا۔ مامی نے بے حد اصرار کرکے کھانا کھلایا۔

رات کو ماموں اس کے ساتھ سوئے۔ کچھ وہ جانتے تھے۔ باقی اس نے دل کھول کر رکھ دیا۔ صبح آفس جا کر چارج سنبھالا اور کام شروع۔ چند دن بعد گھر بھی مل گیا۔

"اکیلے کیسے رہو گے؟" یہ سوال بھی اہم تھا۔ آفس والوں کی مہربانی ایک فیملی مل گئی۔ میاں بیوی بچہ' سرونٹ کوارٹر آباد ہوگیا۔ مامی نے آکر کچن سیٹ کیا۔ کچھ برتن نوید نے خرید لیے۔ کچھ مامی اپنے گھر سے لے آئیں۔ بستر ماموں کے گھر سے آگیا۔

☼ ☼ ☼

رفتہ رفتہ سب کچھ درست ہوگیا۔ مامی اکثر کچھ پکا کر لے آتیں۔ یا بھیج دیتیں۔ ماموں' مامی حج پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بچوں کی نگرانی۔۔۔ نوید نے خود کو پیش کیا۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ بچوں کو ناشتہ' کھانا۔ اسکول کی تیاری۔ ہوم ورک۔ عورت کی موجودگی ضروری تھی۔ تبریز کی شادی واحد حل تھا۔ تبریز ایک ماہ کی چھٹی لے سکتا تھا۔ تاکہ بیوی کے ساتھ گھر پر رہے۔ ماموں مامی کے آنے تک۔ اس بے چاری کو

تنہا تو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔

"مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ نئی دلہن گھر میں قید ہو کر ہنی مون منائے۔ بچوں کے ساتھ۔ پرائے بچوں کے ساتھ۔"

"ہنی مون ہم ہری پور میں منائیں گے آپ کے آنے کے بعد۔" تبریز نے تقریباً" تھر کتے ہوئے کہا سیدھا بیٹھنا اس لڑکے کو دشوار تھا۔ عجیب متحرک انسان تھا۔

ماموں دعائیں سمیٹنے کے لیے نانی اماں کے پاس جانا چاہتے تھے۔ خالہ جان سے ڈرتے تھے کہ کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ عجب معاملات تھے۔ ہر شخص کسی نہ کسی سے خفا۔ ماموں نے انکشاف کیا۔

"اصل میں خود ساختہ جرائم میرے ذمے لگا کر اپیا ناراض ہو گئیں۔ میرا جرم اتنا بڑا تھا نہ عظمیٰ کا کوئی قصور تھا۔ مگر ہم دونوں اپیا کی نظروں میں مجرم ٹھہرے۔" ماموں آہستہ آہستہ بتاتے رہے۔

"عظمیٰ نے میرے گھر رہ کر بی اے کیا تھا۔ ان دنوں بھائی صاحب پشاور میں ہوتے تھے۔ ایبٹ آباد میں عظمیٰ کو کالج لانے لے جانے کا کوئی انتظام نہ ہوا۔ اپیا کی وہمی طبیعت کی وجہ سے مجبوراً" عظمیٰ دو سال ہمارے ساتھ رہی۔ ان دنوں تبریز ہر ہفتے ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ تم نے دیکھا ہے کیسا چلبلا مزاحیہ سا ہے۔ اس کی ملازمت نئی نئی تھی۔ ہری پور میں دل نہیں لگتا تھا۔ خیر میں نے تو اپنائیت اور خیر خواہی میں اپیا سے تبریز کا رشتہ مانگا عظمیٰ کے لیے۔ تبریز میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔ یوں بھی میرا اس سے بہر حال رشتہ بھی ہے، تعلق بھی۔ مجھے یہ رشتہ مناسب لگا تو اظہار کر دیا۔ غنیمت تھی کہ عظمیٰ امتحان دے کر جا چکی تھی۔ ورنہ اپیا دوران تعلیم ہی اسے یہاں سے لے جاتیں۔ سختی سے انکار ہی نہیں کیا۔ ماہا کی توہین بھی کی حالانکہ اس کا اس معاملے سے تعلق نہ تھا۔ میں نے خود ہی سلسلہ چلایا تھا۔"

"ماہی کی توہین؟ وہ کیوں؟"

"تبریز ماہا کا بھائی ہے اور وہ اس کے خاندان کو کمتر سمجھتی ہیں۔ ماہا اور تبریز کی یہ جرات کہ ان کی اعلا ارفع خاندانی بیٹی کا رشتہ طلب کریں۔ حالانکہ اس میں حرج نہ تھا۔ عظمیٰ بھی تبریز کو پسند کرتی تھی۔ وہ ناپسند کیے جانے والا ہے ہی نہیں۔ جب اپیا ماہا پر گرج رہی تھیں۔ عظمیٰ نے انہیں منع کیا تھا اور کہا تھا "تبریز میں کوئی عیب ہو تو انکار کر دیں مگر ماہی کی بے عزتی تو نہ کریں۔" یہ حمایت عظمیٰ بیچاری کو مہنگی پڑی۔ اس کی تعلیم کو روک دیا گیا۔ اس پر الزام لگایا کہ وہ بھی اس رشتے کے معاملے میں شامل ہے اور یہ کہ یہاں رہ کر تبریز کے ساتھ گل چھرے اڑائے ہوں گے۔ اف اپیا کی بدگمانیاں۔ اوپر سے اماں کو بھی مجھ سے بدظن کر دیا۔ اب بھی میری شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔"

"ماموں! نانی اماں کو آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ وہ مجھے بتا چکی ہیں۔ وہ خالہ جان کی وجہ سے۔"

"ان کی وجہ سے؟ کیوں وہ کیا اپیا کی رعیت ہیں؟ جو حکمران کے تابع ہوتی ہے۔" ماموں شدید برہم تھے۔

غصہ کم ہوا تو بولے "حج پر جانے سے پہلے ہم دونوں اماں کی دعائیں لینے جانا چاہتے ہیں تم چلو گے؟"

نوید کو بھلا کیا انکار ہوتا۔ ماہی چاہتی تھیں۔ تبریز اور ثوبیہ کی شادی کی تاریخ طے کر لیں۔ پھر اماں کے پاس جائیں۔ ماموں نے کہا۔

"اماں کے پاس سے آ کر لاہور جائیں گے تاریخ طے کرنے۔ فون پر بتا دو۔"

ماہی نے فون کر دیا۔ ثوبیہ سے بھی بات کی۔ ثوبیہ نے نوید کے بارے میں پوچھ لیا۔

ماہی نے کہا۔ "خود پوچھ لو۔" اور ریسیور نوید کو دے دیا۔ سلام کے بعد ثوبیہ نے خیریت پوچھی۔ نوید نے کہا۔

"یہاں کا موسم بہت خوشگوار ہے اور ہم تمہیں اس خوشگوار موسم میں اس خوب صورت شہر میں لانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟ اور یوں تو ہری پور بھی ہرا بھرا شہر ہے۔ پھولوں سے بھرا ہوا۔ نرسریوں کی بہتات ہے۔ ہری پور میں لوکاٹ اور ٹماٹر بہت ہوتے ہیں۔ اور امرود بھی بہت میٹھے ہوتے ہیں۔"

ثوبیہ ہنستی رہی۔ خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی تبریز کی حرکات ہنسنے کے لیے کافی تھیں۔ تصور میں گم۔

☼ ☼ ☼

ماموں، ماہی کے مدافعتی سفیر بن کر جانا۔ خالہ جان کے در دولت پر پہاڑی راستے حسین مناظر۔ چکر کھاتی سڑکیں۔ سبز پہاڑ کی بلندی، کہیں کھائیاں گہرائیاں اور گہرائیوں میں بستی ہوئی آبادیاں۔ ایبٹ آباد کا موسم بھی بے حد خوشگوار تھا۔ بلکہ خنکی اور نمی کا تاثر لیے ہوئے۔ پھولوں سے بھری شاہراہیں۔ دلکش بہار آخر میں ہوائیں۔ گھر آ گیا تھا۔

ماموں کا انداز کچھ ایسا تھا۔ جسے کہتے ہیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اسی طرح وہ کسی بھی طرف توجہ دیے بغیر اندھا دھند گیلری میں گھسے اور نانی اماں کے کمرے میں دھاوا بول دیا۔ ماہی ساتھ ساتھ، نوید کو اسما مل گئی۔ اس نے بہت لہک کر سلام کیا۔ نوید نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"اور سناؤ۔ چائے وائے بنا لیتی ہو۔ کھانا شانا پکانا آ گیا؟"

خالہ جان آ گئیں۔ انہیں سلام کیا۔ روکھا سا جواب ملا۔ پھر بات بڑھانے کو بولیں۔

"یہ اور چائے۔ اسما اور کھانا؟ توبہ کرو۔ یہ تو رانی پھول ونتی ہیں۔ جو گرمی میں مرجھا جاتی تھی۔ سردی میں جم جاتی تھی۔ یہ اس سے کم نہیں۔ نازک پری۔"

نانی اماں کے کمرے میں جذباتی سین پنجابی ڈائیلاگ چل رہے تھے۔ ماموں ماں کے قدموں میں ماہی ساس سے کندھا جوڑے۔ آنسوؤں کے نشان سب کے چہروں پر نمایاں تھے۔

"تو پھر اور بچے۔ کس کے سپرد کرو گے۔" نانی اماں پریشان تھیں۔ "میں کسی قابل ہوتی تو دیکھ لیتی۔"

"ارے اماں نہیں۔ آپ کو اس عمر میں بھلا کیا زحمت دوں گا؟ میں آپ کی خدمت نہیں کر سکا۔ ملال ہے مجھے۔"

پھر انہیں تبریز کی شادی کا بتایا۔ یہ حل ہی بہتر تھا۔

"ثوبیہ اچھے خاندان کی شریف لڑکی ہے۔ نوید کے دفتر میں ہے لاہور میں رہتی ہے۔ بلکہ نوید نے ہی یہ رشتہ کرایا ہے۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ شادی ہے۔ آپ کو بھی آنا ہو گا۔ اماں! آپ میرے اور ماہا کے لیے دعا کریں گی نا؟ میں بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔ شرمندہ ہوں کہ پہلے نہیں آ سکا۔ اپیا کی ناراضی کے ڈر سے۔"

"تم پہلے بتا دیتے کہ حج پر جا رہے ہو۔ میں تمہارے پاس آ جاتی۔" نانی اماں بے قراری سے ماموں کے سر پر ہونٹ رکھے پیار کر رہی تھیں۔

"حج سے واپس آ کر میں آپ کو لے جاؤں گا۔ آپ کے پوتے آپ سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔"

عظمیٰ نے کھانے کی اطلاع دی۔ سب کھانے کے لیے جمع ہوئے۔ ماموں نے تبریز کی شادی کی خبر دی اور بلاوا دے دیا۔ "بارات لاہور جائے گی۔ سب کو چلنا ہو گا۔"

نانی اماں اپنے کمرے میں ہی رہیں۔ چھوٹے پوتے کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ توتلی زبان میں بول رہی تھیں۔ بڑے دونوں تو اسکول کی وجہ سے چھوڑ کر آئے تھے۔ ماہی کی ایک کزن اسکول میں پڑھاتی تھیں۔

عظمیٰ نے سب کے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ وہ کچن میں ہی مصروف رہی۔ ماموں، ماہی، خالہ جان اور خالو جان نانی اماں کے کمرے میں محفل جمائے بیٹھے تھے۔ نوید اسما کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ عظمیٰ بھی آ گئی۔ رنجیدہ اور سنجیدہ۔

"تم نے ماہی سے کوئی بات نہیں کی۔ کیا تمہاری ان سے کوئی رنجش ہے؟" نوید نے عظمیٰ کی خبر لی۔

"اوہو... آپی اور ماہی سے بات کریں؟ اور امی اس کے ڈانڈے تبریز بھائی سے ملا کر بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیں۔" عظمیٰ نے اسما کو گھور کر دیکھا۔

"تو اسما! تم کیوں نہیں خالہ کو بتا دیتیں کہ۔۔۔"

"لو جی۔ وہ کب کسی کی سنتی ہیں۔ میرا نام لے کر

کہتی ہیں۔ اسما کو تمہارا فلاں سوٹ پسند ہے۔ اسے دے دو۔ یہ فرماں برداری کی اعلا مثال۔ فوراً ”لا کر دیتی ہیں۔ اتنی محنت سے اپنی قمیص پر موتی ستاروں کا کام بنایا۔ امی نے میرے لیے مانگ لی۔ میں منع کرتی رہی۔ مگر انہوں نے میرے ناپ کی سلوائی۔ یہ جب۔ گویا انہیں کوئی حق نہیں۔ اچھا کرنے ’اچھا لگنے‘ کا۔ امی تو جیسے کسی بڑے جرم کی سزا اپی کو دیتی ہیں۔ انتقام لیتی ہیں۔“

عظمیٰ خفا ہو کر چلی گئی۔ نوید حیرت سے اسما کو دیکھنے لگا۔ ”کیسا انتقام‘ کون سا جرم۔“

”تبریز بھائی کو پسند کرنے کا۔“

”مگر یہ کون سا جرم ہے؟ میں بھی مجرم ہوں اس فعل کا۔ تبریز کو ناپسند کرنے کی کوئی وجہ؟“

”امی انہیں چھچھورا کہتی ہیں۔ گھٹیا خاندان۔ لالچی اور اپی کا رشتہ مانگنے پر امی سے خفا۔ امی کہتی ہیں۔ تبریز بھائی نے اپی کو پھانسا ہے۔ جب وہ ماموں کے گھر رہتی تھیں۔ اپی صفائی دے دے کر تھک گئی ہیں۔ مگر امی۔ توبہ‘ جو سوچ لیا۔ وہی سچ ہے۔ بھلا بتائیں۔ مل گئی نا ان کو ایک اچھی لڑکی۔ اپی کو کیا ملا؟ ڈھنگ کا کوئی رشتہ آتا ہی نہیں۔ سب کو اعلا تعلیم یافتہ لڑکی چاہیے۔ اس لیے اب ایسے ویسے کم پڑھے لکھے۔ زمین دار قسم کے رشتے آتے ہیں۔ امی سخت ناراض۔ اپی کو منحوس کہنے لگی ہیں۔“

نوید کو افسوس ہوا۔ کاش اسما سے پہلے رابطہ کر لیتا تو تبریز اور عظمیٰ کی شادی کی کوشش کرتا۔ کتنا اچھا ہوتا۔ ہنستا مسکراتا خوش مزاج۔ آج عظمیٰ البتہ اداس لگی۔ سبب۔ تبریز کی شادی۔ اپنی کوتاہی پر افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن قدرت اور قسمت اگر ملانا چاہے۔ سو طریقے ہو جاتے ہیں۔

وہ ست قدمی سے نانی اماں کے پاس پہنچا۔ ”شوہر بھی۔ نیک‘ ہمدرد‘ کارگزار ہے۔ عظمیٰ جیسی ہنس مکھ نہ سہی۔ یہ بھی اچھی جوڑی ہو گی۔“ تسلی دی۔

رات کو ماموں نے گیسٹ روم میں سونے سے معذرت کر لی۔ وہ نانی اماں سے لپٹ کر سونا چاہتے تھے۔ ساں کی مامتا کی حرارت میں۔

”نوید۔ بیٹا تم لاؤنج میں سونا۔“

”نہیں میں بھی گدا ڈال کر یہیں آپ کے کمرے میں سو جاؤں گا۔“

”اچھا عظمیٰ سے کہو۔ تمہارا بستر یہیں لے آئے۔“

”نانی اماں! میں خود لے آؤں گا اسٹور سے۔ عظمیٰ کو کیوں تکلیف دیتی ہیں۔“

”وہ تو سارا دن کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ تکلیف کیسی؟“

نوید کو اپنا مسئلہ یاد آیا۔ ”نانی اماں! مجھے ایک بات بتا دیں۔ سچی سچی‘ وہ یہ کہ کیا میں بابا کی اولاد نہیں ہوں؟ میں آخر کس کی اولاد ہوں یا امی آپ کی بیٹی میری سوتیلی ماں ہیں۔“ درد بھرا لہجہ تھا۔

نانی اماں انگلی ٹھوڑی پر رکھے استعجاب کی انتہائی تصویر بن گئیں۔ ”بتائیں نانی اماں۔“

”کیسی عجوبہ‘ انہونی بات کی ہے تو نے نوید! میرے لاڈلے ایسا خیال بھی کیوں ہوا تجھے۔ میرے بچے یہ فتنہ کس نے ذہن میں ڈالا ہے۔“

”نانی اماں! فتنہ‘ خیال نہیں ایک حقیقت۔ آپ کی بیٹی کا مجھ سے سلوک نواسیوں کا رویہ چیخ چیخ کر اعلان کر رہا ہے کہ میں ان میں سے نہیں غیر ہوں۔“ دل بھاری ہو گیا۔ آواز بھی۔

”ایسی فضول بات کا خیال بھی کیسے ہوا تجھے۔ ہیں بھلا۔“ نانی اماں بوکھلا گئیں۔ ماموں اندر آ گئے۔

”ہاں اماں! یہ صحیح کہہ رہا ہے۔ مجھے بھی لگتا ہے یہ آپا کا بیٹا نہیں لے پالک ہے۔ ورنہ بھائی جان کی اولاد ہو تا تو برابر کا حصہ دار ہوتا۔“

ماموں نے نوید کو گلے لگا لیا۔ ”تم کوئی بھی ہو۔ میرے ہو۔“

نوید کو زور کا رونا آیا۔ یہ محبت‘ رفاقت اپنے گھر سے کیوں نہ ملی۔ نانی بھی چمٹا کر بیٹھ گئیں۔ بستر لے کر آئی ہوئی عظمیٰ اور اسما بھی حق دق کھڑی تھیں۔ ماموں تفصیل بتا رہے تھے۔



خالہ جان آ گئیں۔ انہیں بھی بتایا؟ ”گیا؟ گھر۔ بلاٹ سب لڑکیوں کے نام؟ نوید کو کچھ نہیں؟“

”ہاں۔ کچھ نہیں۔“

”اگر وہ میرے باپ تھے۔ تو ان کا نام ہی میرے لیے کافی ہے ماموں! لیکن بچپن سے جس کو ماں کہا اسے اب کیا کہوں۔ بہنوں کو کیا سمجھوں؟ کس نام سے پکاروں اور آپ کو کیا سمجھوں۔“

خالہ جان نے اسے لپٹا لیا۔

”مجھے ماں سمجھ لو۔ میں بنوں گی تمہاری ماں۔ بیٹا میرے پاس کوئی جائداد تو نہیں مگر محبت ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ آپا کو قدر ہو جائے گی ایک دن تمہاری وہ دراصل بیٹیوں کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ انہیں عقل مند سمجھتی ہیں اور لڑکیوں کو کیا کہوں۔ ان کا اپنا ہی رویہ ہے۔ ان کو بھی عقل آتے آتے آئے گی۔ میرے پاس جائداد ہوتی۔ ضرور تمہیں دیتی۔“

”خالہ جان! مجھے جائداد کا لالچ نہیں۔ صرف بابا کا نام کافی ہے۔ مگر مجھے الزام تو نہ دیں کہ میں سب کچھ تہس نہس کر دوں گا۔ برباد کر دوں گا۔ گھر کسی گھٹیا عورت کے نام کر دوں گا۔“

آنسو کم ہو گئے۔ دل بھی ٹھہر گیا۔ محبت اور خلوص میں طاقت ہوتی ہے۔ اسی طاقت نے نوید کو حوصلہ دیا۔

✡ ✡ ✡

اگلا قدم نانی اماں نے اٹھایا۔ صبح اٹھتے ہی پہلا کام ٹیلی فون کے سامنے جا کر کیا۔ لاہور فون کر کے بیٹی کو بلایا۔ نواسی کے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ بیٹی سے لاتعلقی۔ مامتا سے خارج ہونے کا اعلان کر کے آرام سے ناشتہ کرنے بیٹھ گئیں۔ عظمیٰ ناشتہ لائی تھی جب وہ بہت دبنگ آواز میں سختی سے بیٹی کو لتاڑ رہی تھیں۔ فون بند کر کے بیٹھیں تو عظمیٰ نے آہستہ سے کہا۔

”نانی اماں! آپ نے کچھ زیادہ سختی نہیں کر دی؟“

نانی اماں نے سرخ آنکھوں سے اسے گھورا۔

”اس نے کیا بہت نرمی کی ہے بچے کے ساتھ؟“

”تو آپ انہیں سمجھاتیں۔ آپ نے تو وہی کیا جو وہ کر چکی ہیں۔“

نانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اسے جائداد سے خارج نہیں کر رہی مگر مجھے بہت غصہ ہے۔ اور اب تم چپ رہو۔ سب کو بتا دو۔ کوئی لاہور کی کال ریسیو نہ کرے۔ سنا؟“

اور واقعی لاہور سے فون کال کا تانتا بندھ گیا۔ لیکن کسی کو کبھی تو اٹھانا تھا۔ اسما نے نانی اماں کو چپکے سے آ کر بتایا۔

”امی خالہ امی سے بات کر رہی ہیں۔“ نانی اماں نے فوراً ”کچہری طلب کی۔ ملازم کو جواب طلبی کے لیے بلایا۔ نوید بے چارگی سے خالہ کو دیکھنے لگا۔ معذرت طلب نظروں سے جو نانی کی برہمی صبر سے برداشت کر رہی تھیں۔

”اماں! میں نے بے خیالی میں فون اٹھا لیا تھا۔ ادھر سے تابڑ توڑ لعنتیں نوید پر برسیں تو میں نے بتایا۔ نوید نے کچھ نہیں بتایا۔ بھائی نے بتایا اماں کو۔ وہ حج پر جا رہے ہیں‘ ملنے آئے ہیں۔ میں نے نوید کا نام ہی نہیں لیا۔ اماں آپا کو پیچھے سے ہدایات دی جا رہی تھیں۔ یہ کہیں‘ وہ بولیں۔ یہ بتائیں اور آپا وہی الفاظ دہرا رہی تھیں جوان کی بیٹیاں انہیں سکھا رہی تھیں۔ میں نے کہا آپا۔ بیٹیوں کے دباؤ میں غاصب بن گئی ہو۔ اللہ سے ڈرو۔ ایک دن یہ بیٹیاں آپ کو بھی بے دخل کر دیں گی پھر کہاں جاؤ گی۔ بیٹا ہی آپ کی چھتر چھایا بنے گا۔ اماں بہت ناراض ہیں۔ سب کو آپ سے تعلق رکھنے کو منع کر رہی ہیں۔ ہم تعلق نہ بھی توڑیں۔ سچ کی حمایت تو کر سکتے ہیں۔ بس میں نے یہی کچھ سمجھایا۔“

نانی بار بار نوید کو گلے لگاتیں۔ پیار کرتیں۔ خالہ جان بھی خفگی بھول کر ماموں مامی سے خوش دلی سے بات کر رہی تھیں۔

شکر ہے۔ برف پگھلی۔ مگر شاید ساری پگھلی ہوئی برف نے عظمیٰ کو نہلا دیا تھا۔ جب سامنا ہوا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی۔ چہرہ پھیکا پھیکا۔ کیا وہ تبریز کے معاملے میں

واقعی سنجیدہ تھی؟ نوید کو تاسف ہوا۔ کاش وہ نوشیبہ کی تجویز نہ پیش کرتا تو آج عظمیٰ کے لیے کوشش کرتا۔
اگلے دن ان لوگوں کی روانگی تھی۔ نوید نے موقع ملتے ہی عظمیٰ سے بات کی۔
"سوری عظمیٰ! میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا۔"
"کیا ؟ نوید بھائی۔ میں سمجھی نہیں۔"
"میں۔۔۔ اگر مجھے ذرا بھی علم ہوتا۔ میں تمہارے لیے تبریز کا نام تجویز کرکے۔۔۔ خالو جان کو تو ضرور ہم نوا بنا لیتا۔"
عظمیٰ کے چہرے پر صبح کے اس وقت پہاڑوں سے اترنے والی شام کی دھند نے بسیرا کر لیا۔ اس کے ہنس مکھ چہرے پر غم کے بادل منڈلانے لگے۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔
"آپ شرمندہ نہ ہوں۔ آپ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ابا بھی مجبور ہیں۔ امی ایک بات طے کر لیں تو اس سے نہیں ہٹتیں۔ یوں بھی مجھے صبر کرنا سکھایا گیا ہے اور میں بہرحال مشیت پر یقین رکھتی ہوں۔ مجھے صرف امی کی بے اعتمادی کا دکھ ہے ورنہ کسی کو پسند کرنا گناہ نہیں اور پسند بھی یک طرفہ۔ اس معاملے میں میرے علاوہ مامی وغیرہ کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کا بھی غم اور پچھتاوا۔ سوچتی ہوں۔ کبھی امی کی نظروں میں اپنی کھوئی ہوئی عزت پا سکوں گی۔ یا نہیں؟"

گلا بند ہونے لگا۔ تو چپ ہو کر آسمان پر نظریں جما دیں۔ پہاڑوں پر بادلوں کے سفید بجرے تیر رہے تھے۔ جیسے سمندر میں کشتیاں۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ آسمان کی نیلاہٹ نے عجیب طرح کا سکون پھیلا دیا تھا۔ عظمیٰ نے مسکرا کر نوید کو دیکھا۔
"آپ بہت اچھے ہیں نوید بھائی! سب کے ساتھ آپ کا سلوک دیکھ کر لگتا ہے۔ اللہ نے خالہ امی کے گھر میں فرشتہ اتارا تھا۔ جس کی کسی نے قدر کی نہ اہمیت جانی۔ آپ اپنے لیے کیوں کوشش نہیں کرتے۔"
عظمیٰ کو مسکراتے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شاید اس کا دل ہلکا ہو گیا تھا۔ بوجھ اتر گیا تھا۔ یا صبر نے قوت برداشت مضبوط کر دی تھی۔ نوید ہنسا۔
"فرشتہ؟ جو شیطان بن گیا۔ بھئی تمہارے فہم و فراست کی داد نہ دینا میری حماقت ہوگی۔ شکریہ عزت افزائی کا۔ ویسے کس طرح کی کوشش کرنی چاہیے مجھے"

"خالہ امی کو رام کرنے کی۔ منانے کی۔ انہیں اپنی اہمیت جتانے کی۔ ان کا دل جیتنے کی۔ غلط فہمیاں دور کرنے کی۔ آپ کر سکتے تھے۔"
"تم نے اپنی امی کے لیے یہ سب کوششیں کریں، کچھ کامیابی ہوئی؟"
"ہو گی ضرور ہو گی۔ میں کبھی ناامید نہیں ہوتی۔" امید کی سنہری کرنوں نے عظمیٰ کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔
"ابھی تو تم مشکوک تھیں۔"
"وہ۔۔۔ وقتی ابال ہوتا ہے۔ کسی سے تو دل کی بات کرنے میں جھجک نہیں ہوتی۔ آپ ان میں سے ہیں۔"

"یعنی میں کسی میں ہوں؟" برا مان کر نوید نے کہا۔
"یعنی آپ ان میں ہیں۔ جو رازوں کے امین۔ صادق اور خیر خواہ ہوتے ہیں۔" وضاحت کی۔
عظمیٰ اب مسکرا رہی تھی۔ گویا غم کی گھٹائیں کہیں دور جا چکی تھیں۔ سامنے پہاڑ سے سفید بادل کا ایک گولا لڑھکتا ہوا نیچے بستی پر آ گرا۔ بے ضرر معصوم۔ اب پہاڑوں پر سبزہ تھا ہریالی اور سورج کی روشنی۔

☼ ☼ ☼

اسلام آباد پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی تھی۔ مامی نے نوید کو روک لیا۔ ماموں بچوں کو لینے چلے گئے۔ مامی نوید سے تبریز کی شادی کے پروگرام پر رائے لینے لگیں۔ آتے ہوئے تبریز کے گھر گئے تھے مگر وہ بے چین روح گھر میں نہ ملا۔ گھر میں جو بابا قسم کے ملازم تھے۔ انہوں نے بتایا۔
"آج صاحب چھٹی لے کر چھترپارک گئے ہیں دوستوں کے ساتھ ذہن ڈھونڈنے۔"
"بہت سیلانی اور سرپھرا ہے تبریز، مجھے ڈر ہے کہیں نوشیبہ اسے بھلا کہاں عادت ہو گی۔"
"وہ خوش رہے گی۔ دراصل اسے ذمے داریوں نے ادھر ادھر دیکھنے کی مہلت ہی نہ دی۔ تبریز اسے اپنا جیسا بنا لے گا۔ فکر نہ کریں۔" نوید نے یقین دلایا۔
آفس میں فائلوں کا انبار۔ نوید کو سر اٹھانے کی فرصت نہ ملی۔ نہ فون سن کر جواب دینے کی۔ فون جو نابر توڑ لاہور سے بہنوں کے آ رہے تھے۔
نانی ماموں کو ہم نوا کرنے۔ ان سے دکھڑے رو کر مظلومیت کا پرچار ایک اور نیا الزام۔
"نوشی کے شوہر پر دباؤ ڈال کر نوشی کو اپنے حصے سے دست برداری پر مجبور کیا۔ تم اسی قابل تھے۔ تمہیں قلق ہے کہ کچھ نہ ملا۔ اگر پاپا تمہیں اپنا سمجھتے تو تمہارے نام پہلے ہی گھر کر دیتے۔ ہمیں کیا ضرورت۔"
نوید نے ہر بار خاموشی سے فون بند کر دیا تھا۔ گھر آ کر ماموں کو فون کیا۔ انہوں نے فوراً طلب کیا۔ ماموں کے گھر جا کر انہیں لاہور کے الزامات کی تفصیل سنائی۔ انہوں نے جلال کے عالم میں فوراً لاہور کال ملائی۔
"تمہاری بیٹیوں کو سازشیں کرنے کے سوا کوئی اور کام نہیں؟ آپا ہوش کریں۔ کس کس کی آہ لیں گی؟"
"اچھا خیر بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔ میں نے کینیڈا فون کر کے وجیہ کو بتایا تھا کہ نوشی نے معہ بہنوں کے بھائی کا پورا حق غصب کر لیا ہے۔ اب اگر میں بھی اپنے بھائی تمہارے مرحوم باپ کی چھوڑی ہوئی تمہارے نام کی جائداد۔ جس کا میں مختار ہوں۔ اپنے نام کروا لوں؟ کیونکہ اب یہ روایت میری بھانجیاں قائم کروا چکی ہیں۔ تو میں کیوں نہ کروں۔ تمہیں بے دخل کر دوں تو تو وہاں بیٹھے بیٹھے کیا کر لے گا اس پر وہ چلایا کہ نوشی نے اسے کچھ نہیں بتایا اور وہ بیٹے کو پاکستان بلانے پر اصرار کر رہی ہے۔ میں نے کہا، تاکہ تم کمزور ہو جاؤ۔ وہ گھر کے ساتھ بیٹے پر قابض۔ تم بچے سے محروم۔ یہ ہے سیاست۔ تو آپا کیا برا کیا میں نے؟ تمہاری نقل کر کے میں بھی بھتیجے کی جائداد ہڑپ کر لوں اور کہوں کہ تم میرے بھائی کی اولاد ہو ہی نہیں۔ پھر اگر آپا آپ کی بیٹیاں منہ بند نہیں رکھ سکتیں۔ تو میں نوید کی طرف سے اپیل دائر کر کے ہائی کورٹ، سپریم کورٹ تک جاؤں گا۔ یاد رکھو برسہا برس مقدمے چلا کرتے ہیں۔ فیصلہ ہونے تک وہ اس گھر یا پلاٹ کی ملکیت حاصل نہیں کر سکیں گی۔ جو جھوٹ پر قلعہ تعمیر کیا ہے آپ نے۔ مٹی کی طرح ڈھے جائے گا اس لیے کہ شریعت اور ملکی قانون کے تحت بیٹا وارث ہوتا ہے یا پھر آپ ثابت کر دیں کہ نوید آپ کی اولاد نہیں لے پالک ہے۔"

ماموں گرج برس چکے۔ فون بند کر دیا۔ تو نوید نے سہارے کے لیے کرسی کا ہتھا تھام لیا۔ سر چکرا رہا تھا۔ نوشی کا کیا قصور تھا۔ کتنی اداس تھی۔ اور چلتے ہوئے اس نے نوید سے کہا تھا۔ "بھائی! تم جا رہے ہو۔" کیسی بے چارگی تھی لہجے میں، جدائی کی اذیت لیے ہوئے۔
"ماموں! یہ آپ نے کیا کر دیا۔ نوشی تو بے قصور ہے۔ شاید آپا اور اپیا بھی شوہروں کی خوشنودی کے لیے۔"

"بیٹے جی۔ میں نے ابھی کیا ہی کیا ہے؟ خالی زبان ہلا رہا ہوں۔ جو کر سکتا ہوں۔ وہ انہیں بتا رہا ہے۔ تاکہ کچھ شرم کر لیں۔"
"ماموں! مجھے جائداد نہیں چاہیے۔ میں اپنی پہچان پاپا کے نام کے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"
ماحول میں اداسی گھل گئی۔ نوید کو یاد آیا۔ پاپا اسے اس کا حق دے چکے ہیں۔ اب کسی سے کیا گلہ۔ ہاں محبتوں سے محرومی کا دکھ کم نہیں ہو رہا تھا۔ محبت میں بھی حق دار کا حصہ ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

تبریز کے چکر بڑھ گئے تھے۔ شادی کی تیاری میں جوش و خروش سے حصہ لے رہا تھا۔ اس دن نوید ماموں کی طرف آیا۔ لان میں تبریز کو کرسی پر سر جھکے

کسی سوچ میں گم پایا۔
"کیا بات ہے دولہا میاں کس سوچ میں گم ہو۔ لگتا ہے نون تیل لکڑی کی فکر میں غرق ہو۔"
جھینپ کر کھڑا ہو گیا۔ "نہیں نوید بھائی! اصل میں پہلی شادی میرا مطلب کہ شادی کا یہ پہلا واقعہ ہونے والا ہے۔ سوچ رہا تھا۔ ثوبیہ کس طرح میرے ساتھ گزارا کرے گی۔ میں ذرا لاابالی۔ لاپروا انسان ہوں۔ ادھر ادھر چیزیں پھینکتا پھرتا ہوں۔ پھر نہیں دیکھتا کہ کیا چیز کہاں ہے۔ نقصان اٹھاتا ہوں۔ سنا ہے عورتیں نقصان برداشت نہیں کرتیں۔ پھر کیا ہو گا گھر مچھلی بازار یا جنگ وجدل کا میدان بنے گا۔ ثوبیہ میں قوت برداشت کتنی ہے اور انتظامی صلاحیت کتنی؟"
اس دوران ہاتھ ملتے رہے۔ پیر کا بوجھ دوسرے پر ڈالنے اور بولنے کا سلسلہ جاری رہا۔ نوید کو ہنسی آگئی۔
"فکر نہ کرو۔ بہت صلاحیت ہے۔ اس نے آفس کے ماحول کو متوازن رکھا۔ ویسے تم کو عورتوں کے بارے میں اقوال زریں کون سناتا ہے۔"
"آپ کی محترم ماں صاحبہ اور میری سسٹر ڈراتی رہتی ہیں مجھے مستقبل سے۔"
"نہیں۔۔۔ اور دل تو نہیں لگالیا؟" تجسس اور تحقیق اس کا حق تھا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوا۔ پھر سٹپٹا کر کرسی پر بیٹھا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔
"آ۔۔۔ آ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" چہرے اور آواز سے لگا بارہ بج رہے ہیں۔
"یہی کہ اگر کوئی اور پسند ہو تو وہیں کوشش کر لیں۔" سادہ لہجے میں کہا۔
اب ذرا سکون سے کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھا۔ اور پروا لا پیر تھر کنے لگا۔ چلبلے کا۔
"جتایا تو ہے۔ چیزیں ادھر ادھر پھینک دیتا ہوں بھول جاتا ہوں۔ اگر آپ کے کہنے کے مطابق ایسا کچھ ہوا بھی ہو گا۔ وقتی طور پر تو بھول چکا ہوں۔ کون تھی؟ کیا تھی؟" بھنگڑ۔
نوید نے رشک سے اسے دیکھا۔ "اچھی عادت ہے۔ مگر تم کہہ رہے تھے نقصان بھی اٹھاتے ہو۔ اس سلسلے میں کوئی نقصان ہوا؟ کسی۔۔۔ کون تھی۔ کیا تھی کے معاملے میں یا نقصان کا خدشہ ہے؟"
"اوں۔ نہیں۔ کیونکہ اب ثوبیہ کے سلسلے میں فائدے کا امکان ہے۔ برابری کی فکر جو ہے۔ مشکور ہوں آپ کا کہ آپ کی کوششوں نے یہ دن دکھایا ورنہ کون بیٹی دیتا مجھے؟"
"ارے اتنی مایوسی کیوں؟ کیا کمی ہے تم میں۔ کسی نے کچھ کہا؟"
"اوہ نہیں۔ آپ کی ماں میری سسٹر کے اقوال زریں میں سے مزید ایک اور وہی مایوس تھیں۔"
"چلو خیر۔ غم نہ کرو۔ میں ثوبیہ کو تمہاری نقصان اٹھانے والی عادت کا بتا دوں گا۔ وہ تمہیں بخوبی سنبھال لے گی۔ آفس سنبھالتی ہے۔ فائلیں سمیٹتی ہے۔ صفائی کرواتی ہے۔ تمہیں بھی سمیٹ لے گی۔"
مایوسی کی وجہ۔۔۔۔ خالہ جان کے اقوال زریں جو انہوں نے تبریز اور اس کے خاندان کے بارے میں ارشاد فرمائے تھے۔ یقیناً "اس لاابالی لڑکے کو تحقیر محسوس ہوئی تھی۔ لاپروا ہے۔ بے حس نہیں۔ اس لیے برابری کی فکر پر مطمئن ہے۔ شاید کبھی عظمیٰ سے لگاؤ ہوا ہو۔ عظمیٰ سمجھ رہی تھی یک طرفہ پسند ہے۔ یہ بھی اچھا ہی ہے۔ عظمیٰ جلد نارمل ہو جائے گی۔ لڑکیاں معصوم اور جذباتی ہوتی ہیں۔ حالات سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ نادانی کو صبر کی طاقت سے زیر کر لیتی ہیں۔ عظمیٰ سمجھ دار ہے۔ اف پھر عظمیٰ۔ آخر لڑکیوں کے بارے میں اقوال زریں مجھے کون بتاتا ہے۔ زبان سے کہا ہوتا تو تبریز ہی پوچھ سکتا تھا۔
نانی اماں کے فون آئے۔ "میں تمہاری طرف سے فکر مند ہوں۔ زیادہ سوچنے کی عادت نہ ڈالنا۔ خوش رہنا۔ میں ہوں تمہاری۔ ہاں بیٹا۔ وہ کوئل اب بھی کوکتی ہے۔ زیادہ سردی میں جم گئی تو کیا ہو گا؟"
بڑی فکر تھی کوئل کی۔ معصوم چڑیا کی اور ایک کوئل جو آپ کے آس پاس گھومتی ہے۔ اس کے آنسو دیکھے نہ آہیں سنیں۔ کاش آپ نے اسے اس کے پیسے ملانے کی تدبیر کی ہوتی۔ پھر وہی عظمیٰ اف کیا ہے بھئی؟

☼ ☼ ☼

اسلام آباد کا موسم بھی بدل رہا تھا۔ خزاں کی اداسی چھا رہی تھی۔ بے برگ پودے سوکھے پھول۔ ماموں ماں کئی بار ایبٹ آباد جا چکے تھے۔ بند راستے کھل گئے تھے۔ محبتوں کی بنیاد مضبوط ہو رہی تھی۔ لاہور کے محاذ پر خاموشی تھی۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ مگر سب کچھ ویسا ہی نہ تھا۔ جیسا نظر آرہا تھا۔ دل پر جبر کر کے ریسیور اٹھایا۔ گھنٹی دیر سے بج رہی تھی۔
"ارے ہاں نوشی! وعلیکم السلام۔ کیسی ہو بیٹا۔ ارے رو کیوں رہی ہو؟ ہوا کیا ہے؟"
"بھائی! میں کینیڈا جا رہی ہوں۔ میں اپنے حصے سے دست بردار ہو گئی ہوں۔ سوری بھائی۔ تایا اور ابا کے کہنے سے میں۔۔۔ آپ کے ساتھ دعا میں شریک ہو گئی۔ اصل میں بھائی صاحب اور دولہا بھائی نے ہم کو مجبور کیا تھا۔ لیکن اب آپ معاف کر دیں مجھے۔"
جذبات نے گلا بند کر دیا۔
"نہیں گڑیا! مجھے تم سے گلہ نہیں ہے۔ تم ایسا نہ کرو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم اپنا حصہ نہ چھوڑو۔"

"بھائی! ایک مثل ہے۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ مجھے اپنا گھر بچانا ہے۔ آپ کا لے کر کیا کروں گی اور۔۔۔ وجیہ کو سزا کیوں دی جائے یہ جائیداد مجھے میرا شوہر اور بیٹا نہیں دے گی۔ بھائی میں تو امی کے اس فیصلے کے پہلے ہی خلاف تھی۔ مگر اب تو وجیہ نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں ان لوگوں کا ساتھ ملاتی گی تو وہ مجھے کینیڈا نہیں آنے دیں گے۔ میں وجیہ اور بچی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بھائی صاحب اور دولہا بھائی مجھے احمق کہہ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے تھوڑے دن بعد وجیہ بھی راضی ہو جائیں گے۔ مگر بھائی میرا ضمیر تو راضی نہیں۔ دوسرے کا حق غصب کرنا گناہ عظیم ہے۔ اس کی سزا بھی سخت ہے۔"
نوشی کی سسکیاں اذیت پہنچا رہی تھیں۔
"سنو نوشی! تم بے قصور ہو۔ تم خوش رہو۔ مجھے پیا کا نام ہی کافی ہے۔ مجھے تم سب سے محبت چاہیے۔ جائیداد نہیں۔ میں وجیہ کو بھی سمجھاؤں گا۔ اب تو جو ہونا تھا۔ ہو گیا۔ جاؤ اپنے گھر میں خوش رہو۔" دیر تک سمجھا بجھا کر شرمندگی کا ازالہ کیا۔
دن بہت بوجھل تھا۔ نوشی کی شرم ساری۔ سسکیاں مگر احمق نہ تھی۔ بہنوئیوں کے لالچ میں حصہ دار نہیں بنی۔ اپنا گھر اپنی خوشیوں کی خاطر۔ اپنے شوہر کے احکام پر پورا اترنے کے لیے۔ بالآخر چلی گئی۔ اب بچ نہیں وجیہ ماموں کی دھمکی سے ڈر گیا۔ یا اس کا ضمیر بھی زندہ تھا۔

☼ ☼ ☼

شام کو ایبٹ آباد سے کال آگئی اسما کی۔ "بھائی آپ آسکتے ہیں فوراً؟"
"کیا؟ نانی اماں خیریت سے ہیں؟"
"پریشان نہ ہوں۔ وہ خیریت سے ہیں۔ دراصل آپی کا رشتہ آیا ہے۔ امی کا اصرار ہے کہ قبول کر لیا جائے۔"
"تو میں کیا کروں گا؟"
"آپ آپی کی مدد کریں گے۔ دراصل یہ رشتہ ایک ٹرانسپورٹر کا ہے۔ دوسری شادی۔ دو بچے۔ امی کی پسند ہے۔ ابا سوچ میں ہیں۔ پرسوں جواب دینا ہے۔"
"تو۔۔۔ عظمیٰ انکار کر دے۔ میں کیا کروں گا۔ آخر کوئی زبردستی تو نہیں کر سکتا۔"
"امی کر سکتی ہیں۔ آپی کو دھمکی دے کر۔ زہر کھانے کی کھائی میں کودنے کی اور وہ یہی کر رہی ہیں۔"

"اف۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے؟" اس نے ماتھا مسلا۔

"ہے نا۔ تبریز بھائی کی شادی سے پہلے آپی کی رخصتی چاہتی ہیں۔ آپ مدد نہیں کریں گے۔" نوید کو اسما پر ترس آیا۔ ہمدرد بہن۔

"میں کیا مدد کروں گا۔ تم نانی اماں سے کہو۔"
"آپ اور آپی کے حالات ملتے جلتے ہیں بھائی! شاید قدرت آپ کو آپی سے ملانے کی تدبیر بتجھا رہی ہے۔ سوچیں ذرا۔ یہ اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔ مسئلہ کے حل کے۔" اسما نے دھماکا کر دیا۔
"مگر۔۔۔ خالہ جان کیوں مانیں گی۔ جب ارادہ کر چکی ہیں۔" نوید کے کانوں میں کوئل کی فریاد گونجی۔
"مان لیں گی۔ امی نے بھی خود کشی کی دھمکی دی ہے انہیں۔ تو ویں اس سے اچھا رشتہ آج کل میں آ گیا تو پھر اس سے کر دوں گی۔ بھائی آپ اس کھوسٹ موٹے بندر سے بھی گئے گزرے ہیں کیا؟" ایک اور بم پھٹا۔
"اچھا۔۔۔ مجھے سوچنے کا موقع تو دو یہ بھلا۔۔۔ کس طرح۔۔۔ تبریز کی شادی سے پہلے او خدا۔"
"بھلا برا سوچنے کا موقع نہیں ہے۔ نانی اماں نے آپ کا نام لیا ہے۔" ایک اور بم۔۔ انکشاف در انکشاف۔
نوید سوچ کے بھنور میں غوطہ زن۔ امی کے بغیر۔۔۔ ان کی مرضی لیے بغیر۔ کوئی بہن نہیں۔ کس طرح آخر۔ سر کھجا کھجا کر عقل بر تد کرنے کی کوشش کی۔ لاحاصل، ماموں آ گئے۔
"چل بیٹا! ایک زندگی بچانی ہے۔ ایک کارنامہ ہی کر گزریں۔ گاڑی باہر کھڑی ہے۔ چل بڑو۔ زہر کھا کر نہ مری تو اس موٹے بھینسے بس والے کے گھر جا کر روز مرے گی۔ ہم اتنے سنگدل نہیں۔" ماموں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
کیسا تجسس۔۔۔ کیسی چھٹی۔ گاڑی میں ہنستی کھلکھلاتی مامی اور شریر بچے۔

☆ ☆ ☆

ایبٹ آباد میں سردی عروج پر تھی۔ ماموں کوٹ سوئٹر جیکٹ ساتھ لائے تھے۔
"ایسا ہے ٹھیک ہے کہ ابھی پرسوں ہی ہم حل کر گئے ہیں۔ مگر حج پر تو اگلے ہفتے جانا ہے۔ کیوں نہ آدھا حج یہاں کے برفانی موسم کے ساتھ کر لیا جائے۔ کہاں ہے عظمیٰ؟ بلاؤ۔ ابھی منگنی نکاح کل۔"
ماموں نے خالہ جان کو ہولا دیا۔ سمجھ میں نہ آیا آدھا حج کیسا؟ نوید کو شرم آ رہی تھی۔ اسما کے کھلکھلاتے وجود کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔ اسما نے "آنا" "فانا" سرخ شال صوفے پر بچھا کر اسٹیج کی شکل دی۔ چائے کا پانی عظمیٰ کو چڑھانے کا کہہ کر نانی کو لے آئی۔
تب ہکا بکا خالہ جان کی سمجھ میں کچھ آیا۔ انہوں نے عجب منظر پیش کیا۔ چیخ مار کر نوید کی طرف دوڑ دی۔ اس نے پھرتی کا مظاہرہ چھلانگ لگا کر خالو کے پیچھے چھپنے سے کیا۔ مگر۔۔۔ خالہ جان "اماں سے لے بھائی کی طرف لپکیں۔ ماموں کو گلے لگا کر رونے لگیں زار و قطار۔ مامی نے باضابطہ اور باقاعدہ نوید کے لیے عظمیٰ کا رشتہ طلب کیا۔
خالو جان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نوید کو لپٹا لیا۔ جو پہلے ہی ان سے چپکا عروسی اسٹیج پر بیٹھا تھا۔ خالو جان اب قہقہے لگا رہے تھے۔ خالہ جان بھی حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگیں رونا دھونا بھول کر۔
"ہاں، ہاں بلاؤ عظمیٰ کو۔" خالو جان چہکے۔ "مگر مٹھائی تو شاید موجود نہیں۔ ہم چائے اور بسکٹ سے منہ میٹھا کر لیں گے کیوں بیگم صاحب۔"
"ہم مٹھائی لے کر آئے ہیں بھائی جان! سب کا منہ میٹھا کرا دیں گے۔" مامی نے تسلی دی۔
گھر میں عجب طرح کی افراتفری پھیل گئی۔ سب ان دیکھے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ اٹھا پٹخ کی آوازیں۔ برتنوں کی کھنکناہٹ۔ نوید لاؤنج میں اسی جگہ اکیلا بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ پھر عظمیٰ کہیں سے برآمد ہوئی۔ نوید کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔
"ارے آپ اکیلے بیٹھے ہیں؟"
"ہونق لگ رہا ہوں نا۔۔۔" نوید اس کے متوجہ ہونے پر جھینپ گیا۔
"نہیں۔۔۔ میں اسما کو بھیجتی ہوں۔ اصل میں امی تو فون پر مصروف ہیں اور ماموں بس اسٹاپ پر۔۔۔ مٹھائی کو لینے گئے ہیں۔ اس کو اسما نے پہلے ہی۔۔۔ یعنی کہ فون!" کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔
نوید نے چاہا۔ عظمیٰ سے پوچھے۔۔۔ تم اس رشتے پر راضی ہو؟ مگر وہ اندر جا چکی تھی۔ لیکن ایک بار پھر آ گئی۔ نذر آن کرنے۔۔۔ نوید نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ تمہی نے پھر اندر بھاگنے کی کوشش کی۔ نوید کو دیکھ کر رک گئی۔
"وہ فون میں نے کروایا تھا اسما سے۔" اور اندر۔ واہ رے۔ میں ہی احمق ہوں۔ ہر کوئی مجھے بے وقوف بنا لیتا ہے۔ لیکن ایک سکون کا احساس۔ اس نے خود کو صوفے پر لڑھکا دیا۔ ہیٹر نے فوراً حرارت اگلنی شروع کر دی تھی۔
عذیر کے آتے ہی منگنی کی رسم ہو گئی۔ گلابی دوپٹے کے درمیان عظمیٰ کا چہرہ چمک رہا تھا۔ خالہ جان مسلسل مسکرا رہی تھیں۔ نانی اماں نے دونوں کو انگوٹھیاں پہنائیں جو ماموں ابھی بس اسٹاپ کے قریب کسی جیولرز کی دکان سے خرید کر لائے تھے۔ نانی کی دعائیں دونوں کے سکھ چین اور خوشیوں کے لیے موقع ملتے ہی نوید نے چپکے سے عظمیٰ سے کہا۔
"یہ تقریب چند دن بعد بھی بہتر طریقے سے ہو سکتی تھی۔ ماموں نے جلد بازی کے ریکارڈ توڑ دیے۔"
عظمیٰ کی طرف سے سخت آواز میں جواب آیا۔
"چند دن بعد تو آپ کو کفن لانا پڑتا۔"
نوید نے جھرجھری لی۔ ماموں کو دیکھا۔ ان کے فیصلے بروقت ہوتے تھے۔ کاش۔ امی کو بھی ماموں والی سوجھ بوجھ اور فیصلہ کرنے کی فراست ملی ہوتی۔ وہ تو بیٹیوں، دامادوں کے جنگل میں گرفتار تھیں۔
بے یقینی کی فضا میں سب نے کھانا کھایا اور حسب روایت سب نے رات بسر کی۔ نانی اماں کے کمرے میں نوید اور ماموں۔ گیسٹ روم میں مامی اور بچے۔ نوید کی نیند غائب تھی۔ مستقبل کی فکر۔ زندگی کے اس حسین خوش نما موقعے پر تنہا۔ امی کے بغیر۔ ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر اور خالہ جان اور نانی اماں کسی کو بھی خیال نہیں آیا۔ یہ کیسی شادی تھی۔ نہ

صبح نانی اماں کا فون آگیا۔ خیریت اور دعائیں۔ سلام کو پھر فون آیا۔ کچھ نئی ہدایات کے بعد۔

"اے عظمیٰ سنو! آج صبح سے کوئل کوکی چپ ہے۔ میں جانوں مر کھپ گئی۔ ٹھنڈ سے جم نہ گئی ہو۔ فکر ہیں۔"

نوید نے بھی ریسیور میں کان گھسائے ہوئے تھے قہقہہ لگا کر نانی سے کہا۔ "نہیں نانی اماں! نہ مری نہ ٹھٹھری آپ کیسے اس کی آواز سن سکتی ہیں بھلا۔ وہ بہار میرے ساتھ آگئی ہے۔ اپنے پیا کے ساتھ۔"

عظمیٰ سرخ چہرے کے ساتھ مسکرا دی۔

ماموں، مامی اور بچوں نے اودھم مچایا ہوا تھا۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ نانی کا فون بند ہونے کے بعد لاہور سے فون آگیا۔ مگر۔۔۔ یہ فون امی نے کیا تھا۔

"نوید! بہت صبر کر چکی۔ اب برداشت نہیں ہوتا بیٹا! میں اب۔۔۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم مجھے اپنے ساتھ۔۔۔ مجھے اب تمہارے پاس رہنا ہے۔"

نوید کے ہاتھ سے ریسیور گرنے لگا۔ امی پر کیا بیتی کیا ہوا۔ ان کی آواز میں نقاہت تھی۔ پچھتاوا یا شکستگی بے یقینی۔ نوید نے ماموں کو پکارا۔ زور سے۔۔۔ کچھ دیر سو ہیجانی کیفیت طاری رہی۔ امی۔۔۔ نوید کی امی دل برداشتہ ہو کر آرہی تھیں۔

دوپہر کی فلائٹ تھی۔ نہ جانے کیا ہوا تھا۔ بیٹیوں کی محبت نے۔۔۔ دھوکا دیا دامادوں کے لالچ نے نوید کی قدر اجاگر کی تھی۔ وہ اور ماموں عظمیٰ کو لے کر ایئرپورٹ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ خوشی فکر اور اندیشے نہ جانے کیا سننا ہوگا۔ گاڑی ایئرپورٹ کی جانب رواں دواں تھی۔

شاید دامادوں کے فریب سے آشنا ہو گئی تھیں۔

اب سب ٹھیک ہونے والا تھا۔ آخر کار ہے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

امید نے ابھی سے بہار کی نوید سنا دی تھی۔

حالانکہ یہ خزاں کا موسم تھا۔ مگر پھولوں کے کھلنے کے دن قریب تھے۔ بہت قریب 'بہار خزاں' کے تعاقب میں تھی۔

ڈھول نہ باجا۔ مہندی نہ برات مگر قدرت کی مرضی۔ سب کچھ اسی طرح ہونا تھا۔

صبح ناشتے کے بعد نکاح ہوا۔ خالو جان نے کافی مہمان جمع کر لیے تھے۔ نانی اماں نے دونوں کو نصیحتوں کے ہار پہنائے۔ دعاؤں کے گلدستے حوالے کیے۔

"اے میں نے کہا نوید! بھلا آج کوئی اس نگوڑی کوئل کو بتا دیتا کہ آم، جامن کا موسم تو کب کا رخصت ہوا۔ ارے بابا! اتنی سردی ہو رہی ہے۔ مگر کوئل کی آواز میں وہی کرارا پن ہے۔"

ایسے وقت بھی نانی کوئل کو نہیں بھولی تھی۔ عذیر مذاق اڑانے لگا کہ شاید کسی پڑوسی کے پاس ریکارڈ ہے جو وہ بجاتا رہتا ہے۔ ورنہ اس موسم میں کوئل۔

رخصتی بہت باوقار سادگی سے ہوئی۔ نوید کو شرمندگی ہو رہی تھی۔ کپڑے زیور سب خالہ جان نے دیے تھے۔ وہ تو ہاتھ ہلاتے آگئے۔ ماموں کی جلد بازی اف۔ راستے میں نوید نے عظمیٰ کی طرف منہ کر کے سرگوشی کی۔

"میں پوری کوشش کروں گا، تمہیں ہر خوشی فراہم کروں۔ دعوا نہیں کر سکتا کہ کمزور انسان ہوں۔ غلطی کوتاہی کر سکتا ہوں۔ تم یاد دلا دینا۔"

"آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ میں البتہ کمزور بندی ہوں۔ لیکن مجھے اپنے اللہ اور اپنی تقدیر پر بھروسا ہے۔ میں ہر حال میں خوش رہوں گی۔"

"ارے بھئی۔ کچھ زور سے بولو۔ کیا شکوے گلے کر رہے ہو تم۔" ماموں نے اگلی سیٹ سے کہا۔

دونوں شرما گئے۔ بچے تالیاں بجانے لگے۔ گھر پہنچ کر کچھ ہنسی مذاق اور آرام کے بعد ماموں مامی اپنے گھر چلے گئے۔ اگلے دن ناشتہ، کھانا لائے بنا کر۔

نوید کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ مگر عظمیٰ کے مطمئن چہرے اور بااعتماد رویے نے اسے اپنی خوش قسمتی کا یقین دلا دیا۔ یہ قدرت کی طرف سے ان کو انعام ملا تھا۔ نیکی، ہمدردی، صبر، استقلال کا۔ خوشی اور اطمینان۔

☆ ☆ ☆



نعیمہ ناز سلطان

بمپر ڈھمپر 'اب تو بس لیا' بچے کو پیک کیا اور جان چھڑائی۔" ساس کو ایک اور موقع مل جاتا۔

بس ساری باتوں کا لب لباب یہی تھا کہ فارغ مت بیٹھو، گھر کے کام کرو، بچے پالو، سینا پرونا کرو، عورت کو آخر اللہ نے کس لیے پیدا کیا ہے؟ ہاں یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی عورت جو غلطی سے اپنے ہاتھ میں سوئی دھاگے کی جگہ کاغذ قلم رکھ لے تو؟ جیسے بہت سارے شرفا کے بیچ ایک بوکھلایا ہوا مجرم۔

کبھی قسمت سے کاموں سے جلدی جلدی فارغ

"اللہ کسی عورت کو لکھاری نہ بنائے، جو بنا دے تو شادی نہ کرے، شادی ہو جائے تو بچے پیدا نہ کرے اور جو بچے بھی ہو جائیں تو؟ اس تو سے آگے بڑے بڑے کئی سوالیہ نشان تھے جو الفسین حیات کی زندگی میں رقص کرتے رہتے تھے۔

بھری پری روایتی سسرال میں بہو ویسے ہی گھن چکر بنی رہتی۔ صبح سے رات ہو جاتی۔ رات سے پھر صبح اور پھر دوبارہ رات، مگر کام "اف کام سمٹنے میں، نمٹنے میں ہی نہیں آتے تھے۔ پہاڑ برابر کام ہو جاتے، کسی کو نظر نہیں آتے۔ رائی برابر بھی کچھ رہ جاتا تو فوراً نظروں میں آجاتا۔"

"اللہ جانے دماغ کہاں رہتا ہے؟ بتاؤ ذرا، میرا حامد بھری دوپہر میں کالج سے گھر واپس آیا ہے۔ بے چارہ بھوکا، پیاسا، ارے یہ نہیں کہ لپک کے ایک گلاس ٹھنڈا پانی اسے پلا دے۔ وہ بے چارہ تو بھابھی بھابھی کرتے آگے پیچھے گھومتا رہتا ہے۔ ادھر ان کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" ساس کو موقع مل جاتا۔

الفسین چور سی بن جاتی، جلدی جلدی ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے جا کر حامد کو پکڑاتی۔

"رہنے دیں، میں نے دے دیا ہے بھائی کو پانی۔" چھوٹی نند احسان جتاتی۔

"اچھا بھئی۔ تو یہ نیک کام پہلے ہی کر لیتیں۔ مگر پھر بہو میں برائی کیسے نکالی جاتی۔"

"اپنے ہی خیالات میں گم رہتی ہیں۔ کام کی طرف دھیان ہی نہیں کوئی۔" اس کا خاموش رہنا بھی ایک مصیبت، منہ بولنا قیامت۔"

بچہ چھوٹا، دادی پھوپھی ویسے تو خوب خوب لاڈ کرتیں۔ مگر بس اس وقت تک جب تک وہ خوشگوار موڈ میں ہنستا کھیلتا رہتا۔ ذرا وہ رویا، اسے آواز لگی، گھر کے روز مرہ کاموں کے ساتھ ساتھ وہ بچے کے کام بھی کرتی رہتی، اب اسے فیڈر پلانا ہے۔ اب فیڈ کرانا ہے۔ ہر تھوڑی دیر بعد اسے چینج کرنا، دن میں ہر وقت بچے کو بیک بھی نہیں رکھ سکتے۔

"سات بچے پالے ہیں میں نے، کبھی نہ پہنائے یہ

ہو کر بچے کو کھلا پلا بہلا کر وہ فرصت کے دو چار پل چرا کے کاغذ قلم سے ناتا جوڑنے کو جرات کر ہی لیتی۔ مگر ذرا دیر بعد ہی بچہ اٹھ کر یوں روتا جیسے کسی نے پٹائی لگادی ہو۔ چٹکیاں کاٹ لی ہوں، نوچ دیا ہوا ہے۔

"بھابھی! کچھ تخلیق کرنے سے پہلے اپنی تخلیق کو تو سنبھال لیں۔" نند آواز لگاتی۔ اس گھر میں ہر فرد کو آزادی تھی کہ وہ جب اور جیسے چاہے اپنی زبان کا استعمال کر سکتا ہے۔

وہ بھاگی بھاگی جاتی اور بچے کو چپ کرانے میں لگ جاتی۔ فرصت کے وہ چند لمحات یوں ہی بیت جاتے، پھر وہی روٹین۔

رات میں سونے سے پہلے کوشش کرتی کہ تھوڑا سا لکھ لے تو شوہر صاحب کبھی موڈ آف کر کے، کبھی لہجے میں شوخی بھر کے اس کا آنچل تھامتے۔

"ارے بھئی ہمیں بھی کچھ وقت دے دیا کرو۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی۔ کاغذ قلم پیچھے رہ جاتا۔

شوہر کی رضا اور خوشی کو مقدم رکھنے والی عورتیں جنتی ہوتی ہیں۔ پتا نہیں بیوی کی کبھی کوئی مرضی کوئی خوشی ہوتی ہے کہ نہیں؟

اس آنکھ مچولی میں دوسرا بچہ بھی ہو گیا۔ بیٹی پا کر وہ تو خوش تھی۔

"میرے بچے بھی یوں ہی ہوئے تھے۔ پہلے بیٹا، پھر بیٹی، باری باری ایک لڑکا، ایک لڑکی۔" ساس زور و شور سے بیان کرتیں۔ یہ دراصل ایک تنبیہہ تھی کہ بی بی اگلی باری بیٹے کی لگانا، ایسا نہ ہو کہ بیٹیاں پیدا کر کر کے ڈھیر لگادو۔

مگر وہ کون سا بچوں کی لائن لگانے جا رہی تھی۔ جو اسے فکر ہوتی۔ اس کا شوق تھا یا جنون، ڈھیروں ڈھیر کام کرنے پر بھی، سیکڑوں باتیں سننے پر بھی، ایک کے بعد ایک چار بچوں میں گھر جانے کے باوجود بھی اس نے قلم سے اپنا رشتہ جوڑے ہی رکھا، بے ربط ہی سہی، ٹوٹا پھوٹا ہی سہی، کمزور سا ہی سہی، مگر یہ رشتہ برقرار رکھنے کی سعی کی اس نے۔

بیٹی اکلوتی تھی، باقی تینوں لڑکے۔ معاشرتی روایات کے مطابق اب افشین کا پلہ کافی بھاری ہو گیا تھا۔ ساس اتنی باتیں نہ سناتی تھیں۔ نہ نندیں پہلے جیسی باتیں بناتی تھیں۔ سسر بھی کبھی کبھار حمایت لے لیتے کسی معاملے پر۔

شوہر خوش تھا تین بیٹوں کا باپ بن کر۔ نندوں کی بھی شادیاں ہو گئیں۔ دیوروں کی بھی۔ آنے والیاں عقل مند تھیں۔ اپنے اپنے شوہروں کو لے کر چمپت ہو گئیں۔ کون بڈھے ساس، سسر کی روز، روز جھک جھک سنے۔ آئے دن نندوں اور ان کے کنبوں کی مہمان داریاں بھگتائے۔ "اپنا میاں، اپنے بچے بس۔"

مگر ساس اس کی ذمہ داریاں کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ ساس، سسر کو بیٹوں کے جانے کے بعد بیماری، بڑھاپے اور چڑچڑے پن نے نازک آبگینہ بنادیا تھا۔ وہ ہر دم یہی کوشش کرتی رہتی کہ ان آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ اپنے بچوں کو بھی پوری توجہ اور وقت دینے کی کوشش کرتی۔ مگر کہیں نہ کہیں چوک ہو جاتی۔ بیٹے کھلونوں سے اور چیزوں سے بہل جاتے۔ بیٹی میں شاید اس کی روح سمائی تھی۔ ماں کہانیاں لکھنے کی شوقین، بیٹی کہانیاں سننے کی شوقین اسے روزانہ کہانی چاہیے تھی۔

افشین حتی الامکان کوشش کرتی کہ روزانہ رات سونے سے پیشتر اسے کہانی ضرور سنائے۔ مگر آئے دن ہی اس سے چوک ہو جاتی۔ جلدی جلدی کام نپٹاتی تو کبھی کسی بچے کی بیماری، کسی کا ہوم ورک۔ جو بیٹا سب سے چھوٹا تھا۔ اسے ہر وقت ماں کی گود چاہیے تھی ورنہ ریں ریں کرتا رہتا۔ پھر نندوں اور دیوروں کے گھر قریب ہی تھے۔ اکثر ہی رات میں کھانے اور کام سے فارغ ہو کر کوئی نہ کوئی آجاتا۔ سب کو بھگتاتے بھگتاتے اتنا وقت ہو جاتا کہ بیٹی اکثر سو جاتی۔ سوئی ہوئی بیٹی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی۔ ابتدا میں اس نے بیٹی کو دادی کی طرف ہنکایا۔

"جاؤ، دادی سے سن لو کہانی، ہم بھی اپنی دادی سے کہانیاں سنتے تھے۔" اس نے اپنے بچپن کی یاد بیٹی کو بتائی۔

دادی نے سنا تو ٹھٹھا مار کر ہنسیں۔

"اے لو، ہم نے الف سے بے نہیں پڑھا۔ کہانیاں کیسے سنائیں۔ اپنی ماں سے سنو، دن بھر کاغذ پہ کہانیاں بناتی رہتی ہے۔" شان بے نیازی سے انہوں نے پوتی کو واپس بہو کے پاس بھیج دیا۔

رات سونے سے پہلے بیٹی آوازیں لگانا شروع کر دیتی۔

"مما! کہانی سنادیں۔"

"ہاں بیٹا! بس ابھی آئی۔" وہ جلدی جلدی چھوٹے کا فیڈر بنا کر اس کے منہ میں ٹھونستی۔

کبھی وہ اچھا خاصا بیٹی کے برابر لیٹ کر اسے مزے سے کہانی سنا رہی ہوتی کہ کھیل میں مگن دوسرے بیٹے آپس میں ایک دوسرے سے الجھ پڑتے۔ شور شرابا، ہنگامہ، وہ بیچ بچاؤ میں لگ جاتی، کہانی ادھوری رہ جاتی۔ سدرہ ادھوری کہانی سن کر ہی سو جاتی، ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہ کبھی پوری کہانی سن کر بھی سوتی تھی۔ مگر وہ اپنی مما کو روزانہ تاکید کرتی۔

"مما! مجھے روز کہانی سنایا کریں۔"

"ہاں بیٹا، روز کہانی سناؤں گی اپنی بیٹی کو۔" وہ اسے چمکارتی۔

"پوری کہانی۔" سدرہ ماں کو مزید پکا کرتی۔

"بالکل۔ میں پوری کہانی سناؤں گی۔" وہ وعدہ کرتی، مگر وہ اپنے وعدوں کو ہمیشہ پورا کرنے سے قاصر رہتی، کبھی یہ وعدے پورے ہو جاتے اور کبھی ادھورے رہ جاتے۔

وقت کتنی تیزی سے بھاگتا ہے۔ افشین کو کبھی بہت حیرت ہوتی۔ سدرہ اب اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ کہانیاں سننے کی عمر سے نکل آئی تھی۔

"مما! میں نے بھی ایک کہانی لکھی ہے۔" وہ آٹھویں کلاس میں تھی، جب اس نے اپنی ماں کو اپنی پہلی تحریر دکھائی۔ افشین پڑھ کر پہلے دنگ رہ گئی اور پھر خوش، بیٹی کو ماں سے ورثے میں لکھنے کی صلاحیت ملی تھی۔

"میری بیٹی اپنی امی سے بھی اچھی اور بڑی لکھاری بنے گی۔"

اپنی خواہش کو اس نے دعا کی شکل میں مانگا اور کچھ وقت قبولیت کے ہوتے ہیں، اس کی دعا اور خواہش پوری ہونے لگی۔ سدرہ نے بہت چھوٹی عمر سے بہت اچھا لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی صلاحیت خداداد تھی۔ مطالعے اور محنت نے اس صلاحیت کو اور نکھار دیا۔ گریجویشن کر کے فارغ ہوئی تو بطور لکھاری افسانوں کی دنیا میں اپنی ایک شناخت بنا چکی تھی۔ وہ اب باقاعدہ لکھ رہی تھی اور بہت اچھا لکھ رہی تھی۔ ان ہی بے حد مصروف اور بہت خوشگوار دنوں میں اس کی بہن نے اپنے بیٹے کے لیے اسے مانگا۔

سدرہ کی رائے لے کر انہیں ہاں کر دی گئی۔ افشین کو اس بات کی طرف سے اطمینان تھا کہ سدرہ کے لیے شادی کے بعد بھی اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے دروازے کھلے رہیں گے کہ ان کی بہن کا پورا گھرانہ اعلا ظرفی اور کشادہ دلی کی دولت سے مالا مال تھا اور یہی ہوا۔

شادی کے بعد ایک بیٹی اور سسرال کی ذمہ داریوں کے ساتھ وہ باقاعدہ لکھ رہی تھی اور خوب لکھ رہی تھی، جاننے والے حیرت بھی کرتے اور رشک بھی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی عورت کے ساتھ، شوہر کا "خصوصاً" اور سسرال والوں کا "عموماً" تعاون ہو تو اس کے لیے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنا اور اپنا کیریئر بنانا "نسبتاً" آسان ہو جاتا ہے۔ ورنہ جو کبھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے یا پھر خود کو اندر سے مارنا پڑتا ہے۔

سدرہ خوش نصیب تھی۔ اسے تعاون کرنے والے افراد کا ساتھ ملا تھا۔ افشین حیات کے دور سے سدرہ اظفر کے دور تک بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ پرائیویٹ ٹی وی چینلز اور پرائیویٹ پروڈکشن نے ڈرامے کی روایت کو ایک بار پھر زندہ کر دیا تھا۔ ڈائجسٹوں میں شائع شدہ ناولز پر مبنی ڈرامہ سیریلز نے دھوم مچادی تھی۔ سدرہ کا ایک ڈرامہ کیا ہٹ ہوا۔

اس کے پاس نئی پروڈکشن ہاؤسز کی آفرز آئیں۔ مگر سدرہ نے یک بیک انکار کر کے سب کو حیران کر دیا۔

"کسی نے منع کیا ہے تمہیں؟" افشین یہ سوال پوچھتے وقت خود بھی تذبذب میں تھی۔ سوچ رہی تھی کہ بھلا کون منع کرے گا اسے؟

"نہیں مما! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی نے منع نہیں کیا۔ میں نے اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"مگر کیوں؟" افشین کے چہرے پر حیرانی رقم تھی۔ چونکہ ابھی کچھ ماہ پہلے ہی تو وہ بڑے ذوق و شوق سے ان سے ایک آئیڈیا ڈسکس کر رہی تھی۔ اپنے نئے ڈرامے کے لیے اور اب یہ انکار؟

"بچے نظر انداز ہو رہے ہیں امی! ریان بہت چھوٹا ہے۔ اسے فل ٹائم میری توجہ چاہیے۔ پہلے خالہ دونوں بچوں کو دیکھ لیتی تھیں۔ اب جب سے وہ پیرالائز ہوئی ہیں۔ بے چاری خود مجبور ہو گئی ہیں۔ ایشا ہے، وہ بالکل مجھ پہ گئی ہے، جیسی میں تھی بچپن میں۔" سدرہ مسکرائی اور چند لمحوں بعد دوبارہ کہنے لگی۔

"اسے روزانہ ایک نئی کہانی سننی ہوتی ہے مجھ سے۔ کسی دن میں مصروف ہوتی ہوں اور وہ کہانی سنے بغیر سو جائے تو اگلا پورا دن شکایتیں کرتی رہتی ہے کہ آپ نے مجھے رات کو کہانی نہیں سنائی۔ مما! میں نہیں چاہتی کہ میں خود تو دوسروں کے لیے کہانیاں لکھوں اور میری اپنی بیٹی کہانی سننے سے محروم رہے۔"

سدرہ عام سے لب و لہجے میں بول رہی تھی۔ مگر یکایک ہی افشین کے دل میں جیسے کوئی بھالا پیوست ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا مما؟" ماں کا متغیر چہرہ دیکھ کر سدرہ پریشان ہو گئی۔

"تم بھی تو کئی بار کہانی سنے بغیر سو جاتی تھیں۔" افشین نے جیسے سرگوشی سی کی تھی۔

"آپ بہت مصروف رہتی تھیں۔ کبھی مہمان داری، کبھی تیمارداری، پھر بھی۔"

"تم مجھے قصوروار سمجھتی ہو۔" افشین کا حساس دل اسی بات پر اٹکا ہوا تھا۔ اس نے سدرہ کی بات کاٹ کر مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت بچپن میں، مجھے آپ سے شکایت ہو، اس بات کا احساس ہو، مگر آج، جب میں آپ کی جگہ ہوں تو سمجھ سکتی ہوں کہ عورت کو کہاں کہاں کیسے کیسے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔" اس نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ آپ میری بات سے ہرٹ ہوئی ہیں۔ آپ یقین کریں میرا کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں آپ پر، اپنی اتنی اچھی ماں پہ طنز کروں۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ کچھ وقت اپنے بچوں کو دوں، کیونکہ اس وقت انہیں میری ضرورت ہے۔ میرے بچوں کو میری ہر وقت کی اٹینشن چاہیے۔ پھر خالہ کی بیماری ہے۔ حالانکہ میری دیورانی بہت اچھی ہے۔ مگر بڑی بہو اور بھانجی ہونے کے ناتے خالہ جان کو مجھ سے زیادہ توقعات ہیں۔ میری کوشش ہے کہ میں ان کی توقعات پر پورا اتروں۔ آخر انہوں نے بھی تو ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ میرے ساتھ تعاون کیا۔" سدرہ بولتے بولتے مسکرا دی۔

"اور رہی بات لکھنے کی، تو بالکل تھوڑی چھوڑ رہی ہوں۔ ڈائجسٹوں کے لیے لکھتی رہوں گی۔ بس ٹی وی کے لیے جو وقت چاہیے، میں فی الحال وہ وقت نہیں دے سکتی۔ دیکھیں کچھ عرصے بعد، خالہ ان شاء اللہ تعالیٰ ٹھیک ہو جائیں گی۔ بچے کچھ بڑے ہو جائیں گے۔"

سدرہ کا لہجہ پر سکون اور ہموار تھا۔ اس کے چہرے پہ سچائی اور سادگی تھی۔ مگر افشین۔ ان سب باتوں کے باوجود بھی نہ جانے کیوں اس کا دل و دماغ ایک ہی فقرے میں اٹکا ہوا تھا۔

"میرے کہانیاں لکھنے کا کیا فائدہ، جب میرے اپنے بچے کہانی سننے سے محروم رہیں۔"

ایک ہی جملے کی بازگشت اس کے حساس دل میں مسلسل چھید کر رہی تھی۔ خلش کا احساس تھا جو دل کے بیابان میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

☆

مکمل ناول

سمیرا حمید

# محبت میں جاں ہارو

وہ اس سے ناراض تھا۔ بلاشبہ۔ بہت ناراض تھا۔ لیکن آج عدن اس کے آفس میں آیا تو اس نے وہ ناراضی بھی چھوڑ دی۔

"کیوں آئے ہو؟" ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور معدوم ہو گئی۔

"افق کے لیے۔"

"بکواس بند کرو۔ تمیز سے بات کرو۔ بیوی ہے وہ میری۔" فرزام کا تو جی چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے۔ ورنہ اس کا گلا ہی دبا دے۔

"بیوی وہ تمہاری ہے۔ لیکن محبوبہ وہ صرف میری ہے۔ وہ آج بھی صرف مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"اسے تم بے وقوف بنا کر بھاگ گئے۔ اب پھر سے آ گئے ہو۔"

"بے وقوف تو تم ہو۔ جو اس کے ساتھ تعلق کا رشتہ سمجھ رہے ہو۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے صرف میرے لیے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ میں پچھلے پانچ چھ سال سے جیل میں تھا۔ مجھے میرا قابل وکیل اور امیر کبیر باپ بھی آزاد نہیں کروا سکے۔ لیکن افق نے کر دکھایا۔ یہ ہے اس کی محبت کی طاقت۔ وہ بہت قابل لڑکی ہے۔ کس کس سے جا جا کر ملی۔ میرے لیے درخواستیں دیں۔ صحافیوں سے ملی۔ پاکستانی کیمونٹی سے واک کروائی۔ اتنی بڑی این جی او کو میرے بے فعال کر دیا۔ کون کون آ کر وہاں مجھ سے نہیں ملا۔ اس نے این جی او کو فنڈز بھی دیے۔ یہ سب کیوں کیا اس نے؟ کس لیے؟ وہ میرے بغیر سانس نہیں لیا کرتی تھی۔ ایک بار پاکستان میں بھی جیل چلا گیا تھا۔ رو رو کر بیمار ہو گئی تھی۔ وہ رات رات بھر دعائیں کرتی تھی میرے لیے۔ اس وقت وہ میرے لیے دعا کر سکتی تھی۔ اس بار اس نے سب کر دکھایا۔ کیا یہ کم ہے سمجھنے کے لیے کہ وہ مجھ سے کس قدر محبت کرتی ہے؟ اتنے سال اس نے میری گمشدگی کا ہی سوگ منایا ہے۔ میری

زبردستی شادی کروی گئی تھی۔ اپنے باپ کی بیماری کے ہاتھوں میں مجبور تھا۔ تمہارے لیے اسے کبھی نہ چھوڑتا۔ وہ تو نہ ہنسی ہوگی نہ ہی روئی ہوگی۔ زندگی کو مر مر کر گزارا ہوگا۔ تم اسے کبھی نہیں جان سکتے۔ اس کے اندر کا بھید نہیں پا سکتے۔"

خاموشی کا وقفہ اس نے اپنی مرضی کا لیا۔

"اور نہیں تو اتنا ہی سوچ لو کہ اس جیسی شریف لڑکیاں محبت کے کھیل بار بار نہیں کھیلتیں ___ یہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو پہلی محبت کا جو پودا اپنے اندر لگا لیتی ہیں اسی کے نیچے اپنی قبر بنا لیتی ہیں۔ اسے اکھاڑ کر نہیں پھینکتیں۔ حالات سے مجبور ہو کر اگر اس نے شادی کر بھی لی تو ___ کیا وہ تم سے محبت بھی کرنے لگی؟ اگر کہہ بھی دیا ہوگا ___ جیسا کہ مجبور مشرقی لڑکیاں کہہ ہی دیتی ہیں ___ تو کیا وہ سچ کرتی ہے؟ اپنی ماں کی وجہ سے تم سے شادی کر لی ہوگی ___ یا سہارا چاہیے ہوگا۔ اس کا تو کوئی بھائی بھی بڑا نہیں تھا۔ تمہیں اس نے سہارا بنا لیا۔ لیکن جان ابھی تک اس کی میں ہی ہوں۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میرے بارے میں جانا تو باز نہیں رہ سکی۔ دیکھو! ہمارے تعلق کی مضبوطی کہ وہ میری طرف بھاگی آئی۔ عقل سے کام لو' اسے چھوڑ دو ___ اسے مجبور نہ کرو۔ اپنی اماں یا تمہارے کسی احسان کے وجہ سے وہ تو شاید تم سے نہ کہے۔ ایسے ہی مجبوری سے تمہارے ساتھ بندھی رہے۔ آزاد کر دو اسے۔ اور پھر دیکھو کہ کیسے بھاگی آتی ہے میرے پاس وہ۔ وہ مجھ سے یہاں بار بار چھپ چھپ کر ملتی رہی ہے۔ تب تم یہاں نہیں تھے۔ اس نے تمہیں بتایا کہ میں نے اس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے؟ چلو! میرے ساتھ اس کافی شاپ جہاں اس نے کافی پی تھی۔ کوئی ایک آدھ تو تمہیں ضرور بتا دے گا کہ وہ میرے ساتھ وہاں جاتی رہی ہے۔ اور کتنی باتیں بتاؤں کہ تم یہ یقین کر لو کہ وہ میرے لیے بنی ہے۔ تمہارے لیے نہیں اسے آزاد کر دو۔"

فرزام گم صم اسے سنتا رہا۔ سنتا رہا۔ دنیا کا کوئی بھی مرد ہوتا' وہ عدنان کو سنتا۔ عدن کا یقین کرتا۔ افق پر شک کرتا' اپنی قسمت پر روتا ___ اور نہیں تو اس سارے نقصان پر اس سب پر خودکشی تو ضرور ہی کر لیتا۔

وہ سب سنتے سنتے فرزام کہیں کا نہ رہا۔ وہ شخص اپنی مرضی سے بول کر چلا گیا۔ وہ فاتح تھا۔ آیا اور چلا گیا اور فرزام شکست خوردہ وہیں پڑا رہا تھا۔ اس نے ماں کو فون کرنا چاہا۔ گلا پھاڑ کر رونا چاہا ___ نہ فون کر سکا' نہ ہی رو سکا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ ___ وہ عدن سے پہلی محبت ___ مشرقی عورت ___ ٹھیک کہا اس نے۔ افق جیسی لڑکی محبت کا کھیل نہیں کھیلتی۔ محبت ایک ہی کرتی ہے اور اسی محبت میں خود کو فنا دیتی ہے۔

اس سے متاثر ہوتے۔ اس کے قریب آتے ___ اس سے محبت کرتے ___ فرزام عین وقت پر لٹ گیا۔ اب وہ کسی پل سے چھلانگ لگا دینے کے ہی قابل رہ گیا تھا بس ___ اب ایسے انجام کے ساتھ وہ کیسے زندگی جیے گا۔ کسی کو بتا بتائے وہ آفس سے چلا آیا۔ مجبوری کے ان دونوں کے رشتے کو اسے ختم ہی کر دینا چاہیے۔

وہ ناراض ہے۔ وہ مان جائے گی۔ لیکن وہ تو طلاق کی بات کر رہا ہے۔ وہ اس انگوٹھی کے انتظار میں تھی جو جلد ہی دوبارہ اسے پیش کی جائے گی اور وہ اسے باہر کا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ اس قدر پتھر دل ہو چکا تھا افق کے لیے اتنا متنفر۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں لوٹ کھسوٹ کرنے لگیں۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

فرزام نے اس کے ایسے دیکھنے پر اسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دو مختلف نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظر میں وہ روبوٹ گھوم رہا تھا جو صرف کام کرتا تھا۔ نہ ہنستا تھا۔ نہ بولتا تھا۔ نہ ہی زندگی میں زندہ تھا۔ وہ اندر باہر سے مردہ ہو چکا تھا۔

افق کی نظر اس فرزام پر تھی۔ جس کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت کا سمندر تھا اور جواب آنکھیں بدل رہا تھا۔ اب وہ شاید رومی کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اس کا یقین ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ فرزام نے سچ مان ہی لیا تھا کہ انار کلی بازار میں شادی کا سن کر بت بن جانے والا وجود عدن کی محبت کا سوگ ہی منا رہا تھا۔ وہ بھول گیا



کہ یونیورسٹی میں اس کے ساتھ وہ کس قدر خوش تھی۔ اب سے مان لیا تھا کہ وہ اس وقت وہ خود بہلا چکی تھی۔ وہ ایک بہلی ہوئی زندگی گزار رہی تھی ___ ایک مجھ سے تی ہی زندگی۔

"مجھے طلاق دے رہو؟" صرف سوال نہیں تھا یہ۔ "تمہیں اور کیا چاہیے؟ تمہیں عدن ہی چاہیے نا۔ تو تم آزاد ہو۔"

واقعات اتنے معمولی اور عام بھی نہیں تھے۔ جتنا یہ بظاہر نظر آ رہے تھے۔ کوئی شخص سربازار کسی دوسرے کی بیوی کا ہاتھ پکڑ لے اور کہے کہ یہ مجھ سے چھپ چھپ کر ملتی ہے تو یہ بات اتنی عام بھی نہیں رہتی۔ کوئی ایسے ہی کسی کی بیوی پر بات نہیں کرتا۔ صاف دل کے بڑے دل کے شوہر اگر غصہ پی بھی جائیں تو دلوں میں بال ضرور آجاتے ہیں۔ شک اور وسوسہ تو شیطان کا پسندیدہ ہتھیار ہے ___ جسے وہ ہمیشہ ہاتھ میں رکھتا ہے اور تاک کر موقعے سے انسان پر وار کرتا ہے اور زہر پھیل کر نس نس تک چلا جاتا ہے۔ تو یہ وار فرزام پر بھی کام کر گیا۔ تب ہی اس کا انداز زہر بند تھا ... جان لیوا تھا۔

"مجھے صرف فرزام چاہیے۔" پانی افق کے سر پر سے گزر چکا تھا۔ اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ فرزام کی زندگی سے نہ وہ جائے گی ___ نہ ہی اسے جانے دے گی ہر کام کو پھرتی اور دل جمعی سے کرنے والی افق' فرزام پر اپنی ساری جان لگا دے گی۔ جو ہو رہا ہے اسے ہونے نہیں دے گی۔

وہ تمسخر سے ہنسا۔ "یہ فرزام تمہارے پاس پچھلے تین سال سے ہے۔ کبھی تم اس کے پاس آئیں؟ اس فرزام سے تمہارا دل بہل رہا تھا ___ بس تمہیں ایک سہارا مل گیا تھا۔ گندم کی بھوسی میں جیسے آگ لگتی ہے اور بجھتی نہیں۔ ایسے ہی فرزام میں عدن آگ لگا گیا تھا اب یہ آگ بجھ نہیں رہی تھی۔

"نہیں ___ ایسا نہیں ہے ___ یہ غلط ہے۔"

اس نے اس کی بات کو درمیان میں ہی اچک لیا۔ "تم اپنے لیے آنے والے ہر رشتے کے لیے انکار کر رہی تھیں۔ تم نے تنگ آکر مجھے ہاں کہہ دیا۔"

"یہ غلط ہے فرزام! یہ زیادتی ہے میرے ساتھ ___ یہ جھوٹ ہے۔ تنگ آکر نہیں ___"

"پھر کیا تمہیں مجھ سے محبت تھی؟"

"محبت تو ہم دونوں کو ہی نہیں تھی نا۔ ہم نے ایک دوسرے کو جان کر ہی ہاں کی تھی۔ میں نے سب سچ بتا دیا تھا۔ میں تب نہیں کرتی تھی۔ مگر اب بہت محبت کرتی ہوں فرزام۔" اس نے ایسے وقت میں اپنی محبت کا اعلان کیا۔ جب اسے کوئی وقعت ہی نہ دی گئی۔

"کب کی تم نے مجھ سے محبت؟ میرا تمہارا محبت کا معاہدہ نہیں تھا ایمان داری کا تو تھا۔ مجھے تم اچھی لگیں۔ تمہاری شرافت' تمہارے کام' تمہارے اصول ___ بہت متاثر تھا میں تم سے۔ میرا ایمان تھا کہ صرف ایک افق جیسی لڑکی میری زندگی کو تباہ نہیں کرے گی۔ میں نقصان میں نہیں رہوں گا۔ میں بہت خوش نہ رہا تو ناخوش بھی کبھی نہیں رہوں گا۔ تمہارے جس حسن پر دنیا مرتی ہے نا ___ اس پر میں نے کبھی نظر نہیں ڈالی تھی کیونکہ ___ جو حسن تمہارے اندر تھا اس پر میری نظر تھی۔ گزرے سالوں میں میں نے رومی کو یاد کیا۔ تاکہ مجھے یاد رہے کہ مجھے رومی جیسی غلطی دوبارہ نہیں کرنی۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے مجھے بہت بار اس کے فون آئے۔ لیکن اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں اس سے بات کرنا میں نے گوارا نہیں کیا۔" آنسو کا گولہ اس کے حلق میں اٹکا۔

"تم سے متاثر ہوتا میں تمہارا مقید ہو گیا۔ تمہارے بغیر رہنا محال ہو گیا۔ پہلے تمہیں پرکھ رہا تھا۔ پھر تمہارے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن صرف تمہارے لیے کہ تم ماضی کے ہر طرح کے دکھ سے باہر نکل آؤ۔ تم اتنی مستحکم ہو جاؤ کہ تم ___ تمہیں مجھ تک آنے میں کوئی مسئلہ نہ پیش آئے۔ اس الٹ پلٹ میں' میں کہیں کا نہیں رہا۔ جس خوف سے بچتا رہا اسی سے محبت کرنے لگا۔ قسم کھائی تھی میں نے کہ کسی عورت پر یقین نہیں کروں گا۔ بہت یقین کیے تھے میں نے رومی پر ___ قسم توڑی اور نقصان بھی خود ہی اٹھایا۔" جسے

انگوٹھی پہنانا تھی وہ تقریباً" رو رہا تھا۔ جسے تالیاں بجوانا تھیں وہ سن کر سن ہو رہی تھی۔

"تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا افق؟ دل میں اسے چھپائے تم میرے ساتھ رہیں۔ دور۔ دور۔"

"میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ بار بار یہی کہوں گی' باقی باتیں حالات نے پیدا کردی ہیں۔ بظاہر وہ سچ ہیں۔ پر وہ جھوٹ ہیں۔ صرف ایک بار میرا یقین کرو۔ میرے ڈر نے مجھے دور رکھا۔ مجھے محبت کرنے سے ڈر لگتا تھا۔"

"محبت سے نہیں افق! کسی اور کے ساتھ محبت کرنے میں۔ تم وہی لڑکی ہو جو پہلی محبت کے نام پر زندہ رہتی ہے اور اسی پر مرجاتی ہے؟"

"ہاں! میں وہی لڑکی ہوں' جو محبت کے لیے جیتی اور مرجاتی ہے اور وہ تمہاری محبت ہے۔ میری اس اس نادانی کو محبت نہ کہیں۔ میرے شوہر کے برابر کوئی نہیں آسکتا۔"

"اس نادانی کو۔" فرزام نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "اپنی اماں کا لحاظ کررہی ہو۔ معاشرے کا۔ خاندان کا۔ مجبور ہو یا احسان اتار رہی ہو۔ آج تم مجھے چھوڑ کر جارہی ہو۔ مجھے ہی تمہیں چھوڑ کر رومی کے پاس چلے جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ تم نے وار میں اسے بھی مات دے دی۔ وہ صاف صاف انکار کرگئی۔ انگوٹھی منہ پر ماردی اور تم روایتی لڑکی' ڈرپوک اور شریف۔ پہلی محبتوں کو سینے سے لگائے رکھنے والی۔ تمہیں تو مجھ سے دور جانا آیا۔ نہ ہی قریب کرنا۔" غم و غصے سے وہ تقریباً" پاگل ہی ہوچکا تھا۔ اس کی آخری بات نے افق کو اندر تک نہس نہس کردیا۔

تو اب اسے بار بار رومی یاد آرہی ہے اور اب یہ خود رومی کے پاس جانا چاہ رہا ہے۔ اب وہ رومی کے لیے تڑپ رہا تھا۔

"تمہارا وہ امان تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہے۔ جس کے لیے تم نے اپنی محنت سے جمع کیا گیا پیسہ فنڈز میں دے دیا۔ اگر تمہارے اکاؤنٹ میں اور پیسے بھی ہوتے تو تم وہ بھی دے دیتیں نا؟"

"بکواس کی ہے اس نے سراسر۔ میں نے کوئی پیسے نہیں دیے۔ اس کی بات پر یقین ہے۔ مجھ پر نہیں۔"

یقین دراصل بروقت سچ بولنے پر کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ افق! اس کی کی گئی باتیں اب تک سچ ہی نکل رہی ہیں۔ کیا اس کا کہا سب سچ نہیں ہے؟ اگر وہ نہ ملتا تو تم مجھے بتاتیں یہ سب؟ شاید بنا بتائے ہی چھوڑ جاتیں۔ یہ شخص تمہارے کالج آیا۔ پھر اسٹور تک۔ تم لوگ کافی شاپ میں ملے۔ اس کے وکیل کے پاس تم بار بار جاتی رہیں۔ اور کیا کچھ تمہیں کرنا تھا افق؟ کیا کچھ اور اتنا کچھ چھپایا تھا تو بتانا کیا تھا؟"

"کہ مجھے تم سے۔ صرف تم سے محبت ہے۔ صرف اپنے شوہر سے۔ اپنے فرزام سے بہت بڑی غلطی کردی میں نے۔ دھوکا نہیں دیا۔"

"اب بھی کہہ رہی ہو محبت کا۔ اب بھی۔ کیا بھی اور میرے نام کا سہارا چاہیے؟ جب تک ڈاکٹر عدن کا کیس ختم نہیں ہوجاتا۔ کیا تب تک؟" وہ واقعی پاگل ہی ہوچکا تھا۔ اس کا دماغ جو جو کچھ سوچ رہا تھا اسے جانچے بغیر وہ زبان پر لارہا تھا۔

صوفے پر گرے ہوئے انداز سے بیٹھی وہ اونچی آواز سے بچوں کی طرح رونے لگی۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں فرزام۔ میرا یقین کرلو۔ چلو ہم پاکستان چلیں۔ میں نے کہا نہیں کہ میں محبت کرتی ہوں۔ لیکن مجھے کہنا ضرور تھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک ہے کہ تم میرے شوہر ہو۔ میں تمہارے پیروں میں گر کر معافی مانگ لیتی ہوں۔ میں نے اتنا کچھ چھپایا' لیکن میں نے ایک پل کو بھی دھوکا نہیں دیا۔ میں کس کی گواہی لاؤں کہ تمہیں یقین آئے۔ صرف اللہ ہی ہے جو سب جانتا ہے فرزام۔ اسی اللہ پر جو سب جانتا ہے' یقین رکھ کر میرا یقین کرلو۔ اسی خدا کے لیے میری بات مان جاؤ۔ صرف ایک بار خدا کے لیے۔"

جس وقت وہ یہ بات کررہی تھی ٹھیک اسی وقت بیل دی گئی۔ فرزام نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ افق بھی نڈھال ہوگئی۔ وہ اٹھ کر اندر جانے لگی۔ لیکن جسے اس سے ملنا تھا۔

فرزام نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر اس کی کنپٹی کی رگیں پھڑک کر تن گئیں۔ وہاں عدن کھڑا تھا۔

اس کی شکل پر وہی تاثر تھا' جو میدان جنگ میں دشمن کے سپاہیوں کی لاشوں کو ٹھڈے مارنے والوں کی آنکھوں میں ہوتا ہوگا۔ وہ عدن آگیا تھا۔ اپنی فتح کا جھنڈا فرزام نامی لاش پر گاڑنے۔

"افق مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔" اس نے ذرا سا جھک کر سرگوشی کی۔

چوٹ عین مقام پر لگی۔

"تمہیں پورا حق ہے۔" فرزام ذرا سی بلند آواز میں بولا۔ وہ بے انتہا غصے میں نظر آنے لگا۔ اس کا جی چاہا' گھونسا مار کر اس خبیث کو چت کردے۔ اسے مرنے سا مار دینا چاہیے تھا لیکن وہ باہر نکل گیا اور عدن اندر آگیا۔ افق دروازے کی طرف جب تک آئی فرزام باہر جاچکا تھا۔

"فرزام!" بند ہوتے دروازے تک یہ آواز پہنچی عدن دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہوگیا۔

"جانے دو اسے۔ اس نے ہی مجھے بلایا تھا کہ میں آکر تمہیں لے جاؤں۔"

افق نے اسے دھکا دیا اور لپک کر باہر نکلی۔ سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ فرزام وہاں نہیں تھا۔ وہ پارکنگ کی طرف بھاگی۔ فرزام کی کار تیزی سے وہاں سے نکلی اور وہ چلا گیا۔ اس نے نیچے آنے میں دیر کردی۔؟

نہیں۔ اس نے ہر معاملے میں دیر کردی۔ عدن سے متعلق ہر بات بتانے میں۔ اپنی زندگی میں فرزام کو اس کا مقام دکھانے میں۔ وہ اسے چھوڑ رہا ہے۔ یہ صرف عدن کی وجہ سے ہی نہیں ہوا۔ یہ افق کی وجہ سے ہوا ہے۔ افق کی آنکھیں جھلملائیں۔

دل کے رستے جان کیسے نکلتی ہے۔ وہ آنسوؤں کی زبان میں بتا سکتی تھی۔ واقعات ایسے کیسے بنتے ہیں وہ یک ایک کو سمجھا سکتی تھی۔ برسوں پہلے اس نے اپنی عقل پر ماتم کیا تھا۔ جب وہ عدن کے باپ کے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی۔ برسوں بعد بھی وہ اپنی عقل پر ماتم ہی کررہی تھی۔ وہ عدن کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکی۔

اب وہ حلق پھاڑ کر اعلان کرسکتی تھی کہ وہ فرزام سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اب اس اعلان کو کون وقعت دے گا۔ یہ ایسے ہی ہوا تھا جیسے کسی کے مرنے کے بعد اس کی پیدائش کا اعلان کیا جائے۔ پھر ایسی خبروں سے کسی کو کیا سروکار۔ فرزام تو جاچکا تھا....

کھڑے کھڑے افق پر بہت سی حقیقتیں وارد ہوئیں۔

وہ اس وقت اسے تنہا کرگیا ہے۔ یہ چھوٹی بات ہے۔ بڑی بات تب ہوگی۔ اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر نہ آئے۔

شاید ایک لمبی مسافت اس کے انتظار میں تھی۔

یا ایک طویل کرب۔

کیا وقت اسے اور سبق دینا چاہتا تھا یا وقت واقعی بے رحم بن کر اس سے کچھ چھین لینا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ اجنبی لوگ بھی اسے دیکھ لیتے تو ضرور اس سے پوچھتے "کیا ہوا؟"

وہ زیر لب اللہ کو یاد کرنے لگی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کررہی تھی۔ وہ تو مجسم التجا (دعا کی صورت جڑے ہاتھ) بنی کھڑی تھی۔

عدن کھڑکی میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہاں ایسے کھڑی تھی۔ جیسے اپنے ہی ہاتھوں اپنے تخت و تاج کے ٹکڑے کرڈالے ہوں۔ جیسے اپنے ہی مردہ وجود پر کھڑی ماتم کررہی ہو۔ ذرا سا دور۔ تھوڑا سا دھندلا ہی سہی عدن دیکھ رہا تھا کہ وہاں کون کھڑا ہے۔ وہاں امان کی افق نہیں کھڑی تھی۔ وہ اس کے لوٹ آنے پر نہیں' کسی اور کے چلے جانے پر ماتم کناں تھی۔

کیا وقت ایسے بدل جاتا ہے۔ اگر یہ وقت ہی ہے تو عذاب کا مستحق ہے۔

عدن نے صاف شیشے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ افق کو خود میں بھینچ لینا چاہتا تھا۔ وہ اس میں حلول کرجانا چاہتا

تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے بتانا چاہتا تھا ان سالوں میں اس پر کیا گزری۔ اس نے ایک ایک ساعت اس کے لیے جمع کر رکھی تھی۔ وہ گزری ساری ساعتیں اس کی جھولی میں ڈال دینا چاہتا تھا۔ وہ اب اسے ٹھیک ٹھیک بتانا چاہتا تھا کہ اس کی محبت اس پر کب اتری اس محبت پر اس کا ایمان کب مکمل ہوا۔ اس کاملیت کا لفظ لفظ وہ اس پر آشکار کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتائے گا کہ قید کے ان برسوں میں اس نے کتنی بار اسے پکارا۔ کتنی بار اس نے اسے خواب میں دیکھا اور آنکھ کھل جانے پر رویا۔

"وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔" اس نے غلطی کی۔

"وہ واپس آگیا ہے۔" غلطی کی اصلاح ہو گئی۔

افق ہتھیلی سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔ اسے اس پر ترس آ رہا تھا.... بہت آ رہا تھا۔ لیکن خود سے زیادہ نہیں۔ ترس اس نے پہلے خود پر کھا لیا تھا۔ اس نے ایک پرعذاب وقت کاٹا تھا۔ زیادہ رحم کا مستحق وہ ہی تھا۔ افق سے دور عدن اس سے زیادہ ہارا کھڑا تھا۔ وہ کیسے افق پر ترس کھا لیتا؟ اتنا ظالم کیسے ہو جاتا کہ خود کو ہی مار ڈالتا؟ عدن کے اندر افق کے لیے اب محبت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جتنی افق کا خیال تھا اس کے اندر فرزام کے لیے ہے۔

وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس حال کو پہنچی کھڑی ہے۔

وہ کس حال کو پہنچ چکا ہے۔ وہ کیوں نہیں پلٹ کر دیکھتی۔

وہ اپنے نفعے کی طرف کیوں نہیں پلٹ رہی؟

"یہ جو آسمان کا رنگ ہے۔ یہ کتنا پیارا ہے امان! مجھے اتنی دیر سے کیوں معلوم ہوا کہ آسمان اتنا خوب صورت ہے؟"

"تمہاری آنکھوں میں امان آ بسا ہے۔ اب تمہیں خوب صورتی کا ہر پیمانہ معلوم ہو گا۔ کہو امان جی! شکریہ...."

"اے اللہ شکریہ۔ میری آنکھوں کو امان دیا۔ یہ بند ہوئی ہیں تو اندھیرے پر بھی فدا ہوئی ہیں۔"

"میں ان پر فدا ہوں۔"

عدن نے اپنی گیلی آنکھیں صاف کیں۔ اب اسے افق کی نفرت ملے گی۔ ایک لمبا عرصہ ملے گی۔ فرزام اسے طلاق دے دے گا۔ وہ عدن سے نفرت کرے گی۔ ٹھیک کرے گی۔ افق کی ہے تو نفرت ہی سہی۔ اسے ایک طویل انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کی بچے جیسی محبت پانے کے لیے۔ اور وہ تو افق ہے۔ مستقل نفرت پال ہی نہیں سکتی۔ محبت کے بنا رہ ہی نہیں سکتی۔

وہ ضرور کرے گا یہ انتظار۔ اب وہ صابر بن جائے گا۔ اب وہ سب کرے گا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا، اب پریم امرت ہی پینا ہے۔ یہی خضر اب اسے زندہ رکھ سکے گا۔ ایک ایک بوند کے لیے وہ ہر حد سے گزر جائے گا۔ وہ افق کے لیے ہر پاتال میں اتر جائے گا اور اسے بھی گھسیٹ لے جائے گا۔ وہ اندر باہر سے افق ہو چکا تھا۔ اس کی ذات میں صرف اسی کا عکس جھلملا رہا تھا۔ وہ کیسے پیچھے ہٹ جاتا۔ اسی لیے وہ فرزام کے پاس گیا تھا۔ ایک سپر پاور ملک کی بدنام زمانہ جیل میں وقت گزارنے والے کو ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا کہ اسے کس وقت ان دونوں کے درمیان دخل دینا ہے۔

وہ اس بلڈنگ کے آگے پیچھے ہی ٹہل رہا تھا۔ فرزام آفس سے "فوراً" ہی اٹھ آیا تھا۔ وہ کیوں جلدی آیا تھا۔ عدن نامی نام نہاد دہشت گرد جانتا تھا۔ الٹی انگلیوں کے کئی گر وہ سیکھ چکا تھا۔

افق گھٹنوں کے بل زمین پر ڈھے گئی۔ بوسٹن میں آج یہ کیسی رات اتری تھی۔ اتنی اندھی۔ اس رات نے سب کو اندھا کر دیا تھا۔ یہ اندھا پن ستارہ صبح کو نگل رہا تھا۔ یہ اندھیرا۔ اندھیرا۔

زندگی میں وہ اتنے صدمات سے گزری تھی۔ وہ کسی ایک بھی صدمے سے مر کیوں نہ گئی۔ مرنے کے لیے یہ آج ہی کی رات کیوں؟

اسی صدمے سے کیوں۔؟

کیا نحس ساعت ابھی بھی اس کے پیچھے ہیں؟

پیچھے ہی ہوں گی۔ ورنہ وہ گہرے ہوتے اندھیرے میں حلول نہ کر رہی ہوتی۔



اس کا جی چاہا دیوانی ہو کر در بہ در بھٹک جائے۔ یہ درد اتنا اس نے فرزام پر ظاہر کیوں نہ کی؟ پلٹ جانے کے بعد، حال ہی سہی۔ قدم بوسی کے لیے خاک ہی سہی۔ یہ بھی کم تھا اس پہلے شخص کے لیے جس عزت سے اس کی طرف دیکھا اور شرافت سے اپنی عزت بنا لیا۔ بلور جان کر رخ رخ روشن کیا۔ دل میں ایک مقدس دعا کی طرح رکھا۔ ایسی دعا میں جن پر خدا سے خاص وعدہ لیا جاتا ہے۔ وہ اس پر زندگی کے رخ روشن کرتا رہا۔ اس پر لمحہ بہ لمحہ فدا ہوتا رہا۔ وہ ایک ایسا فدائی تھا۔ جس نے کبھی پرستش کیے جانے کی خواہش نہ کی۔ بس ہاتھ جوڑے بیٹھے رہنے پر ہی نازاں رہا۔ رشتے اور تعلقات میں کون ایسا کرتا ہے۔ کون ہے جو ماضی کے عیبوں کو فراموش کر کے دیوتا بناتا ہے۔ کون ہے جو تعلق کو مقدس فریضے کی طرح سر انجام دیتا ہے۔ ایسی عبادتیں کون کرتا ہے، جو فرض نہیں ہوتیں۔ لیکن فرض کر لی جاتی ہیں۔ محبت سے۔ محبت سے یہ صرف محبت ہی ہے، جو اس مقام تک لے آتی ہے۔ یہ کرشمے محبت کے ہی ہیں۔

کشمیری ...... حسن پر اس کی چاہت قائم نہ تھی۔ وہ حسن، جس پر نظر پڑتے ہی شاہراہ قائداعظم کی زلف عدن کے لیے ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ وہ نیلی گہری آنکھیں جن میں عدن کا دل ڈوب گیا تھا۔

"مجھے معلوم ہو گیا، صرف ایک ہیلن کے لیے جنگ کیوں کی گئی۔ میں تاریخ کے اس افسانے پر ہنسا کرتا تھا۔ اب یہ تاریخ مجھ پر ہنس رہی ہے افق۔ تمہارے لیے تو عالمی جنگ بھی کم ہے۔"

وہ عدن کی وہ ہیلن تھی، جو لاکھوں انسانوں کو میدان جنگ میں گھسیٹ لائی تھی۔ جسے اٹھا لیا جاتا ہے۔ پہلو میں بٹھایا جاتا ہے۔ وہی حسن اور وہی کشش جو عظیم قوموں میں جائز نہیں۔ جس پر قلم اٹھا کر دو لفظ بھی نہیں لکھے جاتے۔

"تم نے سنا ہے کہ کچھ روگی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ایک سچا اور کھرا انسان ایسے روگیوں پر ایک پھونک مارے تو وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ تمہیں تو مجھے پھونک بھی مارنی نہیں پڑی۔ اور سنو۔ اگر ہم اچانک سے بہت غریب ہو گئے تو ہم ایک شفا خانہ کھول لیں گے۔ تم پھونکیں مارتی جانا۔ میں پیسے اکٹھے کرتا جاؤں گا۔ ہاہا نہیں... نہیں.... میں تمہیں اپنی شفا کے پیسے نہیں دوں گا۔ ایک روپیہ بھی نہیں۔ ٹھیک ہے میں کوئی ایسا روگی بھی نہیں تھا۔ لیکن تم میں تو کمال کا کمال تھا۔"

"افق!" عدن کی آواز اس کی پشت سے ابھری وہ آواز دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑھ کر اسے تھام لینا چاہتا تھا۔

افق آنسو بہاتی رہی۔ وہ اباک (مبہوت) کھڑا رہا۔

"کاش! خدا نے فرزام نامی انسان پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔" خدا اسے یاد بھی آیا تو شکوے کے لیے۔

"اس شخص کے لیے آنسو بہا رہی ہو جو تمہیں چھوڑ گیا۔؟"

افق کے جوگ سادھنا میں تبدیلی نہ ہوئی۔ شاید وہ اسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً "وہ فرزام کے دل کی دھڑکنیں تلاش رہی تھی۔ آس پاس سے اندھی بہری ہوئی' وہ فرزام کے آسن جمائے تھی۔ عدن گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔

"ہم دونوں جانتے ہیں کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ تم کہا کرتی تھیں کہ خدا کو تمہیں امان دینا ہی ہو گا۔ تم خدا کو منا کر ہی چھوڑو گی۔ دیکھو! تم نے خدا کو منا ہی لیا۔ خدا مان گیا افق۔ اسی نے ہمیں دوبارہ ملایا ہے۔ واقعی خدا تمہاری بہت مانتا ہے۔ تم نے راضی کر ہی لیا اسے۔"

"اب ہی تو میں نے اسے ناراض کیا ہے۔" افق نے عین اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں ڈر کا شبہ تک نہ تھا۔ چادر کا کونا دانتوں میں دبائے، سرخ پڑتی ذرا ذرا سی کپکپاتی کیا یہ وہی لڑکی ہے۔ پل پر اس کے سامنے سے گزرتے جس کی جان نکل جاتی۔ وہ فرزام کے لیے اس کی جان لے لینا چاہتی تھی۔ نگاہوں کے اس تصادم نے ایک گہرا صدمہ دیا۔ عدن کا بھاگ کر کہیں چھپ جانے کو جی چاہا۔ کوئی

اس پر صرف اتنا مہربان ہو جاتا کہ وقت کو پیچھے لے جاتا، جہاں اس لڑکی کی نظریں شرما کر چرا کر نکل جایا کرتی تھیں۔ جن نظروں میں پہلی شبیہ اس کی ہوا کرتی تھی۔

اسے صدمہ ہوا۔ گہرا صدمہ ہوا۔ اس لڑکی نے رو رو کر ان آنکھوں کو برباد کیوں نہ کر لیا۔ اسے یہی تو کرنا تھا۔ ایک کمزور ڈال پر بیٹھی کمزور سی تتلی جیسی لڑکی کو۔ خود کو اجاڑ لینا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہ کیا۔ اتنی مضبوط کیوں ہوئی؟ وہ جو کن ہو جاتی تو وہ زندگی کے کسی بھی حصے میں لے خود کو دان کر آتا۔ اب تو وہ کشکول لیے کھڑا ہے۔ افق جیسی لڑکی اس پر یہ نوبت کیوں لائی؟ اول آنے والے کو وہ اس درجے پر کیوں لے آئی؟ وہ افق سے پوچھتا۔ ضرور پوچھتا۔ لیکن اب کیسے پوچھتا؟

"تب وہ میرا تھا۔ اس نے مجھے تم سے بچا لیا۔ میری راتوں کی عبادتوں، سجدوں، دعاؤں پر اس نے مجھے فرزام دیا۔ اس نے مجھے وہ ہیرا دیا، جو انسانوں کی کان سے نہیں نکلتا۔ جسے مقدس صفات سے بنایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو، وہ کیا ہے؟ تم نہیں جان سکتے تمہارے پاس وہ علم نہیں ہے۔ تمہارے پاس تو وہ آنکھ ہے۔ جسے میرا حسن نظر آتا تھا۔ وہ آنکھ، جو مجھے دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔ میرے حسن کے قصیدے بیان کرتی تھی۔ تم نے وہی سب دیکھا نا، جو بازار سے خریداری کرتے وقت ایک گاہک دیکھتا تھا۔ وہی گاہک جو انسان اور چیز میں فرق نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے مطلب کا۔ اپنے مطلب سے خریدنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بس۔ وہی خریدار ہو نا تم۔؟"

"تم اس وقت غصے میں ہو۔" عدن نے اپنے اندر اٹھنے والی کپکپی کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ وہ افق کے سامنے ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اگر میں غصے میں ہوتی تو تم پر تھوکتی۔ کیا میں نے ایسا کیا؟ میرا تم پر غصہ بھی حرام ہے۔ جیسے تم مجھ پر حرام ہو۔"

عدن کو اب سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ بیٹھا ہی رہتا۔ سو وہ کھڑا کیوں ہوا۔؟

"دیکھو! تم میرے لیے کس قدر حقیر ہو۔ اگر تم اس حال تک نہ پہنچتے۔ اگر تم اس دنیا کے بادشاہ ہوتے، تو بھی افق پلٹ کر تمہیں نہ دیکھتی۔ تمہیں تمہاری اوقات معلوم ہوئی؟" افق جم کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ عدن کو واقعی اپنی اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گئی تھی۔

"فرزام کی نظروں میں مجھے تمہاری اوقات معلوم ہو گئی ہے۔" ہمت کر کے آواز کو مضبوط بنا کر عدن نے کہہ دیا۔ جبکہ وہ ایسے گرنے والا تھا۔ جیسے گھن کھایا زینہ۔ جو ذرا سے دباؤ سے دھڑام سے چرمرا کر گر پڑتا ہے۔ اسے کچھ بھی نہ ملا اور وہ گھن کھایا کھڑا رہا۔

"تمہارا نام ان ناموں میں لکھا ہی نہیں گیا۔ جن پر محبتیں واجب ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو جان جاؤ۔"

وہ بددعا دے رہی تھی یا سزا سنا رہی تھی۔ اس نے یہ سب کیسے جان لیا تھا۔ جیل جانے کے بعد سے وہ بار بار رو پڑتا تھا۔ اس سے پہلے زندگی میں یہ نوبت کبھی نہیں آئی تھی اس پر۔ یہ بات سن کر اسے رونا آیا۔ اس پر مہینوں روا رکھے جانے والے تشدد سے زیادہ اسے اس وقت صحیح سلامت کھڑے ہو کر آیا۔

"مجھ پر محبت واجب نہیں ہوگی۔؟ بھول گئیں، کیسے تم سے محبت کرتا تھا۔؟"

"مجھے یاد ہے، کیسے تم مجھے چھوڑ گئے اور کس لیے چھوڑ گئے۔ میں تو تمہاری شکر گزار ہوں۔ کاش! کہ تم جان سکتے کہ میں نے نصیحت کے بعد انعام ملنے پر کیسے شکر ادا کیا۔ تم وہ نصیحت تھے، جو مجھے وقت نے دی۔ اور فرزام وہ انعام ہے، جو مجھے خدا نے دیا۔ تم وہ آزمائش تھے، جو زندگی میں ایک بار تو ہر انسان کو بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ وہ آزمائشیں جو دھل دھلا کر انسان کا اصل اس کے سامنے لے آتی ہیں۔ فرزام کا دل دکھا کر میں خدا کی ناشکری کیسے کروں۔ ابھی تو فرزام کے ملنے پر اس کا شکر ہی ادا نہیں کر سکی۔" اتنی مضبوط دل والی تھی۔ اتنا کھرا انداز اس کا۔

"فرزام تمہیں چھوڑ گیا ہے افق۔ اس صدمے سے



باہر آجاؤ۔" وہی عدن کا شہہ پر مات دینے والا انداز۔

"افق تمہیں دھتکار رہی ہے۔ اسے اپنی پیشانی پر کندہ کر لو۔" اس نے عدن کی بچھائی بساط ہی اسٹ دی۔ "جب جب اپنی شکل دیکھو۔ تمہیں یہ دکھائی دینا چاہیے۔"

"مجھے تم دکھائی دیتی ہو افق۔ ایسی باتیں تو تم کرتی تھیں۔ اب میں کر رہا ہوں۔ مجھ میں تم سما گئی ہو۔ میں سانس کیسے لوں افق۔ میری سانسیں تم سے جڑ گئی ہیں۔"

اس نے بڑھ کر افق کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ افق دو قدم پیچھے ہوئی۔ وہ اس سے ڈر نہیں رہی تھی۔ بھاگ تو اب قطعاً" نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس سے نہیں بھاگے گی۔ یہ ڈر کر بھاگنے کا ہی انجام تھا۔

پانی آئے تو اونچائی پر چڑھ کر جان بچانی چاہیے۔ عذاب آئے تو سجدے میں جھک کر۔ انسان وبال بن کر آئے تو سامنے سے ڈٹ کر۔

"میں اسے تمہاری اور اپنی ساری باتیں بتا آیا ہوں۔ تم کتنی بار میرے ساتھ اکیلی نکلیں۔ کیسے تم دیوانہ وار مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ ساری خاص باتیں بتا کر آیا ہوں اسے افق۔ آخر کو وہ بھی ایک انسان ہی ہے نا۔ کتنا بھی اچھا ہوگا، فرشتہ نہیں ہوگا۔ وہ تمہاری زندگی میں اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ تمہاری قسمت میں میں لکھا گیا ہوں۔"

اس کے ردعمل پر وہ چڑ گیا۔ ورنہ یہ سب نہ کہتا۔ افق نے اپنے تاثرات بمشکل دبائے۔ جن میں پسندیدہ تر غیظ و غضب کا تھا۔

"مجھ سے متعلق مشورہ لینے وہ تمہارے پاس نہیں آئے گا۔"

"اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایسے چلا نہ جاتا۔ اپنی بیوی کو میرے ساتھ چھوڑ کر۔ وہ تمہیں چھوڑ چکا ہے۔"

"اگر وہ مجھے چھوڑتا تو خود یہیں رہتا اور مجھے تمہارے ساتھ چلتا کرتا۔"

"تم بہت خوش فہم ہو افق۔"

"تم جب تک 'گمان' نامی آزمائش میں مبتلا رہی۔ فرزام میرے لیے کوئی جنگلی جھاڑی نہیں ہے جسے اکھاڑا اور زمین کسی اور بیل بوٹے کے لیے تیار کر لی۔ تمہاری بھول ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو بھی وہ میرا ہی ہوگا۔ کیونکہ میں اسے اپنا ہی رہنے دوں گی۔"

اس آخری بات سے عدن کو بہت تکلیف ہوئی اس کا جی چاہا کہ زوردار تھپڑ افق کے گال پر مارے۔

"تم سو سال بھی میری راہ میں کھڑے رہو۔ تو بھی تمہیں میری ایک نظر نہیں ملے گی۔ تم افق کو پلٹ کر خود کو دیکھتا نہیں پاؤ گے۔"

کیا ہوا اگر وہ اس مجسم حور کو سمیٹے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ کاش! وہ پاکستان میں ہوتا۔ کاش! وہ نام نہاد وہشت گرد نہ ہوتا۔

"تم افق کو پلٹ کر خود کو دیکھتا نہیں پاؤ گے۔" اس کے اندر باہر سائیں سائیں ہونے لگی۔

ایک نے اس سے محبت کی تھی۔ ایک سے اس نے شادی کی تھی۔

افق کو چھوڑ دیا تھا۔ ماریہ نے چھوڑ دیا ہے۔

ایک کو دھتکار رہا تھا۔ ایک دھتکار رہی تھی۔

افق نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ضرور رخ موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی چال میں تھکن اور دکھ ضرور تھا۔ لیکن اس کی سمت سیدھی تھی۔ اس کا مکمل انداز بتا رہا تھا کہ وہ کب تک بنا رکے چل سکتی تھی۔ وہ تا عمر بنا رکے چل سکتی تھی۔

عدن وہیں کھڑا رہ گیا۔ افق اپنے پیچھے وہ اندھیرے سمیٹ لائی۔ جو آج ہی کی رات خاص بوسٹن پر اترے تھے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر سب ہی بتیاں روشن کر دیں۔ اندھیرا پھر بھی پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

اس نے چاہا، بھاگ کر جہاں بھر کی روشنی لے آئے۔ فرزام لے آئے۔ باہر نکلے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر فرزام کو آوازیں دے۔ وہ اس کی پہلی آواز پر نہ پلٹے تو آخری آواز پر ہی پلٹ آئے۔ وہ اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دے۔ اسے بچائے بھی نا۔ اسے مر جانے دے۔ لیکن ایسے چھوڑ کر نہ جائے۔

"میرا دل چاہتا ہے، میں تمہیں دریا میں پھینک

دوں۔“

”مجھے۔؟“ اسے سن کر بھی یقین نہیں آیا۔

”ہاں! تمہیں ہی یار۔ تمہیں بہلانے سے سب سے نظر بچا کر کنارے سے دھکا دے دوں۔ پھر جھٹ جیکٹ اتار کر خود بھی کود جاؤں اور تمہیں بچالوں۔“

”سب سن کر بھی مجھے یقین نہیں آرہا۔“

”سنو۔ تمہیں اوپر لے جاؤں اور دھکا دے دوں شڑاپ۔ تم پھر گئیں پانی میں۔ میں بھی کودا پانی میں اور پھر سے تمہیں بچا کر اوپر لے آؤں گا۔ میں ہیرو بن جاؤں گا۔“

”ہیرو۔ بننے کے لیے؟“

”ہاں! میں بار بار تمہارا ہیرو بننا چاہتا ہوں۔“

وہ اس بات پر دنوں ہنسی۔ اور خوشی سے اسے کئی راتیں نیند نہ آئی۔ وہ ذہن میں اپنے دریا میں گرنے کی اور فرزام کے ہاتھوں بچائے جانے کی فلم چلاتی رہی۔ ہر بار اس فلم کو چلاتے اسے بہت اچھا لگتا۔ ہر بار اسے اس فلم کے ہیرو پر انوکھے انداز میں پیار آتا۔

محبت ان پر بہت سے الگ الگ لمحوں میں وارد ہوئی تھی۔ جیسے اوس۔ بارش کی طرح نہیں برستی۔ نظر بھی نہیں آتی۔ لیکن گیلا کر دیتی ہے۔ نرمی سے۔ محبت کے لیے گائے گئے لوک گیتوں کی طرح بھی۔ جو ان گنت پتیاں رکھنے والے پھول کی طرح الگ الگ جدا جدا ہوئے۔ لیکن لے اور ردھم ایک ہی رکھتے ہیں۔

اگر وہ دریا میں کود جائے تو کیا وہ کہیں سے بھی آجائے گا۔

”ہاں۔“ افق جانتی تھی۔ ایسا جاننا، جس کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ جس یقین کے پیچھے ہی شک چلا آتا ہے۔

”میں تمہیں بہت یاد کرتا رہا۔“ ایک دن وہ اسے ہر دو منٹ کے بعد فون کر کے کہتا رہا۔

”بارش ہو رہی ہے۔ بہت بدصورت سی بارش ہے۔ مجھے تو اچھی نہیں لگ رہی۔ ہوا ایسے چل رہی ہے کہ دل بیٹھا جا رہا ہے۔ جانے کیوں۔ اور پھول ہاں صرف پھول ہی پیارے لگ رہے ہیں۔ لگتا ہے سارے امریکی گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ دیکھو مجھے چلنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی۔ اف! یہ امریکی۔ اف! یہ لڑکے لڑکیاں۔ اف افق۔ ہاں! میں بھیگ رہا ہوں۔ نہیں! میں آئس کریم نہیں کھاؤں گا۔ نہیں بیٹھنا مجھے کہیں۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے! نام تو تم لے نہیں رہیں۔ میں بھی نہیں لوں گا۔ خیر! مجھے اب افق نہیں چاہیے۔ وہ دیکھو ذرا۔ ایک گندی سی لڑکی نے مجھ جیسے معصوم سے لڑکے پر گوڈ کلف انڈیل دی ہے۔ وہ اب اسے نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ اسے اس کا گلا دبا دینا چاہیے۔ میں تمہارا گلا دبا دوں گا افق۔ یاد رکھنا۔“

ہولے ہولے الہام کی سی صورت لیے محبت ان پر اترتی رہی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مقید ہونے لگے۔

وہ اسے فون کر رہی تھی۔ لیکن اس کا فون بند تھا۔ اس کے بیڈ روم کی کھڑکی کے ساتھ وہ ٹک کر کھڑی ہو گئی۔ جس راستے سے اسے آنا تھا اس پر نظریں گاڑے۔

واقعات تیزی سے رونما ہوئے تھے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ محبت کا جو معجزہ رونما ہو چکا تھا، وہ اپنا اثر رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا فرزام ضرور آئے گا۔ ایسا یقین جو خود کو خود ہی کروایا جاتا ہے۔ جو پانی پر بنے بلبلے سا ہوتا ہے۔ اس کے پاس یقین کے کئی دھاگے تھے۔ وقت ہی ثابت کرنے والا تھا کہ کون سا دھاگہ کتنا مضبوط ہے اور ٹوٹ جانے کے لیے کتنا نازک۔

وہ بہت زیادہ رونا چاہتی تھی۔ ہر وہ حربہ آزمانا چاہتی تھی۔ جس سے اس کی زندگی میں فرزام کے ہونے پر آنچ نہ آئے۔

جب وہ امریکا آرہی تھی تو اماں نے کہا۔ ”میری بچی بہت خوش قسمت ہے۔“

”امریکا جا رہی ہوں اس لیے؟“ وہ مسکرائی۔

”تم فرزام کے پاس جا رہی ہو اس لیے۔“

اس نے اپنے ویزے کے لیے بہت دعائیں کی تھیں۔ دو بار اس کے ویزے پر مختلف اعتراضات لگ چکے تھے اور دونوں بار وہ کئی گھنٹے روتی رہی تھی۔ اس نے فرزام کو نہیں بتایا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ یہاں آنے کے لیے اس سے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ چیزیں پھسل پھسل کر اس کے ہاتھوں سے گر جاتی تھیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا وہ فرزام کے پاس آخر کار جا رہی ہے۔ آخر کار اس کے عین سامنے بیٹھ کر اسے دیکھ سکے گی۔ اسے سن سکے گی۔ جہاز میں بیٹھنے تک اسے یقین نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ جہاز کریش ہو جائے گا۔ وہ مر جائے گی اور آخر کار وہ کبھی بھی فرزام سے نہیں مل سکے گی۔ بوسٹن ایئرپورٹ پر اس کے کاغذات رد کر دیے جائیں گے۔ ان پر کوئی نیا اعتراض اٹھے گا۔ اسے وہم تھا کہ اس کے اور فرزام کے درمیان ضرور کوئی آئے گا۔ وہ عدن ہو گا اسے گمان تک نہ تھا۔ اس طرح تو آئے گا اسے خیال تک نہ آیا۔

”فرزام۔“ اس نے سسکی سی سرگوشی کی اور پھر وہ سسکی سرگوشیاں کرتی ہی رہی۔

☼ ☼ ☼

ایک غیر معروف علاقہ۔ ایک غیر مصروف سڑک کے کنارے سے ذرا آگے وہ ایک ڈھلان نما جگہ پر دونوں گھٹنوں پر بازو ٹکائے بیٹھا تھا۔

”فرزام۔“

آبادی کے نشانات ذرا دور ہی معدوم ہو جاتے تھے۔ وقفے وقفے سے سڑک پر سے کوئی نہ کوئی گاڑی معمول کی رفتار سے گزر جاتی تو زندگی کے شواہد زندہ ہو جاتے۔

یہاں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھانے کی کوشش کی تھی۔ ”افق جائے بھاڑ میں“ سوچ کر۔

اس سے کھانا نہیں کھایا گیا تھا۔ اس نے کافی پینے کی کوشش کی اور کافی ٹھنڈی ہوتی رہی۔

وہ ایک بار میں بھی گیا۔ وہ خود سے بے خود ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کا دماغ سوچے جا رہا تھا۔ سوچے جا رہا تھا۔ وہ اسے سلا دینا چاہتا تھا۔ وہ ہر اس زبان کو بند کر دینا چاہتا تھا۔ جو اس سے ہزاروں طرح کے سوال کر رہی تھی۔ اسے اکسا رہی تھی۔ بہلا رہی تھی۔ تکلیف دے رہی تھی۔ اتنے سارے سوال جو اس کے اندر اٹھ رہے تھے۔ اس کے پاس ان سب کا جواب نہیں تھا۔

آرڈر دے کر وہ اٹھ گیا۔ واش روم جا کر وہ بلاوجہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے۔ وہ کر کیا رہا ہے۔ کل اس کی زندگی کچھ اور تھی۔ آج کچھ اور تھی۔ کل تک ہی جو تھی وہی زندگی تھی۔

اسے افق پر غصہ تھا۔ وہ اس پر بے حد ناراض تھا۔ اس کی شوخی جاتی رہی تھی۔ وہ بد تمیزی کی حد تک بد مزاج ہو گیا تھا۔ یہی تجویز کردہ سزا تھی۔ اس کی طرف سے افق کے لیے۔ وہ بدل بھی ہوا تھا اور افق کو ایک تھپڑ بھی مارنا چاہتا تھا۔ اور یہ سب بس یہاں تک ہی تھا۔ وہ افق کو نکال باہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”بیوی وہ تمہاری ہو گی۔ محبوبہ وہ میری ہے۔ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

ایسے لفظوں کی بازگشت پر وہ اس وقت گھر سے باہر نہ ہوتا تو کہاں ہوتا۔

”میں اس کی جان ہوں۔ مجھے یقین ہے اتنے سال اس نے میری گمشدگی کا سوگ ہی منایا ہو گا۔ اس جیسی لڑکیاں محبت کے نام پر کھیل نہیں کھیلتیں۔ یہ وہ عورتیں ہوتی ہیں، جو محبت کے نام پر جو پودا لگاتی ہیں اسی کے نیچے اپنی قبر بناتی ہیں۔“

فرزام نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ بار بار اپنا ذہن جھٹک رہا تھا۔ وہ افق کو سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی پرسکون جگہ پر جا کر اپنے ذہن کو سلا دینا چاہتا تھا۔ اسے خیال سا آیا۔ زندگی صرف دو دن پیچھے چلی جائے تو وہ افق کو لے کر کہیں چلا جائے۔ اس نے اس انسان کی یہ سب باتیں نہ سنی ہوتیں۔ جو اب اس کے ہر یقین کو بے یقین کر رہی تھیں۔

وہ افق کو جانتا تھا۔ اس جاننے کو وہ اب بھول رہا تھا۔ وہ افق سے محبت کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس پر اس کا یقین کھو گیا تھا۔

اسے عدن کی کہی باتیں سچ لگ رہی تھیں۔ وہ بکواس کر گیا تھا۔ وہ مکار ہے۔ وہ افق کا امان ہے۔ وہ انہیں برباد کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو صرف حقیقت بیان کر گیا۔ وہ افق کو چاہتا ہے۔ وہ افق کی ترجمانی کر گیا ہے وہ۔

پہلے کو رد کرتے۔ دوسرے سے سر اٹھاتے خیالات اس کے اندر جنگ کی حالت میں تھے۔ اس کی عقل عروج و زوال کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔

رومی گئی تو وہ روتا رہا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا اسے فون کرے اور اسے بتائے "کہ ایسے آکر چلے جانے سے۔ ایسے اپنا کر چھوڑ دینے سے کیا کیا ہوتا ہے۔"

لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ وہ رومی کی محبت کو رومی سی محبت کو دوبارہ زندگی میں لانا نہیں چاہتا تھا۔

افق جا رہی ہے تو اس کی جان کیوں نکل رہی ہے۔ اب وہ روئے گا نہیں۔ اب وہ مر جائے گا۔ کیا نیا ہوگا۔ جانے کتنے چلتے پھرتے اپنی لاش لیے پھرتے ہیں۔

So good bye

please! dont cry

(اچھا تو پھر الوداع۔ دیکھو رونا نہیں)

اسے یہ ساعت منحوس لگی Houston

Whitney کے اس الوداع کا یاد آنا منحوس سا لگا۔

تو کیا وہ افق کو الوداع کہہ آیا ہے؟ کیا محبتوں میں ایسے الوداع کہہ دینا جائز ہے؟

"I will always love you"

اس نے افق کا ہاتھ اپنے شانے پر رکھا۔

سائن کی نیو ایر پارٹی میں Whitney کے انسٹرومینٹل (Instrumental) عشق کو بہت سوں نے زندہ جاوید کیا۔ وہ مبہوت دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے اسے معلوم نہیں تھا۔ محبت رقص کی کیفیت میں ایسے بھی فسوں جگاتی ہے۔ دراصل جس دل کے اندر محبت در آنے لگی ہو اسے ہر چیز رقصاں نظر آتی ہے۔

If i should stay

I would only be

in your way

"تم مجھے گرا دو گی۔ کاش! تم کبھی ایک کام تو میری خوشی کے لیے کر سکو۔"

اس نے اس کی کمر میں بازو حمائل کیے۔ اور اس کے رنگ بدلتے حسن کو دیکھنے لگا۔

وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ وہی شہزادی تھی نا جو سب سے چھپ کر اپنے شہزادے کے لیے میٹھے میٹھے گیت گاتی ہے۔ بالکنی میں کھڑی ہوتی ہے۔ چاند کو دیکھتی ہے اور جنگل میں نکل جاتی ہے۔ اپنی بہترین پوشاک میں ملبوس۔ سارا ہار سنگھار کیے۔ میٹھی آواز میں ترنم سے اسے بلاتی ہے۔ اسے ڈھونڈتی ہے اور جب اس کا محبوب آجاتا ہے تو چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرتی ہے اور اگر وہ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو ہی چھو لیتا ہے تو کانپ کر بھاگ جاتی ہے۔ اور پھر رات بھر مسکراتی رہتی ہے۔

"ویسے ایسے کرنے میں تمہارا کیا جاتا ہے افق؟" وہ اسے دکھا رہا تھا کہ وہ صرف مذاقاً ہی یہ سب کر رہا تھا جبکہ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"میں انگریز نہیں ہوں۔ مجھے ڈانس نہیں آتا۔" شہزادی ڈر گئی۔

"انگریز ہونے سے رقص نہیں آتا۔ محبت ہو جانے سے آتا ہے۔ کیا تم نے دیوانوں کو رقص کی کیفیت میں نہیں دیکھا۔" وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ عشق میں جھوم جانے کی کس کیفیت میں وہ تھا۔

So i'll go but i know

I'll think of you every step

(اور میں چلا ہی جاؤں گا۔ اور ہمیشہ ہر موڑ پر تمہیں ہی سوچوں گا)

وہ بیٹھا تھا۔ وہ افق کی طرف نہیں جا رہا تھا۔



So good bye

Good bye

(اچھا تو پھر الوداع۔ الوداع)

ان سب کا حساب کرنے میں کہ ان کی زندگیوں میں سب کیا ہو گیا۔ بہت وقت نہیں، بہت حوصلہ چاہیے تھا۔ اس میں یہ حوصلہ ابھی نہیں تھا۔

سنسان سی سڑک کے کنارے بیٹھے "افق عدن سے محبت کرتی ہے؟" سوچ آتے ہی اس کا جی چاہا کسی کے سامنے آجائے یا خود کو نوچ ڈالے۔

لیکن کیوں؟ جب بات ہی ختم ہو گئی۔ وہ افق کو چھوڑ دے گا۔ بس سب ٹھیک۔

سر کو تھام کر وہ اس "سب ٹھیک" کو لے کر بیٹھا کیوں ہے۔ کسی آرام دہ جگہ پر جا کر آرام کیوں نہیں کرتا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا، وہ جگہ کھسک رہی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا، وہ جہاں جہاں افق کو خود میں سے جھٹک کر کھڑا ہوگا، زمین اس کے وجود کے نیچے سے کھسکے گی۔ افق نہ رہی تو اس کے پاس کیا رہے گا؟ اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

افق نے اسے ایک شلوار سوٹ خود ڈیزائن کر کے بھیجا تھا۔ صرف خاص اس کے لیے۔ جس کے ساتھ سیاہ رنگ کی مردانہ شال بھی تھی۔ جس الماری میں اس نے وہ شلوار سوٹ ہینگ کیا تھا۔ اسے وہ کھول کر دیکھتا تھا۔ ایسے ہی آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کمرے میں کیل ٹھونک کر اسے لٹکا لیا۔ احمد کی نیو ایئر پارٹی میں وہ پہن نہ سکا۔ اس پر کچھ بھی گر سکتا تھا۔

ایک ہندوستانی ہم جماعت کی شادی میں پہننے کے لیے اس نے ایک گھنٹہ لگا کر اچھی طرح استری کیا اور پھر اسے خیال آیا کہ روایتی ہندوستانی کھانوں میں سے اگر اس پر کچھ گر گیا تو۔ اس داغ کو کون مٹائے گا۔ اگر داغ نہ مٹا تو۔؟

شادی کے دن سوٹ کو پہن کر وہ کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ جب وہ کافی بنانے کے لیے اٹھا تو واپس اپنے پرانے لباس میں آگیا۔ صرف آدھے گھنٹے بعد ہی۔

پھر اسے وہ سوٹ کب پہننا چاہیے؟ اس نے یہ سوچنا چھوڑ دیا۔ بیڈ کے عین سامنے کی دیوار پر وہ افق کے آنے سے پہلے تک لٹکا رہا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس کے روم روم میں چراغ جل اٹھتے۔ وہ اس کے لیے دیپک راگ بن گیا۔ الہامی محبت اسے مکمل کرتی جا رہی تھی۔ اپنے احساسات کی مختلف اشکال پر وہ خود ہی فدا ہوتا جا رہا تھا۔

کون ہے جو محبوب بننا نہیں چاہتا؟

کون ہے جو محبوب کو پانا نہیں چاہتا؟

محبت کی دھن سب کو ہی نچا ڈالتی ہے۔

اب جو کچھ اس کے اندر جل چکا تھا۔ وہ بجھا تو وہ مر جائے گا۔ کیا ابھی بھی شک تھا۔ ابھی بھی کوئی شک تھا فرزام کو۔؟

"میں خود چھوڑ دوں گا افق کو۔" وہ بلند آواز سے بڑبڑایا۔ تاکہ خود کو پکا کر سکے۔ اپنی زبان سے اپنے دل کو سنا رہا تھا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اب اگر کسی رشتے، تعلق سے اسے صدمہ ملا تو وہ اس کی جان لے لے گا۔ وہ اس کی جان لے رہا تھا۔

وہ افق کو چھوڑ دے گا۔ یعنی اپنی جان دے دے گا۔

دو بار اس نے رومی کو وقفے وقفے سے فون کیا تھا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ وہ بری طرح سے چڑ گئی۔

"معلوم ہے۔ تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے۔"

"غلط معلوم ہے۔ خدا نے اسے فرصت سے نہیں بنایا۔ خدا نے اسے اپنی بے پایاں محبت سے بنایا ہے۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اگر تم مجھے نکال باہر نہ کرتیں۔ اگر تم سب وہ نہ کرتیں تو میں خدا کا اتنا شکر گزار نہ ہوتا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے رومی! خدا کی رحمت کسے کہتے ہیں۔ مجھ پر وہ افق کے نام سے نازل کی گئی۔"

"رحمت کو زحمت بنتے دیر نہیں لگتی۔"

"تم بددعا دو تو بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی

نہیں ہے۔"

"تم خوش گمان رہو تو بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہو چکا ہے روی۔ کاربن کاپی کے بجائے کائنات کے مصور نے مجھے اصل تصویر تھمادی۔ اس تصویر کا عنوان "افق" ہے۔ اس تصویر کا خالق خدا ہے۔ اس تصویر کا مالک فرزام کو بنایا گیا ہے۔" وہ خوش ہو رہا تھا۔ ان گزرے سالوں میں وہ بہت خوش رہا تھا۔ کپلز ڈانس کے دوران اس نے ایما کو انکار کر دیا۔

"میں کسی اور کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کس کا۔۔؟" وہ سمجھی کسی اور ہم جماعت کا۔

"ویل۔۔ کوئی بہت ہی خاص۔۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

"وہ بہت ہی خاص" گیارہ ماہ بعد امریکا آ گئی۔

جو دل ہوتا ہے نا، یہ مکمل وجود سے پرے الگ کسی اور ہی مقام پر موجود ہوتا ہے۔ اسے فرق نہیں پڑتا باقی کے وجود نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔ اس دل کے مقام پر باقی کا وجود چاہ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اس نے یاد کرنا چاہا کہ وہ اس سے محبت کرتا بھی ہے یا نہیں۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ گہری ہوئی رات میں وہ گہرائی میں ڈوب چکا تھا۔

البتہ اسے وہ وقت ضرور یاد آ رہا تھا، جب وہ ایک پتلا بنی ان کے پاس کام کیا کرتی تھی۔ ایک ایسا پتلا جسے یہ تو معلوم تھا کہ اسے کام کرنا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ خوش کیسے ہونا ہے۔ ہونا بھی ہے یا نہیں اور۔۔۔ ہونا بھی کیوں ہے؟؟

وہ ایک سوالیہ وجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی کئی سوال جاگ اٹھتے۔

"وہ اس سے محبت نہیں کرتی۔" فرزام کو یقین سا ہوا۔۔ شکوک و شبہات کے بادل میں وہ پور پور ڈوب چکا تھا۔ عدن کا زہر اثر دکھا رہا تھا۔

ایک گہرا سناٹا پھٹ کر پھیلا۔ درد کی ایک گہری تیز لہر اس کے وجود میں لہرا کر پھیلی۔

خود کشی کرنے والا آخری بار تو سوچتا ہی ہو گا۔ آخر یہ موت ہی کیوں؟

مارنے والا نہ جانتا ہو۔ مرنے والا تو جانتا ہی ہے کہ وہ مر رہا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بوسٹن میں رہنے والے دو لوگوں پر ایک ہی قیامت جدا جدا مقامات پر ایک ہی انداز سے گزر رہی تھی۔

فرزام نے سر کو جھٹکا۔ کوشش کر کے بھی وہ دل کو نہ جھٹک سکا۔ ایسی کوشش بار بار کرنے سے بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ ایسی کوششیں بار بار کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی جاتی نا۔

منگنی ٹوٹ جانے پر وہ دس بار روحی کے پاس گیا تھا۔ محبت کے ٹوٹ جانے پر اسے ہزار بار تو جانا ہی چاہیے۔

اس نے کار اسٹارٹ کی۔

اسے تا عمر جاتے رہنا چاہیے۔ ایک محبت کے لیے۔ صرف اتنا کرنے میں کیا جاتا ہے؟

☼ ☼ ☼

عدن اپنے فلیٹ تک جانے کے لیے بس میں بیٹھا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ بس میں بیٹھا ہے۔ اس کا مطلوبہ اسٹاپ آ کر گزر چکا ہے۔ آخری اسٹاپ پر اسے اترنا ہی پڑا۔ اسے پھر معلوم ہوا کہ وہ کتنی دور آ چکا ہے۔ وہ اتنی دور کیسے آ گیا۔ اسے معلوم کیوں نہ ہوا؟

اسے واپسی کی جلدی نہیں تھی۔ ایسی جگہ جانے کی۔ جہاں اس کے سونے کے لیے ایک بستر موجود ہے۔

صرف سونے کے لیے ہی گھروں کو کون جاتا ہے؟

وہ چلتا جا رہا ہے۔ کہیں تو وہ رک ہی جائے گا۔

چند دن پہلے وہ بن ٹھن کر ماریہ کے پاس گیا تھا۔ وہ اس کے باپ کے پاس بھی جانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ باہر آ چکا ہے۔ وہ بے قصور ہے۔ وہ انہیں ذرا سا ڈرا بھی دینا چاہتا تھا کہ اس کے اس طرح جیل جانے پر ان کے ردعمل کو وہ کبھی نہیں بھولے گا۔ کچھ



یہ احساس چوٹ ضرور پہنچائے گا۔

ماریہ تب تک چار مزید شادیاں تو کر ہی چکی ہوگی۔ اسے ایسے دیکھ کر ضرور پچھتائے گی۔ عدن جیسے قابل ڈاکٹر کو یوں ہاتھ سے جانے دیا۔ باہر آ ہی گیا نا۔ کیوں طلاق لی۔ اس کا باپ ضرور ہاتھ ملے گا۔ نشہ کر کر کے کہیں مر گئی ہو۔

اس نے زیر لب گالیاں دیں۔ خالصتاً "وہی گالیاں" جو اس پر تشدد کرنے والے دیا کرتے تھے۔ ان گالیوں کے لائق صرف ماریہ ہی تھی۔

اسے شک تھا کہ وہ اگر زندہ ہوئی تو اسے امریکا میں نہیں ملے گی عزیز کا کہنا تھا کہ وہ ایک لمبے عرصے کے لیے امریکا چھوڑ گئے ہیں۔ آغا کو اس نے تلاش کیا تھا وہ بوسٹن میں ہی تھا۔ ماریہ سے متعلق کوئی خبر نہیں ملی تھی ٹرسٹ سے۔

وہ اپنے اور اس کے گھر گیا۔ وہ گھر بک چکا تھا۔ ناچار اسے تمنا سے بات کرنی پڑی۔ اسے پہچان کر وہ چپ ہو گئے۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"ماریہ سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے ایسے کہا جیسے اگلے الیکشن میں وہ گورنر کی سیٹ کے لیے کھڑا ہونے والا ہے۔ فارغ وقت میں وہ ماریہ سے بھی مل لینا چاہتا ہے۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ وہی اس کے فرعون صفت سابق سسر کی عظیم عادت۔

دس منٹ بعد اسے دوبارہ فون کیا گیا۔ ماریہ کے گھر کا پتا لکھوایا گیا۔ وہ خوب ہنسا۔ یعنی اس گری ہوئی لڑکی کو پھر اس کے سامنے کیا جا رہا تھا۔ پھر سے اسے علاج کی ضرورت ہوگی۔ اس بار وہ اسے اس کا نفیس خلاصہ ضرور سنا آئے گا۔

وہ ٹیکسی سے گیا تھا اور گھروں کے نمبرز پڑھ رہا تھا۔ پھر اسے یہ ضرورت بھی نہ رہی۔ ایک بڑے گھر کے سامنے بنے کھلے اور وسیع لان میں اسے ماریہ کھڑی نظر آئی۔ وہ پودوں اور پھولوں کے ساتھ مصروف تھی اور ایسے مصروف تھی۔ جیسے یہ دنیا کا مقدس ترین کام ہو۔

قریب ہی گھاس کاٹنے کی مشین رکھی تھی۔ جس کے ساتھ ایک دو ڈھائی سالہ بچہ زور آزمائی کر رہا تھا۔

"ماریہ۔۔" گھر کی روش پر کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔

ماریہ پلٹی۔ اس کا حسن۔۔ اف! اس کا وہ بے مثال حسن۔۔ عدن نے جھر جھری لی۔

امریکن میگزین میں چھوٹے چھوٹے کپڑے پہننے والی۔۔ ڈانس فلور پر جم کر ناچنے والی کا حسن نہیں تھا وہ۔۔ بار میں کبھی اس کی بانہوں میں، کبھی اس کی بانہوں میں۔۔ کبھی اس کونے میں کبھی اس کونے میں۔۔ یہ وہ حسن نہیں تھا۔ جس کو دیکھ کر خباثت سے آنکھ ماری جائے۔ نہیں۔۔ اب اسے دیکھ کر یہ جرات نہیں کی جا سکتی تھی۔

"اوہ عدن۔۔" وہ فوراً اس کی طرف آئی۔ سیاہ فام بچہ بھی ماریہ کے ساتھ اس کی طرف لپکا۔

"میرا خیال تھا، تم ایک دو دن میں آؤ گے۔ پاپا نے فون کیا تھا۔ آؤ! کہاں بیٹھو گے۔ آجاؤ! اندر ہی چلتے ہیں۔" پلٹ کر اس نے بے بی کلٹ اٹھایا۔ جس میں اس کی شباہت لیے ایک بچی آنکھیں کھولے دراز تھی۔

"فلورا۔۔" اندر داخل ہوتے ہی اس نے آواز دی۔

میڈ کچن میں سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں فیڈر تھا۔ جو ماریہ نے لے لیا۔

"ابراہیم ابھی اور کانٹ چھانٹ کرنا چاہتا ہے آپ اس کے ساتھ رہیے۔"

ماریہ اسے اپنے ساتھ لیے سٹنگ ایریا میں آ گئی۔

"صرف پندرہ منٹ لگیں گے سارہ کو سونے میں۔ تمہیں اتنا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"ایک سیاہ فام ہے۔ ایک سفید فام۔۔ کتنے شوہر بدل چکی ہو ماریہ۔۔ یا۔۔"

وہ اس کے سامنے صوفے پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ اس نے لفظوں کا پہلا طمانچہ ماریہ کو مارا۔۔ نفیس خلاصے کی پہلی سطر۔

ماریہ کے چہرے کے رنگ بدلے اور صاف نظر آنے لگا کہ وہ خود کو قابو میں رکھنے کے لیے دل ہی دل میں کچھ دہرا رہی ہے۔ ذرا سی دیر بعد وہ مسکرائی اور اس کی طرف کامل اطمینان سے دیکھا۔

"میرا خیال تھا تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔" وہ پھر ایسے مسکرائی۔ جیسے عدن کی بیوی ہوتے تو کبھی نہیں مسکرائی تھی۔

"یہ۔" اس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جس دیوار کو دیکھ کر عدن پہلے ہی منہ موڑ چکا تھا۔

"جس نے بڑا سا ہیٹ پہن رکھا ہے۔ طلال ہے اور اس کے ساتھ جو پنک شرٹ میں ہے وہ زکریا ہے دونوں اس وقت اسکول میں ہیں۔ ورنہ تم دیکھتے کہ یہ تمہیں کبھی اتنے سکون سے بیٹھنے نہ دیتے۔" جن کی طرف وہ اتنے اطمینان سے اشارہ کر رہی تھی۔ وہ بھی سیاہ فام ہی تھے۔ ایک کی عمر تقریباً نو سال تھی اور دوسرا سات آٹھ سال کا ہوگا۔

عدن حیران ہوا۔ دیوار دس پندرہ تصویروں سے ایک ہی جگہ سے بھری ہوئی تھی۔ ایک تصویر میں ماریہ اور ایک اسمارٹ سا لڑکا مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔ صرف اسی تصویر کو عدن نے ذرا سی دیر کے لیے دیکھا تھا۔

"ہوگا موجودہ بوائے فرینڈ۔" وہ تمسخر سے ہنسا۔ بچوں کی تصویروں کے بارے میں اس نے کوئی بھی خیال دوڑانے کی کوشش نہیں کی۔

"یہ جمال ہے۔" اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ جو کرل فش دم سے پکڑے کھڑا تھا اور ماریہ کھلا منہ فش کی طرف بڑھا رہی تھی۔

"ریکس کی جگہ اب جمال نے لے لی۔" عدن نے ٹانگ پر ٹانگ جمائی اور جیسے باپ بیٹی ٹانگ ہلایا کرتے تھے ویسے ہی اپنی ٹانگ ہلانی شروع کر دی۔ مطلب ہش... ہش۔

"میرے شوہر۔" ماریہ کے انداز میں فرق نہیں آیا تھا۔

"اس وقت یوگنڈا میں ہیں۔ ورنہ تم ضرور جمال سے مل کر خوش ہوتے۔"

"شوہر۔" اس نے بلند آواز میں بلند قہقہہ لگایا۔

"تم شوہر پالنے کا تردد کیوں کرتی ہو ماریہ؟"

ماریہ کا رنگ فق ہوگیا۔ عدن نے خوب مزے سے ہاتھ بڑھا کر فریش جوس کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگالیا۔

"شادی کرنے کا تردد تو میں نے تم سے کیا تھا۔ شوہر تو مجھے اب ملا ہے۔ بیوی تو مجھے اب بنایا گیا ہے۔"

"اسے کب تک چلتا کرو گی ماریہ؟" عدن پھر سے ہنسنے لگا۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ٹوٹتے تعلقات ہیں... محبت نہیں۔"

اس بات پر وہ اتنی دیر تک ہنسا کہ تھک کر بے دم ہوگیا۔

"محبت... ماریہ! محبت... تم محبت لائق چیز نہیں ہو۔ تم ناچنے گانے، لڑکھڑانے تک ہی ٹھیک ہو۔"

وہ اٹھی اور جمال کی تصویر کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ "جمال کا کہنا ہے میں وہ صبح ہوں۔ جو زندگی کے لیے کی گئی۔"

"ہاہاہا... اور تم بہل گئیں۔"

"میں ایمان لے آئی۔" وہ بھرپور سنجیدگی سے بولی "اسے دیکھ چکی تھی۔ اسے سن چکی تھی۔ اس لیے ایمان لے آئی۔"

عدن تمسخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے مذاق اڑا رہا ہو۔ جیسے کامیڈی ڈراما سمجھ کر ابھی تالیاں بجانے لگے گا۔

"ہالی وُوڈ کی کس فلم کا ہیرو ہے تمہارا یہ موجود شوہر

ماریہ اس کے انداز پر ٹھٹکی۔ پھر اس نے سمجھا اور جانا کہ وہ کس حد تک جمال کی ہتک کرنے والا ہے۔

"امریکا کے بڑے بزنس ٹائیکون کا بیٹا ہے جمال۔ اس وقت نائیجیریا میں ہے۔ وہاں جلدی امراض کی ایک وباء پھوٹی ہے اور وہ ہر صورت وہاں رہنا چاہتا تھا۔"

"اسے بھی تمہاری طرح شہرت کا شوق ہے؟"

"وہ چھوت کی بیماریوں کے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے... اپنے ہاتھوں سے ان کے زخم صاف کرتا ہے۔ وہ تکلیف سے کراہتے بچوں کو اپنی آغوش میں رکھتا ہے۔ وہ ان کے وہ وہ کام کرتا ہے، جو تم سے قابل ڈاکٹرز نے سے پہلے ناک ڈھانپ لیتے ہیں۔ مجھ سے غیر انسانی لوگ منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ ناک نہیں دبوچتا، ہاتھ نہیں کھینچتا۔ تیسری دنیا کا ایک چھوٹا موٹا شہر خریدنے کی استطاعت رکھنے والا جمال یہ سب کرتا ہے عدن... شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا میری خوش بختی کا۔ ایسی قسمت کہ جمال میرا شوہر ہوتا۔ ہاتھ بڑھا کر یہ خوش قسمتی میں نے خدا سے مانگی تھی۔ زخم زخم صاف کرنے والے کی میں نے جا کر منت کی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کرلے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے بھی بیمار لاچار ہی سمجھ لے اور میرا زخم، زخم صاف کر دے۔ صرف اتنا ہی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ لے۔ میں نے خدا سے پہلی بار دعا کی کہ وہ مجھے جمال دے دے۔"

نشے میں بدمست ہو کر ہر بات پر گالی نکالنے والی خدا کا نام لے رہی تھی۔ دعا کرنا سیکھ گئی تھی۔

عدن پھر ہنسا۔ اس بار اسے معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کس بات پر ہنسا۔ وہ اس کے گھر میں بیٹھا تھا۔ جس کی آرائش گواہی دے رہی تھی کہ یہاں ایک خاندان آباد ہے۔ یہاں کچھ لوگ محبت سے رہتے ہیں۔ گھر خوب صورت تھا۔ سجا ہوا تھا۔ لیکن وہ نمائش کی کوئی دکان نہیں لگ رہا تھا۔

بات ختم کر کے ماریہ خاموشی سے عدن کو دیکھنے لگی۔

"لنچ تیار ہے عدن!"

وہ چونکا۔ وہ انکار کر کے اٹھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ رہ کر اٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر اور اس گھر میں گزارنا چاہتا تھا۔

ماریہ ابراہیم کو کھلاتی رہی۔ وہ اتنے نخرے کر رہا تھا کہ عدن کا جی چاہا اس کی کرسی الٹ دے۔ وہ اسے بدتہذیب کر رہا تھا۔

"انہیں کہاں سے اٹھایا ہے؟" عدن نے انگلش میں اتنی بے رحمی سے کہا کہ ابراہیم ایک دم چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ غصے سے ماریہ کا منہ سرخ ہوگیا۔

"تمہیں اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"کیا یہ سچ نہیں... جگہ جگہ سے اٹھا کر انہیں گھر میں لا رکھا ہے؟"

ماریہ نے ایک نظر ابراہیم کی طرف دیکھا اور اس کے گال چومے۔

"یہ ہمارے بچے ہیں صرف... یہ ہمیں خدا کی خاص رحمت سے ملے ہیں... وہ توفیق، جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، اسی سے۔"

اتنے کرارے جواب پر عدن بدمزہ ہوگیا۔

"تو اب چیریٹی کر کے سکون حاصل کرتی ہو؟"

"جمال مجھے مل چکا ہے۔ سکون کی تلاش نہیں ہے مجھے... سکون کی تلاش چند سال پہلے... تھی۔ اسی تلاش کا انعام ہے جمال... تم کب کر رہے ہو سکون کی تلاش؟"

"میرے پاس بہت سکون ہے۔" نیپکن سے ہونٹ صاف کیے۔

"کیا یہ سچ ہے؟" اس نے دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکا دیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ عدن اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔

"مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

وہ اس پر تھوکنے کے لیے ملنا چاہتا تھا۔ ایک آخری دھتکار کے لیے۔ عدن کا جی چاہا اپنی حسرت پوری کر ہی لے۔ ڈرگز کا کیڑا اب کیسے بن ٹھن کر بکواس کر رہا تھا۔

"اپنے لیے سکون کی تلاش جلد ہی کرلو..."

"عالمہ بھی بن گئی ہو یا نن... مجھے تو ٹھیک سے تمہارے مذہب کا بھی نہیں معلوم۔" یہ بات وہ کہہ رہا تھا جسے ٹھیک سے اپنے مذہب کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

"رب العالمین سے اپنے لیے دعا کرو..."

"خدا کے نام بھی سیکھ لیے ہیں...؟"

"نماز پڑھا کرو۔"
"نیک بھی ہو گئی ہو۔ اتنا حیران مت کرو۔"
"لوگوں پر رحم کیا کرو۔"
"تم تو فرشتہ بن گئی ہو۔"
"اپنے گناہوں پر توبہ نہیں کر سکتے تو شرمندہ ہونا ہی سیکھ لو۔"
"شیخ اور رئیس کے علاوہ کتنوں کا نام لے کر توبہ کی تھی تم نے؟"
"توبہ کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا۔"
"تم تو حیران کر رہی ہو' وہسکی' شراب کے ذائقے بھول گئی ہو؟"
"حرام سے ہر حال میں بچ کر رہنا۔ خدا سے معافی مانگو۔ وہ سب دیتا ہے۔ تیونس کے خیراتی اسپتال کے غلیظ سے اسٹور روم میں روتے بھی اس نے مجھے سن لیا۔ ہر طرح کے حرام کو چکھ چکی میری زبان کو بچنے اس نے مجھے سنا۔ یقین جانو! ایسا ہوا۔"
"بند کرو اپنا یہ وعظ۔" عدن اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں۔ میرے لیے یہ فرض کبھی کسی اور نے ادا کیا تھا۔ افریقہ کے صحراؤں میں۔ تمہارے لیے میں ادا کر رہی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ مشفق سی وہ عدن کو بہت پیاری لگی۔
وہ اس گھر سے جا رہا تھا۔ جانا ہی تھا۔ اور وہ جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ یہیں ماریہ کے سامنے بچھ جائے اور رونے لگے۔ التجا کرے کہ ماریہ اسے کہیں چھپا لے۔ ایسی باتیں کرتی وہ کتنی انوکھی لگ رہی تھی۔ ایرے غیرے کے گلے سے جھول جانے والی۔
وہ ماریہ کے قریب آیا۔ اور ہاتھ اس کے گال کی طرف بڑھایا ماریہ دو قدم پیچھے ہوئی حیران ہوئی۔
"مجھ سے دور رہو۔"
"تم میرے لیے ایسی کیوں نہ بنیں ماریہ؟"
"تم جمال کیوں نہ بنے؟ تم خریدنے والوں میں سے نہیں ہو۔ صرف محبت ہی ایک مکمل انسان کو خریدنے کا ہنر رکھتی ہے۔ تم نے یہ ہنر سیکھا ہی نہیں۔"
عدن اکڑ کر چلتا ہوا ماریہ کے پاس گیا تھا۔ وہ خود گھسیٹتا ہوا وہاں سے نکلا سو میٹر کی دوڑ میں ریکارڈ بنانے والے سے اب کوئی پوچھے۔ پیچھے رہ جانا' ہار جانا کسے کہتے ہیں؟
اس نے اگلی کئی راتیں بار میں گزاری۔ کئی طرح کے افسوس آ لگے تھے اسے۔ لیکن وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ باتیں' یہ وعظ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے الکحل کو اپنے اندر انڈیلتے ہوئے اس نے سب بار ر۔
افق کو کیسے ہار جاتا؟
خالی ہاتھ رہ جانے والا افق کو کیسے جانے دیتا؟
"ماریہ۔ آخ تھو۔ محبت۔ جمال۔ تھو۔ وہ بچ کیا جانے محبت کیا ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے۔ بنگلے میں رہتے میں نے ایک معمولی لڑکی سے محبت کی ہے۔ کسی میں یہ حوصلہ۔ میں نے کی۔ ڈاکٹر عدن نے۔ جس کے پیچھے ایک عالم پاگل تھا۔" وہ بڑبڑاتا رہا۔
"میں کیسے افق کو چھوڑ دوں۔" کتنا ہی گر جائے کتنا ہی بھٹک لے۔ افق کو کیوں چھوڑے وہ؟
"خدا کو مجھے امان دینا ہی ہو گا۔" افق بہت بار یہ کہہ چکی تھی۔
"تم خدا کو میرے لیے اتنا تنگ کرتی ہو؟"
"میں تو التجا کرتی ہوں۔"
"جو ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوتا ہے۔" اس نے انگریزی مثل بیان کی۔
"کیا مطلب ہوا اس بات کا؟"
وہ دل کھول کر ہنسا۔ وہ تو اسے تنگ کر رہا تھا۔
"یعنی کہ اگر تمہارے کہنے پر بھی خدا مجھے تمہیں نہ دے۔ تو۔"
"اتنی بڑی بات۔ اتنی بدشگونی۔" وہ رو دی تھی۔
"تو تمہیں کوئی اور مل جائے گا۔ کوئی رکشہ چلانے والا۔"



"ایسی منحوس بات۔ ایسی۔" وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔
بدشگونی تو اس کے لیے ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا۔ وہ تو اسے چاہیے تھا۔ کاش! وہ ایسی بات نہ کرتا۔ یہ سب کسی منحوس ساعت کی وجہ سے ہوا۔
"ایسی کوئی لڑکی ہے؟" چلتے چلتے اس نے فون نکال کر پاکستان کال کی۔
"لڑکی۔ ؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم ٹھیک تو ہو؟" وہ ماں کی آواز اور انداز پر گھبرا گئے۔
"اب آپ کس سے میری شادی کریں گے؟"
"تم پہلے پاکستان تو آؤ۔ بہت لڑکیاں ہیں۔"
"کیا واقعی بہت ہیں؟ ابھی بھی بہت ہیں؟ کیا ان میں کوئی ایک افق جیسی ہے۔ یاد آئی آپ کو افق۔ بس افق جیسی۔"
غلام علی نے فون بند کر دیا۔ "بدذات۔"
بند فون کو وہ کان سے لگائے رہا۔
"جانتے ہیں آپ وہ کتنی بڑی دھوکے باز نکلی۔ کہتی ہے مجھ پر ایک نظر ڈالنا نہیں چاہتی۔ کہتی ہے مجھ پر محبت واجب نہیں ہوئی۔ اس بات کا کیا مطلب ہے پاپا۔ ماریہ بھی یہی کہتی ہے۔ کچھ ایسا ہی۔ آپ نے مجھے اس بارے میں بتایا ہی نہیں۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے۔ میں تو ہمیشہ شان سے جیتا ہوں نا۔ اب کیسے میں فیل ہو گیا۔ صرف اسی ایک کھیل میں کیوں۔ میں نے تو جم کر کھیلا تھا۔ پہلے تو افق میری ہر بات کا یقین کر لیتی تھی۔ اب کیوں نہیں کرتی۔ میں نے کتنی بار اسے کہا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسے کھونا نہیں چاہتا پاپا! اسے فرق ہی نہیں پڑا۔ کیا اوقات ہے فرزام کی میرے سامنے۔ اندھی ہوئی ہے افق۔ مجھے سننا نہیں چاہتی۔ ایسی بہری پہلے تو نہیں تھی۔ ایسی بہری وہ کب سے ہو گئی؟ وہ نہیں مان رہی۔ فرزام کو چھوڑنے کے لیے وہ نہیں مان رہی۔ میں فرزام کو مجبور کر دوں گا۔ وہ اسے چھوڑ دے گا۔ پھر وہ میرے ہی پاس آئے گی۔ فرزام اسے چھوڑ ہی چکا ہے۔" سڑک پر چلتے وہ بہت دیر تک بند فون سے باتیں کرتا رہا۔ اور پھر ایک بار میں بیٹھ کر بڑبڑانے لگا۔
"میں ہر طریقہ آزماؤں گا۔ میں بہت ذہین ہوں میرے پاس بہت سے راستے ہیں۔"
اس کی بلند بڑبڑاہٹ پر ایک دو اسے اچنبھے سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اتنے بھی حیران نہیں تھے۔ ایسی فلمیں وہاں ہزاروں بار چل چکی تھیں۔
عبادت گاہوں میں بڑبڑانے والوں کو عقیدت کی نظریں نصیب ہو ہی جاتی ہیں۔ انہیں پاگل بھی سمجھا جاتا ہے تو خاص رتبے کا پاگل سمجھتے ہیں۔
ایسی جگہوں پر بڑبڑانے والوں کو لوگ مزے سے گالیاں دے جاتے ہیں۔ ٹھوکریں مار جاتے ہیں۔ یہی ان کا رتبہ ہے۔
وہ حلق تک شراب انڈیل چکا تھا۔ نشہ تھا کہ آ کر نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہی نشہ تھا۔ جا کر نہیں دے رہا تھا۔ افق کے انداز کا۔ وہ ماریہ کو گالیاں بک رہا تھا۔ فرزام کی شان بیان کر رہا تھا۔ لیکن افق کی شان میں کوئی گستاخی نہ کر سکا۔
ٹھیک ہے' اگر افق چاہتی ہے تو یہی سہی۔ اگر وہ اس کی راہ میں بچھ جائے۔ تو وہ آئے گی اس کے پاس۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ وہ پہلی محبت ہے افق کی۔ وہ پہلا مرد جس کے لیے اس نے اپنی ذات کے دروازے کھولے۔ افق یہ کیوں بھول رہی ہے کہ امان سے ہی اس کی محبت کی ابتدا ہوئی۔ انتہا بھی امان پر ہی ہونی چاہیے۔ ایک مشرقی لڑکی ہے وہ۔ اس میں ردوبدل کس طرح کر سکتی ہے۔ ایسی محبت کر کے وہ امر ہو جاتی۔ کسی اور کی زندگی میں جا کر اس نے یہ کڑی کیوں توڑی؟ افق کو تو سزا ملنی چاہیے۔ اسے یہ حق کس نے دیا کہ وہ کسی اور سے محبت کرے؟ اگر اسے یہ حق استعمال کرنا ہی تھا تو پورا پورا اسے امان میں نہیں اترنا چاہیے تھا۔ سارا قصور افق کا ہے۔
فرزام نامی تعلق کو وہ آگ لگا آیا تھا۔ دنیا کو وہ آگ لگا دے گا۔
اس کی ٹانگ پر بھاری جوتے کی ضرب لگی اور ڈوبتی ابھرتی ایک آواز سنائی دی۔

"تم یہاں سے دفعان کیوں نہیں ہو جاتے؟؟"
کون تھا جو اس کے کان کے پاس غرا رہا تھا۔ عدن نے ہوا میں مکے لہرائے اس کے جبڑے پر ایک زوردار گھونسا پڑا۔ اس نے اٹھنا چاہا اور وہ گر گیا۔ چھناکے کی آواز آئی۔ شاید بہت کچھ گرا۔
اس کے پیٹ میں لاتوں کی بارش ہو گئی۔ وہ بھی ہاتھ پیر ہلا تو رہا تھا۔ ابھی اس میں ہمت تھی۔ وہ مار سکتا تھا۔ وہ ہاتھ لہرا رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ لیکن اٹھ کر ہر بار وہی کر رہا تھا۔
اس میں بہت ہمت تھی ابھی بھی۔
وہ مار کھا رہا تھا۔ اسے پیٹا جا رہا تھا۔ اس کے کپڑے محلول سے گیلے ہو چکے تھے۔ جانے کیا کیا کچھ گر گیا تھا اس پر۔ وہ چلا رہا تھا اور جیسے جیسے اس کے چلانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ویسے ویسے اس کے منہ پر۔ پیٹ میں۔ کمر میں آ کر گھونسے لگتے تھے۔ اسے کئی بار گریبان سے پکڑ کر گردن میں ہاتھ ڈال کر کھڑا کیا گیا۔ گھسیٹا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرتا ہی جا رہا تھا۔ اسے خفیہ جیل خانہ یاد آ گیا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلانے لگا۔
"چھوڑ دو مجھے۔ نہیں ہوں میں دہشت گرد۔ میں۔ پانی دو مجھے۔ چھوڑو کتوں مجھے۔" اسے پٹخا گیا۔
"میں دہشت گرد نہیں ہوں خبیثوں۔"
اس کا سر کسی وزنی چیز سے ٹکرایا۔ جلتی بجھتی لائٹس اس کے آگے پیچھے رقص کرنے لگیں۔
وہ کہاں پڑا ہے؟ فٹ پاتھ پر۔ سڑک پر۔ یا کسی گندی سی گلی کی غلیظ سی جگہ پر؟ اور پھر اس کی پروا کسے تھی۔ پروا کرنے والے عدن جیسے نہیں ہوتے۔ وہ عدن کی طرح نہیں ہو جاتے۔
اس کی جیب میں رکھا فون بج رہا تھا۔ اس کا باپ اسے فون کر رہا تھا۔
شاید اب وہ عدن کو کوئی نئی راہ دکھا لے۔ زندگی گزارنے کا کوئی نیا گر۔ نئی مشق۔ اب وہ اسے کسی اور میدان کا رنگ ماسٹر بننے کے لیے کہے گا۔ شاید اب وہ کتے بلیوں سے اوپر کا کوئی اور جانور نما انسان اسے سدھانے کے لیے اکسائے۔ وہ عدن کو بتائے کہ اس کا باپ وہ ہے۔ غلام علی غلام۔ عدن اس کا باپ نہیں ہے۔
اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون کی ایک پتلی لکیر کنپٹی سے ہوتی ہوئی بدبودار جگہ میں جذب ہو رہی تھی۔ ایسی ہی ایک لکیر اس کے منہ سے نکل کر اس کے گریبان تک جا رہی تھی۔
اس میں اٹھ کر چلنے کی سکت نہیں اور وہ فرزام کو مار دینا چاہتا تھا۔
شراب پی کر وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور افق کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔ امریکی عدالت میں اس کا مقدمہ چل رہا تھا اور وہ ابھی بھی بہت سوں کو پیروں تلے مسل دینا چاہتا تھا۔
اس کے باپ نے اسے کبھی ہارنا نہیں سکھایا تھا۔ وہ سکندر اعظم بنا اوندھے منہ پڑا تھا۔
جن انسانوں کو وہ پچھاڑنے گیا تھا۔ ان سے وہ پچھڑ آیا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ مگر ان نہیں رہا تھا۔
"افق میری ہے۔ فرزام اسے چھوڑ دے گا۔" وہ بڑبڑاتا رہا۔
وہ ضدی ہے۔؟ نہیں۔
وہ بدنصیب ہے۔؟ نہیں۔
وہ قفل زدہ ہے۔ وہ قفل جو بے ہدایتوں پر لگتا ہے۔ وہی قفل جسے وہ توڑنا ہی نہیں چاہتے۔
فرزام گھر آیا تو تیزی سے بلڈنگ کی سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔
اسے خوشی ہوئی۔ انجانی خوشی۔ رات کے اس پہر۔ اس آخری پہر یہ دروازہ ایسے ہی نہیں کھلا۔ سارا گھر روشن تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ویسا ہی۔
نہیں۔ وہ ویسا بھی نہیں تھا۔ جس عورت کو وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھی اور گھر تک آتے جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اسے دروازے پر نظریں گاڑے ہی ملے گی وہ وہاں نہیں تھی۔
اس نے سارا گھر دیکھ لیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے بار دیکھا۔ حد تو یہ کہ اس نے کپڑوں کی الماری تک کھول کر دیکھی۔
یہ جو وقت گزر گیا۔ یہ صرف ایک وقت نہیں تھا۔ یہ ایک پیمانہ تھا۔ جو انہیں بتا گیا تھا کہ ان کی محبتیں اس پیمانے میں کہاں ہیں۔ کس درجے پر ہیں۔
فرزام نے وہ درجہ دیکھ لیا تھا۔
یہ صرف ایک رات نہیں تھی۔ گھپ رات۔ یہ ایک حساب کتاب کی رات تھی۔ وہ اس میں موجود محبت کا حساب کمال انداز سے کر گئی تھی۔
اسے افسوس ہوا۔ وہ واپس کیوں آیا۔ افق تو جا چکی تھی۔
وہ عدن کے پاس گئی ہے۔ یا وہ اس سے ناراض ہو گئی ہے۔
اس نے خود سے بھی چھپا کر دعا کی کہ وہ ناراض ہو کر گئی ہو۔ اس کے سارے اعتراضات ابھی بھی اس پر وہی تھے۔ لیکن ایک یہ دل ہے۔ جو اپنے ہی حکم صادر کرتا ہے۔ الگ ہی کھڑا ہوتا ہے۔
فرزام کے پاس افق کے لیے وہی دل تھا۔ وہی دل جو افق دیوانی تھی اپنی طرز پر۔ وہ بار بار اس کے راستے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار تھا۔
وہ بار بار اس کی منت کرنے۔ گڑگڑانے کے لیے تیار تھا۔
یہ دل جو الگ ہی مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔
پلٹ کر۔ لپک کر۔ افق سے لپٹ جانے کے لیے تیار تھا۔
اعتراضات۔ شکوک و شبہات۔ غصہ' نفرت' بے گانگی۔ سب ابھی بھی وہیں تھے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ دل بہت تیز ہوتا ہے۔ بہت پھرتیلا۔ وہ اس جنگ میں فاتح رہا۔
بہت دیر گزری۔ فرزام نے سر اٹھایا۔ اسے آہٹ سنائی دی تھی۔ اسے ایسی ہی آہٹ پہلے بھی بہت بار سنائی دی تھی۔ سٹنگ ایریا میں فلور کشن پر بیٹھے میز پر سر ٹکائے فرزام نے آنکھوں کو اٹھایا۔
وہاں سامنے افق کھڑی تھی۔ دروازے میں۔
گہرے پاتال سے وہ اوپر آیا۔ یکدم جھٹ سے۔
اس کے سارے یقین سچے تھے۔
اس کے سارے شکوک جھوٹے تھے۔
سب دیپ جل اٹھے۔ دیپک راگ آب و تاب سے گونجنے لگا۔
"کہاں تھیں تم۔؟" اٹھ کر بھاگ کر اس سے لپٹنے سے پہلے اس نے یہ پوچھا۔ اسے جواب چاہیے۔ ٹھیک وہی جو ان دونوں کو بچا سکے۔ وہی جواب چاہیے۔
"تمہیں ڈھونڈنے؟" اس پر نظر پڑتے ہی وہ شانت ہو گئی اور فرش پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
اتنے بڑے شہر میں وہ اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔ جبکہ جانتی تھی کہ اسے ڈھونڈ نہیں سکتی۔ جو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ ایسے ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ پھر بھی وہ اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔
"میں تمہیں ڈھونڈنے نکلی تھی۔"
"یہ مجھے ڈھونڈنے نکلی تھی۔"
ایک نیا لوک گیت محبت کے لیے لکھا جا رہا تھا۔
فرزام چل کر اس کے پاس آیا اور اس کے بالکل پاس نیچے بیٹھ گیا۔
"میں ہر سانس کے ساتھ تمہاری منت کروں گی۔ آنسوؤں کا ہر رنگ لیے روؤں گی۔ فرزام۔ میں تمہیں خود کو چھوڑنے نہیں دوں گی۔"
فرزام نے بڑھ کر اسے خود میں سمیٹ لیا۔
لوک گیت لکھا گیا۔
اپنی ہیروئن کا ہیرو بننے کے لیے وہ دریائے سین (پیرس) کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔ اسے وہاں کسی کا انتظار نہیں تھا۔ یہ نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ غضب کا موسم تھا۔ اچھی ہوا چل رہی تھی۔ دراصل کافی رومان پرور ہوا تھی۔ کیا پیرس میں ایسی ہی ہوا چلتی ہے شاید۔ اور شاید یہ صرف محبت کرنے والوں کے لیے ہی چلتی ہو۔ ان ہی پر اثر کرتی

ہو۔

اس کی ہیروئن ایک بہت بڑی آئس کینڈی کھا رہی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اکیلی ہی کھا رہی تھی۔ وہ اسے دینا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی بائیں جیب میں پھنس چکا تھا۔ نکل ہی نہیں رہا تھا وہاں سے۔ جب تک وہ ہاتھ باہر نہیں آئے گا۔ وہ بے رحم ہی بنی رہے گی اس کے ساتھ۔ وہ آس پاس دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں اسی پر لگی تھیں۔

اور وہ ہنس رہا تھا۔ ہاتھ برآمد نہیں کر رہا تھا۔ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

وہ تب بھی ہنسا تھا اور عدن کے تاثرات پر لطف اندوز ہوا تھا۔ جب بہت سے شراب خانوں میں سے اسے ڈھونڈ ڈھانڈ اس نے ایک گھونسا جڑا تھا۔

"میں افق کو ضرور چھوڑ دیتا۔۔۔ اگر میں عدن ہوتا۔" اس نے کہا تھا۔ عدن پر جیسے سب ہی آسمانی بجلیاں آگریں۔ اس کی شکل بتا رہی تھی۔ ایسا ہوا ہے۔ وہ بری طرح سے پٹ چکا ہے۔

افق کو آئس کینڈی بالکل مزہ نہیں دے رہی تھی۔ اسے فرزام پر غصہ بھی آرہا تھا۔

گٹار لیے ایک بے حد خوب صورت لڑکے Jeff Beck (گلوکار) کو گا رہا تھا۔ یقیناً "وہ اپنے سامنے بیٹھی لڑکی پر اپنا جادو جگانا چاہتا تھا اور یقیناً" وہ اسے کچھ اور بتانا چاہ رہا تھا۔

"I am in Love

Oh i am in Love"

کوٹ سے ہاتھ برآمد ہو چکا تھا۔۔۔ ہاتھ مٹھی بند تھا۔۔۔ یقیناً" اس میں کچھ بہت خاص بند تھا۔

I am all shock up

well my knees are shaking...

my hands are getting weak...

And

to stand on my own two...

Can't seem مسرت کی ایک تیز لہر افق میں جاگی۔۔۔ بند مٹھی کے ساتھ فرزام گھٹنوں کے بل جھکا۔ پیار کے پگلے شہر میں رہنے والے ایسے مناظر پر جشن مناتے ہیں۔ آس پاس اردگرد پھیلے ہوئے لوگ فوراً" متوجہ ہو گئے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ کچھ صرف گردنیں موڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ جانتے تھے انہیں کیا کرنا ہے۔

I fear...

I am in Love...oh

I am in Love...

اس نے بند مٹھی کھولی۔ انگوٹھی کو دو انگلیوں میں لیا۔ گستاف ایفل کے ٹاور نے ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ روایت زندہ کی جا رہی تھی۔ محبت کے اظہار کی رسم نبھائی جا رہی تھی۔ صدیوں پہلے کی۔۔۔ صدیوں بعد کی۔۔۔ صرف یہی ایک رسم زندہ جاوید کر دینے کے لیے کافی ہے۔

نامحسوس طور پر نوجوان لڑکے لڑکیوں کا۔۔۔ بوڑھوں کا۔۔۔ بچوں کا ایک دائرہ بن گیا۔۔۔ سب زیر لب مسکرا رہے تھے۔ وہ اس بدیسی کے کچھ بولنے کے انتظار میں تھے۔ وہ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کی شرمگیں مسکراہٹ کے انتظار میں تھے۔

"یہ انگوٹھی تمہاری ہے۔۔۔ اس انگوٹھی کو تھامنے والا ہاتھ تمہارا ہے۔ اس ہاتھ کے مالک کا دل تمہارا ہے۔۔۔ کیا یہ دل ہمیشہ کے لیے تمہارا ہیرو بن سکتا ہے۔۔۔؟"

افق نے ایک بلند قہقہہ فضا میں چھوڑا۔

"ہاں۔۔۔" وہ ذرا سا چلائی۔ انگوٹھی سے اس کا ہاتھ دمکنے لگا۔۔۔ اور انگوٹھی پر افق نے اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ دائرے کی صورت کھینچے لوگوں نے دل کھول کر تالیاں بجائیں' Jeff Beck کا "آئی ایم ان لو۔۔۔ آئی ایم ان لو" تیز ہو گیا۔

محبت کی رسم نبھا دی گئی۔۔۔ اور۔۔۔ محبت مقدس ٹھہری۔۔۔

نزہت شبانہ حیدر

"ہائے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔" پھپھو نے بیٹھتے ہوئے اتنی زور سے کہا کہ عرشہ جو بس نیند کی وادیوں میں اترنے کو تھی ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔

"پھپھو! آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"ہاں چندا! سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔" پھپھو نے ایک دفعہ پھر دہرایا۔ لیکن غنودگی میں اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سر کے درد کے لیے وہ کیا کر سکتی ہے۔

ناولٹ

لیکن جواب تو دینا ضروری تھا۔ اس لیے جمائی روک
ہوئے اس نے پوچھ لیا۔

"سر دبا دوں پھپھو؟"

"نہیں، سر دبوانے کی مجھے عادت نہیں ہے۔ بس چائے اگر مل جاتی تو شاید کچھ بہتری ہو جاتی۔" اور ان کے جملے پر زینب نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"پھپھو! میں آپ کے لیے چائے لے آتی ہوں۔"

اس نے پھپھو سے کہا اور راحمہ کی طرف دیکھے باہر نکل گئی، راحمہ اس وقت کمپیوٹر پر لگی ہوئی تھی۔ جس وقت وہ کمپیوٹر پر ہوتی تھی۔ اپنے دونوں کان کہیں گروی رکھ دیتی تھی۔ پھپھو سے ہمیشہ ڈانٹ پڑتی تھی لیکن نہ جانے وہ کیسی ڈانٹ ہوتی تھی کہ اس پر کبھی اثر ہی نہیں ہوا۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مگن رہتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ اپنے ہی کمپیوٹر میں مگن رہتی تھی۔

کبھی کبھی زینب کو حیرت ہوتی تھی اور وہ پوچھ بھی لیتی تھی اور راحمہ جواب میں ہنس پڑی تھی۔

"تمہیں اس نے کیا بنا دیا ہے زینب!"

"کیوں ایسی کیا بات ہو گئی؟" زینب کو برا بھی لگا۔

"یہ صرف کمپیوٹر نہیں ہے۔ پوری دنیا ہے۔"

"مجھے بھی پتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں بھی تعلیم حاصل کر رہی ہوں اور کمپیوٹر بھی استعمال کرتی ہوں

اور جواباً" راحمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"تم کچھ نہیں کر رہی ہو۔ آئی سمجھ میں بات

وقوف لڑکی! تم صرف اپنی پھپھو کے اشاروں پر چلنے والی ایک چابی والی گڑیا ہو۔" اس کے بعد وہ زور زور سے ہنسنے لگی اور جو کہیں پھپھو سن لیتیں تو ایک دو تو اس کی پیٹھ پر جڑ ہی دیتیں۔

"یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا۔ تمہیں ذرا تمیز نہیں ہے۔" اور مجال ہے' جو اس پر ذرا بھی اثر ہو رہی ہوتی۔

"امی میں کوئی زینب تو ہوں نہیں۔ جو غلط بات کو بھی آنکھیں بند کر کے مان لوں۔"

اور پھپھو اس کی باتوں سے تنگ آ کر کبھی چپ ہو جاتیں' کبھی غصہ ہو جاتیں۔ لیکن دونوں میں سے کسی صورت کا بھی اس پر اثر نہیں ہوتا۔ وہ وہی کرتی جو اس کا دل چاہتا اور یہ واحد ایسی بات ہوتی۔ جس پر زینب کو رشک آتا۔

بہت عرصہ پہلے یہ چیز اس کی زندگی سے نکل گئی تھی کہ جو دل چاہے وہ کرنا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ اسے عقل نہیں تھی یا وہ کر نہیں سکتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اسے لگتا کہ اس کا فائدہ نہیں ہے۔ چیزیں لڑ جھگڑ کر حاصل کر لی جائیں۔ واویلا مچا لیا جائے۔ اپنے حق کا بہت رونا رو لیا جائے۔ لیکن نصیب سے آپ کہاں بھاگ سکتے ہیں اور جو نصیب میں ہے' وہ مل ہی جائے گا۔

وہ ہر بات پر صبر کر لیتی تھی۔

ابا کا انتقال تو بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور جب امی کا انتقال ہوا تو جو کچھ اس نے زندگی سے سیکھا' ان میں ایک صبر بھی تھا۔

☆ ☆ ☆

"اوہ خدایا! تم لوگ کتنی تیاری کر رہی ہو۔" تزئی نے کمرے میں جھانکا۔

"ہاں تو تمہیں کیا ہے۔" عینی نے اپنے بالوں کو رول کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ "تمہیں پتا ہے نا کہ زوار کا ارادہ اسی سال شادی کرنے کا ہے۔"

"تو اس شادی کے پروگرام میں تمہاری تیاری کہاں سے آ گئی۔" تزئی الجھ گئی۔

"حسن بے پروا اسی کو کہا جاتا ہے شاید۔" [illegible] نے جھمکے کانوں میں اٹکاتے ہوئے طنزیہ کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے۔ زوار اتنی ساری کزنز میں سے کسی کو پسند ہی کر لے۔"

"اچھا! اگر شادی تو وہ ایک سے ہی کرے گا نا۔ اتنے سارے لوگ کیوں تیار ہو رہے ہیں۔"

"اس کو کمرے سے نکالو۔" عینی نے دانت پیسے۔ "خود تو یہ اس لیے تیار نہیں ہے۔ کیونکہ اسے پتا ہے۔ بغیر تیار ہوئے بھی قیامت ہے اور ہم لوگوں کے پیچھے لگ گئی۔"

"قسم سے میں یہی تو کہنا چاہ رہی تھی جو تم لوگ اتنی دیر میں سمجھے۔ بلاوجہ ہی اس قدر محنت کر لی تم لوگوں نے۔ جب تم لوگوں کا چراغ جلنا ہی نہیں ہے۔ تو پھر کیا فائدہ۔" اب کے تزئی نے باقاعدہ ان سب کو چھیڑا۔

"ہاں تو کیا ہوا' ایک چیز ہوتی ہے تقدیر اور تقدیر لکھتی ہے۔ یہ تو کسی کو بھی نہیں پتا۔"

"تو عینی! تم کس کی تقدیر آزما رہی ہو؟"

"اپنی۔" عینی نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے مسکارے کا ایک کوٹ اور لگایا۔ عینی کے مسکارا لگانے کی تکنیک بڑی زبردست تھی۔ جس سے اس کی پلکیں گھنی اور خم دار نظر آتی تھیں۔ اور بالوں کو بھی اس نے کرل کیا ہوا تھا۔ جس سے وہ بہت خوب صورت نہیں تو پھر بھی اچھی ضرور لگ رہی تھی۔

عینی آئینے کے سامنے سے ہٹی تو رابی نے اس پر قبضہ جما لیا۔ تزئی چند لمحوں تک ان سب کی تیاری دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"قسم سے مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ اگر وہ تم سب لڑکیوں کو دیکھے ہی نہ۔ ایک لڑکے کے لیے اتنا تیار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ تم جیسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں' جن کی وجہ سے مرد ہمارے سروں پر چڑھتے ہیں۔"

"ہمارے معاشرے میں مرد ہے ہی اس جگہ پر بیٹھا ہوا۔ جس کی طرف ابھی تم نے اشارہ کیا ہے تزئی اور تم



[illegible] ساری باتوں کو لڑکیوں کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش [illegible] ہوگی۔ ہم لوگ اور ہمارا معاشرہ جس [illegible] ہمیں اس طرح کی چیزوں اور ان [illegible] مجبور کر دیا گیا ہے۔ تمہیں نہیں پتا کہ کتنی [illegible] باتیں اور ہماری مائیں۔۔۔"

"[illegible] ہے کس قسم کا ہے۔" تزئی کے [illegible] تمسخر جھلک رہا تھا۔

[illegible] کی اس بات کا کسی نے جواب نہیں دیا تو وہ پور [illegible] کر باہر نکل گئی۔ اس وقت اسے چائے چاہیے تھی اور وہ کسی ایسے فرد کی تلاش میں تھی جو اسے گرما گرم چائے پلا دے۔

منیرہ بیگم نے تسبیح پڑھتے پڑھتے ایک نظر تزئی پر ڈالی اور انہیں پتا چل گیا کہ اسے کوئی چیز چاہیے۔ وہ بے قراری سے ادھر ادھر گھوم رہی تھی اور اس کی آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کو انہوں نے [illegible] پھر تسبیح نیچے رکھ کر اسے آواز دے ڈالی۔

"تزئی بیٹے! ادھر آؤ۔"

"جی تائی امی!" وہ فرماں برداری سے ان کے قریب پہنچ گئی۔

"کچھ چاہیے؟"

"جی تائی امی! مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔"

"تو بیٹا! بنا کر پی لو۔" انہوں نے رسان سے کہا۔

"تائی امی! گرمی تو دیکھیں' کتنی ہو رہی ہے۔ میں ایک منٹ بھی چولہے کے سامنے رہی تو مجھے الرجی ہو جائے گی۔"

"تزئی! تمہارے دماغ میں کون سا بھوت گھس گیا ہے۔ کبھی زندگی میں ایک چیز ہو گئی' سو ہو گئی۔ اسے تم نے دماغ پر کیوں سوار کر لیا ہے۔"

"تائی امی! زندگی میں جو چیز ایک دفعہ ہو جاتی ہے۔ اس کا خوف کبھی جاتا نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ لیکن تائی امی کا وہ بہت ___ احترام کرتی تھی اور ادب احترام اپنی جگہ لیکن اس میں یہ بات کہاں ہے کہ بات مان بھی لی جائے۔ حالانکہ وہ زوار کی ماں تھیں اور زوار خاندان کا سب سے زیادہ چہیتا تھا۔ ان سب کے علاوہ ایک چیز اور بھی تھی اور وہ تھی زوار کی نیچر۔ وہ فطرتاً بہت اچھا تھا۔ اپنی کزنز کی باتوں کی روشنی میں تزئی کا اپنا خیال تھا کہ ابھی بھی وہ اتنا ہی اچھا ہو گا۔ جتنا پہلے تھا۔ آخر کوئی انسان کتنا بدل سکتا ہے۔ اسے آج رات کو پاکستان پہنچنا تھا۔ جس کے لیے اتنی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تزئی کو علم تھا کہ اسے نہ تیاریوں کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی دوسری چیز کی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی آنے والا اس کے حسن سحر سے بچ جائے۔

☆ ☆ ☆

"توبہ کتنی گرمی ہو رہی ہے۔" زینب کو سخت زہر لگتا تھا گرمی کا موسم۔ نہ کام میں دل لگتا نہ سونے میں اور نہ اس کے پاس راحمہ جیسی کوئی مصروفیت تھی۔ جس میں کھو کر وہ سب چیزوں سے بیگانہ ہو جاتی۔

ابھی ابھی پھپھو ——— سبزی وغیرہ لے کر آئی تھیں اور اسے آواز دے رہی تھیں۔

"جی پھپھو!"

"بیٹا! ذرا یہ سبزی دیکھ لو۔"

"جی پھپھو! دیکھ لی۔ ساری سبزیاں بے کار ہیں۔ کوئی ایک سبزی بھی تازہ نہیں ہے۔"

"میں نے تبصرے کرنے کے لیے نہیں کہا ہے۔" انہوں نے جھنجلا کر کہا۔ "ان کو پکانا ہے۔"

"پھپھو! پھر سبزی بنا رہی ہیں راحمہ چیخے گی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"یہ بات بھی صحیح ہے کہ پھر کیا ہوا۔" زینب نے دل میں سوچا۔ پھر وہ فریج سے شامی کباب' چپلی کچھ بھی نکال کر کھا لے گی۔ دونوں ٹائم سبزی اسے ہی کھانی پڑے گی۔

جتنے کباب اسے کھانے ہوتے ___ کھا کر باقی وہ پلیٹ میں چھوڑ دیتی اور وہ پھپھو کو رزق کی بربادی کی وجہ سے کھانے پڑتے۔

یہ وہ باتیں ہوتیں۔ جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا تھا لیکن بس یہ خود بخود ہی دماغ میں آ جاتی تھیں۔

"پھپھو!" اس نے پالک چنتے چنتے دل کڑا کر کے پوچھ ہی لیا۔
"رابی کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ میری بیسٹ فرینڈ ہے۔"
"بیٹا! جو رشتے انسان پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ پھر کیا ان کے پیچھے بھاگنا۔" پھپھو نے تو اسے ایک جملے میں سمجھا دیا لیکن راحمہ جو پانی پینے کے لیے اٹھ کر آئی تھی اس نے فوراً پوچھ لیا۔
"یہ تو آپ نے بڑی عجیب بات کی ہے۔ اگر کل کو میری شادی ہو جاتی ہے تو کیا میرا اور آپ کا تعلق ختم ہو جائے گا؟"
"تیرے منہ میں خاک راحمہ! کیسی باتیں کرتی ہے۔" پھپھو بلبلا گئیں۔
"امی! میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ آپ کی بات کے جواب میں کہا ہے۔ جو بھی کہا ہے۔"
"تمہیں ضرورت کیا ہے ہر بات میں دخل دینے کی جاؤ یہاں سے۔"
جھک جھک تو ہوئی لیکن زینب کو اجازت مل گئی اور وہ راحمہ کی ممنون تو ہوئی لیکن اسے شکریہ نہ کہا۔ اسے پتا تھا کہ اس نے کوئی بات اس کی ہمدردی یا محبت میں نہیں کہی ہے۔ وہ منہ پھٹ تھی اور لاڈلی بھی اس لیے اسے ہر بات کی آزادی تھی۔ یہ اور بات کہ کسی کی آواز کسی دوسرے کے لیے بھی فائدہ مند بھی ہو جاتی ہے۔
اس نے شادی میں بڑا انجوائے کیا۔ ساری پریشان کن سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر، ہر چیز بھلا کر۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ تزئی باہر سے آنے والی ساری آوازیں سن رہی تھی۔ دو دفعہ اس نے اٹھ کر باہر جانا چاہا پھر دونوں ہی دفعہ سستی آڑے آ گئی۔
"چھوڑو بعد میں مل لیں گے۔" وہ دوبارہ سو گئی۔
سو کر اٹھی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور اندر سے کہیں چائے کے برتن کھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے دوپٹا گھسیٹ کر شانوں پر ڈالا اور باہر نکل آئی۔
باہر چائے کے لوازمات لگے ہوئے تھے۔
"آج کافی زیادہ اہتمام نہیں ہو گیا۔" اس نے پیسٹری اٹھاتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔ دماغ نکل گیا تھا کہ آج زوار آیا ہے اور شاید یہ سارا بھی اسی سلسلے میں ہے۔
تزئی نے ایک دم نگاہ اوپر کی۔ سامنے ہی روشن، چمکتی ہوئی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ تزئی ایک دم گڑبڑا گئی۔
زوار چار سالوں میں بالکل بدل گیا تھا۔ اس کا صرف تذکرہ سنا تھا۔ اور کچھ تصویریں دیکھی تھیں مگر وہ تو سب تذکروں، تصویروں سے بڑھ کر تھا۔ اسے اپنی خوب صورتی، اپنے ہی انداز پر بڑا ناز تھا لیکن اگلا بھی کچھ کم نہیں تھا۔
تزئی کو بہرحال برا نہیں لگا۔ کوئی تو ایسا فرد تھا جس میں کچھ خاص تھا۔ ورنہ جب سے وہ پاکستان آئی تھی اسے کوئی بھی خاص پسند نہیں آیا تھا۔ لڑکے ہیں تو ان کا ایک ہی کام ہے۔ ہر وقت ان کے ہاتھ اور کانوں پر سیل فون۔ اور لڑکیاں ہیں تو ڈراموں کی شوقین۔
وہ الگ مزاج کی لڑکی تھی۔ اسے وقت کا زیاں پسند نہیں تھا۔ یا ہر ملک کے لوگ شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہر چیز کو ناپ تول کر دیکھنے کے عادی۔ تزئی بھی اسی طرح کی تھی۔ خود پسند اور تھوڑی سی مغرور۔ یہ الگ بات کہ یہ ساری ہی چیزیں اس پر اچھی لگتی تھیں۔ جب وہ اپنی حسین چھوٹی سی ناک سکوڑ کر کوئی بات کرتی تو مخاطب بس اسے دیکھتا ہی رہ جاتا اور اب ——— وہ دیکھ رہی تھی ——— زوار کو۔
ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ زوار نے بھی اسے کچھ دلچسپی سے ہی لیا تھا۔ وہ گاہے بگاہے ایک نظر اس پر ضرور ڈال لیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

زینب نے ساری چیزیں بنا کر فریج میں رکھ دیں۔ گرمی زیادہ پڑ رہی تھی، باہر رکھنے میں خطرہ تھا کہ خراب ہی نہ ہو جائیں۔
"کتنی عجیب بات ہے۔" اس نے پلاؤ دم پر رکھتے ہوئے سوچا۔
"جتنی فکر چیزوں کی ہوتی ہے۔ اتنی ہی اگر انسانوں کی کر لیا کریں تو۔"
آج راحمہ کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے۔ پھپھو نے پہلے ہی سے بہت سی چیزیں بنوائیں، پھر رات کے کھانے کے لیے بھی تیاری کروا دی۔
"اگر مہمانوں نے کھانا نہیں کھایا تو پھر دو دن تک اسی کھانے کو باسی کر کے کھاتے رہو۔" اس نے آنچ کم کرتے ہوئے دل میں سوچا۔
"کاش! اس گھر میں کوئی لڑکا ہوتا جس کو باسی کھانے ناپسند ہوتے پھر شاید پھپھو کچھ سدھر جاتیں۔" اس نے سر جھٹکا۔ کیسی کیسی سوچیں دماغ میں آ جاتی ہیں۔
"راحمہ!" اس نے قریب سے گزرتی راحمہ کو آواز دی۔ "تم تیار ہو جاؤ پھپھو نے کہا ہے۔"
"میں اسی طرح ٹھیک ہوں۔" اس کے لہجے میں نخوت تھی۔
"مگر ..." زینب نے دوبارہ کچھ کہنا چاہا تو راحمہ نے روک دیا۔
"میرا خیال ہے تم تیار ہو جاؤ۔ تمہیں زیادہ ضرورت ہے زینب!"
زینب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے دل کی بات چھپا کر مسکراہٹ کا فن ازبر ہو گیا تھا۔ محنت بھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس وقت بھی بغیر کسی محنت کے مسکراہٹ اس نے اپنے ہونٹوں پر سجائی اور اندر بڑھ گئی۔
اس نے اپنا کام پورا کر لیا تھا۔ اب آگے پھپھو جانیں اور راحمہ۔ اسے تو راحمہ کا بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کے خواب کیا ہیں۔ وہ ہر آنے والے رشتے پر اتنا برا اور سڑا منہ بنا کر بیٹھتی تھی کہ دیکھنے والوں کو بھی نظر آ جائے کہ وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہے مگر یہ ساری چیزیں فی الحال پھپھو کو نظر نہیں آ رہی تھیں۔
دوسرے دن صبح بھی پھپھو کا موڈ کچھ آف تھا۔ وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ورنہ جس دن وہ بہت سارا کام کرتی یا کوئی دعوت نمٹاتیں۔
چار دن تک پھپھو بہت میٹھے لہجے میں بات کرتی تھیں، پھر اب پتا نہیں کیا ہو گیا ——— اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ پھپھو کے پاس آ کر بیٹھ گئی لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بدستور اپنے کام میں الجھی رہیں۔
"پھپھو! کوئی بات ہو گئی ہے۔ آپ ناراض ہیں؟" اندیشوں میں الجھنے کے بجائے اس نے رسان سے پوچھ لیا۔
"تمہارا کیا خیال ہے، مجھے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ راحمہ کا آنے والا تیسرا رشتہ ہے۔ جنہوں نے تم کو پسند کیا ہے۔"
لیکن اس سارے معاملے میں اس کا قصور کیا تھا ——— وہ پوچھ نہیں سکی۔

☼ ☼ ☼

"آپ اتنی لاپروا کس طرح رہ جاتی ہیں۔"
"کیا مطلب؟" تزئی نے اپنے تیکھے ابرو اٹھائے۔
"شاید میں مطلب نہ سمجھا پاؤں۔"
"کیوں!"
"ہر چیز سمجھانے کے لیے نہیں ہوتی۔ کچھ چیزیں بندے کو خود ہی سمجھ جانا چاہیے۔"
"اس کے لیے بندے کا ذہین ہونا ضروری ہے۔"
"آپ ذہین ہیں ——— یہ آپ کے چہرے پر لکھا ہے۔"
"کیا لکھا ہے؟"
"بتا دوں؟" اس کا لہجہ جیسے کچھ جتانے والا تھا۔ تزئی کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔
آرزو تو ان کے چہرے کا بھی بھید کھول دیتی ہے۔ جو اپنی خواہشوں کو بہت چھپا کر رکھتے ہیں اور وہ کوئی ایسی بھید بھاؤ والی لڑکی تھی بھی نہیں جو اپنا راز چھپا کر اس کی فکر میں گھلتی رہتی۔

لیکن ابھی نہیں۔ ابھی کوئی ایسا وقت نہیں تھا۔ ایک شخص کو اس نے ابھی۔ پندرہ دن پہلے دیکھا تھا۔ اس کے منہ سے اپنے لیے کوئی ایسی بات سنتا۔ جس سے یہ لگے کہ وہ کمزور ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ ایک دم پلٹ کر اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

پھپھو کا موڈ اب کافی حد تک بہتر تھا۔ کچھ لوگ اور راحمہ کو دیکھنے آرہے تھے۔

"دیکھو بیٹا!" پھپھو نے پیار سے اسے نزدیک بٹھایا۔

"میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ اور سچی بات تو یہ کہ صحیح وقت بھی یہی ہے لیکن تم جانتی ہو۔ راحمہ اس قابل نہیں ہے کہ وہ تمہارے بعد اس گھر کو سنبھال سکتی۔ پہلے اس کی شادی ہو جائے پھر تمہارا دیکھوں گی۔"

"پھپھو! میں نے آپ سے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں تو تو بڑی پیاری بچی ہے۔ کاش! راحمہ کے اندر بھی کہیں سے کچھ انسانیت آجائے۔ خیر! دیکھو کل کے لیے۔"

"اف۔" زینب کو بے اختیار پچھلے ہفتے کی تھکن یاد آگئی۔ ابھی تو پوری طرح وہ بھی نہیں اتری تھی۔

"میری بات سن رہی ہے نا۔"

"جی جی!" وہ ایک دم سیدھی ہو بیٹھی۔

رات کے وقت راحمہ اپنے لیپ ٹاپ پر تھی جب اس نے راحمہ سے پوچھ ہی لیا۔ اس روز روز کی پریڈ سے تو جان چھوٹتی۔

"راحمہ! جب تمہیں شادی ہی نہیں کرنی ہے تو روز روز کے تماشوں کی کیا ضرورت ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔۔۔ کم از کم اس بہانے ہماری اماں کچھ پیسے تو خرچ کرتی ہیں نا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" اس کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا۔

"ایک تو تم بڑی کوڑھ مغز ہو۔" راحمہ نے بر... کر کہا۔ "یار باہر کھانے کھا کھا کر ہماری سوچنے کی صلاحیتیں بالکل ختم ہو گئی ہیں۔ میرا سیدھا مطلب یہ تھا کہ اس بہانے مزے دار چیزیں تو گھر مل جاتی ہیں۔"

"اور رشتہ۔۔۔ وہ؟"

"رشتے گئے ہوا میں۔" راحمہ نے ہاتھ کو جھٹ... طرح اڑایا۔ "جس قسم کے رشتے گھر میں آتے ہیں میں تو کبھی ایسے کسی بندے سے شادی نہ کروں۔"

زینب صرف سر اٹھا کر بے وقوفوں کی طرح اسے منہ دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ باتیں آئیں... نہیں آئیں مگر اس نے راحمہ سے دوبارہ پوچھنے کا رسک نہیں لیا۔ وہ موڈی تھی۔ مرضی ہوتی تو جواب دیتی ورنہ خاموشی۔

وہ پھپھو کے ساتھ بھی یہی کرتی تھی تو پھر زینب کہاں کی آسمان سے اتری ہوئی تھی کہ اس کے سوال کا جواب دیا جاتا۔

"ویسے میرا خیال ہے زینب! کہ وہ رشتے جو... نہیں کہاں کہاں سے اٹھ کر آجاتے ہیں۔ اماں تمہاری شادی ان سے کیوں نہیں کر دیتیں۔ تم ان کے پرفیکٹ ہو۔"

"راحمہ! یہ کسی کو بھی نہیں پتا کہ کون کس کے لیے پرفیکٹ ہے۔"

"رائٹ۔" راحمہ نے کاندھے اچکائے "میز...۔"

"زینب!" پھپھو کی آواز باہر سے آئی تو وہ راحمہ کا پورا جملہ سنے بغیر باہر آگئی۔

"تمہاری خالہ کا فون آیا تھا۔"

"اچھا۔" وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ "خالہ نے کب آنے کا کہا ہے؟"

"اب اس کا تو مجھے نہیں پتا۔" پھپھو نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے انہوں نے آنے کا کہا ہے اب کب اس کا مجھے علم نہیں۔"



"پھپھو! آپ میری بات کروا دیتیں۔ بہت عرصہ ہو گیا خالہ کی آواز سنے ہوئے۔"

"ارے! آواز سے کیا ہوتا ہے۔ بہت دل چاہ رہا ہے تو جا کر مل آؤ۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"چل نہیں ہو سکتا۔ اب کے تمہاری خالہ آئیں تو ان کے ساتھ چلی جانا مگر تمہارے پاس تو کوئی ڈھنگ کا جوڑا بھی نہیں ہوگا۔ نیا سوٹ تم نے جلا دیا۔ کتنا مہنگا جوڑا تھا۔"

"پچاس یا پچپن۔" زینب نے جلدی سے دل میں حساب جوڑا۔

اس جوڑے کا جلنے کا اسے بھی بہت افسوس تھا کیونکہ وہ پچھلے چار سالوں میں بننے والا پہلا نیا اور قیمتی جوڑا تھا۔ قیمتی اس لیے کہ اس کی قیمت راحمہ کے جوڑے کی قیمت کے برابر تھی اور وہ تھا بھی بہت پیارا۔ اس کا کلر، ڈیزائن نفاست سب ہی کچھ راحمہ کے سوٹ سے اچھا تھا۔ لیکن وہ سوٹ پتا نہیں کس طرح جل گیا۔ وہ ایک دفعہ بھی اس سوٹ کو نہیں پہن سکی۔ اس کا ملال کتنے دنوں تک نہیں گیا۔ اور پھپھو بھی اس بات کو نہ جانے کتنی مرتبہ جتا چکی تھیں۔ اب تو زینب نے حساب رکھنا شروع کر دیا تھا۔ آج کا ملا کر پچپن دفعہ یہ جملہ ہو گیا تھا۔

"چلو تم ایسا کر لینا۔ راحمہ کے دو تین جوڑے لے لینا۔ اس کے پرانے جوڑے بھی کافی نئے ہوتے ہیں۔"

"پھپھو! کوئی کام ہے تو بتا دیں۔"

"کیوں خیریت؟"

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں اب جا کر لیٹوں گی۔"

"لڑکیوں کو اتنا بہت زیادہ آرام نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں۔ اب راحمہ کو ہی دیکھ لو۔ آرام کر کر کے اس نے اپنا جسم کیسا موٹا کر لیا۔ آج کل موٹی لڑکیوں کو کہاں پسند کیا جاتا ہے اور تم کو دیکھو کتنی اسمارٹ لگتی ہو۔ چہرہ دیکھو کیسا چمکتا ہوا ہے۔"

زینب کا دل چاہا کہہ دے۔ "اسمارٹ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں پھپھو! جس کے مقدر نہیں چمکتے ان کا چہرہ چمکے بھی تو کیا۔"

لیکن وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر کمرے میں آگئی۔

اس نے راحمہ سے کوئی سوٹ نہیں مانگا۔ جو دو تین سوٹ اس کے پاس قدرے بہتر حالت میں تھے زینب نے وہی نکال لیے۔ کل صبح اس میں کلف لگاؤں گی۔ پھر نئے لگیں گے۔

"خیریت؟" راحمہ نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

"نہیں! خالہ امی آرہی ہیں۔"

"اوہ نو۔۔۔ پہلے بھی تم چلی گئی تھیں۔ اتنی پریشانی ہو گئی تھی اور امی نے کہا تھا۔ آئندہ زینب کو

نہیں بھیجوں گی۔ بڑی پریشانی ہو جاتی ہے اور اب تم دوبارہ کراچی جا رہی ہو۔۔۔ اور تو کچھ نہیں ہوتا میری شامت آجاتی ہے۔"

"اور میں یہاں رہی تو میری شامت آجائے گی۔ بہت مشکلوں سے تو پھپھو کا منہ سیدھا ہوا ہے اور ابھی ایک دو لوگ باقی ہیں۔ جنہوں نے آنا ہے۔ اسی لیے شاید وہ مجھے بھیج بھی رہی ہیں۔" زینب نے دل میں ساری باتیں سوچ لیں۔ مگر راحمہ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ ہر بات کو اپنے مطلب کا مفہوم پہنا دیتی تھی۔

"پتا نہیں کیوں تمہاری خالہ کو اچانک ہی محبت کا جوش چڑھ گیا ہے۔ پہلے تو انہیں کبھی خیال نہیں آیا۔"

"کیونکہ وہ پہلے شارجہ میں ہوتی تھیں۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"اچھا۔" راحمہ نے طنزیہ کہا۔ "ایک تو تمہیں جو کوئی جو کچھ بتا رہا ہے۔ تم اس پر حرف بہ حرف یقین کر لیتی ہو۔ تمہاری خالہ پچھلی دفعہ کالے رنگ کی ٹیکسی میں آئی تھیں۔ ان کا لباس، پرس، کسی بھی چیز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ شارجہ سے آئی ہیں لیکن تم نے ان کے کہنے پر فوراً یقین کر لیا۔ جب چہ۔ تمہیں تو کوئی بھی بے وقوف بنا سکتا ہے زینب!"

"کوئی فرق نہیں پڑتا راحمہ! انسان کو زیادہ تر اس کے اپنے ہی بے وقوف بناتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"آپ کالج جا رہی ہیں؟"

"جی۔" تزکی نے مختصر جواب دیا۔

"آپ پاکستان صرف پڑھنے کے لیے آئی ہیں؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔ دبئی سے بہتر مما پاپا نے سمجھا کہ مجھے پاکستان بھیج دیں۔ یہاں کی پڑھائی بھی اچھی ہے۔"

"بہت اچھی ہے، جو لوگ کچھ کر نہیں سکتے، وہ صرف ہر چیز میں خامی نکالتے ہیں اور پاکستان اور اس کی چیزیں ان کے لیے آسان ٹارگٹ ہے۔" زوار نے سادگی سے کہا۔ تزکی نے ایک نظر زوار پر ڈالی۔

وہ سادہ انداز میں بات کرنے والا بندہ تھا مگر اس کے اندر کوئی بات تھی۔ انوکھی، الگ سی۔ تزکی نے ایکدم سر جھٹکا۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ یوں اس طرح اس کے بارے میں سوچنا۔ جس سے فقط دو ہفتے کی شناسائی تھی۔

"کیا ہوا آپ کے سر میں درد ہے؟" زوار کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ مگر تزکی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوئی۔ اتنا تو اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کی فطرت میں ہمدردی ہے۔ وہ ہر ایک کا بہت خیال کرنے والا انسان تھا۔ شاید یہی خوبیاں ہوتی ہیں جو ایک بندے کو دوسرے سے الگ کرتی ہیں۔

"میں آپ کے کالج کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اگر چند ہو تو میرے ساتھ ہی چلیں۔" زوار نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ تزکی منع کرنا چاہتی تھی مگر اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔

وہ ان راستوں سے چھ مہینے سے گزر رہی تھی۔ ہر چیز اسے ازبر تھی۔ لیکن آج ہر چیز نئی تھی۔

"اتنا فرق پڑ جاتا ہے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "زندگی میں اور خود اپنے آپ میں۔"

رات تزکی کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ کروٹ بدل بدل کر اس کا حال خراب ہو گیا۔

"کیا ہوا خیریت۔۔۔ تم کچھ بدل سی گئی ہو۔ پہلے تو تمہیں بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی تھی۔" نوری نے فکر مندی سے کہا۔

"تو؟" تزکی چڑ گئی۔ "ضروری نہیں کہ زندگی میں ہر چیز پہلے کی طرح ہو۔ چیزیں اپنے مقام سے ہٹتی رہتی ہیں۔"

"چیزیں ہٹ جائیں ان کی خیر ہے مگر کچھ چیزیں جیسے دل وغیرہ وہ اپنے مقام پر ہی صحیح رہتی ہیں۔"

"تمہاری ہر وقت مذاق کرنے کی عادت مجھے زہر لگتی ہے۔"



"زہر تو تمہیں ہم لوگ بھی لگتے ہیں مگر برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"وہ اور لوگ ہوں گے نوری! میں نے زندگی میں بھی کچھ برداشت نہیں کیا ہے۔ جو چاہا مل گیا۔ اس لیے مجھے نہیں پتا برداشت کرنا کسے کہتے ہیں۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ کوئی تو اپنی زندگی سے خوش ملا۔" نوری کا انداز صلح جو تھا۔

"ہم سب کی دعا ہے کہ آگے بھی تمہارے ساتھ اسی طرح رہے۔ ویسے ایک مفت مشورہ ہے۔ حالانکہ پکی بات ہے کہ تم سنو گی نہیں لیکن انسان اپنا کام تو پورا کرے نا۔"

"کون سا مشورہ۔" تزکی نے ابرو اچکائے۔

"لڑکوں یا مردوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ جوان کی ماں ہوتی ہیں نا۔ ان سے بندے کو اچھی ریلیشن شپ رکھنی چاہیے۔"

"مجھ سے فالتو باتیں نہیں کرو۔" تزکی نے منہ بنایا

"فالتو بات۔ ایک وقت آئے گا۔ جب تمہیں میری بات یاد آئے گی۔ مگر تب تک دیر ہو چکی ہو گی۔" نوری نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم یہ نجومیوں والی باتیں مجھے نہیں بتاؤ۔ ساری زندگی میں نے اپنے دل کی مانی ہے۔"

"ہمیشہ دل کی نہیں ماننی چاہیے۔ ہمیشہ ساتھ دینے والا دل بھی کبھی بڑا بے مروت جاتا ہے۔"

"بن نہیں جاتا ہے۔ بن گیا ہے۔" تزکی نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ تو ہونا تھا۔ اللہ نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ رکھا ہے۔ تمہیں اپنے حسن پر جتنا غرور تھا۔ کسی کو تو یہ غرور توڑنا ہی تھا۔"

"تمہیں کیا پتا ہے کچھ بھی نہیں بس فضول باتیں کروا لو۔ کسی کے اندر کوئی چیز ہوتی ہے تو وہ غرور کرتا ہے بلا وجہ تو ایسے کام کوئی نہیں کرتا۔"

"اچھا بھئی! اب سو جاؤ!" نوری نے ہاتھ جوڑے "تم سے تو کوئی جیت نہیں سکتا اور ایک بات بتاؤں۔ محاورے مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آتے۔ لیکن ایک محاورہ بڑے اچھے طریقے سے سمجھ میں آگیا۔ ایک تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔"

تزکی نے جواب میں اس پر تکیہ کھینچ مارا۔

☼ ☼ ☼

"تزکی! آج صبح ہی صبح کیسے اٹھ گئیں خیریت؟"

"اف!" تزکی نے کڑواہٹ سے سوچا۔

"میں صحیح کہتی ہوں کہ پاکستان میں لوگ ہر چیز کے لیے پریشان ہو جاتے ہیں اور کر بھی دیتے ہیں۔ ہر بات کا جواب دو۔ نیند نہیں آرہی تو ان کو بتاؤ۔ جلدی اٹھ گئے تو جواب دو۔"

منیرہ بیگم نے ایک نظر تزکی کے چہرے پر ڈالی۔ انہیں پتا چل گیا کہ وہ جواب دینا نہیں چاہ رہی ہے۔ انہوں نے تسبیح نیچے رکھ کر اس کے چہرے پر پھونک ماری۔

وہ ان کی ساری بھتیجیوں میں سب سے خوب صورت تھی مگر پتا نہیں اس کا مزاج کس پر چلا گیا تھا۔ ایک عجیب سی خود سری اور ہٹ دھرمی تھی۔ جس سے انہیں خوف آتا تھا۔ وہ دور اندیش خاتون تھیں۔ انہیں وقت سے پہلے واویلا کرنے کی عادت نہیں تھی لیکن ان کی چھٹی حس کچھ الگ سی کہانی سنا رہی تھی۔

زوار۔۔۔ ان کا تابعدار بیٹا تھا۔ وہ سچ مچ ان اولادوں میں سے تھا۔ جنہیں آنکھوں کی ٹھنڈک کہا جاتا ہے۔ وہ اس کی آنکھوں کے سارے رنگ پہچانتی تھیں۔ وہ باہر رہ کر نہیں بدلا تھا لیکن کچھ دنوں سے اس کے سارے انداز بدلے ہوئے تھے۔ محبت نے ان کے بیٹے کے انداز بدل دیے تھے۔ جس محبت نے ان کے بیٹے کو بدلا تھا۔ اس نے دوسرے فریق پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ان کے لیے بیٹے کی خوشی سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا مگر اب ان کے لیے راستے تکلیف دہ ہو گئے تھے۔

"اللہ مالک ہے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" ہمیشہ کی طرح انہوں نے ساری پریشانیوں کو کہیں اور منتقل کیا

اور پرسکون ہو گئیں۔

آج انہیں بہت سارے کام کرنے تھے۔ پچھلے چار پانچ دن سے انہیں زینب یاد آ رہی تھی۔ انہوں نے اس کی پھپھو کو فون تو کر دیا تھا مگر انہیں امید تھی کہ اس دفعہ بھی انہیں منع کر دیا جائے گا۔ لیکن اس دفعہ وہ بڑی خوشی سے بھیجنے پر آمادہ تھیں۔ چاہے اس کے پیچھے جو بھی وجہ ہو اللہ نے میرا راستہ تو بنا دیا۔ وہ پھر سے رزکی کے متعلق سوچنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

ابھی کل رات ہی کی بات تھی۔ وہ اپنے لیے ایک بہت پیارا سا سوٹ بوتیک سے لے کر آئی تھی۔ وہ سب ہی کو پسند آیا تھا۔ اس پر بہت نفیس سا کام بنا ہوا تھا۔ سوٹ دیکھ کر عینی نے کہا۔

"میرا بھی اسی قسم کا سوٹ ہے۔ میں نے اپنی پاکٹ منی جمع کر کے خریدا ہے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا میں جس بوتیک سے لیتی ہوں۔ اس کا ہر پیس سنگل ہوتا ہے۔ اس کی کاپی مارکیٹ میں نہیں آتی۔" اس کا لہجہ بے حد خراب تھا۔ سب ہی کو برا لگا۔ لیکن رزکی کو کسی نے ٹوکا نہیں۔ عینی کو مگر اس کا لہجہ زیادہ ہی برا لگا۔ وہ اٹھ کر اپنا سوٹ لے کر آ گئی۔

وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ دونوں سوٹ بالکل ایک جیسے تھے اور اس نے پہلے خریدا تھا۔ اس لیے وہ اس پر حسب معمول چلا بھی نہیں سکتی تھی اور اپنی ہی چیزوں پر اختیار ہوتا ہے اس لیے اپنے سوٹ کو اس نے گولہ بنا کر شاپر میں ٹھونس دیا۔

"کل لالی آئے گی۔ اس کو یہ سوٹ دے دیجئے گا۔"

"ہیں! ہیں!" سب ہی تڑپ کر رہ گئے۔ لیکن سب کو ہی پتا تھا۔ وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ جو کہہ دیا، چاہے وہ صحیح ہو یا غلط۔ اسی پر عمل ہوتا تھا۔

"پلیز رزکی! ایسا مت کرو۔ میرا سوٹ بھی ڈی ویلیو ہو جائے گا۔" عینی گڑگڑائی۔

"سزا تو ملنی چاہیے۔"

"کیسی عجیب منطق ہے۔ مجھے کیا الہام ہوا تھا کہ تم یہ سوٹ خریدو گی۔" عینی گڑگڑانا بھول کر ناراضی سے بولی۔

"اس کا مجھے نہیں پتا۔" رزکی نے کاندھے اچکائے اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

منیرہ بیگم نے کچھ نہیں کہا۔ انہیں لڑکیوں کی اس قسم سے بڑا خوف آتا تھا، جو بولڈنیس کے نام پر اس قسم کی حرکتیں کرتی ہیں اور صرف اپنی ہی چلانا چاہتی ہیں۔ تربیت ہو جاتی ہے، بعد میں صرف پھل کھانا ہوتا ہے اور منیرہ بیگم کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ تربیت جس نے کرنی تھی کر لی۔ کیا پھل انہیں کھانے پڑیں گے؟

انہیں جھرجھری سی آ گئی۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئیں۔ لیکن دل کو کسی پل قرار نہیں تھا۔ کوئی چیز تھی جو ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"باہر کوئی خاتون آئی ہیں۔" راحمہ نے روٹی بناتی ہوئی زینب کو اطلاع دی۔ "تمہارا حال چال پوچھ رہی ہیں۔"

"خالہ امی ہوں گی۔" وہ ایک دم باہر بھاگی۔

"اس کو کیا ہو گیا۔" راحمہ نے ناگواری سے جاتی ہوئی زینب کو گھورا۔

"بعض اوقات بالکل بچوں والی حرکتیں کرتی ہے ویسے بڑی سمجھ دار بچی ہے۔ اور پتا نہیں امی اس کو بھیجنے کی کیا پڑ گئی ہے۔ جب کہ جانتی بھی ہیں کہ پورا گھر اس نے سنبھالا ہوا ہے۔" اس نے یہ بات ماں کو بول بھی دی تھی۔ جس پر انہوں نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

"گھر سنبھالنے کے ساتھ ساتھ وہ تمہاری تقدیر بھی سنبھال سکتی ہے، تم پڑی سوتی ہی رہنا۔ یہ آنے والا تیسرا رشتہ ہے جنہوں نے زینب کو پسند کیا ہے۔ اب وہ لوگ اور دیکھنے کے لیے آنے والے ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ ان کے آنے سے پہلے زینب کچھ دنوں



کے لیے چلی جائے اور ظاہری بات ہے۔ وہ اس کی [illegible] ہیں۔ تین دفعہ منع کرنے کے بعد چوتھی دفعہ تو مجھے بھیجنا ہی تھا۔"

"آپ کی اپنی منطق ہے امی ـــــ پہلے یہ خالہ جان کہاں غائب تھیں۔"

"دبئی میں ہوتی تھیں۔" انہوں نے بے زاری سے کہا۔ "ابھی چار سال پہلے پاکستان آئی ہیں۔"

"اچھا مذاق ہے۔" راحمہ نے بہت لطف لیا۔ "یہ جو ابھی کل ٹیکسی میں بیٹھ کر خاتون آئی تھیں یہ دبئی میں ہوتی ہیں۔ امی! انسان کا رہن سہن بھی بہت کچھ بتا دیتا ہے۔ آپ کو تو جو کوئی جو بھی بات کہتا ہے۔ اسی پر یقین کر لیتی ہیں۔"

"ارے بھئی! وہ سادہ مزاج خاتون ہے۔" آدھا جملہ پھپھو کے منہ میں تھا کہ راحمہ باہر نکل گئی۔

"ساری زندگی اس لڑکی کا دماغ خراب ہی رہے گا۔" پھپھو نے پاندان کا ڈھکن بند کرتے ہوئے جھنجھلا کر سوچا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے تائی امی کی بھانجی کو دیکھا؟" نوری نے مسکرا کر عینی کو دیکھا۔

"صبح سے اسے دیکھ کر بڑے مزے کا خیال آ رہا ہے۔" عینی نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"کوئی فالتو بات نہیں کرنا۔ مجھے تو بڑی اچھی لگی۔ اب ایسی لڑکیاں کم ہی نظر آتی ہیں۔ سادہ اور معصوم سی۔"

"بات تو صحیح ہے لیکن وہ بے وقوف نہیں لگتی۔ بااعتماد لڑکی ہے۔ خیر ہمیں کیا ہمیں کون سا اس سے رشتے داری بنانی ہے۔ چار پانچ دن میں وہ واپس چلی جائے گی۔"

"تمہیں لگتا ہے کہ اس طرح ہو گا؟"

"کیا مطلب؟"

"کچھ چیزیں تقدیر لکھتی ہے اور کچھ چیزیں انسان کو خود لکھنی پڑتی ہیں۔ یا بنانی پڑتی ہیں۔ اسے منصوبہ بندی کہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" نوری نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"تم واقعی عقل مند ہوتی جا رہی ہو یا بننے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"دونوں میں سے کچھ نہیں۔" عینی نے ٹھنڈی سانس لی۔

"اور میرا نہیں خیال کہ یہ کچھ ایسا غلط بھی ہے۔ عقل مند لوگوں کی اپنی باتیں ہوتی ہیں۔" نوری نے عینی کو اس کے حال پہ چھوڑا اور باہر نکل گئی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے عینی کا، نہ جانے خود ہی کیا بڑبڑائے جا رہی ہے۔"

باہر نکلتے ہی اس کی نظر زوار اور رزکی پر گئی۔

زوار کچھ کہہ رہا تھا اور وہ سر جھکائے سن رہی تھی۔ کتنا عجیب سا منظر ہے۔ رزکی اور یوں اس طرح سر جھکا کر بات سن لے۔ بڑی بات ہے۔ اس نے رزکی کے چہرے پر پھیلے شفق کے رنگوں کو غور سے دیکھا، پھر زوار کو دیکھا۔

زوار بہت اچھا لڑکا تھا۔ سب ہی لوگ اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی چاہت کرتے تھے مگر وہ جس کی چاہ کر رہا تھا۔ وہ پورے گھر میں کسی کو بھی پسند نہیں تھی۔ شاید اپنی زبان کی وجہ سے یا شاید اپنی عادتوں کی وجہ سے۔ مگر محبت یہ سب کچھ کہاں دیکھتی ہے اور حسن تو واقعی بہت بڑا ہتھیار ہے۔ آدھی جنگ تو آپ حسن سے ہی جیت لیتے ہیں۔ نوری نے بہت کچھ سوچا اور پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

رزکی نے یہ دیکھا اور دل ہی دل میں ہنس پڑی۔ دل نے جس کی خواہش کی تھی یا محبت جس کی خواہاں تھی۔ وہ اس کا نصیب بننے والا تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ اور ایسے میں لوگوں کے یہ جلے کٹے رویے اسے بڑا لطف دیتے تھے اور پہلے سے موجود احساس برتری کو کچھ اور جلا مل جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی زوار کو پانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ اس کے منہ سے بات نکلتے ہی پوری ہو جاتی ہے۔ باقی لوگوں کی

تقدیر نہ جانے کس سے لکھی ہوتی ہے۔ تزکی! تو اپنے متعلق اتنا جانتی تھی کہ اس کی تقدیر سونے کے قلم سے لکھی گئی ہے۔ جہاں سب کچھ سنہرا ہوتا ہے۔ چمکیلا اور روشن۔

اس روشنی میں منزلوں کے نشان بھی نظر آتے ہیں اور خود منزل بھی۔

بس صرف ایک چیز بھول گئی تھی وہ کہ غرور اور تکبّر اللہ کی چادر ہے۔ یہ بندوں کے لیے بنی ہی نہیں ہے۔

"ایک کانٹا چبھنے کی اتنی تکلیف؟"

زوار نے حیرت سے اس کی چھوٹی انگلی کو دیکھا۔ جس پر خون کی ایک لکیر سی بہہ رہی تھی۔

"آؤ تمہاری بینڈیج کردوں۔"

"نہیں نہیں' اس سے مجھے زیادہ تکلیف ہوگی۔"

"کیوں تکلیف ہوگی۔" زوار نے حیرت سے کہا۔

"بس یوں ہی ٹھیک ہے۔" تزکی نے نزاکت سے گردن جھٹکی۔ زوار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی اپنی منطق ہوتی تھی۔ اتنا تو وہ اسے جان ہی گیا تھا۔ اس لیے بحث بھی نہیں کرتا تھا۔

✿ ✿ ✿

مما کا فون آیا تھا۔ انہوں نے دبئی میں ہی کوئی رشتہ دیکھا تھا۔ انہیں رشتہ بہت پسند آیا تھا اور وہ چاہ رہی تھیں کہ تزکی بھی اس رشتے کو اوکے کردے۔ لیکن تزکی نے سنتے ہی دو ٹوک الفاظ میں منع کردیا۔

"مجھے نہیں کرنی ہے شادی۔"

"کیا مطلب ہے؟" مما چراغ پا ہو گئیں۔ "یہی وقت ہے رشتے کا۔"

"مجھے اس سے کوئی کنسرن نہیں ہے کہ وقت رشتے آنے کا ہے یا جانے کا۔ لیکن ابھی اس رشتے کو منع کردیں۔"

"تزکی! میں بہت پریشان ہو گئی ہوں۔" وہ جھنجلا گئیں "بچہ بننا چھوڑ دو۔ ماں کو اس طرح نہیں ستاتے۔"

تزکی نے پورا جملہ سنے بغیر ہی فون کاٹ دیا اور غصے میں کشن اٹھا کر پھینکا' جو سیدھا اندر آتی زینب کو لگا اور بہت زور سے لگا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا سامنے آنے کو۔" زینب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف ایک بات سوچی کہ اس دنیا میں راحمہ جیسے لوگ بھیس بدل کر ہر جگہ ہی موجود ہیں۔ اور وہ ان سب چیزوں کی عادی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے شیلف سے کتاب نکالنے لگی۔

حالانکہ تزکی کو امید تھی کہ وہ کشن اٹھالے گی۔

اس کی زینب سے دشمنی نہیں تھی۔ دشمن بنانے کے لیے کوئی تو وجہ ہونی چاہیے۔ جبکہ وہ شکل سے بڑی بے ضرر لڑکی معلوم ہوتی تھی لیکن اس بے ضرر لڑکی نے اس وقت اسے ماؤ دلا دیا تھا۔

"کشن اٹھاؤ۔" اس کا انداز حکمیہ تھا۔

وہ کشن اٹھانے پلٹی۔ لیکن اس کے انداز پر ایکدم ٹھٹک گئی۔ وہ اس انداز کی عادی تھی۔ لیکن ہر کسی کے نہیں۔ وہ دوبارہ پلٹ کر کتاب دیکھنے لگی۔

"کیا سنائی نہیں دیتا؟" تزکی نے غصے کو کنٹرول کیا۔

"بہت ساری چیزیں مجھے واقعی سنائی نہیں دیتیں۔" اس نے آرام سے کہا مگر وہ ایکدم بھڑک گئی۔

"تمہیں کسی نے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی؟" اس کے زور سے چلانے کی وجہ سے زینب ایکدم ڈر گئی۔

"میں مہمان ہوں تمیز سے بات آپ کو کرنی چاہیے۔"

"مہمان؟" وہ شاید آگے کوئی اور طنزیہ جملہ کہتی کہ نوری کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیا ہو گیا ہے تزکی!"

"کچھ نہیں۔ تم سب لوگ مل کر پھر مجھے ہی ڈانٹو گے۔ کیونکہ اس گھر میں صرف میں ہی غلط کرتی ہوں۔ باقی تو سارے گھر والے اور ان گھر والوں کے باہر سے آئے ہوئے لوگ سب معصوم ہیں۔"

"تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟"

"بھلا میں کون ہوتی ہوں اعتراض کرنے والی۔ گھر میں نوری لوگوں کا ہے۔"

"اب فالتو باتیں نہیں کرو۔ اور وہ صحیح کہہ رہی ہے وہ مہمان ہے۔ چار پانچ دن میں چلی جائے گی۔ تمہیں کیا ضرورت ہے کہ تم اس سے بلاوجہ الجھو۔ زینب! آجاؤ۔ باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ دونوں وہاں سے چلی بھی گئیں۔ تب بھی تزکی کو خود کو سنبھالنے میں بڑی دیر لگی۔

"باہر آؤ۔ موسم اچھا ہو رہا ہے۔ تم کہاں کمرے میں بیٹھی ہو۔" زوار نے حیرانی سے کہا۔

"مجھے کمرے میں رہنے دو۔ جاہل لوگوں کے ساتھ میرا کوئی کام نہیں ہے۔"

"اب اچانک کون جاہل ہو گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ تمہیں کسی نے بتا دیا ہے کہ غصہ تم پر اچھا لگتا ہے۔ اسی لیے تم ہر وقت غصے میں رہتی ہو۔"

"زوار! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے بہت غصہ آرہا ہے۔ یہ تمہاری امی کس کو اٹھا کرلے آئی ہیں۔ چیپ نوار؟"

"ارے! رے کیا ہو گیا ہے۔" زوار نے جلدی سے اسے ٹوکا۔ "وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم بلاوجہ غصہ نہیں کرو۔"

"ایک بات بتاؤ۔ کیا میری بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر میں کہہ رہی ہوں کہ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے تو تمہیں میری بات کا یقین کرنا چاہیے بجائے اس کی طرف داری کرنے کے۔ میں کسی اور سے امید نہیں کرتی' لیکن تم سے تو کرسکتی ہوں۔" اس نے اپنی سیاہ بھنورا جیسی آنکھیں اس پر جمائیں۔

"اف! اپنی آنکھیں مجھ پر سے ہٹاؤ۔ بندہ کسی اور کام کے قابل ہی نہ رہے۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی اور تزکی کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ۔ اس کو بخوبی علم تھا کہ ان آنکھوں کے سحر سے بچنا اتنا آسان نہیں۔ یہ اور بات کہ وہ اپنی آنکھوں سے بہت کم کام لیتی تھی۔ اسے ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اس کا حسن' اس کی تمکنت لوگوں کو ویسے ہی مرعوب کردیا کرتی تھی۔ لیکن زوار بھی تو کوئی عام شخص نہیں تھا۔

حسن اس کے لیے نئی چیز نہ تھی۔ وہ چار سال باہر رہ کر آیا تھا۔ وہاں بھی اس نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔

اور جب وہ پاکستان آیا تو سب ہی کچھ ویسا تھا۔ جیسا وہ چھوڑ گیا تھا۔ سوائے ایک تبدیلی کے اور اس تبدیلی کا نام تزکی تھا۔ بہت ساری لڑکیوں کے جھرمٹ میں وہ اسے بالکل علیحدہ سی لگی۔ کچھ الگ سی' منفرد سی۔ اسے اپنے حسن کا بھی کوئی خاص احساس نہیں تھا۔ وہ یوں ہی رف ٹف حلیے میں رہتی۔ پھر بھی ایسی لگتی جیسے چودھویں کا چاند۔

بہت ساری جگہوں پر اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ عام لڑکیوں کی طرح نہیں ہے۔ وہ ان سے بہت آگے ہے۔ لاشعوری طور پر ہی اس کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ کب اس کی محبت میں گرفتار ہوا۔ خود اسے بھی خبر نہیں ہوئی۔

کتنے دن ہو گئے تھے۔ امی کو یہ بات کہتے ہوئے کہ زوار اب کسی کو بھی پسند کرلو۔ تاکہ میں تمہاری شادی سے فارغ ہو جاؤں۔ انہیں اپنے بیٹے' بہو کے ساتھ حج پر جانا تھا۔ یہ عجیب منطق تھی۔ وہ دونوں اکیلے جا کر بھی حج کرسکتے تھے۔ لیکن امی کو بہو کو بھی ساتھ لے کر جانا تھا۔

ابھی کچھ دنوں سے امی کا دھیان اس بات سے ہٹا ہوا تھا۔ وہ اپنی بھانجی کی دلجوئی میں لگی رہتی تھیں۔ بہت عرصے کے بعد انہیں اپنی یہ بھانجی ملی تھی۔

زوار کی ۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اتنی بڑی لڑکی کے ساتھ بچوں کی طرح اس کی ماں کیوں برتاؤ کرتی ہیں۔

اس کی زیادہ بات نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا خیال تھا وہ اپنی عمر سے پیچھے رہ گئی ہے۔ اس عمر کی لڑکیوں کے ہونٹوں سے تو ہنسی جدا نہیں ہوتی۔

مگر زوار نے ایک دفعہ بھی اس کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ تزکی کی طرح غصہ کرتے ہوئے بھی نہیں۔ اس میں کوئی بات بھی نارمل لڑکیوں والی نہیں تھی۔ اسی لیے زوار کو حیرت ہو رہی تھی کہ تزکی کس

لیے اس پر اتنا غصہ کر رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

بارش تیز ہو رہی تھی۔ زینب نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آج اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی خالہ امی اسے دودھ کا گلاس دے کر گئی تھیں۔

"کھڑکی دروازے صحیح سے بند کر لو تیز ٹھنڈی ہوا ہے۔ کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔" پھر انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر سب چیزیں چیک کی تھیں۔

"بیمار ہو گئیں تو تمہاری پھپھو مجھے چھوڑیں گی نہیں۔" انہوں نے ہنس کر کہا تھا اور زینب مسکرا بھی نہیں سکی۔ وہ کیا بتاتی کہ بارش اس کے لیے کیسا درد سر لے کر آتی تھی۔

راحمہ کی چیزیں ہر جگہ سے سمیٹنا پڑتی تھیں۔ چھت پر بھاگنا پڑتا تھا۔ کچن میں جا کر بارش والے مینو بنانے پڑتے تھے اور جیسی بارش وہ آج منا رہی تھی' ایسی بارش کا اس نے صرف خواب ہی دیکھا تھا۔

گرم کمرا' آرام دہ بیڈ' سرہانے رکھا دودھ کا گلاس۔ اس نے نرم نرم قالین پر چلتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔ بلکہ سانس اپنے اندر اتاری۔ اس نے کہیں پڑھا تھا ایسا کرنے سے سکون ملتا ہے لیکن جن کی زندگی میں ہی سکون نہ ہو جن کا اندر خالی ہو' ان کے لیے یہ کوشش بھی لاحاصل ہی ہوتی ہے۔ اس نے سوچتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور ایک دم ڈر گئی۔

سامنے زوار اسے کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا گو کہ وہ دروازے سے باہر ہی تھا۔

"کوئی کام تھا آپ کو؟"

"نہیں۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ امی اپنی شال یہاں بھول گئی تھیں۔ وہی لینے بھیجا ہے مگر آپ کیا کر رہی تھیں۔"

"کھمن بنا رہی تھی۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا بغیر زوار کے تاثرات دیکھے۔ اب وہ اپنی فضول سی حرکت کا کیا۔ جواب دیتی۔ بس اسے یہ نہیں پتا تھا کہ لگتا ہے ضرور سا جواب اسے سچ مچ پاگلوں کی صف میں کھڑا کر دے گا۔ وہ شال لے کر چلا گیا تو اسے ہنسی آ گئی۔ ایک بہت اچھا دن اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔

"ویسے تو آپ اپنی بھانجی سے بڑا پیار کر رہی ہیں مگر...."

"اس کا نام ہے۔ نام لے کر بات کرو۔" منیرہ نے اسے ٹوک دیا۔

"ہاں وہی زینب' مگر اس کا علاج تو کروا دیں حالانکہ مشکل ہو گی۔ کافی ٹائم گزر گیا ہے۔"

"زوار! کس کا علاج اور کہاں مشکل ہو گی۔" انہوں نے الجھ کر کہا۔ وہ زینب کا نام لینے ہی والا تھا کہ سیل فون بج اٹھا۔

"ایک منٹ امی! میں ابھی آیا۔"

"اتنی بارش میں کہاں جا رہے ہو۔"

"کہیں نہیں امی! آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ انہیں تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"راحمہ! زینب کی خالہ کو فون ملاؤ۔ ایک ہفتے کا کہہ کر لے گئی تھیں۔ آج دس دن ہو گئے ہیں۔"

"بہت جلدی آپ کو خیال آ گیا۔" راحمہ کا بھی لہجہ جل بھنا تھا۔ "میں پچھلے چار دن سے کہہ رہی ہوں تب تو آپ کو میری کوئی بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔"

"ہاں تو کیا کرتی کل ہی تو مہمان گئے ہیں۔"

"امی! جس قسم کے رشتے آپ گھر بلوا رہی ہیں میں ان میں سے کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ بہت لوگ ہیں شادی کرنے کے لیے۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔

"اچھا۔ میں بھی تو سنوں ان بہت سے لوگوں کے بارے میں۔"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا' بتا دوں گی۔"

"سب بکواس ہے۔" پھپھو نے سر جھٹکا۔ "یہ جو آج کل کے لڑکے ہیں ان سے شادی کا خواب دیکھنا چھوڑ دے بیٹا! کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔" انہوں نے لہجے میں شہد سمو لیا۔

"امی! مجھے ابھی شادی ہی نہیں کرنی ہے۔ اگر کوئی بہت اچھا رشتہ آ گیا تو پھر سوچوں گی۔ آپ پلیز زینب کو تو واپس بلائیں۔"

☼ ☼ ☼

خالہ امی اس کے سر میں تیل لگا رہی تھیں اور اسے اتنا مزا آ رہا تھا کہ دل چاہ رہا تھا یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہے۔ اس نے شرما حضوری میں دو دفعہ منع بھی کیا تھا اور اسے اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا جو لوگ دوسروں کی خدمتیں کرتے ہیں پھر کوئی ان کی خدمت کرے تو ذرا سی شرم تو آتی ہے۔

"زینب! تمہاری پھپھو کا فون آیا تھا' وہ واپس بلا رہی ہیں تمہیں۔" اس جملے کے ساتھ ہی جس طرح اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ ان سے چھپا نہیں رہ سکا۔ حالانکہ اس نے وہاں کی کوئی بات انہیں نہیں بتائی تھی۔ وہ اچھی لڑکی تھی انہیں لگتا تھا کہ زینب نے اپنی تربیت خود ہی کی ہے۔

انہیں نہ اس کی پھپھو کے گھر کا ماحول پسند آیا تھا اور نہ ان کی بیٹی۔ عجیب بددماغ لوگ تھے۔ ان کے دماغ میں یہی بات تھی کہ اس ماحول میں رہتے ہوئے زینب بھی اسی طرح ہو گئی ہو گی لیکن زینب نے ان کے سارے خدشے غلط ثابت کر دیے تھے۔

اور جب وہ زرکی کو دیکھتیں تو ہولی جاتیں اور پھر جب زینب پر ان کی نظر پڑتی تو انہیں بڑا سکون سا ملتا۔ کاش وہ کسی طرح زینب کو اپنے پاس رکھ پاتیں۔ زوار کی آنکھوں کے خواب یا پھر مستقبل۔ وہ صرف ایک بات جانتی تھیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت جس طرح کی ہے وہ کبھی بھی زرکی جیسی لڑکی کے ساتھ خوش نہیں رہ پائے گا لیکن یہ بات وہ زوار کو کیسے سمجھاتیں۔

"اللہ تعالیٰ تو ہی کوئی راستہ نکال دے۔" دل میں اللہ سے دعا مانگ کر وہ زینب کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"ابھی ایک ہفتے کی اور اجازت لے لوں تمہاری پھپھو سے۔" ان کا خیال تھا کہ زینب فوراً "ہاں" کہہ دے گی' لیکن ہاں میں کہتے کہتے اس نے ایک دم نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں خالہ امی! مجھے جانا ہو گا۔ پھپھو نے کہا تھا کہ جب بلاؤں فوراً" آ جانا۔"

"حد ہو گئی۔ ان کے پاس تو تم رہتی ہی ہو پھر۔"

"جن کے ساتھ رہا جاتا ہے پھر ان کی بات بھی ماننی چاہیے۔" اس نے رسان سے کہا۔ وہ خود بڑے سبھاؤ والی خاتون تھیں لیکن اس کا رسان سے کہا گیا چھوٹا سا جملہ انہیں بڑا اچھا لگا۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے زینب! زوار سے کہوں گی پھر شام کو تمہیں چھوڑنے چلیں گے۔ جب تک تم پیکنگ وغیرہ کر لو میں نے بوتیک سے تمہارے لیے تین چار سوٹ لیے ہیں۔ وہ بھی رکھ لینا۔"

"نہیں' نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف ایک سوٹ لے جاؤں گی۔ آپ بس سمجھ جائیں میں کیوں منع کر رہی ہوں۔"

"زینب!" انہوں نے دل میں سوچا۔ "میں تو صرف یہ سمجھی ہوں کہ میرے بیٹے کے لیے بس تم جیسی کوئی لڑکی اس گھر میں آ جائے تو بڑا اچھا ہو جائے۔"

☼ ☼ ☼

"بس یہ ایک سوٹ!" راحمہ نے اس کا سوٹ چٹکیوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ "تم غالباً" پہلی دفعہ گئی تھیں نا اور انہوں نے بس ایک سوٹ پکڑا دیا اور کچھ نہیں دیا تمہاری خالہ نے۔"

"نہیں' دیا بہت کچھ ہے' لیکن شاید وہ نظر نہ آئے' محبت' دعائیں نظر نہیں آتی نا۔"

"تو ان کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔" راحمہ نے کاندھے اچکائے۔ "میں اسی لیے تم سے کہتی ہوں کہ

لیتا ہے۔" زوار لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ اور وہ اکیلی کھڑی رہ گئی اس سرد اندھیری شام کے بیچ۔ اب کبھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی اس کی بات کو اس طرح ٹھکرا دے۔ اس نے بہت مشکل سے اپنے کھولتے دماغ کو قابو میں کیا۔

غصہ اور اتنا شدید غصہ۔۔۔ وہ ہر چیز کو تہس نہس کر سکتی تھی۔ وہ خود کو بھی مار سکتی تھی۔ وہ بہت کچھ کرتی آئی تھی اور بہت کچھ کر سکتی تھی، مگر آج اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ نہ یہاں کے لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ان کو تکلیف دیتی آئی تھی، جو اس سے محبت کرتے تھے اس کے چاروں بھائی، بابا اور مما۔ ان سب لوگوں کی محبت اور بے جا لاڈ و پیار نے ہی اس کے اندر بہت ساری خامیاں پیدا کر دی تھیں، جن کا احساس اسے خود بھی نہیں تھا اور اگر کوئی دلانے کی کوشش کرتا تو وہ تو بس معتوب ہی ٹھہرتا، سو رفتہ رفتہ سب نے ہی اسے چھوڑ دیا تھا اس کے حال پر۔

☼ ☼ ☼

زوار اور تزکیٰ۔۔۔ یہ وہ دو لفظ تھے جو پورے گھر میں موضوع بحث تھے۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ایسا ہو کیسے گیا۔ لڑکیوں کو تو پھر بھی اندازہ تھا لیکن بڑوں کو اس طرح کی کسی بات کی خبر نہیں تھی۔

اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ منیرہ بالکل گم صم ہو گئی تھیں۔ ان کا کھانا پینا سب چھوٹ گیا تھا۔

زوار نے تزکیٰ سے شادی کرنے کا کہہ دیا تھا اور وہ اپنے فیصلے پر اٹل تھا۔ محبت تو پھر محبت ہی ہوتی ہے سارے نفع نقصان سے بے نیاز۔

جس بیٹے نے ہمیشہ سر جھکا کر بات مانی تھی، آج وہی بیٹا سر اٹھا کر ان سے وہ چیز مانگ رہا تھا جس کو وہ دینے سے قاصر تھیں۔

انہوں نے بہت سوچا لیکن اس مسئلے کا کوئی سیدھا حل ان کے پاس نہیں نکل پا رہا تھا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ اس شادی کو ہونے دیتیں۔ پھر چاہے چار مہینے بعد ہی یہ شادی ٹوٹ جاتی۔

وہ دونوں ہی انتہا پسند تھے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ حاکمیت اور ضد زوار میں بھی تھی اور تزکیٰ میں اس سے کہیں زیادہ۔۔۔ اور عورت میں یہ چیزیں ہوں تو گھر بنتے نہیں ہیں صرف بگڑتے ہیں۔ محبت انسان کو کتنا بھی بدل دے، مگر فطرت تو نہیں بدلتی۔

☼ ☼ ☼

"تائی امی بوڑھی ہو گئی بس اور کیا کہہ سکتے ہیں۔" تزکیٰ نے کاندھے اچکائے "تم نے ان کو بتا دیا ہے بس کافی ہے۔ فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے اور تم نے اپنا فیصلہ سنا بھی دیا ہے۔ پھر پریشانی کس بات کی ہے۔"

"تم تو ایسے بات کر رہی ہو جیسے ہم یورپ میں رہتے ہیں۔ یہ ہماری روایات نہیں ہے کہ فیصلہ سنا دیا اور بس۔"

"مجھے کیا پتا اس کے بعد کیا کرتے ہیں۔ کیا پاؤں پکڑتے ہیں مجھے یہ بتا دو۔" تزکیٰ جھنجلائی۔

زوار نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا صبیح چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ ابھی غصہ آیا نہیں تھا اس کی آمد آمد تھی۔ ہر طرف سے وہ مشکل میں تھا، جو محبت ابھی اتنا خوار کر رہی تھی وہ محبت پتا نہیں بعد میں کیا کرتی۔ زوار فی الحال کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ تزکیٰ کی آنکھ کے آنسو اس سے برداشت نہیں ہوتے اور تزکیٰ کا غصے میں آنا بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا پھر مسئلے کا حل کس طرح نکلتا۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ آنے والا چوتھا رشتہ تھا جنہوں نے زینب کو پسند کیا تھا۔ ظاہر سی بات ہے اس میں زینب کا کوئی قصور نہیں تھا۔ گھر اتنا بڑا نہیں تھا کہ کہیں جا کر چھپ جاتی۔ آنے والوں کی نظر لازمی پڑتی تھی اور وہ پسند بھی کر لیتے تھے۔ پھپھو کی جان سب سے زیادہ مشکل میں تھی۔ ان کے پاس بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔



پریکٹیکل لڑکی بن جاؤ مگر میرا خیال ہے تم خوابوں پر زیادہ یقین رکھتی ہو۔"

خوابوں کے نام پر۔ ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے دلاچھو آیا۔ زینب نے فوراً سر جھٹکا۔

زوار کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ وہ کسی ضروری میٹنگ میں تھا تو خالہ امی خود ہی اسے چھوڑ گئی تھیں اور پھپھو سے ایک مہینے بعد کا وعدہ بھی لے لیا تھا۔ پھپھو خاموش رہی تھیں۔ اقرار نہیں کیا تھا تو انکار بھی نہیں کیا تھا۔ شاید ان دو سوٹوں کی وجہ سے، جو خالہ امی ان کے لیے بھی لے کر آئی تھیں۔

راحمہ کا موڈ بھی ٹھیک تھا۔ اسی وجہ اس نے باتیں بھی کر لیں۔ بہت سارے کام تھے، جو اس کے منتظر تھے اس نے اللہ کا نام لے کر جو شروع کیا تو رات سر پر آ گئی مگر چیزیں سمٹ کر نہیں دیں۔

بستر پر لیٹی تو ایک آہ منہ سے نکل گئی حالانکہ اس نے وہی کچھ کیا تھا جو وہ ہمیشہ کرتی آئی تھی، پھر آج نیا کیا تھا۔ اس نے کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔

"زینب! تم مجھے ڈسٹرب کر رہی ہو۔" راحمہ کا لہجہ برا نا تھا۔ بیڈ بہت پرانا تھا۔ ہر کروٹ پر چوں چوں بولتا تھا اب نیند تو خراب ہونا ہی تھی۔

اس کے بعد وہ کروٹ بدلنے سے بھی گئی۔ جاگتے رہنا اور ایک کروٹ پر رات آنکھوں میں گزار دینا، بڑا ہی تکلیف دہ امر تھا۔ اس نے بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں لیکن زندگی اب جس رخ سے سامنے آئی تھی اس سے زیادہ تکلیف دہ امر بھی تو اور کوئی نہیں تھا۔ ایک ہفتے کا جانا ایسا غضب ڈھائے گا۔ اسے پتا ہوتا تو وہ جاتی ہی نہیں۔ ایک ہفتہ تو تعارف کے لیے بھی کم ہوتا ہے۔

پوری پوری رات گزر جاتی اور وہ بغیر کروٹ بدلے سوچے جاتی۔ وہاں اس گھر میں خود کو محسوس کرتی اور ایک شخص کی خوشبو بھی اسے کہیں آس پاس ہی محسوس ہوتی۔ یہ دونوں چیزیں مل کر اسے پاگل بنا رہی تھیں۔

راستے نامعلوم، منزل کی کوئی خبر نہیں اور ایسے میں آنکھوں کے خواب اور دل کی دھڑکن دونوں ہی بے وفائی پر اتر آئیں تو بندہ کیا کرے۔

اس نے وقت کی بے وفائی کو سہہ لیا تھا لیکن اب جو کچھ بھی تھا۔ وہ برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"زوار! بس کر دیا مجھے جانا ہے۔"

"ذرا موسم دیکھو۔ طوفان آنے والا ہے۔"

"اگر کوئی میری بات نہیں مانے تو سب سے بڑا طوفان تو خود میں ہوں۔" اس کا لہجہ بے حد خراب تھا۔

"یعنی تم سے ڈرنا چاہیے۔" زوار نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

"بے کار باتیں نہیں کرو۔ ایسے موسم میں گھر میں رہنا بالکل فضول ہے۔"

"ایسے موسم میں میری امی مجھے کہیں جانے نہیں دیتیں۔"

"زوار! تم کوئی چھوٹے بچے ہو، جو اس طرح بہانے بنا رہے ہو۔"

"بہانے نہیں بنا رہا ہوں۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ اس لیے وہ تھوڑا تھکی ہو جاتی ہیں۔"

"اسے تھکی ہونا نہیں پاگل پن کہتے ہیں۔ پاکستانی مائیں عجیب ہوتی ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے؟" زوار نے اسے ڈپٹا۔

"اور تمہارا دماغ مجھ سے زیادہ خراب ہے۔" تزکیٰ چیخ گئی۔

"تم یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟"

"میرا ایسا ہی لہجہ ہے۔ تم جو سمجھو۔"

"زہر لگتی ہیں ایسی لڑکیاں، جو اس طرح چیخ چیخ کر بات کریں۔"

"اس سے پہلے تو تمہیں محبت کا دعویٰ تھا اور آج زہر لگنے والی بات۔ تم سچ کب بولتے ہو۔"

"میرے پاس تمہاری فضول بات کا کوئی جواب

انہیں فی الحال زینب کی شادی نہیں کرنی تھی۔
اس کی وجہ سے ایک تو انہیں بڑا آرام تھا اور دوسری بات کہ ابھی فی الحال انہوں نے صرف راحمہ کی ہی چیزیں اکٹھی کی تھیں اور اس میں بھی بڑا ہاتھ زینب کی ٹیوشنز اور دوسرے کاموں کا تھا۔ اس کی جو بھی آمدنی ہوتی، تھوڑے سے پیسے رکھ کر وہ سارے پھپھو کو ہی دے دیا کرتی تھی اور وہ راحمہ کے جہیز کے لیے سامان لے آیا کرتی تھیں لیکن اب جو صورت حال تھی ان سے کس طرح نپٹا جائے۔ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اور کسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ساری باتیں نیتوں کا کھیل ہیں۔ جن کی نیت اچھی ہوتی ہے ان کی مدد وہاں سے ہوتی ہے۔ جہاں سے کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

منیرہ پھپھو کا بی پی اتنا شوٹ کر گیا کہ ڈاکٹروں نے صاف کہہ دیا کہ اگر برین ہیمبرج نہیں ہوا تو صرف معجزہ ہوگا۔ کئی دنوں سے گھر میں ٹینشن تھی۔ سرد مہری تھی اور اس کا جو نتیجہ نکلا اس نے سب کے دل کی دھڑکن روک دی۔ سب سے خراب حالت زوار کی تھی۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ ماں کی محبت تو کہیں اندر جڑوں میں بیٹھی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ محبت او جھل رہتی ہے۔ چھپی رہتی ہے۔ پھر جب وہ ظاہر ہوتی ہے تو اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جیسے زوار کو کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ نہ تزئی کے آنسو، نہ اپنی محبت.... ایک پلڑے میں یہ ساری چیزیں تھیں اور دوسرے میں ماں کی زندگی....

فیصلہ ہو گیا۔ زیادہ مشکل وقت کس نے گزارا، کوئی نہیں جانتا لیکن اس مشکل وقت کے اختتام پر زوار اور زینب کا نکاح ہو گیا۔

زینب تو صرف خالہ امی کو اسپتال دیکھنے آئی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اس کھلے دروازے سے کہیں وہ نصیب بھی اندر آگیا ہے جو اس کے خوابوں کو.... تو تکمیل کی شکل دے دے گا لیکن اس کے دل پر کتنے زخم آئیں گے۔ اس کا اندازہ زینب ابھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا شوہر محبت کے معاملے میں تہی داماں ہو گیا تھا۔

اور اسے مانگنے کی عادت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

پچھلی زندگی کیسے اور کس طرح ختم ہو جاتی ہے، کوئی نہیں جانتا۔ ایک دفعہ آپ نئی زندگی میں قدم رکھ دیں تو لگتا ہے پرانی زندگی تو کسی اور نے بسر کی تھی۔

زینب کو جو کچھ اب میسر تھا ان میں سے کسی چیز کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ زندگی خوابوں کی اجازت ضرور دیتی تھی مگر وہ جانتی تھی۔ یہ صرف خواب ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور چیزیں جب حقیقت بنیں تو وہ بالکل شاک میں آگئی۔

جو تقدیر ہمیشہ بے مہر رہی تھی۔ اس نے آج کس طرح اتنا نواز دیا۔ وہ پہروں سوچتی، پھر بھی سوچ کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا اور اسے یوں گم صم دیکھ کر زوار مزید چڑ جاتا۔

میں نے اس لڑکی کے متعلق صحیح سوچا تھا۔ زیادہ یا کم مگر یہ پاگل ضرور ہے۔ مائیں اپنی محبتوں کا خراج کس طرح وصول کر لیتی ہیں۔ وہ جھنجلا جاتا۔ زینب سے چڑتا۔

مگر اب سب کچھ لاحاصل تھا۔ تزئی بیس دنوں سے بیمار تھی۔ اس کا بخار ہی نہیں اتر تا تھا۔ حسین صورت بالکل کملا گئی تھی۔ پھر اس نے منع بھی کیا تھا کہ اس کے گھر والوں کو کچھ بھی نہیں بتایا جائے۔

حالات و واقعات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے تھے کہ فی الوقت کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ تزئی کی حالت دیکھ کر دل دکھ جاتا تھا۔ وہ جس نے تین سال سے اپنے غرور سے سب کی زندگی اجیرن کی ہوئی تھی۔ اسے یوں لٹا پٹا بستر میں دیکھنا بھی الگ اذیت سے دوچار کرتا تھا۔

نوری کا خیال تھا ایسے انتہا پسند لوگوں کو محبت نہیں کرنی چاہیے۔ اب کیا یہ لڑکی جان دے دے گی۔"

"جان دینا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے۔" عینی نے کہا۔

"اب ضروری ہے کہ انسان زہر کھا کر یا کسی اور چیز سے ہی جان دے۔ جو تزئی کر رہی ہے۔ اسے بھی جان دینا ہی کہتے ہیں۔"

"تمہیں یاد ہے۔ ڈاکٹر نے اسے کتنا ڈانٹا تھا۔ وہ ٹھیک ہونا ہی نہیں چاہتی۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو بہت افسوس ہوتا ہے۔"

"اب زیادہ افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غرور کا شاید یہی انجام ہونا تھا اور افسوس تو شاید زینب کی قسمت پر بھی ہونا چاہیے۔ جو زینب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ وہ زیادہ تکلیف دہ ہے۔ زوار سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ تو بڑا نائس بندہ تھا۔"

"فیصلوں کو وقت دینا پڑتا ہے نوری! ہم تو صرف باتیں کر رہے ہیں۔ جو محبت کی چوٹ کھاتے ہیں۔ صرف وہی جانتے ہیں کہ انہیں سنبھلنے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ ہمیں اور آپ کو اس پر تبصرے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"اف! میں تو ویسے ہی ایک بات کر رہی تھی۔" عینی نے کہا۔ "حالانکہ میں تمہیں ایک بات بتاؤں ابھی تو خیر تزئی بیمار ہے یا اس نے فی الحال دنیا سے منہ موڑا ہوا ہے لیکن وہ جب بھی ٹھیک ہوگی، وہ وہیں پر کھڑی ہوگی۔ جہاں سے چلی تھی۔ انتہا پسند لوگ اپنی زندگی تو اجیرن کرتے ہی ہیں، ساتھ میں دوسروں کی بھی کر دیتے ہیں۔ زینب کو بڑا مضبوط ہونا پڑے گا۔ میری ساری ہمدردی اور دعائیں زینب کے ساتھ ہیں۔"

"اور میری بھی۔" نوری نے کہا۔

"اور ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ زینب کو تھوڑا گروم کر دیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ سمپل ایبل لڑکی ہے۔ مجھے پسند آئی ہے۔ بلکہ سب کو ہی اچھی لگی ہے۔ سیدھے لوگ سب ہی کو پسند آتے ہیں۔"

"مگر وہ سیدھی نہیں ہے۔" نوری نے کہا۔

"تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو۔"

"تجربے سے بیٹا!" نوری نے فرضی کالر جھاڑے۔

دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ جو ابھی ابھی خاموشی سے پلٹ کر گیا ہے۔ اس نے کیا سنا ہے اور کیا نہیں۔

☆ ☆ ☆

زینب کی زندگی میں آنے والی وہ رات پچھلی گزری راتوں سے مختلف نہیں تھی۔ وہ خالہ امی کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔

رات میں اسے زبردستی زوار کے کمرے میں بھیج دیا جاتا تھا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ زوار صوفے پر ہوتا تھا اور وہ بیڈ پر۔ کبھی یہ ترتیب الٹی بھی ہو جاتی۔

وہ بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ اس دن بارش کے ساتھ بجلی بھی چمک رہی تھی۔ سب لڑکیوں کی طرح اسے بھی ایسے موسم سے ڈر لگتا تھا۔

وہ راحمہ کے ساتھ ہوتی تھی۔ تب بھی آیتہ الکرسی اور دوسری دعائیں پڑھتی رہتی تھی۔ وہ ہر طرف سے کھلا گھر تھا۔ بارش ہوتی تو ہواؤں سے ساتھ مل کر عجیب خوفناک سی آوازوں کا روپ دھار لیا کرتی تھی۔

ایک دفعہ پہلے بھی اس نے یہی سوچا تھا۔ اس وقت جانے کا ڈر تھا کہ ایک ہفتے کے بعد واپس جانا ہے۔ آج اسے ڈر نہیں تھا۔ خوف تھا کہ اسے واپس بھیج دیا جائے گا۔ اس کے کمرے سے بائیں طرف مڑ کر جو دوسرا کمرا ہے۔ اس میں سانس لیتا وجود اسے یہاں ٹھہرنے نہیں دے گا۔

نہ جانے وقت کے کس کمزور لمحے میں آکر زوار نے ماں کے آگے سر جھکایا تھا۔ ورنہ وہ شکست قبول کرنے والا آدمی لگتا نہیں تھا۔ تزئی کو زینب نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ لیکن آج جس تزئی کو وہ دیکھ رہی تھی، وہ

صرف دل دکھانے کا باعث بنتا تھا۔

زینب دعا کرتی تھی کہ وہ ٹھیک ہو کر دبئی چلی جائے تو اس کی اپنی زندگی میں بھی کچھ بہتری آجائے۔ لیکن مقدر کے راستے تو طے شدہ ہوتے ہیں۔ اس نے بہت پہلے جو بات سوچی تھی۔ وہ بات سچ ہی تھی۔ اسے ہنسی آنے لگی۔ لوگ نہ جانے کیوں ہاتھ دکھا کر مقدر پوچھتے ہیں۔ مقدر تو ماتھے پر لکھا ہوتا ہے۔ انسان کا اندر اسے بتاتا ہے۔ ہنستے ہوئے اسے اطمینان تھا کہ زوار سو رہا ہے۔

لیکن کسی نے اس کے اوپر سے کمبل ہٹایا تو وہ ڈر گئی۔ زوار نے ایک دم جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ زینب کو لگا اس کی کلائی ٹوٹ جائے گی۔

"مجھے بالکل سچ سچ بتانا۔ کیا تم پاگل ہو؟"

"نہیں۔" اس نے بھی سچ سچ بتایا۔

"پھر اس طرح چھوٹے بچوں کی طرح بلینکٹ میں منہ چھپا کر کیوں ہنس رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ تم رو رہی ہو۔" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

"جو کچھ آپ میرے ساتھ کر رہے ہیں اس کے بعد اصولاً "تو مجھے رونا ہی چاہیے" لیکن میں ہنس اس بات پر رہی تھی کہ میں نے بہت پہلے اپنے متعلق ایک بات سوچی تھی۔ کہ زندگی مجھے کوئی چیز آسانی سے نہیں دے گی اور اب مجھے لگتا ہے کہ مشکل سے بھی نہیں دے گی۔"

زوار نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی نمی تھی۔

اس کے دل کو ایک دم ملال نے آگھیرا۔ جو وہ کر رہا تھا' وہ اس طرح کا آدمی بھی نہیں تھا لیکن جو وقت درمیان میں آگیا تھا۔ اس کا وہ کیا کرتا۔

وہ سخت غصے میں اٹھ کر صوفے سے اس کے بیڈ تک آیا تھا اور اسے لگا کہ وہ واپس اپنے صوفے تک نہیں جاسکے گا۔

☼ ☼ ☼

نوری' یعنی کوئی بھی گھر پر نہیں تھا۔ ترنگی کا بخار تیز ہو رہا تھا۔ اب وہ کافی بہتر ہوگئی تھی مگر پتا نہیں کیوں بخار ایک دم تیز ہوگیا تھا۔

وہ خالہ امی کو یخنی کا پیالہ دے کر آرہی تھی کہ ترنگی کے کمرے سے آتی کراہوں نے اس کے قدم روک لیے۔

وہ دروازے پر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اس نے قدم آگے بڑھائے۔

"ترنگی!" اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے پکارا اور وہ جو غنودگی میں پڑی ہوئی تھی' ایک دم تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

"تم۔ تم۔" غصے کی شدت سے وہ جملہ ہی پورا نہیں کرپائی اس کی سرخ لہو رنگ آنکھیں' لال بھبھوکا چہرہ۔ اس کے چہرے پر نظر نہیں ڈالی جاتی تھی۔

"ترنگی! تمہاری طبیعت خراب ہے۔ میں تمہارے لیے۔"

"تم یہاں سے چلی جاؤ' میں ایک منٹ بھی تمہارا وجود نہیں دیکھ سکتی۔" اس کے لہجے میں بخار اور نفرت دونوں کی ہی حدت تھی۔ وہ ایک دم سن ہوگئی۔

انسان' انسان سے اتنی نفرت کیسے کرسکتا ہے' اس نے ایک لمحے کو سوچا۔ پھر آگے بڑھ آئی۔

"ترنگی! نفرت کرنے کے لیے عمر پڑی ہے۔ گھر میں کوئی بھی نہیں ہے اگر طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو؟"

"تو کیا۔ مرجانے دو' مگر پلیز تم جاؤ یہاں سے۔ کاش! تمہیں پتا ہوتا کہ تم کتنی بڑی غاصب ہو اور تم نے کیسا ظلم کیا ہے۔" زینب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دل میں ضرور سوچا۔ پتا نہیں ہم دونوں میں کون مظلوم ہے۔

باہر آکر پھر اس نے نوری کو فون کیا۔ ان لوگوں کو سب کام چھوڑ کر آنا پڑا۔ اس دفعہ پھر دو تین دن لگ گئے۔



"چچی جان کو فون کردیں۔ یہ اب صحیح نہیں ہوگی۔" نوری کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ وہ دو راتوں سے مسلسل ترنگی کے ساتھ جاگ رہی تھی۔ سب ہی لوگ پریشان ہوگئے تھے۔ "ایک آخری کوشش کرلو اس کو سمجھانے کی اور کیا کرسکتے ہیں۔"

"سمجھایا اس کو جاتا ہے جو زندہ رہنے کی کوشش کرے' اور جس نے مرنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ کوئی انسان کسی دوسرے کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہر انسان اپنے غم کی گہرائی کو اور اس کے مصائب کو خود ہی جان سکتا ہے۔ ہم آپ کیا کرسکتے ہیں دعا کرنے کے علاوہ۔"

"دعائیں زندگی کو آسان بناتی ہیں' مگر مقصد تو خود ترنگی کو ڈھونڈنا ہوگا۔"

"ایک شخص تھا جو زندگی سے چلا گیا اور اب چیزیں واپس نہیں پلٹ سکتیں۔ یہ ساری چیزیں خود اپنے آپ کو سنبھالی ہوں گی۔"

"سمجھا کر دیکھ لو۔ پتا چل جائے گا۔ واپسی پر تمہارے ماتھے پر دو گومڑ ہوں گے۔"

"چپ کر جاؤ۔ ہر وقت مذاق۔"

"تم سے مذاق نہیں کررہی ہوں بلکہ اب تو کوئی چیز بھی مذاق نہیں لگتی۔"

"ایک مرد ہے۔ دو عورتیں ہیں اور زوار شاید آج بھی ترنگی سے ہی محبت کرتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے پرسوں جب ہم لوگ ترنگی کو لے کر اسپتال بھاگے تھے وہ کتنا پریشان تھا۔ مجھ سے تو اس کا چہرہ دیکھا ہی نہیں گیا۔"

"اچھا ہوا نہیں دیکھا' اس چہرے پر صرف ترنگی کی محبت تھی۔ شاید اس لیے کہ ابھی زخم تازہ ہے تو درد بھی زیادہ ہوتا ہوگا لیکن جو کچھ بھی ہے یہ سلسلہ تادیر نہیں چل سکتا۔ کسی ایک کو تو اپنی جگہ چھوڑنی ہی ہوگی' سب کچھ غلط ہوگیا۔ حتیٰ کہ بڑی امی جن کا کوئی فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا ان کا یہ فیصلہ غلط ہی ثابت ہوا۔ انہیں زوار کی شادی ترنگی سے کردینی چاہیے تھی۔"

"ہمیں بڑوں کے تجربے کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے۔" نوری نے کہا۔ "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ترنگی ہی کچھ بدل جائے۔ غم اور دکھ بھی تو انسان پر اپنا اثر رکھتے ہیں۔"

"بشرطیکہ اسے غم سمجھا جائے' انتقام نہیں۔"

"کیسی باتیں کررہی ہو۔" ہینی خوف زدہ ہوگئی۔

"صحیح کہہ رہی ہوں۔" نوری نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ابھی صبح امی بھی کہہ رہی تھیں کہ اس کی حالت سنبھل جائے تو دبئی والوں کو اطلاع دیں۔ سب لوگ پریشان ہوگئے ہیں اور حیرت۔ اس بات پر ہے کہ زینب نے جب فون کیا تھا۔ تو وہ بھی پریشان تھی۔"

"وہ اچھی لڑکی ہے اس لیے اور تم نے غور نہیں کیا۔ وہ حساس بھی ہے اور ایسے لوگوں کو تو یوں بھی ہر چیز جلدی محسوس ہوجاتی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

"اللہ جو ہر چیز کا مالک ہے۔ جو تقدیریں لکھتا ہے اور جسے ہر چیز کی خبر ہوتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

زینب نے لمبی لمبی سانسیں لیں۔ وہ پھپھو کی طرف دو مہینے کے بعد آئی تھی۔ اس نے پھپھو اور راحمہ کے لیے بہت ساری چیزیں لی تھیں۔ ڈرائیور سب چیزیں رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔

"ارے زینب! اس کی کیا ضرورت تھی۔" پھپھو نے اتنے سارے شاپر دیکھ کر لہجے میں شیرینی بھرلی۔

"ضرورت کیوں نہیں تھی امی! پتا کس طرح چلتا کہ آپ کی بھتیجی کی شادی کہاں اور کتنے امیر خاندان میں ہوئی ہے۔" راحمہ نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

زینب اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔ پتا تو اسے بھی نہیں چلتا تھا کہ شادی ہوئی بھی ہے یا نہیں۔

اسے کانٹوں کے ساتھ گلاب نہیں ملا تھا' صرف کانٹے ملے تھے۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی' اس کا شکستہ وجود کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔

نظر صرف دولت آتی تھی۔ وہ بارہ لاکھ کی گاڑی

میں بیٹھ کر آئی تھی اور اس کے بیگ میں بارہ سو روپے بھی نہیں تھے۔

خالہ امی نے کہا تھا۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری اپنی ہے۔ روپے' پیسے' چیزیں' پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے' لیکن جب وہ شخص ہی اپنا نہیں بنا تو اس سے نہ چیزیں ——— نہ اٹھائی گئیں۔

اسے لگتا وہ بہت سارے لوگوں کی ایک دم سے مجرم بن گئی ہے لیکن مجرم کے ہاتھ کچھ تو آتا ہے۔ اس کا جرم عجیب تھا جس میں ہاتھ بھی خالی تھا اور دل بھی۔۔۔

تزکیٰ کا وجود نہیں ہوتا تو بہت کچھ صحیح ہو سکتا تھا مگر اب یوں لگتا کہ صحیح ہونے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

تزکیٰ اب کافی حد تک بہتر ہو گئی تھی۔ اس کے والدین ایک دفعہ ملنے آئے تھے۔ انہوں نے جانے کے لیے اسے مجبور بھی کیا مگر وہ جانے پر رضامند نہیں ہوئی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ وہ اب یہاں پر کیوں ہے۔ اس کا بی اے مکمل ہو گیا تھا۔ اس کا ارادہ ایم بی اے کا نہیں تھا۔ اس کا ارادہ کیا تھا۔ ایسی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں تھی۔

خالہ جان کی طبیعت صحیح نہیں تھی۔ زینب ان کے ساتھ ساتھ ہی رہتی تھی۔ وہ شرمندہ ہو جاتیں کہ اس لیے تو انہوں نے زوار کی شادی نہیں کی تھی کہ نئی دلہن کو اپنے ساتھ جوڑ لیں اور یہ واحد بات تھی جو وہ مانتی نہیں تھی۔

انہیں زوار پر بھی حیرت ہوتی تھی۔ وہ بہت سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ اب اسے زندگی کو اسی طرح قبول کر لینا چاہیے۔ یہی موجبہ اصول ہے' لیکن سب کچھ الٹ ہو رہا تھا۔

اور جس دن انہوں نے زوار کو دیکھا' یہ اس دن کی بات تھی جب اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔

اور وہ تزکیٰ کو لے کر اسپتال بھاگا تھا۔ اس نے وہ پوری رات باہر گزاری تھی۔ وہ سردیوں کی طویل رات تھی اور سردی بھی اس دن بہت تھی لیکن اس نے صرف ایک سوئٹر میں ہی وہ رات گزار دی۔ صبح اس کی حالت خطرے سے باہر ہوئی تو وہ گھر آگیا تھا لیکن بس وہ جسمانی طور پر ہی گھر آیا تھا۔

پھر بہت سارے ایسے مواقع آئے' جب انہوں نے سوچا کہ میرے ہاتھوں کس کی زندگی برباد ہوئی ہے۔ جلد بازی کا فیصلہ تھا اور فیصلہ بھی وہ جو ہو چکا تھا۔ اب اس فیصلے سے کس کو آباد ہونا تھا اور کس کو برباد۔ یہ تو بس تقدیر لکھنے والے کو ہی پتا تھا' لیکن جو نظر آرہا تھا' وہ اچھا نہیں تھا حالانکہ زینب بہت ان کا دماغ ادھر ادھر لگانے کی کوشش کرتی۔ ان کو خوش رکھنے کی بھی کوشش کرتی۔ لیکن جو خود خوش نہ ہو۔ وہ دوسروں کو کس طرح خوش رکھ سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بات زینب سے بھی کہہ دی لیکن زینب نے پہلی دفعہ ان کو جھٹلا دیا تھا۔

"میں خوش ہوں۔ شاید بہت نہیں' مگر پھر بھی خوش ہوں اور اس کی وجہ شاید آپ کو سمجھا بھی نہ سکوں۔"

☆ ☆ ☆

عورت مرد کو ایک دفعہ راستے سے بھٹکا دے۔ پھر وہ بھٹکتا ہی چلا جاتا ہے۔ مرد یہ بات سمجھے نہ سمجھے عورت کو یہ نکتہ بہت اچھی طرح پتا ہوتا ہے اور نفرت وانتقام کی آگ میں جلتی عورت کہاں تک جا سکتی ہے۔ یہ تو کسی کو بھی نہیں پتا ہوتا ہے۔

اور یہ تو نفرت وانتقام سے کہیں آگے کی بات تھی۔ یہ محبت کی بات تھی۔ اس کے دل کی بات تھی۔ تزکیٰ بھی اپنے آپ کو کتنا ہی سمجھا لیتی۔ لیکن وقت' ساری چیزیں دماغ سے نکل جاتیں۔

کتنی ہی راتیں ایسی گزرتیں کہ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا یا وہ پوری پوری رات جاگتے گزار دیتی۔



اس وقت اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو شاید یقین نہیں کرتا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ جو دن کے اجالے میں قہر بن جاتی ہے۔

زوار نے اس سے کہا تھا کہ جیسے ہی امی کی طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ میں امی سے بات کروں گا۔ وقت کا کیا' گزر لو۔ میری گرفت میں بھی آئے گا۔ جب نہیں میری بات ماننی پڑے گی۔

☆ ☆ ☆

مما کا فون آیا تھا۔ وہ اب باقاعدہ ناراض تھیں۔ وہ اسے رشتوں کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ دو لڑکوں کو انہوں نے باقاعدہ اس کے لیے پسند کر لیا تھا۔

"تم آکر ایک دفعہ دیکھ لو' آخری فیصلہ تو تمہارا ہی ہوگا۔ ہم تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔ لیکن تم کچھ سوچو تو سہی۔"

رات کو ہی خالہ جان نے زوار سے کہا تھا کہ کل تم زینب کو شاپنگ کے لیے لے جانا۔ عجیب موڑ تھا۔ نہ وہ جانا چاہتی تھی۔ نہ وہ اسے لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے جانا بھی پڑا اور زوار کی ساری باتیں بھی ماننی پڑیں۔

زوار نے۔۔۔ کہا' صرف چیزیں پسند کر لو اور وہ اتنی کنفیوز ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کون سی چیز کی اسے ضرورت ہے' پھر پتا نہیں کب موقع ملے۔ لیکن اسے کبھی موقع سے فائدہ اٹھانا نہیں آیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے۔" زوار نے اس کے نزدیک آکر کہا۔ "آپ کوئی چیز پسند کیوں نہیں کر رہی ہیں۔"

"کیا مجھے کرنی چاہئیں؟"

"تو یہاں کس لیے آئی ہیں؟" زوار نے جھنجلا کر کہا۔

"تو میں آپ کے گھر بھی گئی ہوں' تو کیا میں نے کچھ پسند کر لیا۔ نہیں نا' میں صرف وہ کر رہی ہوں۔ جو مجھے کہا جا رہا ہے۔" اس کا لہجہ بہت نارمل تھا۔ لیکن لہجے کی تہ میں۔۔۔ کہیں آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔

زوار باہر سے آیا تھا۔ وہاں عورت مظلوم نہیں ہوتی۔ وہ اپنا حق خود سے لیتی ہے یا پھر عدالتیں موجود ہوتی ہیں۔ پھر یہاں تزکیٰ تھی۔ اس کی پرورش بھی مغربی ماحول جیسی ہی تھی۔ اس لیے زوار کو احساس نہیں ہو سکا کہ عورت کا ایک روپ یہ بھی ہوتا ہے۔ خاموش مگر کہیں اندر گہرائی لیے ہوئے۔

زوار ایک دم خاموش سا ہو گیا۔ زینب کو اس کا چہرہ دیکھ کر شرمندگی سی ہوئی۔

"کچھ چیزیں اتنی اچانک ہوتی ہیں کہ سنبھلنے میں ٹائم لگتا ہے۔ سنبھلتے سنبھلتے کہیں برباد ہونے کا ٹائم نہ آجائے۔"

"انسان کی نیت صاف ہو تو کوئی برباد نہیں ہوتا۔ میرا اس بات پر یقین ہے اور میری نیت بہت صاف ہے۔ اتنا اندازہ تو آپ کو ہو ہی گیا ہوگا۔"

"ہاں۔۔۔" زینب نے گہری سانس لی۔ "مجھے صرف اتنا اندازہ ہوا ہے کہ ایسے ہی ہر کسی کے لیے جان نہیں دی جاتی۔ کسی انسان میں کچھ ہوتا ہے تو اگلا وہاں تک پہنچتا ہے۔ ایسے لوگ اب کم ہی رہ گئے ہیں۔"

زوار کو اس کی شخصیت کا یہ پہلو بہت اچھا لگا کہ اس نے کسی بات کی بھی اس سے شکایت نہیں کی تھی۔ رونا دھونا نہیں مچایا تھا۔

تزکیٰ تو پھر اس سے لڑتی تھی۔ اپنی بربادی کا اس کو ذمہ دار ٹھہرا دیتی تھی۔ بعض اوقات وہ اتنی ہسٹریائی ہو جاتی تھی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا اور بعض اوقات بالکل چپ خاموش۔ زوار اس کے مزاج کے ایک رنگ سے خود کو مانوس کرتا' تو اگلی دفعہ اس کا نیا رنگ ہوتا۔ وہ اس رنگ کو سمجھتا تو وہ واپس پہلے والے موڈ میں آجاتی۔ اس کا مزاج دھوپ' چھاؤں کی طرح ہمیشہ سے تھا۔

لیکن آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی میں شاید ہر چیز کی اہمیت ہوتی ہے۔ اسے زینب پر غصہ تھا۔ زینب کے حوالے سے ایک تلخی کا تاثر اس میں آہی جاتا تھا۔ لیکن اس سے تین دفعہ بات کر کے اسے

محسوس ہوا کہ وہ اپنی جگہ غلط تھا اور اس نے ہر موقع پر اسے غلط سمجھا تھا۔

پہلے وہ اسے پاگل سمجھتا رہا۔ پھر غاصب اور وہ دونوں میں سے کچھ بھی نہیں تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔

زوار نے کتنی دفعہ نوٹ کیا تھا کہ وہ تزکیٰ سے بھی نرم اور اچھے لہجے میں بات کرتی تھی۔ جبکہ جواباً "تزکیٰ اس کی بات کا جواب بھی نہیں دیتی تھی۔ زوار نے بہت کچھ سوچا اور اسے صرف ایک بات سمجھ میں آئی کہ وہ اب آسانی سے زینب کو اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتا تھا۔ اس کے اندر بہت کچھ ایسا تھا جو دوسروں کو اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا تھا اور وہ دوسرا تو نہیں تھا۔ اجنبی ہی سہی مگر وہ ایک کمرے میں رہتے تھے۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال کرتی تھی اور اس کی ماں کی بھی۔

شروع شروع میں یہ چیز اسے غصہ دلاتی تھی اور اپنے مزاج کے برخلاف۔ وہ اسے کوئی نہ کوئی بات کہہ بھی دیتا تھا اور تلخ بھی ہو جاتا تھا کہ امی نے موم کی گڑیا سر پہ لا کر بٹھا دی ہے لیکن گزرتے وقت نے تسلیم کرا لیا کہ وہ موم کی گڑیا صرف اس کے لیے تھی۔ وہ اس کی ہر بات پر راضی بہ رضا ہو جاتی تھی اور زوار کے نزدیک یہ بڑی خوبی تھی۔ اور رہی زینب کی بات تو وہ شکایت کس بات پر کرتی۔ اسے زوار کے ساتھ ہی اندھیرے اور تنہائی نہیں ملی تھی۔ یہ دونوں چیزیں پہلے بھی اس کے ساتھ تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات تزکیٰ نے زوار سے جھگڑا کیا تھا۔ بہت دنوں سے وہ خاموش تھی اور زوار کو لگتا تھا کہ یہ خاموشی کسی دن ضرور بپھرے گی۔

"میں بہت پریشان ہوں زوار! تم تائی امی سے بات کیوں نہیں کرتے ہو۔ میں ہر ایک کو جواب دیتے دیتے تھک گئی ہوں۔"

زوار سے اس کا چہرہ دیکھا نہیں گیا۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی۔ جس سے پہلی ملاقات میں زوار کو لگا تھا کہ زندگی صرف رعنائی کا نام ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور گلابی چہرے پر ایسا لگتا تھا' کسی نے ہلدی پھیر دی ہو۔

زوار کو اپنا آپ مجرم لگتا اور ایک بات بھی سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ زینب کو کبھی اپنی زندگی سے علیحدہ نہیں کر سکے گا۔ شادی ایسا بندھن نہیں۔ جو اتنی آسانی سے توڑا جا سکے اور یہ بات وہ تزکیٰ کو کیسے سمجھائے۔ جو آہستہ آہستہ گھل رہی تھی۔

جان دینا آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی ٹھان لے تو شاید یہ مشکل بھی نہیں رہتا۔ تزکیٰ اسی راہ پر چل رہی تھی۔ نہ وہ کچھ بھول رہی تھی۔ نہ اسے بھولنے دیتی تھی۔

کیا خوب ہوتا کہ یادیں ریت ہوتیں
مٹھی سے گرا دیتے پاؤں سے اڑا دیتے

ڈیڑھ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔۔۔ تین زندہ آدمیوں کی مثلث تھی۔

ان ہی سارے دنوں کے بیچ ایک دن خالہ جان کو ہارٹ اٹیک ہوا اور اس دفعہ وہ ان کی جان لے کر ہی ٹلا۔ زینب کو اس دن لگا کہ کوئی خالہ جان کی جگہ اسے قبر میں ڈال آئے۔ کس کو پتا۔۔۔ کہ بہت سارے ثابت اور زندہ نظر آنے والے بھی اصل میں زندہ نہیں ہوتے۔ اس نے جس طرح خالہ جان کی خدمت کی تھی۔ آج ان کے مرنے پر سب اسے ہی صبر کی تلقین کر رہے تھے۔

اور اس سے زیادہ کون صبر کی حقیقت کو جانتا تھا۔ ڈیڑھ سال سے یہی دو لفظ تو راہ ہدایت سے ہو گئے تھے۔

زندگی رک گئی تھی مگر سانس نہیں۔

☼ ☼ ☼

خالہ جان کے انتقال کے ایک مہینے بعد زوار اس کے پاس آکر بیٹھا۔

"زینب! مجھے آفس کی طرف سے شنگھائی بھیجا جا رہا ہے۔"

"؟؟" اس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں۔

"چار دن ہیں تمہارے پاس۔۔۔ فیصلہ کرنے کے لیے۔ مجھے چھوڑنے کے لیے۔ تو یہ سب کچھ تو آپ کو کرنا ہے' مجھے نہیں۔" وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اتنے بڑے نقصان پر رونا اس کا حق بنتا تھا۔

"زینب! تم نے اگر ایسا سمجھا ہے تو ٹھیک ہی سمجھا ہے۔ لیکن میں تمہیں چھوڑ نہیں رہا ہوں۔ میں نے تو تمہیں شنگھائی جانے کی تیاری کے لیے چار دن دیے ہیں۔" اس کا لہجہ سادہ تھا مگر اس میں تھکن تھی۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ کہیں نہ کہیں مقدر کا ستارہ ضرور روشن ہوا تھا۔ کیا ہوا' جو اس کی روشنی مدھم تھی۔ کیا ہوا جو ابھی یہ راہ دھندلی تھی اور تزکیٰ نے کہیں راہ میں ہمت ہار دی تھی۔ اس کا روز کا زوار سے جھگڑا رشتہ رکا تھا۔ اب تو راستے صاف تھے۔ پھر اب وہ کیوں فیصلے میں دیر کر رہا تھا۔ تزکیٰ نہیں جانتی تھی کہ وہ اب اس لیے دیر کر رہا ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہیں ہوتا جس کو آسانی سے توڑ دیا جائے۔

زوار پریشان بھی تھا اور الجھن میں بھی کہ اچانک ہی اس کے پوسٹنگ آرڈر آگئے۔ اسے چار دن میں نئے آفس میں رپورٹ کرنا تھی۔

پھر جیسے سب کچھ بدل گیا۔ وہ جو اوپر آسمانوں میں بیٹھا ہے۔ وہ کسی چیز سے بے خبر نہیں ہے۔

تزکیٰ رات کو روتی ہوئی آئی تھی لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا تاثر بدل گیا۔

"تم غاصب ہو زینب! تم نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ میری زندگی برباد کرنے میں تمہارا ہاتھ ہے۔" وہ چلائی تھی۔

زینب نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ حسین لڑکی تھی مگر بھٹکی ہوئی روح لگ رہی تھی۔

"مجھے بتاؤ میرے ہاتھ کیوں خالی ہیں۔ راہ وفا طویل تھی اور مشکل بھی زینب! مگر مجھ جیسی لڑکی نے نبھالیا۔ پھر میرے حصے میں اجر کیوں نہیں آیا؟"

"راہ وفا میرے لیے بھی طویل تھی اور مشکل بھی۔ اس شخص سے اس گھر سے میں نے وفا نبھائی جس کے بارے میں مجھے پتا تھا کہ وہ میرا نہیں ہے۔ مگر پھر بھی تزکیٰ! آج میں خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ تم فرق سمجھو' جائز رشتوں سے وفا نبھائی جائے تو کہیں جواب دہ نہیں ہونا پڑتا۔ تم جتنی جلد اس بات کو سمجھو گی' زندگی تمہارے لیے اتنی جلد بدل جائے گی۔"

"میرے ہاتھ آج اس لیے خالی ہیں کہ میں نے ایک کمزور شخص سے محبت کی تھی۔ جو رشتے نبھانا تو جانتا تھا محبت نہیں۔ مجھے جائز یا ناجائز محبت کی اس راہ پر لانے والا کون تھا۔ وہ شخص جو بیچ راہ میں ساتھ چھوڑ کر رشتے نبھانے چلا گیا۔"

زینب نے گہری سانس لی۔

"زندگی کی ہر مشکل راہ صبر مانگتی ہے۔ میرے ساتھ گزرے سالوں کا صبر تھا۔ مجھے صبر کی عادت تھی۔ اس لیے میں نے یہ دو سال گزار لیے۔ تم بھی اس لفظ کو آزمانا' پھر تم جان جاؤ گی۔۔۔"

"تمہارا صبر۔" تزکیٰ کے چہرے پر جیسے مدتوں بعد ہنسی آئی اگر اسے ہنسی کہیں تو۔

"وہ صبر نہیں مجبوری تھی زینب! تمہارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو تمہیں مل گیا' وہ تمہارے خوابوں سے بڑھ کر تھا۔ اسے چھوڑتیں تو سر چھپانے کو چھت بھی نہ ملتی۔ ہاں' یہ صحیح ہے کہ مجھے اس شخص کے لیے نہیں رونا چاہیے۔ جس کو میری پروا نہیں ہے' پر یہ بات یہ دل بھی تو سمجھے۔" تزکیٰ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

باہر کھڑے زوار کا سر جھک گیا تھا۔

"صحیح کہا تم نے تزکیٰ! جب کوئی راہ نہیں ہوتی تو صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ تمہیں بھی ایک دن صبر آجائے گا۔ پھر تم جان جاؤ گی۔ صبر کیا ہے؟"

رخسانہ نگار عدنان

# ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا حق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔
حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے، بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔
رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بہو اور اس کے گھر والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔
اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ زبیر کے ہاتھوں لٹ جانے پر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔
عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل، عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔
عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

-11-

## گیارہویں قسط

عمران انسپکٹر کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے جیسے گونگا ہو گیا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔
"اغوا؟" اس کی سماعتیں ایک ہی لفظ کو سن کر جیسے منجمد ہو کر رہ گئی تھیں اور پیچھے کھڑی ذکیہ کا دل بھی ایک لمحے کو ٹھہر سا گیا تھا۔
یہ تو ان میں سے کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ عدیل یا نسیم بیگم اس حد تک بھی جا سکتے ہیں کہ وہ مثال کے اغوا کے کیس میں انہیں تھانے گھسیٹ لے جائیں گے۔
"او مسٹر! ہٹو راستے سے ہمیں گھر کی تلاشی لینی ہے۔" انسپکٹر کے ساتھ موجود سپاہی نے عمران کو پتھر کا بت بنے کھڑے دیکھا تو اس کو ذرا تحقیر آمیز لہجے میں کہہ کر جیسے ہوش دلایا۔
"کیوں... کیوں تلاشی لیں گے آپ؟" وہ ایک دم سے بھڑک کر بولا۔
انسپکٹر اور سپاہی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ انسپکٹر نے جیب سے سرچ وارنٹ نکال کر عمران کے آگے کر دیے۔ "ہمارے پاس تلاشی لینے کا اختیار ہے۔ خالی خولی رعب نہیں جما رہے ہم۔ ہٹو راستے



سے۔" انسپکٹر نے اب کے ذرا درشت لہجے میں کہا۔
"مگر کوں کس لیے لینی ہے آپ کو تلاشی۔ میں نے... ہم نے کیا کیا ہے۔" عمران اب کے ڈرے ہوئے لہجے میں اٹک اٹک کر بولا۔ پیچھے کھڑی ذکیہ حوصلہ کر کے آگے بڑھ آئیں۔
"مجھے بات کرنے دو بیٹا! کیا بات ہے۔" ذکیہ نے خلاف مزاج لہجے میں انکساری، عاجزی اور تھوڑا خوف سمو کر کہا۔
"خاتون! بچی کے اغوا کا معاملہ ہے۔ ہم بچی در آمد کرنے آئے ہیں۔" انسپکٹر ذکیہ بیگم کو دیکھ کر تھوڑا مودب ہو کر بولا۔
"یہ وقت ہے اس طرح کی تلاشی اور بازیابی کا؟" عمران تلخی سے مگر دبے لہجے میں بولا۔
انسپکٹر نے اسے گھور کر دیکھا جیسے کچھ سخت بولنے سے اس نے خود کو روکا ہو۔
"بیٹا! کیا ہم اندر بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے۔" ذکیہ لجاجت سے یوں بولیں جیسے ان سے بڑا مجبور کوئی ہے ہی نہیں۔ سپاہی نے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔
"ٹھیک ہے تم باہر کھڑے رہو۔ میں اندر جا کر بات کر کے آتا ہوں۔" انسپکٹر نے سپاہی کو تاکید کی۔
"مگر امی!" عمران اس چیز کے حق میں نہیں تھا کہ یوں جھک کر من کر کے مذاکرات کیے جائیں۔ اسے معلوم تھا کہ ان مذاکرات کا نتیجہ کیا ہو گا۔ وہ وہیں گیٹ میں کھڑا رہا۔
"اندر آؤ عمران! میرے ساتھ۔" ذکیہ حکمیہ لہجے میں بولیں۔
عمران لمحہ بھر کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ایک کے بعد ایک بے سکون کر دینے والی بات... وہ جھنجلا کر رہ گیا اور سپاہی کی موجودگی کی پروا کیے بغیر بہت بدتمیزی سے زور سے گیٹ بند کیا اور اندر چلا گیا۔
عدیل پولیس کی گاڑی سے بہت فاصلے پر اندھیرے میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑا بے چین نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے امید تھی کہ کچھ دیر میں انسپکٹر مثال کو ساتھ لے کر آجائے گا اور وہ مثال کو اپنے گلے لگا کر فاتحین کر واپس چلا جائے گا۔ معاملہ اب صرف مثال کی محبت کا نہیں تھا بہت کچھ جیتنے اور ہارنے کا تھا۔ اسے ہر صورت بشریٰ کو نیچا دکھانا تھا۔
اسے جتانا تھا کہ وہ کتنا بڑا خسارہ اپنے بخت میں درج کرا چکی ہے۔ عدیل کی زندگی سے نکل کر اب اس کی زندگی میں صرف اور صرف بچا ہے دکھ جدائی اور ذلت!
گھر کا گیٹ زور کی آواز کے ساتھ بند ہوا اور سپاہی سست قدمی سے چلتا پولیس وین کے پاس آگیا۔
عدیل اور بھی بے چین ہو گیا۔
"اگر یہ کمینہ انسپکٹر اس ذکیہ کی لچھے دار باتوں میں آگیا اور اس نے اسے یونہی مثال کو دیے بغیر بھیج دیا تو..."
ایک رات کے لیے ہی سہی بشریٰ جیت جائے گی اور اسے بشریٰ کی ایک رات کی جیت بھی گوارا نہیں تھی۔ وہ بے چین سا سپاہی کے پاس آیا۔
"انہوں نے بات کرنے کے لیے بلایا ہے انسپکٹر صاحب کو اندر ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔" سپاہی کی بات پر وہ خاموش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"پاپا... پاپا۔" مثال نیند میں پکار رہی تھی۔ بشریٰ کی آنکھ کھل گئی۔

مثال غنودگی میں تکیے پر سر رکھتے ہوئے باپ کو پکار رہی تھی۔ بشریٰ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ بے اختیار روتی چلی گئی۔
"کیا اب میری بچی یونہی عمر بھر دونوں کے لیے تڑپتی رہے گی۔ باپ کے پاس رہے گی تو ماں کی قربت کو ترسے گی، میرے پاس ہو گی تو باپ کو مس کرتی رہے گی۔ میرے خدا! ہم نے اس کے لیے یہ زندگی تو نہیں سوچی تھی۔ ہم تو اسے دنیا کی خوش قسمت ترین بیٹی بنانا چاہتے تھے کہ جس پر دنیا کے سارے ماں باپ رشک کرتے۔ ایک مثال بنانا چاہتے تھے ہم۔"
"یہ مثال..." اس کے ماتھے کے بال سنوارتے وہ سسک اٹھی۔
باہر کہیں زور سے بیرونی گیٹ کسی نے بند کیا۔ بشریٰ بری طرح اپنے خیالوں سے چونکی۔
"اس وقت باہر کون گیا ہو گا... یا کوئی آیا ہو گا... مگر کون؟ جس طرح عمران مثال کو لے کر آیا ہے، کہیں عدیل تو نہیں..." وہ دہل کر رہ گئی۔
باہر سے باتوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔
بشریٰ ننگے پاؤں اٹھ کر باہر بھاگی لیکن پھر کچھ خیال آنے پر الٹے قدموں واپس آئی۔ مثال کو دیکھتی رہی کہ وہ گہری نیند میں ہے بھی یا نہیں، پھر آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔
"ہوں میرے خیال میں یہ معاملہ یوں لڑائی جھگڑے، ضد اور انا سے حل نہیں ہو گا۔ آپ دونوں فیملیز کو مل بیٹھ کر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہو گا، ورنہ پولیس کیس بننے کے بعد اس کا فیصلہ ہو جانے تک آپ دونوں فیملیز کو ذہنی، جسمانی اور مالی بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" انسپکٹر کو ذکیہ ساری صورت حال بتا چکی تھیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہنا شروع کر دیا۔
"مگر انسپکٹر صاحب! یہ بات ان لوگوں کو کون سمجھائے۔ میری بیٹی جس کو بے وجہ طلاق دی ان لوگوں نے قسم لے لیں مجھ سے، پورے چار دن سے اس کی حالت پاگلوں جیسی تھی۔ جس کی وجہ سے مجبور ہو کر عمران کو زبردستی بچی کو لے کر آنا پڑا ورنہ سچی بات ہے میں اور میرے دونوں بچے جتنے صلح جو اور..." ذکیہ آنکھوں میں آنسو لیے عاجزی سے ابھی اپنے اور اپنے بچوں کے مزید فضائل گنوانا چاہتی تھیں کہ انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"ٹھیک ہے میں عدیل صاحب سے بات کرتا ہوں۔ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس طرح معاملہ سلجھنے کے بجائے مزید بگڑ جائے گا۔"
انسپکٹر سمجھ دار تھا یا وہ واقعی ان لوگوں کو صرف دھمکانے آیا تھا کہ دونوں فیملیز مذاکرات کی میز پر آ جائیں۔
"انسپکٹر صاحب! ہم نے تو دوہرا نقصان جھیلا ہے۔ بیٹی کا گھر بھی اجڑا اور اب یہ ظالم اس کی گود بھی اجاڑنا چاہتے ہیں۔" ذکیہ لہجے کو گلوگیر کرتے ہوئے بولیں۔
اور سچی بات ہے کہ اس وقت تو واقعی ذکیہ کا دل رنجور تھا کہ یک بیک ہی بیٹی کے یوں اجڑ کر گھر آ بیٹھنے کا صحیح معنوں میں دکھ ہو رہا تھا۔
اور جس دیوانگی سے وہ مثال کے لیے مری جا رہی تھی۔ ذکیہ بشریٰ سے چھپ چھپ کر روتی رہتیں۔
"ٹھیک ہے۔ میں عدیل صاحب سے بات کرتا ہوں اور آپ لوگ مل بیٹھ کر اس مسئلہ کو حل کریں ورنہ نقصان دونوں خاندانوں کا ہے۔" انسپکٹر کہہ کر جانے لگا۔
تب ہی سامنے بشریٰ آ گئی... ننگے پاؤں، ننگے سر، اجاڑ صورت لیے آنکھوں میں تیرتا پانی اور چہرے پر آنسوؤں کے مٹے مٹے نشان۔



...تے کے... آگے بڑھتے قدم رک گئے۔
...نی... پکارا گیا۔
بشریٰ کھاتے پر ابھی بھی پٹی بندھی تھی۔ آنکھوں میں بے حد خوف لیے وہ سہم کر انسپکٹر کو دیکھنے لگی۔
"امی... امی یہ مثال کو لینے آئے ہیں، انہوں نے پولیس بھیجی ہے میری بچی کو لینے کے لیے۔" وہ بری طرح ...ری تھی۔
"یہ میری بیٹی ہے انسپکٹر صاحب! دیکھیے اس کا حال، چار دنوں میں برسوں کی بیمار لگنے لگی ہے۔" ذکیہ اسے ...تھام کر سسک کر بولیں۔
انسپکٹر نے خفیف سا سر ہلایا اور بغیر کچھ کہے باہر کی طرف بڑھ گیا۔
"...ن! یہ کیوں آئے تھے یہاں؟" بشریٰ ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔
"مثال کو لینے کے لیے ناں۔" وہ ماں کی خاموشی پر بے قراری سے بولی۔
"ہاں... میری بچی۔" ذکیہ تو بھر کر بولیں۔
"نہیں... ہرگز نہیں، بالکل نہیں، میں مثال کو کسی کو نہیں دوں گی امی۔ میں اسے لے کر کہیں دور چلی جاؤں گی کل ہی... میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ یہ لوگ مجھ سے میری بیٹی چھین لیں گے۔ میں جانتی ہوں امی عدیل کو... عمران! تم مجھے کہیں بھجوا دو... امی... جمال ماموں کے پاس دوبئی میں... بھجوا دیں مجھے یا میں خود کہیں چلی جاتی ہوں۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔" وہ بالکل اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی، بے ربط سا بولے جا رہی تھی۔
عمران اور ذکیہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔
"کوئی نہیں چھینے گا تم سے مثال کو اور تم اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گی۔" ذکیہ اسے چمکار کر بولیں۔
"اپنا گھر" بے اختیار ہی اس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔ ذکیہ بھی نظریں چرا کر رہ گئیں۔
بس غریب کا اپنا گھر رہا کہاں تھا، نہ یہاں نہ وہاں۔
ذکیہ کی تو خود بیٹی کے غم سے کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ نڈھال سی ہو کر صوفے پر گر گئیں۔
عمران بھی تھکا ہوا ماں کے پاس بیٹھ گیا۔
"امی! بہت ہی گھٹیا لوگ نکلے یہ۔ حرکت دیکھیں ان کی مجھ پر اغوا کا الزام لگا دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، یہ اتنا بھی کر سکتے ہیں۔" وہ کوفت اور نفرت سے بولا۔
"ابھی بھی تم یہ نہیں سوچ سکتے۔ ان کی ذہنیت کو تم ابھی بھی نہیں جان سکے۔ اتنی بودی اور بے کار بات کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنے بیٹے کا بسا بسایا گھر اجاڑ دیا۔ وہ لوگ کسی بھی حد سے گزر سکتے ہیں۔" ذکیہ تلخی سے بولیں۔
بشریٰ ٹکر ٹکر دونوں کو دیکھے جا رہی تھی جیسے ان کی باتیں اس کی سمجھ میں نہ آ رہی ہوں۔
"امی! یہ انسپکٹر پھر تو نہیں آئے گا... مثال کو لینے۔" وہ بے یقینی سے ماں کا بازو ہلا کر پوچھ رہی تھی۔
ذکیہ دکھ سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔
"امی! بتائیں ناں۔" وہ بالکل چھوٹی بچی لگ رہی تھی ذکیہ کو۔ ڈری سہمی خوف زدہ بے یقین سی۔
ذکیہ کو بے اختیار رونا آ گیا۔
"نہیں میری بچی... نہیں۔" وہ اسے ساتھ لگا کر رونے لگی۔ عمران دونوں کو پریشان نظروں سے دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"یہ ناممکن ہے۔" عدیل انسپکٹر کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔
انسپکٹر نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ اتنا تو اندازہ اسے ہو ہی گیا تھا۔ اس ایک گھر کے اجڑنے میں زیادہ ہاتھ کس کا ہے۔
عدیل کی جذباتیت ان چند گھنٹوں میں اس پہ عیاں ہو گئی تھی۔
"تو پھر آپ دوسری صورت حال کے لیے تیار رہیں۔" انسپکٹر بے تاثر لہجے میں بولا۔ عدیل نے کچھ پریشان ہو کر اسے دیکھا۔
حالانکہ اسے قطعی امید تھی کہ انسپکٹر مثال کو ساتھ لے کر آئے گا مگر بشریٰ کے گھر سے آنے کے بعد وہ اسے سمجھانے لگا تھا۔
"واقعی یہ بشریٰ کی ماں ایک جادوگرنی ہے۔ امی ٹھیک کہتی ہیں بلکہ یہ بشریٰ بھی کیسے آدمی کو سحر زدہ کر دیتی تھی۔ میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" نئے سرے سے اس کے دل میں بشریٰ کے خلاف غصہ ابلنے لگا۔
اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ غصہ اب نارسائی اور پچھتاوے کا ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اذیت بڑھاتا ہی چلا جائے گا۔
"کیا مطلب... کیسی صورت حال؟"
"عدیل صاحب! اتنا قانون تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اگر یہ معاملہ کورٹ میں چلا گیا تو پھر آپ کے لیے مشکل ہو جائے گی۔"
انسپکٹر اسے واضح الفاظ میں سمجھانے کے بجائے اشارتاً بولا۔
"کیا ہو جائے گا پھر؟" وہ ہر بات کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔
"بچی آپ کی سابقہ بیوی کو ہی ملے گی کیونکہ وہ ماں ہے۔ ماں کا حق پہلے ہے دوسرے بچی ابھی چھوٹی ہے۔ اس کی بلوغت تک تو اسے ماں کے پاس ہی رہنا ہو گا اور شاید اس کے بعد بھی۔"
انسپکٹر طارق نرمی سے اسے سمجھانے لگا۔
"تو کیا باپ کا کوئی حق نہیں؟" وہ تلخی سے بولا۔
"قانون میں نے نہیں بنایا۔ اس لیے میں نہیں جانتا۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ ایک باپ جو اپنی اولاد سے بے پناہ محبت رکھتا ہو اس کے ساتھ قانون میں یہ زیادتی کیوں کی گئی۔ لیکن ظاہر ہے کچھ وجوہات ہوں گی جن کو ہم جذباتی انداز میں نظر انداز کرتے ہیں۔ سمجھنا نہیں چاہتے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔
"کیسی وجوہات؟" عدیل اپنی تلخی، اپنی جذباتیت چھپا نہیں پا رہا تھا۔ دوسرے اسے لگ رہا تھا کہ مثال اس سے ہمیشہ کے لیے چھن گئی ہے۔ انسپکٹر بھی بشریٰ کی ماں کے ساتھ مل گیا ہے اور اب اسے فضول باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔
اس نے دل ہی دل میں اسی وکیل کے بارے میں سوچ لیا تھا جو اس کا بہت اچھا دوست بھی تھا اور شہر کا مانا ہوا قانونی ماہر بھی۔
"جتنی بھی فیس ہو میں اسے دوں گا مگر مثال کو حاصل کر کے رہوں گا۔" وہ دل میں پختہ عزم کر رہا تھا۔
"باپ کو روزگار کے لیے گھر سے باہر رہنا ہوتا ہے۔ ایسے میں بچی یا بچے کی دیکھ بھال وہ کیسے کر سکتا ہے بھلا؟



بات تو اور بھی نازک ہوتے ہیں۔" انسپکٹر اپنے دھیان میں کہے جا رہا تھا۔ عدیل ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھے گیا۔
"ان حالات کو صرف مائیں ہی سمجھ سکتی ہیں اور سنبھال سکتی ہیں۔" انسپکٹر نے نرمی سے بات گویا ختم کر دی۔
"اب تو میں اپنی بیٹی اس عورت کے حوالے کر کے بیٹھ جاؤں جس کے بارے میں میں جانتا ہوں، وہ میری بچی کا خیال نہیں رکھ سکتی جیسا میں رکھ سکتا ہوں نہ اس کی ویسی تربیت کر سکتی ہے جیسی میں چاہتا ہوں۔" عدیل بے بسی سے بولا۔ "میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا یوں ہار نہیں مان سکتا۔ ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔" وہ کہتا چلا گیا۔
"اوہ تو یہ بات ہے۔" انسپکٹر چونک کر بولا۔
عدیل نے بھی انسپکٹر کی طرف دیکھا۔
"آپ کے نزدیک یہ صرف بچی کی کسٹڈی کا معاملہ نہیں، آپ کی انا کی جیت، آپ کی ضد کا معاملہ ہے اور آپ دونوں کی اس جذباتی لڑائی میں آپ کی بچی کی نفسیات کس بری طرح سے متاثر ہو رہی ہے۔ آپ کو کوئی پروا نہیں۔" انسپکٹر کو لحہ بھر میں غصہ آگیا تھا۔
"میں جانتا ہوں، مجھے اپنی بچی کی کیسی تربیت کرنی ہے، اس کے لیے اسے میری سرپرستی کی ضرورت ہے۔" عدیل ذرا سنبھل کر بولا۔
"ٹھیک ہے، آپ خود یہ معاملہ حل کر لیں۔" انسپکٹر بے نیازی سے بولا۔
"کل دن کے وقت آیئے گا ہم آپ کا کیس فائل کر لیں گے۔ اس کے بعد قانونی کارروائی شروع ہو گی۔ اس کے مکمل ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا اس کی ضمانت کسی کے پاس نہیں اور اس کے بعد یعنی اتنا روپیہ پیسہ، انرجی اور وقت ضائع کرنے کے بعد بھی اگر بچی آپ قانوناً نہ حاصل کر سکے تو عدیل صاحب مجھے واقعی آپ کے ساتھ سخت ہمدردی ہو گی۔" عدیل اسے دیکھتا رہ گیا۔
"کیا کروں پھر میں؟" وہ بہت دیر بعد شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ انسپکٹر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ایک ٹوٹا ہوا شکست خوردہ انسان غصے نے جس کی زندگی اجاڑ کر رکھ دی ایک جلد باز فیصلے نے سب کچھ ختم کر دیا۔ انسپکٹر کو عدیل پر ترس آیا۔
"آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ کل شام میں میرے پاس آیئے گا۔ میں آپ کی ضرور مدد کروں گا یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" انسپکٹر نے اسے تسلی دی تو وہ کچھ بول بھی نہ سکا۔ بس خاموشی سے سامنے اندھیرے میں دیکھتا رہا کہ اب یہ اندھیرے اس کی قسمت کا بھی حصہ تھے۔

✲ ✲ ✲

عدیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس خبر پر خوش ہو ہنسے۔ روئے یا پھر دھاڑیں مارنے لگے۔
نسیم کا چہرہ خوشی اور جذبات کا عکاس بنا کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں چمک ہونٹوں پر مسکراہٹ اور چہرے پہ فتح کا احساس۔
وہ عجیب سے احساسات سے دوچار ہو گیا۔
ایسا لگا جیسے فوزیہ کی شادی کی خوش خبری نہیں سنی اس کے کندھوں پہ اس دنیا کا سب سے بھاری پہاڑ کسی تنکے کی طرح آگرا۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پہ ہولے ہولے اپنے کندھے دبانے لگا۔

نسیم بیٹے کو یوں گم صم دیکھ کر پریشان سی ہو گئیں۔ انہیں تو اندازہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ عدیل اتنی بڑی خبر سن کر اتنا خوش ہو گا کہ اسے شادی مرگ ہو جائے گا۔

مگر اس کی اتری ہوئی شکل اور یوں کندھے دباتے دیکھ کر نسیم واقعتاً پریشان سی ہو گئیں۔

"عدیل! میرے بچے! تم ٹھیک تو ہو ناں.... تمہیں خوشی نہیں ہوئی یہ سن کر کہ تمہاری بہن کی اتنی اچھی بغیر کسی الٹی سیدھی شرط شرائط کے جھٹ پٹ شادی طے پا گئی ہے وہ بھی اتنے شریف اور خاندانی لوگوں میں۔" بیٹے کی خیریت پوچھتے پوچھتے پھر اس خوش خبری کے زیر اثر آ گئیں۔

"ٹھیک ہوں میں امی۔ خوشی ہے مجھے یہ سب سن کر۔" وہ اتنا تھکا ہوا بولا جیسے میلوں میل دوڑ کر آیا ہو۔

نسیم اس کے لہجے پر چونک سی گئیں۔

"مثال کی وجہ سے پریشان ہے نا میرے بچے! جانتی ہوں تیری تو جان ہے اس ننھی پری میں۔ وہ بے دید ایسا تحفہ کہ میں خود کل سے یوں پورے گھر میں بولائی بولائی پھر رہی ہوں جیسے میرے ہاتھوں سے کوئی قیمتی چیز گر گئی ہو۔"

باتیں بنانے کا اور ان میں الجھانے کا فن وہ بھی برمحل اس فن کو استعمال کرنا تو نسیم کو آتا ہی تھا مگر سامنے والے کی نبض پر ہاتھ رکھنے میں بھی وہ خوب طاق تھیں۔

"دل ایسا اداس اور پریشان سا ہے وہ ضدی بشریٰ اڑتی نہ تم سے یوں بدزبانی کرتی نہ یہ سارا معاملہ بگڑتا نہ وہ یوں تم سے.... مطلب ہم سے اپنے گھر سے بچھڑتی۔"

وہ آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھنے لگیں۔

عدیل بے تاثر چہرہ لیے بیٹھا رہا۔ وہ جو کچھ اب کہہ رہی تھیں۔ اس کا خیال تو اول شب ہی عدیل کے دل کچوکے لگانے لگا تھا۔

اسے اعتراف کرنے میں اقرار کرنے میں صرف ایک مردانگی کی جھجک آڑے آ رہی تھی ورنہ وہ ابھی ماں کے منہ پہ برملا کہہ دیتا کہ وہ بشریٰ کو طلاق دے کر پچھتا رہا ہے۔ وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔ بچے کی طرح رو کر ماں سے ضد کرنا چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح کوئی صورت نکال کر وہ اس کا من پسند کھلونا واپس لے آئے۔ نسیم تو کسی بھی طرح سے کوئی بھی حل نکالنے میں باکمال تھیں۔

مگر وہ ماں سے یہ سب بول نہیں سکا۔

"کہاں جا رہے ہو عدیل؟" اسے یوں بنا کچھ کہے اٹھ کر جاتے دیکھ کر نسیم کچھ بوکھلا سی گئیں۔

اس وقت انہیں عدیل کی مکمل تائید چاہیے تھی۔ اس کا یہ گم صم رویہ اور ڈھکی چھپی تائید! جو بھی تھا۔ فوزیہ کی شادی کا سارا بار تو عدیل نے ہی اٹھانا تھا اور اب جو وہ ایسے ذہنی و قلبی بحران کا شکار تھا کھلے دل سے ہامی بھر سکتا تھا سوائے بڑے پیار اور طریقے سے اس طرف لے کر آنا تھا کہ اسے ذرا بھی نہ لگے اس کی ماں بہن مطلبی، خود غرض اور بے حس ہیں۔

"امی! میں کمرے میں ہوں۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میرے بچے! اکیلے کمرے میں جا کر کیا کرو گے اور دل برا کرو گے۔ وہ تو اپنا گھر یوں لات مار کر اجاڑ گئی۔ عورتوں کو صرف اپنی خواہشوں سے مطلب ہوتا ہے۔ پوری ہوتی رہیں تو وہ خوش نہ ہوں تو....

"امی پلیز۔ میرے سر میں درد ہے۔ کچھ دیر ریسٹ کروں گا۔" اب وہ بشریٰ کے بارے میں کچھ بھی سننا نہ



سب من کرو کرتا بھی کیا کہ ان باتوں کا ماحصل تو بشریٰ کو یہاں سے ہمیشہ کے لیے دفعان کرنا تھا سو وہ ہو چکی

"میرے بچے ادھر میرے پاس ہی لیٹ جا۔ میں تیرا سر دبا دیتی ہوں۔ فوزیہ! چائے کے ساتھ کوئی گولی لے آتی اکیلے کمرے میں جا کر اور دل برا ہو گا۔" وہ اس کو پیار سے بہلانے لگیں۔

"نہیں امی میں سونا چاہتا ہوں کچھ دیر۔" وہ جان چھڑانے کو بولا ورنہ وہ آج تک کبھی آفس سے آ کر بستر پر نہیں لیٹا۔ شادی سے پہلے وہ فوزیہ اور نسیم سے گپ شپ کرتا تھا اور شادی کے بعد بشریٰ کے ساتھ کہیں نہ کہیں ہر ہفتے یا شاپنگ پہ نکل جاتا تھا کیونکہ اسے شام کے وقت بستر پر پڑنا سخت ناپسند تھا۔

"عدیل۔ مجھے بات کرنی تھی تم سے۔ وہ لوگ مہینے بھر کے اندر شادی کرنا چاہتے ہیں تو میں کیا جواب دوں انہیں؟" وہ پریشان ہو کر اصل مدعا پر آ ہی گئیں۔

"امی! آپ ان سے کہہ دیں۔ جب چاہیں تاریخ رکھنے آ جائیں۔ ہماری طرف سے کچھ دیر نہیں ان شاء اللہ سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ بھی فکر مند نہ ہوں۔" وہ کہہ کر لحہ بھر کو بھی نہیں رکا کہ نسیم پھر سے اسے کسی بات میں الجھا لیں۔

نسیم اسے ڈھیر ساری دعائیں دینا چاہتی تھیں اور دے بھی رہی تھیں مگر جانے کیوں عدیل کو پہلی بار اپنی ماں کی دعاؤں میں کسی دکان دار کی سی خصلت محسوس ہوئی جیسے کوئی پیشہ ور بھکاری زیادہ بھیک کے عوض ان گنت دعائیں دیتا ہی چلا جاتا ہے۔

"مجھے اپنی ماں کے بارے میں اتنے گھٹیا انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔" اس نے اپنی سرزنش کی۔

"کیا کروں.... یہ کل سے دل بہت ہی پریشان تھا۔"

کچھ دیر میں انسپکٹر طارق نے ذکیہ اور بشریٰ سے بات کرنے کے بعد اس کی طرف آنا تھا کہ وہ دونوں مثال کا معاملہ کیسے حل کرنا چاہتی ہیں۔

اور نہ معلوم وہ صاف انکار کر دے کہ وہ مثال پہ باپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی اور اتنا قانون تو وہ بھی جانتی ہو گی کہ بچے پر پہلا حق ماں کا ہے۔

وہ خالی کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا یونہی سوچے جا رہا تھا۔

کمرے میں سب کچھ موجود تھا اسی طرح سے جیسے وہ اس صبح چھوڑ کر گئے تھے جب وہ بشریٰ کو ذکیہ کی طرف عمران اور فوزیہ کے رشتے کی بات کرنے کے لیے چھوڑ کر گیا تھا۔

اوپر والا پورشن اسی طرح سامان سے سجا تھا اگرچہ سب طرف دھول اور مٹی تھی۔ بشریٰ کو معلوم تھا کہ عدیل کو صفائی سے عشق ہے اور جب وہ دونوں نیچے کمرے میں رہتے تھے تب بھی اور بعد میں اس پورشن میں آ کر بھی بشریٰ عدیل کے آنے سے پہلے صفائی اور خاص طور پر ڈسٹنگ کر کے رکھتی تھی۔

جب بھی عدیل گھر میں آتا اس کا جی خوش ہو جاتا تھا۔

صاف ستھرا چمکتا گھر، کچن سے آتی کھانوں کی خوشگوار خوشبوئیں اور بشریٰ کا بنا سنورا مہکتا وجود اور سب سے بڑھ کر ہنستی مسکراتی اچھلتی کودتی صاف ستھری اچھے لباس میں سلیقے سے بال بنائے پیاری سی مثال۔

اور اب صرف چار دنوں میں یہ پورشن کسی اجاڑ کھنڈر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔

یونہی اس نے الماری کھولی۔ مثال اور بشریٰ کے کپڑے پریس شدہ ہینگرز میں لٹکے تھے۔

دوسری الماری میں عدیل کے سارے کپڑے ترتیب سے استری کیے ہوئے تہہ بہ تہہ پڑے تھے۔
نیچے جوتوں کے ریک میں اس کے سارے پالش شدہ چمکتے جوتے اور دراز میں دھلی ہوئی جرابوں کے جوڑے تہہ بہ تہہ ساتھ پڑے تھے۔
اسے یکدم خود سے بے تحاشا نفرت محسوس ہوئی۔
اتنا خیال رکھنے والی' اتنا پیار کرنے والی' گھر کو سنوارنے والی' زندگی کو ڈسپلن کے تحت جیسا عدیل چاہتا تھا ویسی ہی شکل دینے والی بیوی کو اس نے کس طرح ایک لایعنی ضد میں آکر خود سے کاٹ پھینکا۔
کیا اس کی زندگی دوبارہ سے کبھی اس قرینے میں ڈھل سکے گی۔
اسے ایک نیا خیال ستایا۔
یہ سلیقہ' قرینہ جو اس کے لیے زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر وہ خوش نہیں رہ سکتا۔۔۔ اور خوش تو وہ اب کبھی بھی نہیں رہ سکے گا۔ اتنا اسے اندازہ ہو چکا تھا۔
وہ تھکا ہوا ڈھول سے انی بیڈ شیٹ پر گر سا گیا۔
فوزیہ کی شادی کس طرح صرف چند دنوں میں طے ہو گئی' جس کی وجہ سے اس نے ماں' بہن کے کہنے میں آکر مشتعل ہو کر اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا اور نتیجہ یہ اجاڑ کمرہ!
اس کا نقصان' اس کا خسارہ ناقابل تلافی تھا۔
بے اختیار اس کی آنکھیں بھر آئیں اور بہت دنوں بعد ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور روتا ہی چلا گیا۔
شاید وہ کچھ دیر اور روتا' مگر اس کا سیل فون نہ بج اٹھتا' اس نے سیل پر آتا نمبر دیکھ کر بمشکل خود کو سنبھالا۔
انسپکٹر طارق کی کال تھی۔ وہ بشریٰ اور ذکیہ سے بات کر چکا تھا اور آدھے گھنٹے میں اسے آکر ملنے کو کہہ رہا تھا' اس نے ہامی بھر کر فون بند کر دیا۔
اگرچہ اس نے انسپکٹر سے پوچھا بھی کہ ان دونوں نے کیا کہا' اسے جانے کیوں دھڑکا تھا کہ بشریٰ اب کبھی بھی مثال کو واپس نہیں کرے گی۔
وہ اب کبھی مثال کی شکل نہیں دیکھ سکے گا۔
جانے کیا اس کے جی میں آیا' اس نے بشریٰ کا نمبر ملا لیا۔
بشریٰ اپنا سیل فون' اپنا بیگ سب کچھ تو یہیں چھوڑ گئی تھی مگر اس نے یا عمران نے بعد میں اس کے فون کی سم نکلوالی تھی اس کا نمبر آن تھا۔
فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی' مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔
اسے بھی عجیب ضد سی ہو گئی' وہ فون کرتا چلا گیا۔
آخر میں دوسری طرف سے سیل آف کر دیا گیا۔
اسے یوں لگا' بشریٰ نے اس کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو' بالکل غیر شعوری طور پر اس نے اپنے گال پر ہاتھ رکھ دیا۔
وہ اب مجھے کبھی مثال سے ملنے نہیں دے گی۔ اس کے دل کا یہ گمان پختہ ہو گیا۔
جو سلوک وہ بشریٰ کے ساتھ کر چکا تھا اس کے بعد وہ بھی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔
وہ یوں ہی آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔



☼ ☼ ☼

آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔" واثق ماں کی بات سن کر ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ عاصمہ اب اور بھی تیزی سے ٹیبل پر کام کر رہی تھی۔
اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے واثق کی کوئی بات ہی نہ سنی ہو۔
"جاؤ اور جا کر چینج کرو' روٹیاں پک گئی ہیں' دیکھو جا کر دونوں نے کپڑے تبدیل کر لیے ہیں تو ان سے کہو آکر ممیں دسترخوان بچھا کر۔" عاصمہ مصروف انداز میں کہتی چلی گئی۔ واثق یوں ہی کھڑا رہا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماں کو اب کس طرح اپنے سوال کا جواب دینے کے لیے آمادہ کرے۔
کچن میں ماں کو بجلی کی سی تیزی سے کام کرتے دیکھتا رہا۔
"واثق! کھڑے کیوں ہو۔ جاؤ ناں۔" وہ اسے یونہی کھڑے دیکھ کر اب کے ذرا سختی سی بولی۔
"مگر مما! مجھ سے تو علی نے کہا تھا کہ اس کے ماموں' آپ کا بالکل فارمل سا انٹرویو لیں گے اور آپ کو اپائنٹ کریں گے تو پھر انہوں نے کیوں نہیں جاب دی آپ کو؟" اس نے ماں کے سخت لہجے کو بھی نظر انداز کر کے بہت نموں لہجے میں بولتے اپنا سابقہ سوال دہرایا تھا۔
عاصمہ کو جی بھر کر غصہ آیا۔ یہ چھوٹا سا لڑکا اکثر اسے کیسے لاجواب کر دیتا تھا۔ اس کا جی چاہا' واثق کو کس کر ایک تھپڑ لگائے۔
لیکن واثق جیسا بچہ تھپڑ سے بھی مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ عاصمہ جانتی تھی۔
"تم چینج کرو۔ کھانا کھاؤ تو پھر میں تمہیں سب بتاتی ہوں۔" اب ذرا طریقے سے اس کے سوالوں کا جواب مہیا کرنے کے سوا عاصمہ کے پاس اور کوئی انتخاب نہیں بچا تھا سو ذرا نرمی سے بولی۔
واثق نے ماں کے چہرے پر سچائی کو تلاش کیا کہ وہ اسے کتنا تشفی بخش جواب دے گی۔ مگر وہ کچھ زیادہ نہ جان سکا' تھا تو ابھی بچہ ہی۔ بہت زیادہ چہرہ شناسی اسے ابھی نہیں آتی تھی اگرچہ آج کل اس کا پسندیدہ مشغلہ ہی اس فن کو سیکھنا تھا۔
باپ اور دادا کی بے وقت موت نے اسے اس فن میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے غور کیا تو اسے پتا چلا تھا کہ ان سے ملنے والے' ان سے ہمدردی کرنے والے زیادہ تر لوگ دل میں ان کے لیے ویسے ہمدردانہ جذبات نہیں رکھتے' جیسا وہ اپنے منہ سے اس کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔
دوسرے لفظوں میں وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ زیادہ تر لوگ دو چہروں والے بلکہ کئی چہروں والے ہوتے ہیں۔
اس لیے اسے بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔
عاصمہ جلدی جلدی سالن نکالنے لگی' واثق سست قدموں سے اندر جا چکا تھا۔
"یہ بچہ بہت مشکل ہے اور اس سے جھوٹ بولنا بھی آسان نہیں۔ وہ علی کے ذریعے میرے کسی بھی ایسے جھوٹ کا پتا لگوا سکتا ہے جبکہ اس کا ماموں بہت خواہش مند ہے مجھے جاب دینے کے لیے۔" عاصمہ اب سے کے جلتے شعلوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
ان شعلوں میں اسے یک دم ہی زبیر کا سادہ سا بے ریا چہرہ اور مکار آنکھیں نظر آئیں جن پر شروع دنوں میں اس نے بھی غور نہیں کیا تھا۔
اس چہرے کے ساتھ علی کے ماموں نعیم کا چہرہ ابھرنے لگا۔

ایسا چہرہ جس پر بہت ہمدردی محبت اور خوش اخلاقی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ایسی بھوک تھی جس کی مد ... سے تشفی نہیں ہو سکی تھی اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

عاصمہ کے اندر سیٹ پر بیٹھتے ہی خطرے کی گھنٹی ٹن ٹن بج اٹھی تھی پھر بھی اس نے محتاط انداز میں اس شخص کے سرسری سوالوں کا جواب دیتے ہوئے تھوڑا مارجن نکالنے کی کوشش کی۔

"ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔" اس نے پھر سے ہمت کر کے اس شخص کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں وہی کرنٹ بھری لہر گزری کہ وہ کیا کہہ رہا تھا اس کی سماعتیں سن ہی نہ سکیں۔

ایک شاندار پرکشش تنخواہ کا پیکج!

ساتھ میں میڈیکل فری اور مہینے میں عام تعطیلات کے علاوہ دو چھٹیوں کی سہولت اور بوقت ضرورت ایڈوانس تنخواہ آدمی بھی مل سکتی تھی۔

عاصمہ جیسی ضرورت مند عورت کے لیے آئیڈیل جاب!

مگر اس کی آنکھیں! وہ سخت کشمکش میں مبتلا رہی۔ نعیم نے اس کی سی وی کی فائل عاصمہ کے آگے ذرا سی کی ... عاصمہ نے غیر ارادی طور پر فائل اپنی طرف کرنے کے لیے ہاتھ فائل پر رکھا اور اس نے یونہی پین ہاتھ سے گرایا اور اٹھاتے ہوئے عاصمہ کے ہاتھ کو بہت نرمی سے دبا کر ایک دل فریب مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔ عاصمہ کے لیے فیصلہ آسان ہو گیا۔

وہ سیٹ سے کھڑی ہو گئی۔ فائل وہ کھینچ چکی تھی۔

صاف انکار کرتے ہوئے اس نے اس شخص کی آنکھوں میں جو اضطراب اور بے چینی دیکھی، وہ متوقع تھی مگر اس سے بھی بڑھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"اگر آپ کو تنخواہ کم لگ رہی ہے تو میں اس کو ڈبل بھی کر سکتا ہوں صرف علی کی وجہ سے اور آپ جس طرح ضرورت مند ہیں، مطلب اپنے بچوں کے لیے محنت کرتے ایک آبرومندانہ زندگی کی خواہش مند ہیں تو۔"

اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

سو ایک اور شاندار آفر کرتے ہوئے بولا۔

"نعیم صاحب! یہ میری خواہش تو ہے کہ میں ایک آبرومندانہ زندگی اپنے بچوں کے ساتھ گزار سکوں لیکن ایسا ہونا آسان نہیں اور یہ زمانہ یہ تو بالکل بھی ایسا نہیں چاہتا اور ہر خواہش پوری ہو آدمی کی۔ یہ بھی ممکن نہیں!" سکون سے طنز کے تیر چلا کر بولی کہ اسے کسی بات کا خوف نہیں تھا اسے یہاں جاب نہیں کرنی تھی۔

"میں ہوں نا آپ کے ساتھ" آپ کی سب خواہشات میں پوری کروں گا وعدہ کرتا ہوں آپ سے۔ آپ بیٹھ کر بات تو کریں مجھ سے۔ بہت راستے ہیں۔" وہ سیٹ چھوڑ کر اس کے پاس آتے ہوئے بے قرار ہو گیا تھا۔

"جانتی ہوں۔ اندر آنے کے بہت سے راستے ہوں گے لیکن باہر جانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے خدا حافظ۔" وہ کہہ کر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے دروازے کھول کر باہر نکل گئی۔

وہ اسے پیچھے سے بلاتا رہ گیا۔

وہ طے کر چکی تھی کہ اسے مڑ کر نہیں دیکھنا۔

وہ واثق کو بہت واضح الفاظ میں تو نہیں مگر ڈھکے چھپے الفاظ میں سمجھا گئی کہ اسے صرف جاب نہیں چاہیے ایک عزت بھری زندگی بھی چاہیے جس میں تحفظ ہو اور سب سے بڑھ کر شرافت ہو۔

واثق کیا سمجھا کیا نہیں لیکن اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا، وہ واقعی ایک سمجھ دار بچہ تھا۔ عاصمہ نے خود پر فرض کیا اور اٹھ کر بچوں کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی۔ اگرچہ دل سخت مضطرب اور بے قرار تھا کہ ابھی کون



... گوارا نہیں آسکتا تھا۔

... وہ خالہ اپنی بہن کے پاس ایک ماہ کے لیے کوئٹہ چلی گئی تھیں۔ ہاشم کی نوکری کا کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔ وہ پریشان تھا اس لیے عاصمہ کا خود بھی جی نہیں تھا کہ وہ بھائی کو پریشان کرے مگر وہ اب کیا کرے گی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟" عدیل جیسے سنتے ہی سکتے میں آگیا۔

"میں نے سمجھایا ہے ان لوگوں کو۔ مگر۔" انسپکٹر کچھ بے بسی سے بولا۔

"ٹھیک ہے اگر وہ کورٹ میں جانا چاہتے ہیں تو یونہی سہی۔ میں یہ کیس لڑوں گا اور اپنی آخری سانسوں تک ہمت نہیں مانوں گا۔ اپنی بیٹی کو حاصل کر کے رہوں گا۔" وہ سخت غصے اور اشتعال میں آگیا۔

وہ کیا کرتا۔ مثال میں جیسے اس کی جان اٹکی تھی۔ دو دن سے وہ اس کو دیکھ نہیں پایا تھا۔

وہ بیٹی جس کو وہ اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ رات کو اپنے ساتھ ہی سلاتا تھا۔ وہ نانی کے گھر جاتی تو وہ آفس سے سیدھا اس سے ملنے پہنچ جاتا۔

اور اب پورے بائیس گھنٹوں سے وہ اسے نظر نہیں آئی تھی۔

"تم فکر نہیں کرو۔ میں نے بات کی ہے۔ سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ تمہاری سابقہ مسز تو کسی صورت بیٹی کو دینے کے لیے تیار نہیں مگر تمہاری ساس نے مجھ سے ٹائم لیا ہے کہ اس دوران۔ وہ بیٹی کو سمجھائے گی تو ایک بار پھر بات کریں گے۔"

انسپکٹر نے عدیل کا غصہ دیکھ کر قدرے نرمی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں! وہ نہیں مانے گی۔" عدیل کو بشریٰ پر اتنا شدید غصہ آرہا تھا کہ جی چاہ رہا تھا ابھی جا کر اس ضدی ہٹ دھرم عورت کا گلا دبا دے۔

"نہیں عدیل! ایسا نہیں ہے۔ میں نے تمہاری ساس کی باتوں میں کافی لچک محسوس کی ہے۔" انسپکٹر پر امید تھا۔

"کیا مطلب؟" عدیل اس کی بات پہ کچھ چونکا۔

انسپکٹر کچھ دیر خاموش رہا کہ عدیل کو اس بات کا کیا مطلب سمجھائے۔ اسے خود بھی امید کم تھی۔ مگر تھی۔

"جو بھی ہے وہ ماں ہے بشریٰ کی .... اس نے ان چار پانچ دنوں میں بہت کچھ سوچا تو ہو گا۔ اس لیے وہ کچھ ٹائم لے رہی ہے۔" وہ رک رک کر بولا۔

"یار! میں ابھی بھی نہیں سمجھا۔ کیا مطلب ہے اس بات کا۔" عدیل زچ ہو کر بولا۔

وہ تو بس جھٹ سے مثال کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔ ایک بار اسے گلے سے لگا کر خوب پیار کرنا چاہتا تھا۔

وہ بیمار تھی جب اسے عمران یہاں سے لے کر گیا تھا۔ اب وہ کیسی تھی بہتر تھی یا ویسی ہی وہ دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔

"یار دیکھو نا! ابھی تمہاری بچی بھی بہت چھوٹی ہے اور تمہاری۔ مسز سابقہ۔ ظاہر ہے اس کی ماں اسے ساری عمر گھر میں تو نہیں بٹھائے گی۔ اس کے دماغ میں بھی ان چار پانچ دنوں میں بہت کچھ چلا ہو گا۔ اس نے بیٹی کے مستقبل کے متعلق بہت کچھ سوچا ہو گا۔"

انسپکٹر طارق کی بات نے جیسے گردش کرتی کائنات روک دی۔ عدیل کا دل بھی جیسے تھم سا گیا۔

ایسی بات تو اس نے ان چار پانچ دنوں میں ایک لمحے کے لیے ایک ثا کے لیے بھی نہیں سوچی تھی۔
بشریٰ کسی اور کی... ناممکن۔
وہ عجیب سی نظروں سے انسپکٹر کو دیکھے گیا۔
"میرے دوست! یہ دنیا ہے اور یہاں زندگی گزارنے اور اسے چلتے رہنے کے لیے ان ہی سلسلوں کی ضرورت ہے اس کے بغیر یہاں سروائیو کرنا بہت مشکل ہے۔" وہ مبہم سی بات کرکے کھڑا ہوگیا۔
"انتظار کرو ان شاء اللہ بہت اچھا ہوگا جو بھی ہوگا۔" وہ اسے تسلی دے کر جانے لگا۔
"اور کتنا انتظار کرنا ہوگا مجھے۔ میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ بے قرار ہو کر بولا۔
"صرف ایک دو دن ٹھہر جاؤ ان شاء اللہ کسی نہ کسی نتیجے پر ہم پہنچ جائیں گے۔ تھوڑا سا صبر کرنا ہوگا اور ریلیکس ہو جاؤ۔ خود کو اتنا نہ تھکاؤ تمہاری بیٹی تمہیں ہی ملے گی۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت تم سے دور نہیں لے جاسکتی۔" وہ اس کا کندھا — تھپتھپا کر اسے تسلی دیتا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔
دونوں ایک ریسٹورنٹ میں ملے تھے۔ انسپکٹر طارق اجازت لے کر چلا گیا عدیل وہیں بیٹھا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے کہیں بھی نہیں جانا ہے۔
"گھر... گھر جا کر کیا کرتا۔ خالی گھر... خالی کمرے... خالی دل!"
وہ یونہی بیٹھا ارد گرد خوش گپیوں میں مصروف قہقہے لگاتے نہ تھکنے والی باتوں اور نہ رکنے والی گفتگو کرتے آتے جاتے لوگوں کو یک ٹک دیکھتا چلا جا رہا تھا۔
لوگ کیسے اتنا خوش رہ لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جڑے اور بندھے... ایسے رشتے جن کے ٹوٹنے کا خوف نہیں۔
صرف ایک ہفتہ قبل تک وہ بھی تو ان ہی لوگوں جیسا تھا ہنستا مسکراتا نہ تھکنے والی گفتگو کا حصہ بنا خوش باش خاندان کا حصہ...
ایک ضد... ذرا سی دیوانگی نے سب کچھ ختم کر ڈالا۔
اس کے ہاتھ کیا آیا... یہ سونا پن اور خالی زندگی... اور بشریٰ جب کسی اور کی ہو جائے گی۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔
اسے لگا کسی نے اس کے دل پر گھونسا مارا ہے۔ بشریٰ کسی اور کی... ناممکن۔
مگر وہ طلاق کا دھبہ ماتھے پہ سجائے تا عمر تو بیٹھی نہیں رہ سکتی۔ ابھی پانچ ماہ پہلے تو اس نے بشریٰ اور مثال کے ساتھ مل کر اس کی انتیسویں سالگرہ منائی تھی اور وہ جتنی خوش لباس نازک اندام تھی۔ کہیں سے بھی پچیس چھبیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔
"تو..." اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں امی... یہ ممکن نہیں۔ کسی بھی صورت نہیں۔ میں مر تو سکتی ہوں۔ مگر اس کے حوالے اپنی بیٹی نہیں کر سکتی۔" بشریٰ ضدی لہجے میں بچوں کی طرح زور سے سر ہلاتی کہتی چلی گئی۔
ذکیہ بے بس سی اس ضدی بیٹی کو دیکھتی چلی گئیں جس نے آج کل ماں کی ایک نہ ماننے کی قسم کھالی تھی گویا۔
"حوالے کرنے کو کون کہہ رہا ہے بشریٰ؟" ذکیہ نرمی سے بولیں۔
"کچھ بھی کہیں... یہ میرے لیے ممکن نہیں۔" وہ اسی ہٹ دھرم لہجے میں سر جھٹک کر بولی۔



"تم ابھی کچھ بھی نہیں سمجھ رہیں نہ سوچ رہی ہو۔" ذکیہ نے گہرا سانس لے کر قدرے مبہم انداز میں کہا۔
"کیا مطلب؟" ماں کے لہجے نے بشریٰ کو کچھ چونکایا۔
"کیا کروں گی اکیلی اس بچی کے ساتھ۔" وہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولیں۔ بشریٰ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔
ذکیہ کی بات بالکل بھی نہیں سمجھی تھی۔
"امی آپ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟" وہ کافی دیر تک ذکیہ کے خاموش رہنے پہ بولی۔
"مثال ابھی چھوٹی ہے اسے تمہاری اور باپ دونوں کی محبت بھی چاہیے اور توجہ بھی اور تم یہ تو مانو گی۔ مثال کو میں بہت بوجھ کر نہ کوئی پیار دے سکتا ہے نہ توجہ اور نہ..." ذکیہ بشریٰ کی تیز نظروں سے خائف ہو کر ایک دم سے چپ کر گئیں۔
"اور نہ اسے آگے کیا کہنا چاہتی ہیں آپ۔" وہ تیکھے پن سے بولی۔
"جتنے مہنگے اسکول میں وہ پڑھ رہی ہے جتنے مہنگے وہ کپڑے، جوتے، کھلونے جن سے وہ کھیلتی ہے۔ فرمائش کرتی ہے۔ وہ سب صرف عدیل جیسا باپ ہی پوری کر سکتا ہے۔" ذکیہ نے رک رک کر بشریٰ پر کچھ صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔
"امی!" بشریٰ پر تو جیسے صدمے کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا "میری مثال۔ اس کا کھانا پینا۔ پہننا اوڑھنا۔ اس کا اسکول آپ پر ابھی سے بوجھ بن گیا۔ ابھی سے۔" اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے آنسو بہتے ہی چلے گئے۔
"بشریٰ! میری بچی! میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" ذکیہ اس کے آنسوؤں سے ایک دم گھبرا کر رہ گئیں۔
"بس امی... میں سب سمجھ گئی ہوں اور صاف بات ہے۔ پہلے بھی آپ کو میرے بسنے اجڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی آپ کو صرف بیٹے سے پیار ہے۔ اسی کو بچانے کے لیے آپ نے میرا گھر اجاڑ دیا۔ آپ فکر نہیں کریں میں مثال کو لے کر چلی جاؤں گی کچھ دنوں میں یہاں سے۔" وہ آنسو صاف کرتی غصے میں بولتی اٹھ کر چلی گئی۔
ذکیہ پریشان سی بیٹھی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"امی بھائی کبھی نہیں مانے گا میں جانتی ہوں۔ اس مثال میں تو اس کی جان ہے۔" فوزیہ نے بڑے سوٹ کیس میں پڑے شادی کے لیے جمع کیے ہوئے سامان کو نکالتے ہوئے کہا۔
"ارے تو کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ کا دم چھلا ساتھ لگانے کی اور وہ بالشت بھر کی لڑکی ماں جیسی ہوشیار ہے باپ کو عمر بھر مٹھی میں رکھے گی یہاں رہے گی... باپ کے پاس تو اسے کچھ اور سوچنے نہیں دے گی۔" نسیم زہرخند لہجے میں بولیں۔
اور یہ تو ان کی منشا کے عین مطابق ہوگیا تھا کہ عمران مثال کو زبردستی لے گیا تھا ورنہ عدیل خود سے تو اسے کبھی نہیں بھیجتا۔
"مگر امی بھائی کو کیسے سمجھائیں گی؟" فوزیہ نے خود کو بہت صفائی سے اس سارے معاملے سے الگ کر لیا تھا۔
یوں بھی جب سے اس کی خالدہ سے فون پر بات ہوئی تھی وہ ایک بار ماں کے ساتھ گھر چکر بھی لگا گیا تھا۔
اگرچہ فوزیہ خالدہ کو دیکھتے ہی لمحے بھر کو بھڑکی تھی۔ ماں سے خفا بھی ہوئی تھی۔ خالدہ کا رنگ بھی پکا تھا اور عمر بھی اپنے میں اچھی خاصی لگ رہی تھی پھر سر پر بال نہ ہونے کے برابر۔
فوزیہ تو جیسے سکتے میں چلی گئی۔

ہنستے ہوئے خالد کی پوری بتیسی بھی باہر آجاتی تھی اگرچہ قدو قامت کافی حد تک معقول تھا مگر یہ تین چار خامیاں ہی اس کا دل توڑنے کے لیے کم نہ تھیں۔

"امی۔ میں۔ خالد سے ملی ہیں آپ؟ اس کی عمر اس کا پکا رنگ گنجا سر اور۔" وہ ان کے جاتے ہی روہانسی ہو کر بولی۔

اور نسیم نے فوزیہ کے ہونٹوں پہ زور سے انگلی رکھ دی تھی۔

"ایک لفظ منہ سے نہ نکالو یہ اللہ نے تیرے لیے آخری موقع بھیجا ہے سمجھ معجزہ بنا کر ورنہ طلاق کے بعد اور اتنی عمر ہو جانے کے بعد سچ فوزیہ! میں تو دل چھوڑ بیٹھی تھی کہ اب میرے جیتے جی تو کہیں تیرے ہاتھ پیلے نہیں ہونے والے اور میں اپنے سوہنے رب کے صدقے جاؤں کیسے اس نے مجھ بیوہ بے کس کی سن لی۔ اب تو نے ایک حرف منہ سے نہیں نکالنا۔ بس شکر کر اپنے رب کا۔"

نسیم کا بروقت ٹوکنا فوزیہ کو بھی بہت کچھ جتا گیا۔

ہاں۔ طلاقن بن جانے کے بعد کہاں ممکن تھا۔ اسے کوئی دوہاجو دو چار بال بچوں والا یا رنڈوا کے علاوہ کوئی رشتہ مل جاتا۔

خالد کی تو صرف عمر زیادہ تھی ذرا شکل کم تھی۔ رنگ پکا تھا بال کم تھے تو کیا ہوا۔ اس کے پاس درہم تھے۔ اچھا دل تھا اور خوب صورت احساس۔

اس کا اندازہ اسے فون پہ خالد سے بات کر کے ہوا۔

اور پھر وہ سب کچھ بھول گئی۔ صرف مہینے بھر میں ہونے والی رخصتی کے دن گننے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کل وہ تاریخ رکھنے آرہے ہیں اور ہمارے گھر میں کوئی تیاری ہی نہیں۔ دیکھو تو اس عدیل کو کچھ پتا ہی نہیں فکر نہیں کہ گھر بھی جانا ہے وہاں بھی کوئی کمبخت بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔" نسیم جوڑے الٹ پلٹ کرتے ہوئے بڑبڑانے لگیں۔

"امی! امثال کو لے آئیں گے بھائی تو اچھا ہے آپ کے پاس دو سراہٹ ہو جائے گی۔" فوزیہ نے اشارتاً اپنی رخصتی کے بعد کی بات کی۔

"خاک دو سراہٹ ہوگی اور میرا سر درد بڑھ جائے گا۔ کون اس کو کھلائے پلائے گا۔ نہلائے دھلائے گا۔ اسکول بھیجنا تیار کرنا اور اللہ جانے کیا کیا سیاپے ہیں کون کرے گا۔ میری بوڑھی بیمار جان تو یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔" نسیم کے دل کے سارے اندیشے زبان پر آگئے۔

"پھر تیرے جانے کے بعد میں کیسے یہ سب کروں گی نہ بابا! اسے رہنے دو اس کی ماں کے پاس۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔

"پھر۔ عدیل کا رشتہ کرتے ہوئے یہ لڑکی رستے میں رکاوٹ بنے گی چلو طلاق کا معاملہ بندہ کچھ بھی کہہ کر ادھر ادھر کر سکتا ہے کہ بیوی صحیح نہیں تھی مگر اس مثال کی موجودگی میں لوگ ہچکچائیں گے رشتہ کرتے ہوئے۔" نسیم دور کی کوڑی لے کر آئیں۔ فوزیہ ماں کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

"امی۔ آپ بھائی کی دوسری شادی کی بات کر رہی ہیں۔"

"ہاں تو اور کیا! کیا اسے یوں ہی بٹھائے رکھوں گی اور میں نے تو بلقیس سے کہہ بھی دیا تاکہ کوئی اچھا سا رشتہ ہاتھ میں رکھے بس آٹھ دس دنوں میں سلسلہ شروع کر دیں گے۔ وہ مزے سے بولیں تو فوزیہ ماں کو سمجھتے ہوئے بھی



...روگئی۔

"...تو کہتی ہوں تیری شادی سے پہلے اگر کہیں بات وات پکی ہو جائے۔ شادی مہینہ دو مہینہ میں ...بہت ہی اچھا ہے۔" وہ اور بھی جوش میں آگئیں۔

"...اتنی جلدی۔" فوزیہ پریشان سی ہو گئی۔

"...تو پگلی! میں اکیلی گھر کہاں چلا سکتی ہوں اب تیرے جانے کے بعد مجھے ہی تو یہ سب کچھ سوچنا ہو گا۔ اب ...رکھے میرا بچہ کوئی اکیلا تھوڑی رہے گا۔ میں تو ابھی اسے یوں اجڑا اجڑا دیکھ کر بمشکل اپنے دل کو سنبھالے ...ہوئے ہوں۔" نسیم بیٹے کی محبت میں تڑپ کر بولیں۔

"ہاں امی! بھائی کی طرف تو دیکھا نہیں جاتا۔ اتنے چپ چپ رہنے لگے ہیں کبھی کبھی تو مجھے دکھ ہوتا ہے اور ...تھوڑا پچھتاوا بھی۔ کیا تھا امی! آپ خواہ مخواہ یہ شرط نہ لگاتیں بھائی کا گھر تو بسا رہتا۔" فوزیہ کے خیالات میں بڑی ...تبدیلی آگئی تھی۔

کیونکہ اس کی اپنی قسمت جو تبدیل ہونے جا رہی تھی کبھی تو وہ اس بشریٰ کا نام سننے کی روادار نہیں تھی اور اب ...لگ رہا تھا کیا فرق پڑتا اگر وہ بیاہ کر چلی جاتی۔ بشریٰ عدیل کے ساتھ رہتی۔ ان کا گھر بنا رہتا اسے کچھ فرق تو ...نہیں پڑتا تھا۔

...وہ اب کی بات ہے۔ اب اور تب میں فرق تھا۔ جبکہ بشریٰ اور عدیل کی شادی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بھی فوزیہ ...کی وجہ سے۔

"چھوڑ رے۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ اسے عزت اور شان سے اس گھر میں بسایا جاتا۔ کمبخت سانس بھی ...ماں کی مرضی سے لیتی تھی کہاں ٹکنا تھا اس نے۔ تیرے جاتے ہی وہ عدیل کو لے کر یہاں سے چلنے کی کرتی تو ...بڑھیا کیا بگاڑ لیتی اس کا۔"

نسیم بشریٰ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی اس صورت میں بھی نہیں جبکہ ایسا ہوتا اب ممکن بھی نہیں تھا۔

"خیر چھوڑیں اس موضوع کو۔ کل کا کیا پروگرام ہے۔ آنٹی نے بتایا نہیں کتنے لوگ آئیں گے ان کے ساتھ؟" فوزیہ جلد اکتا گئی بھائی کے بور ٹاپک سے بات کا رخ اپنی طرف موڑنے کو بولی کہ آج کل اس کی دلچسپی

صرف اسی میں تھی۔
"زیادہ نہیں۔ ایک اس کی بہن' دوسری نند اور اس کا شوہر اور ایک شاید بیا ہی بیٹی اور داماد ہو گا۔ بہت نیک و دار خیال کرنے والے لوگ ہیں' دھیمے اور سلجھے ہوئے۔ فوزیہ! تیری تو سمجھو اور لاٹری نکل آئی ہے۔" نسیم بیگم بہت خوش تھیں۔
فوزیہ دل ہی دل میں خوش ہونے لگی۔
"امی! بھائی ابھی تک نہیں آئے۔" اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو تشویش سے بولی۔
"ہاں' اتنا وقت تو کبھی نہیں ہوا۔ فون ملا ذرا' اس سے بات کرتی ہوں۔ پتا نہیں شام سے اس نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔" نسیم فکر سے بولیں تو فوزیہ فون پر نمبر ملا کر کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی' پھر مایوسی سے سیل ایک طرف رکھ دیا۔
"فون نہیں اٹھا رہے۔"
"راستے میں ہو گا' خیر سے آتا ہے تو کل کا پروگرام طے کرتی ہوں اس سے کیا کیا کھانے میں ہوٹل سے آئے گا۔" نسیم اگلا پروگرام دل میں سوچے ہوئے تھیں۔

☼ ☼ ☼

"مما۔۔۔ مما۔۔۔ پپا آئے ہیں۔" مثال' بشریٰ سے بال بنوا رہی تھی رات کے پہننے والے کپڑے وہ پہن چکی تھی۔
باہر لاؤنج کی طرف ماموں کے ساتھ کھیلنے جا رہی تھی کہ کھڑکی سے لپٹے پردے سے دیکھتے ہوئے' ایک دم سرخوشی کے عالم میں بولی۔
بشریٰ ایک دم سے ساکت رہ گئی۔
اسے لگا بالکل پہلے جیسے دن ہیں وہ کچھ دنوں کے لیے ماں کے گھر آئی ہے اور اب عدیل اسے اور مثال کو لینے کے لیے آیا ہے۔"
وہ بے حس ہاتھ میں ہیئر برش لیے بیٹھی رہ گئی۔
مثال اچھلتی کودتی باہر جا چکی تھی۔
گیٹ کھلا تھا' عمران باہر کچھ لینے کے لیے گیا تھا۔ گیٹ ذرا سا کھلا تھا۔
عدیل گھر کی طرف جا رہا تھا کہ یہاں سے گیٹ کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ بے اختیار بریک لگا بیٹھا۔
گیٹ کھلا دیکھا تو گاڑی باہر ہی کھڑی کر کے وہ کچھ جھجکتے ہوئے گھر کے اندر آ گیا۔
ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اندر جائے یا نہیں کہ مثال بابا' پاپا پکارتے بھاگتی اس سے آ کر لپٹ گئی۔
اور اسے یوں لگا جیسے صحرا کے ایک لمبے سفر کے بعد اسے کسی ٹھنڈے نخلستان کے نیچے پناہ مل گئی۔
اس نے زور سے مثال کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ آنکھیں بند کیے وہ بے اختیار رونے لگا۔
مثال بھی باپ کے ساتھ زور سے لپٹی تھی۔ جب عمران ہاتھ میں شاپر لیے اندر آیا۔
اندر کے منظر نے اس کے قدم جکڑ لیے۔
اس کے خون میں ابال سا اٹھنے لگا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا تھا کہ اندر سے آتی ذکیہ نے وہیں سے صورت حال کا اندازہ کر لیا۔



"عمران! تم اندر آ جاؤ۔" وہ وہیں سے حکمیہ لہجے میں بولیں۔
عمران اور مثال نے چونک کر انہیں دیکھا۔
مدیر سپیشلسٹ نے عدیل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ خود سے مثال کو زبردستی لے کر آئے گا یا کچھ ایسا ویسا غیر قانونی حرکت کا تو یہ حرکت اس کے کیس کو اور بھی کمزور کر دے گی اور اس کی بیٹی کو اور بھی اس سے دور لے جائے گی۔ اس لیے ایسا کرنے کا تو اس کا ارادہ نہیں تھا۔
بیٹی کو سامنے دیکھ کر سینے سے لگا کر اب خود سے الگ کرنا بھی اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔
"پاپا۔۔۔ نہیں نا اندر۔۔۔ مما اندر ہیں۔ اب مما بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ ہمیں لینے کے لیے آئے ہیں نا۔" مثال اب ہاتھ کھینچتے ہوئے اندر لے جانے لگی۔
عدیل نے اپنے قدم وہیں مضبوطی سے جما لیے۔ ذکیہ اور عمران بھی مثال کی بات پر نظریں چرا کر رہ گئے۔
کھڑکی میں کھڑی بشریٰ' مثال کو باپ سے لپٹے اس کے ساتھ لگے دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی روئے جا رہی تھی۔
آج اتنے دنوں بعد اس ستم گر کو سامنے دیکھ کر کیسے اس کا دل پانی بن کر بہے جا رہا تھا۔ حالانکہ اسے عدیل پر سخت غصہ تھا۔ نفرت ہو چکی تھی اس سے۔۔۔ مگر یوں اسے سامنے دیکھ کر وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔
"پاپا آئیں نا۔۔۔ ابھی جا میں' مما کے پاس چلتے ہیں۔" وہ باپ کو بے حس و حرکت کھڑے دیکھ کر کھینچتے ہوئے بولی۔
"نہیں بیٹا میں پھر کسی دن آؤں گا۔ ابھی مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے' میں پھر آؤں گا۔" وہ ایک دم سے اس سے ہاتھ چھڑا کر بولا۔
مثال حیران سی باپ کی شکل دیکھنے لگی۔ اس نے کتنی آہستگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ جدا کیا تھا۔ اتنا اجنبی تو اسے اپنا باپ کبھی بھی نہیں لگا تھا۔
ذکیہ آگے بڑھ کر آ گئیں۔ انہوں نے مثال کو اپنے ساتھ لگا لیا۔
"چلو مثال! اندر چلو بیٹی! تمہارے پپا بعد میں آئیں گے تم سے ملنے۔" وہ نرمی سے اسے ساتھ لگا کر بولیں۔
"مگر نانو! مجھے تو پاپا کے ساتھ جانا ہے۔" وہ کمزور سے ضدی لہجے میں بولی۔ وہ چند ہی دنوں میں بہت بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔
"مثال میری جان! میں' پھر آؤں گا آپ کو لینے۔ آپ ابھی ریسٹ کرو۔ میں چلتا ہوں۔" اسے مڑ کر پیار کرتے ہوئے وہ بمشکل خود پر قابو پا کر تیزی سے ادھ کھلے گیٹ سے باہر نکل گیا۔
مثال' باپ کی طرف دیکھتے ہوئے رونے لگی۔
"پاپا۔۔۔" وہ بہت ہولے سے بولی تھی جیسے اونچی آواز میں چیخے گی تو سب اسے ڈانٹیں گے۔ وہ نانی کے ساتھ اندر جاتے ہوئے رو رہی تھی مگر اب کے دل میں باپ کو پکار رہی تھی۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

نورِ عین

"اللہ کی پاک ذات نے ہر دکھ، ہر تکلیف کا مداوا رکھا ہے، ہر بیماری اتارنے سے پہلے اس کا علاج اتارا ہے۔ اللہ رب العزت نے ہر انسان پر آنے والی تکلیف کا علاج اس کے آس پاس ہی رکھا ہوتا ہے۔

کشمیر میں پائی جانے والی ایک بوٹی جس کا نام بچھو بوٹی ہے۔ اس کی زندہ مثال ہے۔ بچھو بوٹی سے جسم چھو جائے تو جسم میں آگ سی دہک اٹھتی ہے۔ سارا جسم سلگ اٹھتا ہے۔ یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے۔ اکثر پودے بہت زہریلے اور تکلیف دینے والے ہوتے ہیں۔ اصل حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بچھو بوٹی کے آس پاس ہی شلجم کی طرح کا ایک پودا ہوتا ہے۔ جس کے پتے توڑ کر زخم خوردہ مقام پر ملے جائیں تو درد اور تکلیف کا وہ جان لیوا احساس یوں ختم ہو جاتا ہے، جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

لیکن ہم انسان بہت ناشکرے ہیں۔ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے بار بار گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہم پر اللہ کی رحمتیں برسنا بند ہو جاتی ہیں اور یہ وقت آزمائش کا نہیں بلکہ سزا کا ہوتا ہے۔ جس کا مداوا ممکن نہیں۔"

متانت سے ٹھہر ٹھہر کر بولتی پروفیسر رقیہ سیکنڈ ایر کی لڑکیوں پر سحر پھونک رہی تھیں۔ اسلامیات کے اس پیریڈ میں کلاس میں اتنی خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز آتی۔ ان کے لیکچر میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ سبق آموز ضرور ہوتا تھا۔ کچھ ایسا جو ان معصوم ذہنوں کو سیدھے راستے کی طرف لے جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بلی کے بچے! آخری وارننگ دے رہی ہوں۔ مجھے برگر لا دو، ورنہ میں عدنان بھیا کو بتا دوں گی۔" علشبہ نے اس کو دھمکی دی۔ جس پر سلمان کے میوزک کے ساتھ تھرکتے ہوئے پیر اچانک ہی ساکت ہوئے۔

"کیا مصیبت ہے۔ سکون سے ٹی وی دیکھنا بھی حرام کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔ اللہ کرے تمہارا گلا اتنا خراب ہو جائے کہ تمہاری یہ کوے جیسی آواز نکلنا بند ہو جائے۔ سچ کتنا سکون ہو گا جب تمہاری اس چیخ چیخ سے جان چھوٹ جائے گی۔" سلمان نے اس سے پیسے جھپٹتے ہوئے دہائی دی کہ عدنان بھائی کی ڈانٹ کھانا بہت تکلیف دہ عمل تھا۔

"واہ! کتنا مزے کا برگر ہے۔ اماں! چکھ کر تو دیکھیں ذرا۔ اپنے اس ٹنڈوں کے سالن کو بھول جائیں گی۔" علشبہ نے کھانا کھاتی ہوئی حمیرا بیگم سے سامنے رکھے ٹنڈوں کے سالن کو دیکھ کر ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں کھانا یہ الا بلا۔ اتنا چٹور پن اچھا نہیں بیٹا! بیٹیوں کو ایسے نخرے جچا نہیں کرتے۔ کل کو تمہیں اگلے گھر بھی جانا ہے۔ اگر تمہارے یہی چھن رہے تو میری اور اپنے بھیا کی خوب بے عزتی کرواؤ گی اپنے سسرال میں۔" حمیرا بیگم سخت لہجے میں بولیں۔



"مجھے شادی نہیں کرنی۔ میں اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ لکھ کر رکھ لیں۔ میں بھیا کو برگر کھلا کر آتی ہوں۔ بہت مزے کا ہے۔" علشبہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں کھایا جا رہا تو مجھے دے دو۔" سلمان نے برگر کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"بکواس بند کرو۔ تمہیں دینے سے بہتر ہے کہ میں سے دشت بن میں پھینک دوں۔" علشبہ نے پاؤں پٹختے ہوئے بات اڑا دی۔

"ٹھیک ہے تو پھر آئندہ میں بھی تمہیں کوئی چیز لا کر نہیں دوں گا۔" سلمان نے انگلی اٹھا کر اسے دھمکی دی۔

"ہونہہ! نہیں لا کر دوں گا۔ ایسی بات تم صرف سوچ ہی سکتے ہو۔ کر نہیں سکتے۔ بھیا کے غصے کا اندازہ تو ہے نا تمہیں۔ سو پلیز۔ ایسی باتیں مت کیا کرو جنہیں پورا کرنا تمہارے بس میں نہ ہو۔" علشبہ اس کو چڑاتے ہوئے عدنان کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"دیکھا امی! بھیا نے اسے کتنا سر چڑھایا ہوا ہے۔ اب اگر بھیا کہیں گے بھی تو میں اس کے لیے کچھ نہیں لاؤں گا۔ دیکھیے گا آپ۔" سلمان نے غصے سے اپنے ہاتھ پر مکا مارا۔

"نہیں بیٹا! ایسامت کہو۔ علشبہ ابھی بچی ہے تم دونوں نے تو اپنے باپ کا پیار کچھ نہ کچھ سمیٹ ہی لیا تھا۔ لیکن وہ معصوم تو صرف آٹھ ماہ کی تھی جب حمید صاحب اس دنیا سے چلے گئے۔ بھلا ہو عدنان کا جس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی بہن کو بھی اسی طرح سنبھالا کہ اسے باپ کے پیار کی کمی کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی۔" حمیرا بیگم نے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو دوپٹے کے پلو میں سمیٹا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھیا! یہ برگر کھا کر دیکھیں۔ کتنا مزے کا ہے۔" وہ تیزی سے کہتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ عدنان ٹی وی پر کوئی ڈراما دیکھ رہا تھا۔ علشبہ کو دیکھ کر اس نے تیزی سے ٹی وی بند کیا۔

"ارے واہ! یہ تو واقعی بہت مزے کا ہے۔" عدنان نے برگر کا لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو آپ کے لیے لے کر آئی تھی۔ ویسے بھیا! آپ وہی ڈراما دیکھ رہے تھے نا جس میں ہیروئن اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اور اس کے ابو اس کی شادی اسی کزن سے کروا دیتے ہیں۔" علشبہ نے معصومیت سے کہا۔

"علشبہ بیٹا! بہت بری بات ہے میں نے تمہیں کتنی دفعہ یہ فضول قسم کے ڈرامے دیکھنے سے منع کیا ہے یہ محبت وحبت سب بکواس ہوتی ہے۔ آئندہ میں تمہارے منہ سے ایسی کوئی بات نہ سنوں۔" عدنان کے رد عمل پر علشبہ کا کھلا ہوا چہرہ یک دم مرجھا گیا۔ آنکھوں کے کٹورے تیزی سے نمکین پانی سے بھرنے لگے۔

"دیکھو گڑیا! ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ یہ ڈرامے دیکھنے کے لیے ابھی تم امیچور ہو۔ ابھی تم صرف اور صرف اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔ یہ ڈرامے دیکھنے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔" علشبہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عدنان کے دل پر گھونسا پڑا۔ اسی لیے لہجہ نرم رکھا۔

"جی بھیا! اب نہیں دیکھوں گی۔" علشبہ کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔

"میں جو بھی کہتا ہوں تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتا ہوں۔ اچھا چلو یہ بتاؤ کہ اب کیسے مانو گی۔" عدنان نے علشبہ کو بازو کے گھیرے میں لیا۔

"مجھے آپ کی شادی میں لہنگا بنوانا ہے۔ دکان دار اس کی قیمت آٹھ ہزار بتا رہا تھا۔ امی نے اتنا مہنگا لہنگا بنوانے سے منع کر دیا۔ آپ بس مجھے وہ لہنگا لے دیں میں مان جاؤں گی۔" علشبہ نے سوں سوں کرتے ہوئے فرمائش کی۔

"ٹھیک ہے میڈم جی! آپ کا یہ کام ہو جائے گا۔ اب خوش! چلو اب جلدی سے بتاؤ کہ آج سارا دن کالج میں کیا کیا۔" عدنان نے پیار سے اس کا سر سہلایا۔ علشبہ کے پورے دن کی روداد سننا عدنان کی روز مرہ کی روٹین تھی۔

"وہی تو بتانے آئی تھی آپ نے پکڑ کر ڈانٹ دیا۔" علشبہ کا لہجہ روٹھا ہوا تھا۔

"او کے بابا سوری! اب نہیں ڈانٹوں گا بس اب شروع ہو جاؤ۔ تم مجھے بولتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہو۔" اور علشبہ مسکراتے ہوئے پروفیسر رقیہ کے لیکچر کے بارے میں بتانے لگی جس کو سن کر عدنان بھی کافی متاثر نظر آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھئی میرے لیے تو میرے بھیا ہی ہر تکلیف کا مداوا ہیں۔ جب بھی مجھے کوئی پریشانی ہوتی ہے تو وہی میری پریشانی کو ختم کرتے ہیں۔"

میڈم رقیہ کے لیکچر پر تبصرہ کرتے ہوئے علشبہ کالج کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں اپنی پانچ دوستوں کا دائرہ بنا کر بیٹھی اپنے بھیا کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھی۔

"بڑی خوش نصیب ہو تم۔ ورنہ بھائی تو بہت [illegible] اور خود غرض ہوتے ہیں۔" ثمرہ نے [illegible]

"ارے کہاں میرا بھی تو ایک بھائی ایسا ہی ہے [illegible] کے ساتھ میری کبھی نہیں بنتی۔ میری خوشی [illegible] کا باعث تو میرے عدنان بھیا ہیں۔" علشبہ نے مسکراتے ہوئے چپس کا پیکٹ کھولا۔

"بھئی بس زمانۂ قدیم ــــ کے ہیں تمہارے [illegible]۔ کل کو کہیں تمہیں کسی سے پیار ہو گیا تو پھر [illegible] شکی بھیا کا کیا ہو گا۔" سمیرا نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"نہیں سمیرا! میرے بھیا شکی نہیں ہیں۔ وہ بس میرے لیے تھوڑے پوزیسو ہیں وہ مجھے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ویسے میرے کہیں آنے جانے اور بننے سنورنے پر انہوں نے کبھی کوئی روک ٹوک نہیں کی، میں بھی کچھ بھی ایسا نہیں کروں گی جو میرے بھیا کو ناپسند ہو۔ شاعری پسند ہونا اور بات ہے لیکن عشق و عاشقی کا یہ جھوٹا کھیل کم از کم میں تو کبھی نہیں کھیلوں گی۔" علشبہ کے لہجے میں موجود قطعیت نے سب کو چپ کروا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نازک سے دلکش کام والے گولڈن لہنگے میں ملبوس علشبہ کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔ نک سک سے تیار علشبہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ حمیرا بیگم نہ جانے کتنی بار چپکے چپکے اس کی بلائیں لیں۔ عدنان کے ولیمہ کی اس پروقار دعوت میں وہ سب سے نمایاں تھی۔ بات بات پر ہنستے ہوئے وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کتنی ہی آنکھیں اس کے خواب بننے لگی تھیں۔

"عدنان بھائی! آپ ذرا باہر جائیں میں نے اپنی [illegible] تو حنا بھابھی سے ملوانا ہے۔" علشبہ نے عدنان سے [illegible] میں سرگوشی کی جسے پاس بیٹھی حنا نے بخوبی سنا تھا۔ عدنان ہنستا ہوا کمرے سے باہر گیا تو حنا کا دل اس کی فرماں برداری پر پیچ و تاب کھانے لگا۔ بظاہر ہنستے ہوئے لیکن جلتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے علشبہ کی سہیلیوں کے ساتھ وہ گھنٹہ بڑی مشکل سے گزارا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عدنان! خالہ پھپھو کا فون آیا تھا۔ معیز کے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔ علشبہ انہیں بہت بھائی ہے۔ معیز اچھا خاصا پڑھا لکھا خوب صورت لڑکا ہے۔ اتنی اچھی نوکری ہے۔ آپ امی جان سے بات کر کے انہیں ہاں کروا دیں۔ ایسے رشتے بار بار نہیں ملتے۔"

حنا نے ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں حنا! علشبہ ابھی بہت چھوٹی ہے اور رشتوں کا کیا ہے میری شادی کے بعد اس کے لیے کئی رشتے آئے ہیں۔ وقت آنے پر میں اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے کروں گا۔ ابھی اس کی شادی کے بارے میں سوچنا درست نہیں۔" عدنان کا لہجہ رسانیت لیے ہوا تھا۔

"آپ امی سے بات تو کریں معیز شادی پر موجود تھا علشبہ نے بھی اسے دیکھا ہو گا۔ آپ اس کی رائے تو لیں ہو سکتا ہے کہ وہ معیز سے شادی میں انٹرسٹڈ ہو۔" حنا نے عدنان کو کنوینس کرنے کی کوشش کی۔

"شٹ اپ حنا! بنا سوچے سمجھے بات کرنے کی عادت تو ہے تمہیں، لیکن علشبہ کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات کرنے سے پہلے ایک لاکھ مرتبہ سوچنا۔ میری بہن بہت معصوم ہے۔ وہ کسی میں انٹرسٹڈ ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کی ساری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے ہے۔" عدنان نے حنا کی بات کاٹ کر درشت لہجے میں کہا۔

"آئی ایم سوری عدنان! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کو اتنا برا لگے گا۔ مجھے پتا ہے علشبہ ایسی نہیں میرا

مطلب وہ نہیں تھا جو آپ نے سمجھا۔ پلیز ایم سوری۔" حنا ایک دم گھبرا گئی تھی۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ روؤ نہیں بس آئندہ تھوڑا خیال رکھنا علشبہ کے بارے میں کچھ بھی کہتے ہوئے۔" عدنان نے حنا کے آنسو نرمی سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ حنا کے دل میں علشبہ کے لیے نفرت کی شدید لہر ابھری تھی۔

☼ ☼ ☼

"علشبہ۔ علشبہ! کہاں ہو۔" عدنان اس کو آوازیں دیتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

"آئی بھیا!" علشبہ پانی کا گلاس لیے دوڑتی ہوئی صحن میں پہنچی۔

"ادھر بیٹھو۔" عدنان نے پانی کا گلاس سائیڈ پر رکھتے ہوئے علشبہ کو اپنے قریب بٹھایا۔ "یہ دیکھو تو ذرا میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" عدنان نے بیگ سے خوب صورت ریپر میں پیک کیا ہوا ڈبا نکالا۔

"اس میں کیا ہے۔" علشبہ پیکنگ کھولتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"واؤ۔ موبائل۔ کیا یہ میرا موبائل ہے۔" علشبہ نے جدید ماڈل کا موبائل فون ڈبے سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" عدنان کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ خوشی سے چلائی۔

"تھینک یو بھیا! اب میں اپنی فرینڈز کو اپنا پرسنل نمبر دوں گی۔" خوشی سے اس کا چہرہ انار کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"موبائل میں نے لے دیا ہے۔ اب اس کی سم لانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ کل تک موبائل چالو ہو جانا چاہیے اور ہاں کل تک کا مطلب کل تک ہی ہے۔" عدنان نے "کل تک" پر زور دیتے ہوئے سلمان کو اس کام کی اہمیت کا احساس دلایا۔

"اور ہاں علشبہ! موبائل کا غلط استعمال ہر گز نہیں کرنا۔ بالکل ویسے ہی میرا اعتماد بحال رکھنا جیسے تم رکھتی آئی ہو۔" عدنان نے پیار سے علشبہ کا سر تھپتھپایا۔

"بیٹا! ارم آئی ہے ابھی تک تم ادھر ہی ہو۔ کیا سوچے گی تمہاری سالی۔" حمیرا بیگم نے عدنان کو یاد دلایا۔

"جی امی! ادھر ہی جا رہا تھا۔ بس ذرا منہ ہاتھ دھولوں۔" عدنان واش بیسن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"دیکھا تم نے عدنان ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ بہن کے علاوہ انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ انہیں پتا بھی ہے کہ ان کے سسرال والے آئے ہیں لیکن مجال ہے کہ انہیں کسی کی پروا ہو۔ بس پروا ہے تو اس بات کی کہ کسی طرح ان کی لاڈلی کے چہرے پر مسکراہٹ آجائے۔ اس گھر میں تو میری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔" حنا کا لہجہ زہر خند تھا۔

"ویسے آپی! اگر آپ چاہیں تو آپ کی حیثیت اس گھر میں بڑی مضبوط ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیسے۔" ارم کی بات پر حنا نے اسے چونک کر دیکھا۔

"سو سمپل آپی! اگر کسی طرح میری شادی سلمان سے ہو جائے تو ہم دونوں مل کر اس گھر پر کنٹرول پا سکتی ہیں۔" حسان کا وجیہہ سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"بات تو تمہاری سولہ آنے درست ہے لیکن حسان بے روزگار ہے۔ امی نہیں مانیں گی اور سلمان کی مرضی کیا ہے۔ یہ بھی تو معلوم نہیں۔"

"امی کو میں مناؤں گی اور نوکری کا کیا ہے فرسٹ کلاس ایم بی اے ہے۔ نوکری بھی مل ہی جائے گی اور رہی بات سلمان کی۔ اپنے آپ کو اس کی مرضی کیسے بنانا ہے یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" ارم کی بے ساختہ تھی۔



☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے آج تو بڑی خوش نظر آ رہی ہو۔" حنا کو ہنستے ہوئے دیکھ کر عدنان نے استفسار کیا اور حنا جو بیڈ پر مختلف ڈائریاں پھیلائے انہیں پڑھنے میں مگن تھی چونک اٹھی۔

"ارے آپ آ گئے۔ میں آپ کے لیے پانی لے کر آتی ہوں۔" حنا نے ڈائریاں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں پانی پی کر آیا ہوں۔ علشبہ نے پلا دیا تھا۔ تم ذرا مجھے اپنے ہنسنے کی وجہ تو دکھاؤ۔" عدنان نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے ایک ڈائری اٹھائی۔

چاہا تو بہت نہ چاہیں تمہیں
چاہت پر مگر کوئی زور نہیں
دل ہی تو ہے تم پہ آ ہی گیا
دل کا اس میں کوئی قصور نہیں

پہلے ہی صفحے پر لکھے اس فضول اشعار کو پڑھ کر عدنان کا سب بے حد بد مزہ ہوا۔

"اچھے ہیں نا یہ شعر۔ مجھے ڈائری لکھنے کا بہت شوق تھا۔ شادی سے پہلے میں نے آٹھ دس ڈائریز تو لکھی ہی ہوں گی اور ان سب میں شعر و شاعری کی ایسی کولیکشن ہے کہ انسان عش عش کر اٹھے۔" عدنان کے جذبات سے بے خبر حنا اٹھلاتے ہوئے بولی۔

"اگر تم اب یہ ڈائری لکھتیں تو مجھے اچھا لگتا۔ پلیز یہ ڈائریز لاک کر کے رکھنا۔ علشبہ انہیں نہ پڑھے ویسے بھی اس کی ڈائری پڑھنا۔ اس کی ڈائری کو بھری محفل میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسی با اخلاق اور باکردار بہن عطیہ خداوندی ہے میرے لیے۔"

حنا کی کیفیت سے بے خبر وہ علشبہ کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نہیں جانتیں، مجھے کتنا ذلیل کیا ہے تمہارے بھائی صاحب نے۔ تم ہی بتاؤ ارم! کیا میں بدکردار تھی۔ کبھی کوئی بدکرداری والی حرکت کی ہے میں نے۔"

"ارے نہیں آپی! کسی سے فون پر ہیلو ہائے کرنا بدکرداری تو نہیں ہوتی۔ آج کے زمانے میں تو ہر لڑکی فون پر ٹائم پاس کرتی ہے۔ آپ کون سا کسی کے ساتھ ڈیٹ پر گئی تھیں۔" ارم نے حنا کو پارسائی کا سرٹیفکیٹ عنایت کیا۔

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ علشبہ کے کردار کے وہ چیتھڑے اڑیں کہ عدنان کبھی میرے سامنے سر نہ اٹھا سکیں۔" زہریلے لہجے میں پھنکارتی ہوئی وہ ارم سے مخاطب تھی۔

"ٹھیک ہے آپی! آپ علشبہ کو بدکردار ثابت کرنا چاہتی ہیں نا تو بس اب یہ کام میری ذمہ داری ہوا۔ دیکھیے گا عدنان بھائی کیسے علشبہ سے بددل ہو کر آپ کی طرف مائل ہوتے ہیں۔" ارم کے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے وہ تیر تھے جو علشبہ کی زندگی کو زہر آلود کرنے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ چائے آپ کے لیے۔" ارم نے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ سجاتے ہوئے سلمان کے سامنے چائے کا کپ رکھا۔ ٹی وی دیکھنے میں مگن حسان ارم کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

"ارے آپ کیوں لے آئیں۔ علشبہ کہاں ہے۔" سلمان نے حیرانی سے کہا۔

"اصل میں علشبہ، حنا آپی کے پاس بیٹھی ہے اور حمیرا آنٹی سو رہی ہیں اسی لیے میں چائے بنا کر لائی ہوں۔ ویسے آپ کو اتنی اچھی جاب ملنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ بہت خوش قسمت ہیں آپ کہ بے روزگاری کے اس دور میں آپ کو اتنی اچھی جاب مل گئی۔"

"تھینک یو۔" سلمان نے چائے کا کپ منہ سے

لگاتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو میں چائے بہت اچھی بناتی ہوں لیکن اگر آپ کو پسند نہ آئے تو بتا دیجیے گا۔ میں علشبہ سے کہوں گی کہ وہ آپ کے لیے آپ کی پسند کی چائے بنا دے۔"

"ارے نہیں۔ اصل میں آپ مہمان ہیں' اسی لیے حیرانی ہوئی۔ ورنہ چائے تو واقعی بہت مزے کی ہے۔" سلمان نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے تعریف کی۔

"واقعی اگر آپ کو چائے پسند آئی ہے تو پھر میں آپ کو اکثر چائے بنا کر پلایا کروں گی۔" ارم نے سلمان کی تعریف پر پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔

یہ ان دونوں کی پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔ ارم نے سلمان کی طرف جانے والے رستے پر پہلا قدم رکھ دیا تھا اور پھر ایسی ملاقاتیں ہر تیسرے دن ہونے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"بھئی۔ تم تو شاید مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں۔ میں نے سوچا خود ہی تم سے راہ و رسم بڑھائی جائے۔" ارم نے بے تکلفی سے علشبہ کے مقابل بیڈ پر بیٹھے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اصل میں اسٹڈیز کا بہت بوجھ ہے۔ کچھ ہی ماہ تو رہ گئے ہیں پیپرز میں۔ بس اسی لیے۔" علشبہ نے کتابیں سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔

"ویسے علشبہ! تم واقعی اتنی خوب صورت ہو کہ تمہیں دیکھ کر کوئی بھی تمہارا دیوانہ ہو جائے۔ معیز بھائی کو ہی دیکھ لو۔ تمہارے رشتے سے انکار پر انہوں نے شادی کرنے سے ہی انکار کر دیا۔" ارم نے بے تکلفی کی ہر حد پھلانگتے ہوئے کہا۔

"کیا۔ میرے لیے معیز کا رشتہ... لیکن معیز کون ہے' اس کا رشتہ کب آیا۔ میں تو کچھ نہیں جانتی۔"

علشبہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"حیرت ہے تمہیں نہیں پتا۔ ارے معیز ہماری پھپھو کے بیٹے ہیں۔ بہت ہینڈسم ہیں اور بہت اچھی جاب بھی کرتے ہیں۔ عدنان بھائی کی شادی پر تمہیں دیکھ کر مر مٹے تھے۔ رشتہ بھی بھجوایا' مگر تمہارے عدنان بھیا نے انکار کر دیا۔ میں تو سمجھی' تمہیں شاید کوئی اور پسند ہے اسی لیے انکار کروایا ہے۔" ارم بڑی باریک بینی سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔ "پسند" کے نام پر علشبہ کا حیرت زدہ انداز شدید غصے کا روپ دھار گیا۔

"بھیا نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی رشتے سے انکار کر دیا۔ مجھے حیرت تو ضرور ہوئی ہے' لیکن یہ بھیا کا حق ہے وہ میری زندگی کے فیصلے کرنے کا کلی اختیار رکھتے ہیں۔ تم ان کے انکار کو میری پسند کے ساتھ کیسے جوڑ سکتی ہو۔ میرے ہر عمل کے ساتھ میرے بھائیوں اور ماں کا اعتماد بندھا ہوا ہے۔ اور یہ اعتماد' یہ مان میں اپنی جان دے کر بھی قائم رکھوں گی۔ آئندہ میرے بارے میں ایسے اندازے لگانے سے پہلے سو بار سوچنا۔" غصے سے علشبہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"ریلیکس علشبہ! میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی اگر تم نے مائنڈ کیا ہے تو سوری یار!"

ارم کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر علشبہ ارم کی توقع کے مطابق نادم ہوئی اور ارم نے حالات نارمل ہونے پر دل ہی دل میں شکر کیا۔

"واؤ! تمہارا موبائل تو بہت پیارا ہے۔ مجھے اپنا نمبر نہیں دو گی۔" ارم نے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ موبائل مجھے عدنان بھیا نے تھوڑے دن پہلے ہی خرید کر دیا ہے۔ میں تمہیں مس بیل دیتی ہوں تم میرا نمبر محفوظ کر لو۔" علشبہ نے ارم سے پوچھ کر نمبر ملاتے ہوئے کہا جو شکار کے جال میں پھنس جانے پر خوش ہو رہی تھی۔



☼ ☼ ☼

"علشبہ! تمہاری آنکھیں اتنی لال کیوں ہو رہی ہیں۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" سمیرا نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں بس وہ رات کو نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے۔" علشبہ نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ویسے بھی رات کو گرمی کافی زیادہ تھی۔ میری تو بجلی بھی نہیں تو ٹوٹتی رہی۔"

"نہیں سمیرا! اصل میں میں رات بھر پریشانی کی وجہ سے سو نہیں پائی۔ دو تین دن سے کوئی میرے موبائل پر مسلسل گھٹیا قسم کے عاشقانہ میسج بھیج رہا ہے۔" علشبہ نے اپنی پریشانی کی وجہ کھول ہی دی کہ اب اکیلے اس پریشانی کو برداشت کرنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے۔ کس نمبر سے میسجز آ رہے ہیں۔ تمہیں کچھ تو اندازہ ہو گا۔" سمیرا نے پوچھا۔

"نامعلوم نمبر ہے۔ تمہیں تو پتا ہے کہ میرا نمبر صرف میرے مخصوص فرینڈز کے پاس ہے۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوں کہ اگر عدنان بھائی کو پتا چلا تو کیا ہو گا۔" علشبہ کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

"میری بات مانو تو عدنان بھائی کو خود ہی سب کچھ بتا دو۔" سمیرا نے مخلصانہ مشورہ دیا۔ "وہ ہی تمہارے اس مسئلہ کو حل کریں گے۔ ویسے بھی اس سے پہلے کہ انہیں کہیں اور سے پتا چلے اگر تم خود انہیں بتاؤ گی تو تم پر ان کا اعتماد بحال رہے گا۔" سمیرا کی دلیل نے اسے متاثر کیا تھا۔

"بھیا! میں اندر آ جاؤں؟" علشبہ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"آ جاؤ بھئی!" عدنان بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے نائٹ کریم کا مساج کرتی ہوئی ثمینہ نے مڑ کر ایک نظر علشبہ کو دیکھا۔

"وہ دراصل بھیا! آپ سے ایک بات کرنی تھی ضروری۔" نم آنکھوں کے ساتھ اٹک اٹک کر بات کرتی ہوئی وہ عدنان کو پریشان کر گئی۔

"ہاں ہاں علشبہ! بولو۔ اتنی پریشان کیوں ہو۔ کیا مسئلہ ہے' بتاؤ شاباش۔" عدنان نے جلدی سے سیدھے ہوتے ہوئے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیا۔

"بھیا! آپ یہ موبائل لے لیں۔ مجھے نہیں چاہیے۔" علشبہ نے موبائل عدنان کی طرف بڑھایا۔

"تمہیں تو موبائل کا اتنا شوق تھا' پھر یہ واپسی کیسی؟" عدنان کی آنکھوں میں الجھن کے رنگ بڑے واضح تھے۔

"بھیا! اصل میں کوئی تین دن سے مجھے تنگ کر رہا ہے۔ میسج پہ میسج بھیجے جا رہا ہے۔ پہلے میں نے سوچا کہ رانگ نمبر ہے جب رسپانس نہیں ملے گا تو خود ہی چپ ہو جائے گا۔ لیکن وہ تو... میں پریشان ہو گئی ہوں بھیا!"

"بس اتنی سی بات۔" عدنان نے اس کے یخ ٹھنڈے ہاتھوں کو سہلایا۔

"لاؤ اپنا موبائل مجھے دو۔" عدنان نے اس نمبر پر تین چار بار کال کی' لیکن مقابل نے ایک دفعہ فون پر عدنان کی آواز سنتے ہی فون آف کر دیا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔ تم ایک دو دن کے لیے مجھے دے دو موبائل۔ میں دیکھتا ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں۔" عدنان نے علشبہ کو ساتھ لگاتے ہوئے اس کا ماتھا چوما۔

"اور آئندہ ایسی فضول باتوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اچھا! اب جا کر آرام سے سو جاؤ۔"

علشبہ کے جانے کے بعد عدنان کافی دیر تک اس نمبر پر کال کرتا رہا مگر دوسری طرف سے یا تو کال کاٹ دی جاتی یا بجتی رہتی۔ عدنان کو تپ چڑھنے لگی تھی۔ ثمینہ مسلسل اسے شیشے میں دیکھ رہی تھی۔

"اب بس بھی کریں عدنان! کوئی رانگ نمبر ہو گا۔

آپ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ بلاک کر دیں نمبر۔ بس۔ اتنی سی بات پر اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" حنا ناراض ہو کر بولی۔ اور اس کی حالت کے پیش نظر عدنان نے لائٹ بند کر کے کروٹ بدل لی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا یہ پلان تو فیل ہو گیا۔ عدنان تو علشبہ کی معصومیت کے اور بھی قائل ہو گئے دل تو چاہتا ہے کہ علشبہ کو کچا چبا جاؤں۔ وہ عدنان کی توجہ اپنے اوپر سے ہٹنے ہی نہیں دیتی۔ اچھا یہ بتاؤ تم نے سم تو پھینک دی ہے نا کہیں ہم پکڑے ہی نہ جائیں۔" حنا نے دہل کر پوچھا۔

"جی آپی! عدنان بھائی کی آواز سن کر تو میرا سر ہی چکرا گیا تھا۔ میں نے اسی وقت سم توڑ کر پھینک دی تھی۔"

"اچھا آپی! آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر عدنان بھائی علشبہ کے موبائل کے سینٹ آئٹم میں کوئی عاشقانہ میسج پڑھ لیں تو کیا تب بھی وہ علشبہ پر اپنا اعتماد قائم رکھ پائیں گے؟"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ لیکن علشبہ کسی کو ایسا میسج کیوں بھیجے گی۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔ اتنے عرصے میں تمہیں اتنا بھی اندازہ نہیں ہوا۔" حنا کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"اگر کوئی اور چپکے سے اس کے موبائل سے ایسا میسج کر دے پھر تو وہ گناہ گار ٹھہرائی جا سکتی ہے نا۔" ارم کے لہجے سے عیاری ٹپک رہی تھی۔

"لیکن یہ کام کرے گا کون میں تو نہیں کر سکتی۔ اگر عدنان کو پتا چل گیا تو۔ نہیں بابا نہیں میں ایسا رسک نہیں لے سکتی۔"

"یہ کام کوئی ذہین اور قابل بندہ ہی کر سکتا ہے تو پھر بھلا میرے سوا ایسا کون ہے؟" ارم کا لہجہ تفاخر لیے ہوئے تھا۔

"تم۔ لیکن ارم! اگر سلمان کو پتا چل گیا تو کیا ہو گا۔ ابھی تو تمہارا رشتہ بھی طے نہیں ہوا۔"

"آپی! آپ سلمان کی فکر نہ کریں وہ مکمل طور پر میرے کنٹرول میں ہے۔ ویسے آپ پریشان مت ہوں سلمان کو بالکل پتا نہیں چلے گا۔" ارم نے حنا کی گہری چپ کو بھانپتے ہوئے تسلی دی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بتاؤں علشبہ! آج کل بازار میں لان کے اتنے خوب صورت پرنٹس آئے ہیں کہ بس۔ دل تو چاہتا ہے کہ پوری کی پوری دکان ہی گھر لے آؤں۔" اور کپڑوں کی دیوانی علشبہ سچ مچ حسرت زدہ ہو گئی۔

"تم بہت لکی ہو ارم! مہینے میں کتنی بار بازار کے چکر لگا لیتی ہو اور ایک میں ہوں۔ تین تین مہینے گزر جاتے ہیں مجھے بازار کی شکل دیکھے ہوئے۔ آج کل کون سا فیشن چل رہا ہے اس بات کا پتا مجھے فیشن کے جانے کے بعد ہی پتا چلتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں علشبہ! اب میں تمہیں لیٹسٹ فیشن کے بارے میں اپ ڈیٹ کرتی رہوں گی۔ آخر کو تم میری بیسٹ فرینڈ ہو۔" علشبہ کے چہرے پر ممنونیت کے گہرے رنگ دیکھ کر ارم نے نرمی سے کہا۔

"ویسے علشبہ! فیشن کے بارے میں نت نئی اپ ڈیٹس تو موبائل پر بھی مل جاتی ہیں۔"

"اچھا۔ لیکن وہ کیسے۔ مجھے بھی بتاؤ۔" علشبہ بے حد ایکسائٹڈ ہوئی۔

"ہاں ہاں دکھاتی ہوں۔" ارم نے علشبہ کا اسٹائلش سا موبائل پکڑتے ہوئے کہا۔

"علشبہ۔" ارم نے موبائل کی مختلف کیز دباتے ہوئے علشبہ کو مخاطب کیا۔ "تم نے موبائل میں بیلنس تو ڈلوایا ہے نا۔" ارم ہنوز مصروف تھی۔

"بیلنس۔ ہاں۔ وہ۔"

"علشبہ بیٹا!" حمیرا بیگم ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئیں تو علشبہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ان کی طرف لپکی۔

"کیا ہوا امی۔!" حمیرا بیگم کو کندھوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے علشبہ نے گھبرائے ہوئے انداز میں [illegible]

"پتا نہیں کیا چکر سے آ رہے ہیں۔ دل بھی گھبرا رہا ہے۔" حمیرا بیگم کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"امی کو ابھی اسپتال لے کر جانا ہو گا۔ کیا کروں عدنان بھائی اور سلمان دونوں گھر پر نہیں ہیں۔" حمیرا بیگم کی بگڑتی ہوئی حالت نے علشبہ کے حواس معطل کر دیے۔

"بھابھی۔ بھابھی۔!" کوئی چارہ نہ پا کر علشبہ نے زور زور سے حنا کو پکارا۔

"علشبہ! گھبراؤ نہیں۔ تم ایسا کرو آنٹی کو لے کر خود ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ۔" ارم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا علشبہ کا موبائل نامحسوس انداز میں بیڈ پر پڑے صوفے کے پیچھے چھپایا۔

"کیا بات ہے علشبہ!" حنا نے تیزی سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

"بھابھی! امی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ عدنان بھائی اور سلمان کو اطلاع ملنے پر بھی نا جانے کتنی دیر میں گھر پہنچیں۔ آپ میرے اور امی کے ساتھ ڈاکٹر ذیشان کے کلینک چلیں عدنان بھائی کو وہیں سے اطلاع کر دیں گے۔" علشبہ نے جلدی سے حنا کو سمجھانا چاہا۔

"میری تو خود طبیعت بہت خراب ہے علشبہ! صبح سے جی متلائے جا رہا ہے۔ تم ایسا کرو امی کو لے جاؤ میں عدنان کو فون کرتی ہوں وہ جلد ہی کلینک پہنچ جائیں گے۔"

"میں کنوینس کا انتظام کرنے کی کوشش کرتی ہوں تم آنٹی کو چادر اوڑھاؤ۔" ارم نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"ایک سکیوزمی بھائی! ذرا بات سنئے۔" ارم نے گلی میں کھڑے تیرہ چودہ سال کے بچے کو مخاطب کر کے جلدی سے ٹیکسی منگوائی اور پریشان سی علشبہ اور ارم نے نڈھال سی حمیرا بیگم کو بڑی مشکل سے ٹیکسی میں بٹھایا۔ اسی لڑکے کو سو روپے اور ایک پرچی دیتے ہوئے ارم نے کہا "اس نمبر پر پچاس روپے کا ایزی لوڈ کرا دو اور باقی پیسے تم رکھ لو۔"

"تو بھلا علشبہ تو اپنا موبائل یہیں بھول گئی۔ اب میں اس سے کیسے کانٹیکٹ کروں گی۔" ارم کے ہاتھ میں علشبہ کا موبائل دیکھ کر حنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"ارے آپی! یہ موبائل تو میں نے خود ہی چھپا لیا تھا۔" ارم نے ہنستے ہوئے موبائل ہوا میں اچھال کر کیچ کیا۔ حنا حیران ہو گئی۔

"بھول گئیں؟ علشبہ کے موبائل سے کچھ میسجز کرنے ہیں۔" ارم نے یاد دلایا اور اگلے تیس منٹ میں ارم نے پھرتی سے چند انتہائی گھٹیا میسجز علشبہ کے موبائل سے اپنے پاس موجود خفیہ سم پر "عدیل" کے نام پر بھیج دیے اور پھر اسی خفیہ سم سے جوابا" ویسے ہی میسجز علشبہ کے نمبر پر بھی سینڈ کر دیے۔ ان تمام میسجز کے اختتام پر "تمہارا عدیل" بڑا واضح لکھا ہوا تھا۔

"یہ موبائل اپنے کمرے میں رکھ لیجیے گا۔ ویسے آپی! ابھی تک بیلنس وصول ہونے کا کوئی میسج ہی نہیں آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی بیلنس لوڈ ہونے کے باوجود میسج نہیں آتا۔ تم بیلنس چیک کر لو۔" حنا نے لاپروائی سے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ میسجز تو چلے ہی گئے۔ ویسے آپی! عدیل کیسا نام ہے۔" ارم نے ہنستے ہوئے موبائل حنا کو پکڑایا اور پھر اگلی پلاننگ بڑے سکون سے کی گئی۔

"حنا۔ حنا۔!" عدنان نے حمیرا بیگم کو کندھوں سے تھام کر تخت پر بٹھایا اور پھر تقریبا" چیختے ہوئے حنا کو آواز دی لیکن حنا کے بجائے ارم کمرے سے باہر نکلی تھی۔

"آپ آ گئے عدنان بھائی اور آنٹی! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔" ارم نے حمیرا بیگم سے دریافت کیا جواب بہتر لگ رہی تھیں۔

"ہاں بیٹا! اب تو ٹھیک ہوں۔ بس گرمی کی وجہ سے ڈی ہائیڈریشن ہو گئی تھی۔ ڈرپ لگوائی تو طبیعت

ٹھیک ہوگئی۔ میری بچی پریشان ہوگئی۔"

حمیرا بیگم نے علشبہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا جس کی سوجی ہوئی آنکھیں اس کے مسلسل رونے کا پتا دے رہی تھیں۔

"پرنسس حنا کہاں ہیں جنہیں اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ ساس کی بیماری میں ساتھ چلی جائیں اب امی کے آنے پر بھی کمرے سے باہر نہیں نکلیں بلا ڈالے ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں کیا اس کی۔" عدنان کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"بھائی! دراصل حنا آپی تھوڑی دیر پہلے ہی سوئی ہیں، سارا دن وہ الٹیاں ہی کرتی رہیں۔ وہ تو ساری دوپہر پریشان رہی ہیں کہ آنٹی کی طبیعت اتنی خراب ہونے کے باوجود وہ ان کے ساتھ نہیں جاسکیں۔ آپ کہتے ہیں تو میں ان کو جگا دیتی ہوں۔" ارم نے جلدی سے بات کو سنبھالا۔

"ارے بیٹا نہیں، بہو کو سونے دو۔ عدنان تو ایسے ہی پریشان ہو رہا ہے جاؤ عدنان بہو کے پاس اور خبردار! جو اسے کچھ کہا۔" حنا کی طبیعت کی خرابی کا سن کر عدنان کا غصہ بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"یہ میڈیسنز لے آنا اور ہاں جوس کے پیکٹ بھی۔ ڈاکٹر نے امی کو زیادہ سے زیادہ لیکویڈ دینے کے لیے کہا ہے۔ میں ذرا حنا کو دیکھ لوں۔" عدنان نے دواؤں والا پرچہ سلمان کی طرف بڑھایا۔

"چکن بھی لے آیئے گا۔ آپی کو یخنی بنا کر دینی ہے۔" ارم نے ایک ادا سے سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سلمان کو کیسے پتا چلا۔" ارم نے سلمان کے جانے کے بعد علشبہ سے دریافت کیا۔

"ہمارے کلینک پہنچنے سے پہلے ہی یہ وہاں پر موجود تھا۔ نہ جانے اسے کیسے پتا چلا۔ سارا دن بھاگ دوڑ میں ہمیں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب آئے گا تو پوچھوں گی۔" علشبہ نے حمیرا بیگم کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ آگئے۔ اب امی کی طبیعت کیسی ہے

مجھے بھی ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا لیکن میری طبیعت اتنی بگڑ گئی کہ میں چاہتے ہوئے بھی جا نہ پائی۔" حنا نے بیڈ پر نیم دراز ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی اس کو جاتے ہوئے دیکھ کر اپنا دکھتا ہوا عدنان تیزی سے اٹھا۔

"آرام سے۔" عدنان نے حنا کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھنے میں اس کی مدد کی۔ "امی کی طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے۔ بس پانی کی کمی کی وجہ سے طبیعت بگڑ گئی تھی۔ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے ہمیں گھر آئے ہوئے تم سو رہی تھیں اس لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ لو جوس پیو۔ فریش محسوس کرو گی۔" عدنان نے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"میں جوس پی لوں پھر آپ مجھے امی جی کے پاس لے جائیں اور ہاں علشبہ افراتفری میں اپنا موبائل ہمارے کمرے میں ہی بھول گئی تھی۔ ساری دوپہر وقفے وقفے سے فون پر بیپ ہوتی رہی۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں اٹھ کر فون دیکھ سکتی آپ دیکھیے کہیں سلمان کا فون نہ ہو وہ گھر پر نہیں تھا۔ اسے دے دیجیے گا۔ مجھے ارم سے کہنے کا خیال ہی نہیں رہا کہ وہ سلمان کو اطلاع کردے۔ ویسے بھی ارم آج سارا دن کچن میں ہی بزی رہی۔"

"سلمان پہنچ گیا تھا۔ میں موبائل علشبہ کو دے دیتا ہوں۔" عدنان نے موبائل اٹھاتے ہوئے کہا جس میں میسج باکس کھلا ہوا تھا اور پھر ایک کے بعد ایک میسج پڑھتے ہوئے عدنان کے چہرے کے زاویے بگڑنے لگے۔

"کیا ہوا عدنان!" حنا نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ عدنان اس کی بات ان سنی کر کے تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھا۔

"علشبہ۔ علشبہ!" بلند آواز میں دھاڑتا ہوا عدنان صحن میں پہنچا تو علشبہ جو حمیرا بیگم کے پاس بیٹھی رہی تھی گھبرا کر یکدم کھڑی ہوگئی۔

"کیا ہوا بھائی!" عدنان کے خطرناک تیور دیکھ

کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"بے شرم بے غیرت! کب سے کھیل رہی ہو یہ دوستی کا کھیل۔ کون ہے یہ عدیل جس کو تم میسج کرتی ہو۔" چٹاخ کی تیز آواز سے عدنان کا ہاتھ علشبہ کے گال سے ٹکرایا۔ عدنان کے آگ کی طرح جلتے ہوئے الفاظ نے اس کے کانوں کو سیسے کے گال کی طرح دہکا ڈالا تھا۔

"ہوش میں ہو؟ عدنان! کیسی باتیں کر رہے ہو۔ اپنی بہن پر بنا بات کے ایسا الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں۔" حمیرا بیگم نے زرد پڑتی علشبہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"بات ہے امی! بات ہے۔ یہ دیکھیں اس کا موبائل۔ کتنے گھٹیا میسجز سے بھرا ہوا ہے۔"

"شاید آپ کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ڈیلیٹ کرنا بھول گئی۔ کتنا نازاں تھا میں تمہارے کردار پر اور تم نے مجھے کتنا ارزاں کردیا۔" علشبہ کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سرد لہجے میں بولا۔

"علشبہ! کیا عدنان سچ کہہ رہا ہے۔" حمیرا بیگم کی کمزور سی آواز ان کی بے یقینی کا ثبوت بن کر ابھری اور وہ بے دم سی تخت پر آہستگی سے بیٹھ گئیں اور علشبہ وہ تو جیسے اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ دائیں گال پر ہاتھ رکھے وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے عدنان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صرف ایک احساس شدت سے اس پر طاری ہوا تھا اپنے دل کے کسی پاتال میں گرنے کا احساس۔

"ارے بھئی! میرے عدنان بھیا ہی میرے ہر درد کا مرہم ہیں۔"

"مجھے اپنی بہن پر مکمل اعتماد ہے۔"

"میری ہر تکلیف کا مداوا اللہ تعالیٰ نے عدنان بھیا کی صورت میں کردیا ہے۔"

مختلف اوقات میں کی گئی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

اذیت کی شدید لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا۔ شاید دست پھوجانے کی اذیت بھی اتنی ہی ہوتی مگر

یہاں کوئی شلجم کا پودا نہیں ہے علشبہ کے پیٹ میں پڑتی گرہیں اس کی زبان کو بھی گرہ لگا گئیں تب ہی وہ اپنی صفائی میں کچھ بول ہی نہیں پائی۔

"کیا ہوا۔ امی آپ ٹھیک تو ہیں۔" سامان سے لدا پھندا سلمان سر جھکا کر بیٹھی ہوئی گم صم سی حمیرا بیگم کے قریب آیا۔ "کیا بات ہے علشبہ!" علشبہ کے لٹھے کی طرح سفید چہرے کو دیکھ کر وہ حقیقتاً شدید پریشان ہوا۔

"یہ کیا بتائے گی میں بتاتی ہوں۔ ذلیل کردیا ہے اس نے ہم سب کو۔ اس کی وجہ سے تم دونوں بھائی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔" حنا کی شعلے برساتی زبان سلمان کو پورا ماجرا سنانے کے بعد ہی بند ہوئی تھی۔

"آج سے اس کا کالج جانا بند۔ امی! آپ جلدی کسی بھی بری بھلی جگہ اس کی شادی کردیں اور ہاں شادی کے بعد اپنے ناپاک قدم اس گھر میں نہ رکھنا۔" عدنان درشتی سے بولا۔

"اتنا پیار کرنے والے بھائی کا مان بھی سلامت نہ رکھ سکی یہ بے حیا۔ میں تو اپنی بھولی سی ارم کو اس کی معصومیت کی مثالیں دیا کرتی تھی، مگر مجھے کیا پتا تھا کہ اس معصوم شکل کے پیچھے اتنا کریہہ چہرہ ہے۔"

"شاید میں سمجھ گیا ہوں کہ سچ کیا ہے۔" گہری سوچ میں گم سلمان اچانک بولا تھا اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نے وہاں موجود سب ہی نفوس کو حیرت زدہ کردیا۔

"ہاں بھابی! میری بہن آج بھی اتنی ہی پاکیزہ ہے جتنی آج سے پہلے تھی ـــــ ہاں آپ کی ایک بات تو مجھے ماننی پڑے گی کہ آپ کی بہن واقعی بہت معصوم اور بھولی ہے۔" مضبوط قدم اٹھاتا ہوا وہ حنا کے ساتھ کھڑی ارم کے مقابل آکھڑا ہوا۔ "بہت بھولی ہو تم بہت بھولی۔ یہ لو سو روپے اور یہ رہی چٹ۔ اس نمبر پر بیلنس لوڈ نہیں ہوسکا دراصل یہ نمبر پوسٹ پیڈ (بعد میں ادائیگی) تھا۔ شاید تم یہ نہیں جانتی تھیں۔ بیلنس لوڈ ہونے کی تصدیق کرنا بھی تم نے ضروری

نہیں سمجھا۔"

سلمان نے جیب سے دونوں چیزیں نکال کر ارم کے ہاتھ میں تھمائیں۔ ارم کا دل شدت سے اچھل کر سکڑا۔

"خوب کھیل کھیلا تم دونوں نے میری معصوم بہن کے ساتھ۔ تم جیسی عورتوں کو تو بیچ چوراہے میں پھانسی دے دینی چاہیے۔ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے' لیکن تم نے ثابت کردیا کہ تم ڈائن سے بھی بدتر ہو اور تمہاری یہ بدکردار اور رنگین مزاج بہن بہت بھولی ہے۔ واہ بھئی واہ! شاباش!" سلمان نے زوردار تالی بجائی۔ "کیا کیا جتن نہیں کیے اس نے مجھے پھنسانے کے۔ شاید میں اس کی رنگین اداؤں کا شکار ہو بھی جاتا اگر آج اس کا اصلی روپ میرے سامنے نہ آتا۔"

سلمان بدلحاظی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔

"شٹ اپ سلمان! یہ کیا بکواس کررہے ہو اس سارے معاملے میں حنا اور ارم کا کیا قصور۔ علشبہ قصوروار ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو خود ہی اس کا موبائل دیکھ لو۔" عدنان نے موبائل سلمان کی طرف بڑھایا۔ "سارے ثبوت اس کے خلاف ہیں۔"

"ثبوت۔ بھائی! علشبہ کی پچھلی زندگی اس کی بے گناہی کے ثبوت کے لیے کافی ہے' لیکن پھر بھی میں آپ کو آپ کی بیگم اور سالی کا اصل چہرہ ضرور دکھاؤں گا۔ ارم حیران تو ہوگی کہ اس لڑکے کو دی گئی چٹ اور پیسے میرے پاس کیسے آئے۔ بھائی! ارم نے اقبال بھائی کے بیٹے معید سے ہی ٹیکسی منگوائی اور پھر اسے علشبہ کے نمبر پر پچاس روپے کا ایزی لوڈ کروانے کے لیے پیسے دیے۔ ساتھ ہی ساتھ معید کو پچاس روپے رشوت بھی دی گئی جس وقت معید اسٹور پر آیا میں اپنے کسی دوست کا انتظار کررہا تھا۔ معید تین بج کر پچیس منٹ پر اسٹور پر پہنچا تھا۔ بھائی ذرا علشبہ کا موبائل دیجیے گا۔" حنان نے حیران پریشان عدنان کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔

"یہ دیکھیں بھائی سارے میسجز ساڑھے تین سے چار بجے کے دوران کیے اور وصول کیے گئے اور اس وقت تو علشبہ کلینک میں موجود تھی نا۔ میرے قریب کھڑا معید دکان دار سے بحث کررہا تھا کہ اسے چٹ پر موجود نمبر پر فوری طور پر ایزی لوڈ کروانا ہے مگر آج اسٹور پر ایزی لوڈ دستیاب نہیں تھا۔ چٹ پر موجود نمبر پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا' وہ نمبر علشبہ کا تھا۔ علشبہ کا موبائل کنکشن پوسٹ پیڈ ہے اور یہ بات جانتی ہے۔ سو یہ بات تو طے ہوئی کہ یہ ایزی لوڈ علشبہ نے نہیں کروایا۔ میں نے اسی وقت معید سے ایزی لوڈ کروانے والے کے بارے میں معلومات حاصل کیں اس نے جو حلیہ بتایا وہ سراسر ارم کا تھا۔ ماتھے پر بڑا سا تل کا نشان۔ ارم کے سوا کسی اور کا نشان تو نہیں ہوسکتا نا اور جب معید سے امی کی بیماری کا پتا چلا تو میں سب کچھ بھول کر اسپتال چلا گیا۔

اگر ارم جانتی کہ موبائل پوسٹ پیڈ ہے اور اس میں بیلنس ختم ہونے کا کوئی ڈر ہی نہیں تو شاید وہ ایزی لوڈ نہ کروائی اور ان دونوں کی سازش کامیاب ہوجاتی۔ ویسے سمجھ تو مجھے اب بھی نہیں آیا کہ ان دونوں نے یہ سب کچھ کیوں کیا' لیکن کڑی سے کڑی ملانے سے یہ بات تو ثابت ہے کہ علشبہ کے موبائل سے بھیجے۔ میسج کم از کم علشبہ نے نہیں کیے۔ یہ ان دونوں کی ملی بھگت ہے۔ آپ خود سوچیں بھائی! جب علشبہ کا موبائل گھر پر تھا تو اس نے میسج کیسے کیے اور غور طلب بات تو یہ ہے کہ موبائل آپ کے کمرے میں کیسے پہنچا۔ یہ موبائل خاص طور پر آپ کے کمرے میں رکھا گیا تاکہ یہ تماشا کری ایٹ ہوسکے اور یہ سارا کام بھابھی کی مدد کے بغیر پایہ تکمیل تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ کوئی کرے نہ کرے مجھے اپنی بہن کے کردار کی مضبوطی پر مکمل یقین ہے۔"

سلمان کے الفاظ سلگتی ہوئی علشبہ کے زخموں پر مرہم لگا رہے تھے۔ سلگتی ہوئی آگ پر یک دم کسی نے پانی انڈیل دیا۔

یہ سزا نہیں آزمائش تھی جس کو اللہ نے خوش اسلوبی سے... اس بات کا احساس علشبہ کے دل کو پاتال کی گہرائیوں سے ابھار لایا۔



"اللہ تیرا شکر ہے تو نے میری بیٹی کے دامن کو داغدار ہونے سے بچالیا۔" حمیرا بیگم کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔

"کیوں کیا تم نے ایسا۔" عدنان نے سفید چہرہ لیے سہمی ہوئی حنا کے بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے کہا۔ "اپنا سامان اٹھاؤ اور اپنی بہن سمیت یہاں سے دفع ہوجاؤ۔ تمہیں طلاق کے کاغذات ایک دو دن تک مل جائیں گے۔" عدنان نے اس کے بالوں کو زور سے جھٹکا دیا تو وہ اس کے قدموں میں جاگری۔

"مجھے معاف کردیں عدنان! حاسد تھی میں۔ علشبہ سے حسد کرتی تھی میں۔ آپ کا علشبہ سے لگاؤ برداشت ہی نہیں کرپائی اسی لیے یہ گناہ کر بیٹھی پلیز مجھے معاف کردیں۔"

"پلیز علشبہ! مجھے معاف کردو۔ اپنے بھیا سے کہو مجھے طلاق نہ دیں' میں مرجاؤں گی۔ امی! آپ سمجھائیے نا انہیں' مجھے معاف کردیں۔" علشبہ اور حمیرا بیگم کے پاؤں پڑتی ان کے آگے ہاتھ جوڑتی حنا یقیناً ہوش میں نہیں تھی۔

"بھائی! بھابھی اپنی غلطی مان چکی ہیں آپ انہیں معاف کردیں۔"

"ہاں بیٹا! بہو کو ایک موقع اور دے دو یہ میرا حکم ہے۔" حمیرا بیگم نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے امی۔" عدنان کا آگ برساتا لہجہ اچانک ٹھنڈا پڑا۔ "دیکھ لو جس علشبہ کی زندگی کو جہنم بنانا تمہارا اولین مقصد تھا اسے دیکھو! میں تو علشبہ کے ذریعے جنت پانا چاہتا تھا' لیکن تم نے میری راہ کھوٹی کردی' ساری زندگی اکٹھے گزارنے کے باوجود ایک بات تو طے ہے کہ آج کے بعد میں شاید ساری زندگی تمہاری عزت نہ کرپاؤں۔" عدنان نے حنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں آج کے بعد تمہارے لیے اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہیں۔ آئندہ یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" گم صم سی ارم کی طرف مڑتے ہوئے عدنان کا لہجہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

حنا اور ارم کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے سست قدم شکست کی علامت تھے کہ دونوں کے مستقبل کی خوشحالی بے صبری' ناشکری اور حسد کی آگ میں جل گئی تھی۔

"تھینک یو سلمان!" علشبہ سلمان کے گلے سے لگی آنسو بہا رہی تھی۔

"مجھے معاف کردینا علشبہ! میرا یقین بہت کچا نکلا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میری بہن کو ڈسنے والا میری ہی آستین کا سانپ ہوگا۔" علشبہ کے سامنے ہاتھ جوڑے عدنان کے آنسو اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔

"نہیں بھائی! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ پلیز رلائیں نہیں۔ میں آپ کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔" عدنان کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو عقیدت سے چومتے ہوئے کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں میں بھی جگمگائے۔ عدنان نے تڑپ کر اسے گلے سے لگایا۔ "درد تو نہیں ہورہا۔" علشبہ کے چہرے پر اپنی انگلیوں کے نشان پر عدنان نے نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"اب نہیں ہورہا۔" علشبہ کی آنسو ملی مسکراہٹ بڑی خالص تھی کہ مندمل ہونے کے بعد زخم کبھی تکلیف کا باعث نہیں بنتا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"اللہ نے میری اذیت کو سلمان کے ذریعے ختم کیا اور میں جو عدنان بھائی کو ہی اپنی ہر تکلیف کا مداوا سمجھتی رہی' یہ کیوں بھول بیٹھی تھی کہ تکلیف کا مداوا کرنے کی طاقت تو اللہ کے سوا کسی میں بھی نہیں۔ مداوا کرنے کے لیے وہ کس کو کس طرح ذریعہ بناتا ہے یہ سراسر اس کی مرضی ہے اس کی رحمت سے مایوسی اور ناشکری گناہ کیوں ہے۔ حنا بھابھی اور ارم کو ملی سزا سے میں نے اس بات کو بھی خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ آج کے بعد مجھے صرف اور صرف اللہ پر توکل کرنا ہے اور اس بات کا کامل یقین بھی کہ وہی ہر تکلیف ہر درد کا مداوا کرنے والا ہے۔"

لبنیٰ جدون

# عشق دعا ہے

"بابا! کیا میں آجاؤں۔" لالئی نے ہلکا سا دروازہ کھول کے اندر جھانکا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ۔ بابا کی جان!" انہوں نے مسکرا کے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"بابا! کیا پڑھ رہے تھے۔" اجازت ملتے ہی وہ ان کے سامنے والی کرسی پہ آن بیٹھی۔

"بچے! یہ کتاب "ہم دیکھیں گے" کافی اچھی ہے۔ تم بھی پڑھو۔ مزا آئے گا۔" وہ کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"نہیں بابا! میں آج کل ایک اور کتاب پڑھ رہی ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا۔ بھلا ہماری بیٹی آج کل کون سی کتاب پڑھ رہی ہے۔" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابھی اس کے نام سے لاعلم ہوں۔ جب پوری پڑھ لوں گی تو نام خود ہی رکھ لوں گی۔" وہ عمر خان کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب۔" وہ اس کے دیوانے پن پہ مسکرائے۔

"بلا عنوان ہے بابا! جب ساری کتاب پڑھ لوں گی تو عنوان کا تعین خود بخود ہی ہو جائے گا۔" اس نے ذو معنی لہجہ اختیار کیا۔

"انٹرسٹنگ۔"

مکمل ناول
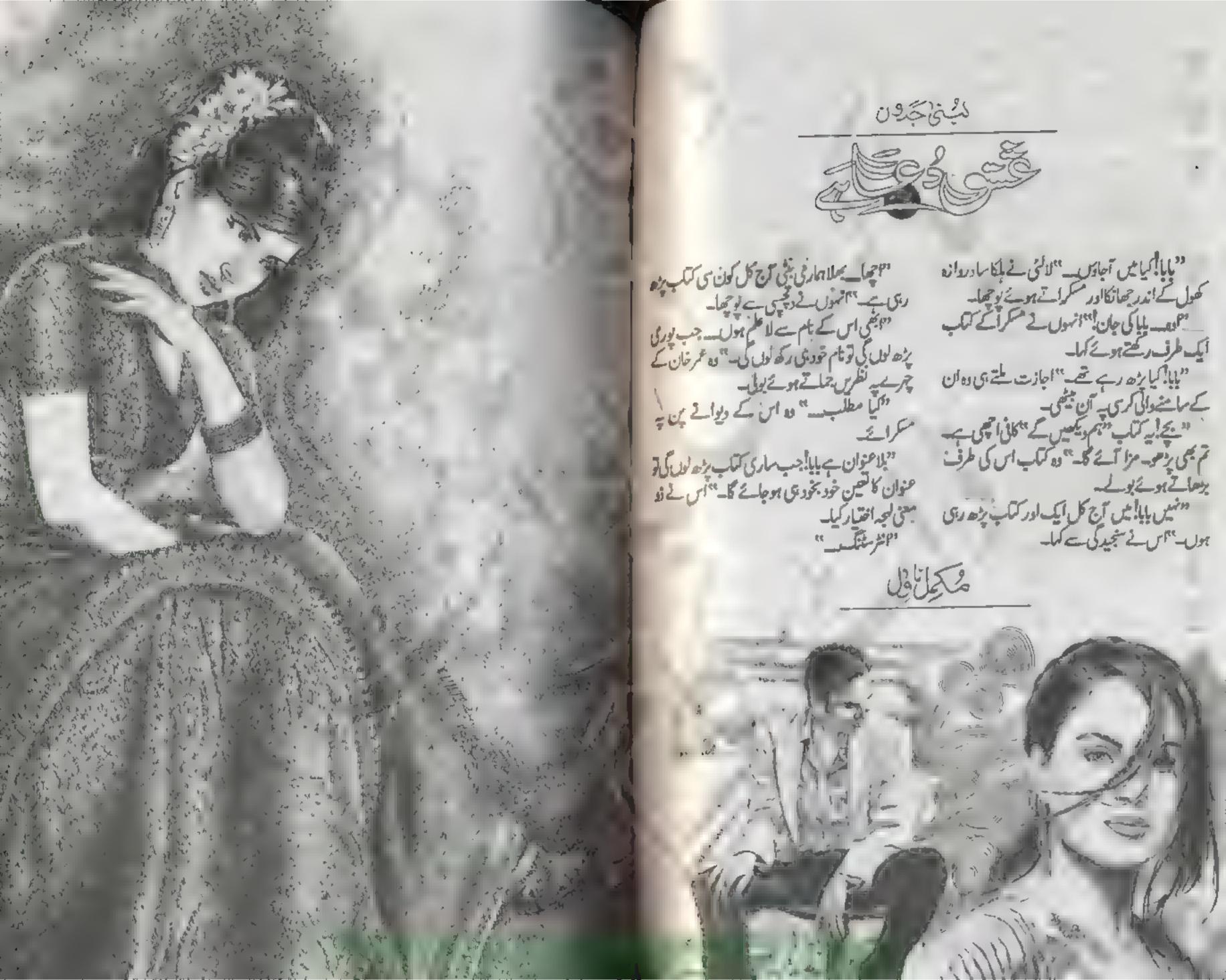
"بابا! وہ کتاب کس کے متعلق ہے۔ پوچھیں گے نہیں؟" لالئی نے نظریں ان کے چہرے پہ جماتے ہوئے سوال کیا۔
انہوں نے بنا سوال کیے اسے دلچسپی سے دیکھا۔
"آپ اور اماں کے متعلق۔ ان لکھی کتاب ہے بابا! مگر میں پڑھتی جا رہی ہوں۔" وہ سر جھکا کے بولی۔
عمر خان نے جھٹکے سے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ جو دھان پان سی کمزور سی لڑکی تھی، مگر ان کے اندر جھانکنے کی خواہش مند تھی۔
"بابا! کیوں نہیں یہ فاصلے سمٹ رہے خواہش کے باوجود۔ کیا انا کا وزن محبت سے زیادہ ہے؟ محبت تھی نہیں تو خدا کو حاضر ناظر جان کر بتائیں کہ اب ہو نہیں گئی؟"
عمر خان اس کے سوال کا کیا جواب دیتے کہ وہ خدا کو حاضر ناظر جان کے حقیقت سے منکر تو نہیں ہو سکتے تھے، سو چپ رہے۔
"بابا! آپ چاہتے ہیں نا کہ یہ دوریاں سمٹ جائیں۔" اقرار کرنے کا حوصلہ کم از کم بیٹی کے سامنے نہ تھا۔
وہ چند ثانیے انہیں دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کے آہستہ آہستہ بیڈ سائیڈ کے پاس آئی اور کرسٹل کے نفیس جگ سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے اپنے شان دار شخصیت والے بابا جان کو دیکھا۔ جن کی آنکھوں میں کھو دینے کا احساس دکھائی دے رہا تھا۔
کھدر کی کالی شلوار قمیص پہنے کندھوں پہ روایتی براؤن شال لیے اور خون چھلکاتے سرخ و سفید پاؤں میں پشاوری چپل پہنے وہ آج بھی انتہائی گریس فل شخصیت کے مالک تھے۔
سوچوں کو جھٹک کے وہ اٹھی اور پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھایا۔
"بابا! پانی۔"
"ہوں۔ ہاں۔ طلب بھی تھی۔" انہوں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کے چند ہی گھونٹ لیے اور گلاس اسے لوٹا دیا۔
"بابا! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"
گلاس ٹیبل پہ رکھ کے وہ پلٹی تو سوال بدستور موجود تھا۔
وہ خاموش رہے تو اس نے دوبارہ پوچھا۔
"کچھ سوالوں کے جواب نہ دینے میں ہی عافیت ہوتی ہے لالئی بچے! انسان اور رشتوں کا بھرم رہ جاتا ہے۔"
"لیکن بابا! کبھی کبھی انسان اپنے اندر کے دکھوں کو اٹھائے اٹھائے تھک بھی تو جاتا ہے اور اس وقت اس کا چہرہ اس کی ان اذیتوں کا آئینہ بھی بن جاتا ہے، جو وہ اپنے اندر سہہ رہا ہوتا ہے۔ کبھی تو ان زخموں کا بھی حساب ہونا چاہیے۔"
وہ انہیں محسوس کرتی تھی۔ انہیں جانتی تھی۔ کہ انہوں نے ایک جنگ لڑی تھی اور اس جنگ کی تباہ کاریاں اب انہیں نڈھال کیے ہوئے تھیں۔
"بارہا حساب کیا ہے میری جان! ہمیشہ گھاٹے میں رہا ہوں۔" وہ افسردگی سے بولے۔
"خود حساب کتاب کر کے خود ہی منصف بن جانا انصاف تو نہیں بابا جان!" وہ ان کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے بولی۔
"تو پھر کیا کروں۔ بولو تم۔ کس سے کہوں اپنا دکھ۔ اس سے جو پتھر بنی بیٹھی ہے۔" وہ اذیت سے چیخ اٹھے۔
"بابا جان! میں سنوں گی۔ آپ اعتبار تو کریں۔ میں ان کے برف وجود کو بھی توڑوں گی اور آپ کے زخموں کا بھی مرہم بن جاؤں گی۔" وہ بے بسی سے رو دی۔
"اسے میری اتنے سالوں کی محبت تو توڑ نہ سکی۔ تم کیسے سب کر پاؤ گی، جاؤ لالئی! جاؤ۔ تنگ نہ کرو۔" انہوں نے منہ موڑتے ہوئے کہا۔
"نہیں بابا۔ اب اور نہیں۔ اب اس لاوے کو باہر آنے دیں۔ اس بھڑکتے ہوئے لاوے کو اب آپ کو اپنے وجود سے نکالنا ہو گا۔ بہت جلا لیا ہے آپ نے کچھ تو زندگی کا احساس جاگے آپ کے اندر۔ کچھ سانسیں تو نصیب ہوں آپ کو۔ بابا۔ آپ نہ مانیں مگر وقت سے پہلے آئے بڑھاپے کی تھکن آپ کے چہرے پہ بہت واضح ہے۔ آپ دونوں نے بس ایک رشتے کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ پلیز بابا۔ گرا دیں اس نام نہاد انا کی دیوار کو۔ تھام لیں ان کا ہاتھ کہ زندگی راتوں کا حساب کتاب بہت لمبا ہو چکا ہے اور تسلیم کر لیں اس قسمت کے لکھے کو۔" وہ ان کی گود میں سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔
عمر خان کا ہاتھ اپنی حساس بیٹی کے بالوں پہ پڑا تو اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کے ان کی جانب دیکھا جہاں ان کی آنکھوں میں تیرتی نمی لالئی کا دل چیر گئی۔ جیسے بارش سے بھیگی گھاس پہ پانی کے چند قطرے۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے نظریں چرائیں اور اٹھ کے اپنی صندل کی لکڑی سے بنی الماری میں کچھ تلاش کرنے لگے جو شاید کہیں اور کھو گیا تھا۔
لالئی سے پھر وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ کمرے میں آئی اور پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔
ہوش سنبھالتے ہی اسے بابا اور اماں کے دکھوں کا ادراک ان کہے، ان بتائے ہی ہو گیا تھا۔ وہ جان گئی کہ وہ دونوں ہی نایاب تھے۔ یوں رل جانے کے قابل نہ تھے۔ مگر وقت کی بے رحم طوفانی موجوں نے انہیں اتنے زخم دیے تھے کہ دونوں محسوسات کی دنیا سے ہی عاری ہو گئے تھے۔ وہ دونوں جو ایک دوسرے سے بھاگ رہے تھے۔ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ وہ ایک دوسرے سے کتنی محبت کرنے لگے تھے۔ مگر اماں تو شروع سے ہی بابا کی چاہت میں گرفتار تھیں مگر وقت نے درمیان میں بہت موٹی دیوار بنا دی تھی۔ اب اس دیوار کو توڑنے کا حوصلہ ایک میں بھی نہیں تھا۔ شاید وہ اس لیے بھی زیادہ تھک گئے تھے کہ اس دیوار کی تعمیر میں ان کی محنت بہت زیادہ تھی۔
عمر خان اور فاطمہ بی بی کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا زیاد خان پھر لالئی اور سب سے چھوٹی ملالئی۔
زیاد خان کو اپنے بابا سے بہت زیادہ پیار تھا مگر اس کا مزاج ایسا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا مگر لب خاموش ہی رہتے۔ ملالئی کی فطرت چلبلی تھی۔ ہر ایک سے ہنسی مذاق کرتی۔ زندگی کے ایک ایک لمحے سے خوشیاں کشید کرنے کے ہنر سے واقف۔ البتہ لالئی نے اپنے اندر اپنے بابا اور اماں کا روگ پال رکھا تھا۔ اس کی ایک ہی کوشش تھی کہ ان دونوں کو دکھوں کے اس سفر سے واپس لے آئے۔ مگر اسے راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بھنڈی اس بار جلدی نہیں آ گئی۔" ثوبانہ شاہ نے ریڑھی پہ بھنڈی دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پرانی تو نہیں اسٹور کی ہوئی۔"
"ارے نہیں باجی۔ یہ دیکھیں بالکل تازہ ہے۔"
اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بھنڈی اٹھائی اور درمیان سے توڑتے ہوئے اس کی تازگی کا ثبوت پیش کیا۔ ثوبانہ شاہ

کا دل بری طرح دکھا۔

"کیا توڑ کے ہی سچائی کی گواہی تسلیم کی جاتی ہے چاہے وہ انسان ہو یا کوئی بے جان چیز۔"

"کتنی تول دوں باجی!" اس نے ترازو اٹھایا تو ثوبانہ شاہ کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

"آدھا پاؤ ادرک لہسن اور آدھا کلو بھنڈی اور ایک کلو ٹماٹر ڈال دو۔ میں ماسی کے ہاتھ پیسے بھیجتی ہوں۔" وہ بتا کے اندر آگئیں کہ ان کی آنکھوں کو ترازو میں تلنے کا منظر خوف زدہ کررہا تھا۔ ثوبانہ شاہ گیٹ سے اندر آئیں جہاں رشیدہ بڑا گیٹ کھولے کار پورچ دھو رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح دوپٹا کمر کے گرد بندھا تھا۔ آنے جانے والوں کی بری نظروں سے بے نیاز وہ اپنے کام میں مگن تھی۔

"رشیدہ! جاؤ ریڑھی والے سے سبزی لے آؤ اور اسے پیسے حساب کرکے دے آؤ۔" ثوبانہ نے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر رشیدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی بی بی! ابھی دے آتی ہوں۔" وہ دوپٹہ کھول کے لاپروائی سے گلے میں ڈالتے ہوئے بولی اور سبزی لاکر کچن میں رکھی اور بقایا رقم ثوبانہ شاہ کے حوالے کرکے دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی۔

ثوبانہ کا دماغ اس سے پہلے کہ ماضی کی تلخ یادوں کی جانب مڑتا، رشیدہ کی آواز انہیں واپس لے آئی۔

"باجی! میرا کام ختم ہوگیا ہے اب جاؤں؟" اس نے اجازت مانگی، جو فوراً مل گئی۔

اس کے جانے کے بعد گیٹ بند کرکے اپنے چھوٹے سے لان میں موجود آم کے درخت کی چھاؤں میں رکھی کرسی پہ آن بیٹھیں اور اپنی ذات کے سفر پہ نکل کھڑی ہوئیں۔ پتوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ انہیں زندگی کے تپتے صحراؤں میں نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتی تھی۔

سوچوں کے سمندر میں ناؤ ڈالتیں تو کنارے گم ہوجاتے تھے۔ کشتی منہ زور طوفانوں میں گھر جاتی اور سب کچھ پیچھے رہ جاتا۔ اگر کچھ یاد رہتا تو صرف یہ، زندگی کی جنگ بہت بری طرح ہاری تھیں۔ مات بھی ایسی کہ پھر کبھی لڑنے کی ہمت ہی نہ کرسکیں۔ اس بے دردی سے زخم لگایا تھا کہ اس گھاؤ کی تکلیف بھی اسی شدت سے محسوس ہورہی تھی۔ حالانکہ مارنے والے کے ہاتھ نہ خنجر تھا اور نہ تلوار۔ پھر کیا تھا اس کے ہاتھ میں؟ ہاں۔ ان ہاتھوں میں ترازو تھا، انصاف کا علمبردار۔ تو پھر اس میں تل کے میں رسوا کیوں ہوگئی۔ اس ترازو میں نہ انصاف تھا اور نہ احترام۔ صرف انسانیت کی رسوائی تھی۔ وقار انسانیت کی توہین، ظلم اور صرف ظلم، مگر تب جب بڑے بڑے دعوے کرنے والے نے بیچ منجدھار کشتی ڈبو دی، یوں کہ سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ سرکش لہروں نے ہر لمحہ قہقہوں کے نئے باب کھولے، کوئی خوشی پھر ثوبانہ شاہ کے قریب نہ آسکی۔

ان حالات میں اگر فیض اور شبیر کا ساتھ نہ ہوتا، یقیناً وہ ہوش مندوں کی صف سے نکل چکی ہوتیں۔ کسی سڑک، کسی چوراہے پہ "اللہ کے نام پہ" کی صدائیں لگا رہی ہوتیں۔ کاسہ گدائی میں چند سکوں کے بجائے تھوڑی سی خوشیاں مانگ رہی ہوتیں۔ بہت ممکن تھا کہ زندگی کی ڈور بھی کٹ چکی ہوتی۔

☼ ☼ ☼

راہداری سے گزرتے ہوئے ننھے فرشتے کی چیخ و پکار پہ ڈاکٹر زیاد مسکرا دیا۔ اسے آج تک اس احتجاج کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی کہ آخر دنیا میں آنے والی یہ چھوٹی مخلوق اتنا ہنگامہ کیوں کرتی ہے۔ وہ دنیا کی تکلیفوں سے آگاہ کیسے ہوجاتی ہے۔ اپنے خیالوں میں مگن وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ ڈاکٹر ساریہ گائنی ڈپارٹمنٹ سے نکل کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

"یہ اکیلے اکیلے کیوں مسکرایا جارہا ہے ڈاکٹر صاحب!"

"ساری دنیا احتجاج کررہی ہے آج کل۔ مانا کہ ان



[illegible] مسائل ہیں۔ کسی کو دھماکوں نے ڈس رکھا ہے [illegible] کو سیلاب نے۔ کسی کو بجلی نے نچایا ہوا اور [illegible] مہنگائی نے۔ مگر ان کا دنیا میں آتے ہی احتجاج [illegible] سمجھ سے بالاتر ہے۔" زیاد خان بچوں کے وارڈ کی [illegible] اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

[illegible] پہ فیس دی۔ مجھے جناب سے کچھ بات کرنی ہے اگر وقت دیں تو۔"

"چلیں کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ کچھ کھا بھی لیتے ہیں۔" ساریہ نے کیفے کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

"جی فرمائیں۔" چائے اور اسنیکس کا آرڈر دے کے وہ ساریہ کی جانب مڑا تو اس نے پوچھا۔

"تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی؟" جواباً [illegible] نے نفی میں ہلادیا۔

"مگر کیوں۔"

"اس لیے کہ میں چاہتی ہوں کہ تمہارے اماں، بابا کا فیصلہ تو پتا چلے۔ اپنے گھر والوں کو میں منالوں گی۔" وہ پریقین انداز میں بولی۔

"اور اپنے اماں بابا کو میں خود منالوں گا۔"

"تو پھر بھیجو نا انہیں۔"

"کیوں بہت جلدی ہے تمہیں۔" وہ شرارت پہ اترا تو بار حیا سے ساریہ کی پلکیں جھک گئیں۔

"ساریہ! انسان محبت میں سب کچھ بھول کیوں جاتا ہے۔ یہ محبت کم بخت سحر بن کر سوچوں کو مفلوج کیوں کردیتی ہے۔ تم ساتھ ہوتی ہو تو میں خود سے بھی بیگانہ ہونے لگتا ہوں۔ سب کچھ بھول جاتا ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کے دیوانگی سے بولا تو اس نے جھٹ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔

"زیاد! یہ پبلک پلیس ہے۔"

"یہ محبت ہے ساریہ! کیا تم نہیں جانتیں یا اقرار محبت سے ڈرتی ہو۔"

"زیاد! میں آگے وقت سے ڈرتی ہوں۔" وہ سر جھکا کے بولی۔ اس کے لہجے میں چھپے خدشات سے وہ بخوبی واقف تھا۔

"میرے ساتھ ہوکے ڈرتی ہو۔ ہاں۔ یہ ضرور ہے کہ حالات اتنے آسان نہیں ہیں مگر مجھ پہ بھروسا رکھو۔ میں ان شاء اللہ اپنی محبت کی جنگ جیت لوں گا۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ میں اس محبت میں اپنے کسی پیارے کو کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا کہ وہ مجھے بہت عزیز ہیں۔"

"اور اگر وہ نہ مانے تو۔۔۔"

"مجھے یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میری محبت کی پرواز کوئی عام نہیں ہے۔"

اگلے پل دونوں یوں مسکرائے جیسے زندگی کے سارے رنگ مسکرا اٹھے ہوں۔

"زیاد! کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کیا واقعی تم پتھریلے پہاڑوں کے باسی ہو جہاں کی برفیلی ٹھنڈ میں جوان ہونے والے پٹھانوں کے لیے اپنی روایات سب سے مقدم ہوتی ہیں۔" اس کے لہجے میں اس کے خوف بول رہے تھے۔

"روایات تو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں ڈیئر!" اس کے انداز گفتگو پہ ساریہ نے گھبرا کے اسے دیکھا۔

"مجھے تب ہی تو ڈر لگتا ہے زیاد۔ جب فیصلے کا وقت آتا ہے تو روایات کا بھنور فاتح بن کے تاج سر سجا لیتا ہے۔ محبت کی کشتی نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ہاتھوں سے ڈبونی پڑتی ہے۔" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی کہ ماما کے ذریعے ہی اسے ثوبانہ خالہ کے بارے میں صرف اتنا پتا چلا تھا کہ وہ بھی ان ہی رسموں کی ڈسی تھیں۔

"روایات کا بہت غلط مفہوم لیتے ہو تم شہری لوگ۔ کتنا بھیانک تصور ہے تم لوگوں کے ذہن میں۔ بہرحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"سوری زیاد! مگر مجھے یہ خوف سونے نہیں دیتے۔" وہ تڑپ کے بولی تھی۔

"جب نیند تمہاری آنکھوں سے روٹھ جائے تو میری محبت کی ردا اوڑھ لیا کرو۔ آنکھیں خود ہی نیند بن جائیں گی۔" اس کے لہجے میں چاہتوں کا ہر رنگ تھا۔

"زیاد! میں چلتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ تم بہک جاؤ۔" وہ کہہ کے اٹھی اور بنا اسے دیکھے وہاں سے نکل گئی۔ زیاد خان نے انتہائی سکون سے آنکھیں موندھ لیں۔

☼ ☼ ☼

"عمر خان! کل دلاور خان ملا تھا۔ وہ بہت شرمندہ ہے تم سے۔ جرگہ بلا کے تم سے اور فاطمہ بی بی سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔" جبار خان نے عمر خان کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے کہا تاکہ اس کے تاثرات سے اندازہ لگا سکیں، مگر وہ پتھر کی مانند سخت تھے۔

"خان لالا! آپ کیوں ملتے ہیں ان لوگوں سے۔ کیوں بات کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ زندگیوں سے کھیلنے والوں کے لیے کوئی معافی نہیں ہوتی۔ وہ بھول جائے اس بات کو کہ وہ کبھی اپنی بہن سے مل پائے گا یا اس کا چہرہ دیکھ پائے گا۔ اس نے نہ صرف میری زندگی کو تماشا بنایا بلکہ اپنی بہن کی زندگی بھی برباد کی۔ ہمت ہے تو آکے دیکھے کہ اس کی بہن میرے گھر میں تلسی کے پودے کی مانند زندگی گزار رہی ہے۔" عمر خان کا لہجہ انتہائی سخت ہو گیا۔

"فاطمہ بی بی کی اماں کی طبیعت کافی خراب ہے۔"

"خان لالا! جو شخص اپنی بہن کو رسوا کردے اس سے کیا ہمدردی۔ آپ کو خواہ مخواہ ترس آرہا ہے اس پہ۔ رونے دیں اسے۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے گا۔" عمر خان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

یہ وہ واحد مقام تھا جہاں ان کے ہر فیصلے پر سر جھکا دینے والا عمر خان چٹان بن کے اپنی بات پہ جم جاتا تھا۔ اس کا سر صرف نفی میں ہلتا تھا۔

"خان لالا! اس نے اپنی بہن میرے پاس رہن رکھوائی تھی۔ قیمت ادا کرے اور رہن چھڑوا لے۔"

"کیا مطلب۔" جبار خان نے حیرت سے پوچھا۔

"جرگے میں آکے اپنی بہن سے معافی مانگے اور اس بات کا اقرار کرے کہ انہوں نے کیسے جرگے کے منصفوں کو خریدا تھا۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے عمر خان۔ تم جانتے ہو اس میں بڑے بڑے نام آئیں گے۔" جبار خان کی آواز حیرت سے پھٹ گئی۔

"انسان بڑا نام سے نہیں بلکہ اپنے اعمال سے ہوتا ہے خان لالا! انہوں نے کتنا چھوٹا کام کیا، دیکھا نہیں آپ نے۔ چند سکوں کے عوض جب منصف بک جائے تو آپ انہیں کیا کہیں گے۔ انہیں خدا کا خوف بھی نہیں آیا کہ کیسے انہوں نے اسے مجھ سے جدا کر ڈالا، جو میرا محبت بھرا ہاتھ تھام کے خوابوں کی تعبیر پانے آئی تھی اور رسوائی کا طوق گلے میں لٹکائے ہوئے لوٹ گئی۔ خان لالا! وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔" آج پہلی دفعہ عمر خان نے کسی کے سامنے یہ اقرار کیا تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو عمر خان!" جبار خان کی زبان لڑکھڑائی۔

عمر خان نے دکھ سے سر جھکا لیا۔ آج پھر زخم تازہ ہو گئے تھے۔

"یہ بات تم آج بتا رہے ہو۔" جبار خان کا دل بھائی کی اذیتوں پہ تڑپ اٹھا۔

"لالا! اس نے فیصلے والی صبح ہی مجھے بتایا تھا اور مجھے واسطہ دیا تھا کہ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کروں۔"

"مگر کیوں۔"

"کیونکہ ہم دونوں ہی ڈر گئے تھے کہ ہمارے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔"

"اف خدایا۔ عمر خان! میں تمہارے کون کون سے دکھ پہ روؤں۔" جبار خان نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تم نے پھر اسے ڈھونڈا؟" کچھ توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"جی لالا۔ مگر نہ جانے اسے زمین کھا گئی تھی کہ آسمان۔ وہ اپنے ماں، باپ کے گھر بھی نہیں گئی تھی۔ اگر چلی بھی جاتی تو مایوس ہی ہوتی کہ اس نے مجھ سے شادی ماں، باپ کی مرضی کے خلاف کی تھی۔ انہیں بہت کا کافی دکھ بھی تھا۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

"عمر خان! تم جانتے تھے کہ تمہاری بات فاطمہ بی بی سے طے ہے، پھر تم نے ایسا قدم کیوں اٹھایا۔ کیا اور پھر اسے لے کے بھی نہیں آسکتے۔"

"خان لالا! میں سمجھا تھا کہ میں اسے منوا لوں گا۔ مگر میں اپنی محبت کا بھرم نہیں رکھ پایا۔" عمر خان کو اپنے ہر دکھ کو ہلکا کرنے کے لیے ایک ہی کندھا نظر آتا تھا، اپنے جان سے پیارے بڑے بھائی جبار خان کا، جو ان کے ہر دکھ کے ساتھی تھے۔

"بہرحال اب تمہیں حوصلہ کرنا ہے کہ اب تمہارے بچے جوان ہیں۔ بھرم رکھنا پڑے گا۔" انہوں نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

خان لالا کے جانے کے بعد ان کی سوچوں کا رخ بدلتے ہوتا ہوا فاطمہ بی بی کی جانب چلا گیا۔

فاطمہ نے میرے ہاتھوں میں اپنی بے قدری اور ذلت کتنی ہمت سے سہی ہے۔ اس کی تو تمام عمر ہی رائیگاں گزری۔ مجھے اس کی بربادی کا دکھ ہے۔ وہ بھی تو بے بس تھی۔

اکثر عمر خان کا جی چاہتا تھا کہ وہ آگے بڑھ کے ان کا ہاتھ تھام لیں اور ان کے چہرے کی اداسی کو دور کردیں۔ جو عمر خان خود نہ پاسکے، وہ محرومی ان کے مقدر سے کھرچ ڈالیں۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ان سے محبت کرتی تھیں۔ وہ رو، رو کے عمر خان سے محبت کی بھیک مانگتی رہیں، مگر جواب میں عمر خان نے سوائے نفرت، اذیت اور تکلیف کے انہیں کچھ نہ دیا۔ عمر خان کا رویہ ان کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز رہا۔ شادی کے پہلے تین سالوں میں وہ عمر خان کے لیے تختہ مشق بنی رہیں۔ ذلت کے سب سے نچلے درجے پہ عمر خان نے انہیں پہنچایا اور جب احساس ہوا تو وہ پتھر ہو چکی تھیں۔

اس پتھر کو پھر توڑتے توڑتے عمر خان کے ہاتھوں پہ چھالے پڑ گئے تھے۔

"خان جی! یہ دودھ لے لیں۔" خاندانی ملازمہ نے دل سے ڈھکی ٹرے میز پہ رکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے اسے ٹرے لوٹا دی۔

وزرے نے جاکر فاطمہ بی بی کو بتایا تو وہ پریشان ہو گئیں۔

"کیوں؟"

"پتا نہیں خانم!"

"اچھا تم جاؤ۔"

وزرے کے جانے کے بعد فاطمہ بی بی کو عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ خود ان کا عمر خان کے کمرے سے تعلق ٹوٹے کئی سال گزر چکے تھے۔ کیسے ان سے بات کرتیں۔ بے چینی بڑھی تو اٹھ کے لائبہ کے کمرے میں آگئیں۔

"اماں آپ۔ ابھی تک سوئی نہیں۔" وہ فوراً تابعداری سے بیڈ سے اٹھی اور حیرت سے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت تک وہ سو جاتی تھیں۔

"لائبہ! جاگ رہی ہو بچے؟" انہوں نے ممتا کی ساری مٹھاس لہجے میں سموتے ہوئے پوچھا۔

"جی اماں! یہ کتاب پڑھ رہی تھی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا لائبہ! ذرا اپنے بابا کی طرف چکر لگالو، آج انہوں نے دودھ بھی نہیں لیا اور کھانا بھی برائے نام ہی کھایا ہے۔" فاطمہ بی بی نے فکرمندی سے کہا تو وہ فوراً "کتاب میز پہ رکھ کے اٹھی۔

"ابھی دیکھتی ہوں۔"

"تمہاری بے رخی کی کوئی تو حد ہوگی عمر خان۔ کاش! تم مجھے میری ریاضتوں کے بدلے اتنا حق تو دیتے کہ مجھے کمرا بدر نہ کرتے۔ میں تمہیں جینے کا حوصلہ تو کرتی۔"

"خاندانی بیوی لانے کا مقصد بچے پیدا کرنا ہے، سو تم نے کرلیے۔ تمہاری حیثیت پہلے کسی جانور کی سی تھی۔ اب تمہاری ترقی ہو گئی ہے، اب تم میرے پاؤں کی جوتی کے برابر ہو گئی ہو۔" عمر خان نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے کمرے سے نکال دیا۔ اس وقت لائبہ صرف تین دن کی تھی۔

عمر خان کے جانے کے بعد ملازمہ بھاگ کے ان

تک آئی اور فاطمہ بی بی کو دوسرے کمرے تک پہنچایا۔ عمر خان کے سامنے تو اسے یہ غشی گلے پڑ جاتی۔

اس دن عمر خان نے بابا جان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ ورنہ عمر خان اتنی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ عمر خان کی نافرمانی پہ خود اس کے اپنے بابا نے فاطمہ بی بی کے بھائی دلاور خان کو یہ کہہ کر عمر خان کے خلاف جرگہ بلا لیا تھا اور پھر اپنے اثر و رسوخ سے ایسا فیصلہ دلوایا کہ عمر خان اور ثوبانہ پھر کبھی نہ پائے۔ رشتے کی ڈور تو نہ ٹوٹی مگر دونوں کا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ اسے کیسے واپس بھیجا گیا۔ عمر خان سے سب کچھ پوشیدہ رکھا گیا۔ خود عمر خان کی حالت دیوانوں کی سی تھی مگر بابا جان کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔

بابا جان نے جلد سے جلد پوتے کی خواہش کر ڈالی۔ عمر خان کا فاطمہ سے صرف اذیت کا رشتہ تھا۔ جب اس نے فاطمہ کے وجود کو بری طرح دھتکارا تو بابا جان نے اسے تیسری شادی کا کہنا شروع کر دیا۔ مگر فاطمہ بی بی کے بعد ایک اور اذیت عمر خان کو منظور نہ تھی۔ بابا جان کی خاطر پہلی شادی کے چھ ماہ بعد وہ مجبوراً ان کی طرف بڑھے اور پھر خدا نے یکے بعد دیگرے زیاد خان، لالئی اور ملالئی سے نوازا۔ اور پھر وہ گرابدر ہو گئیں۔

اس سے پہلے کہ یہ خبر بابا جان تک جاتی ان کو پڑنے والا دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا اور وہ زندگی کی بازی ہار گئے۔

بابا جان کے دنیا سے جانے کے بعد عمر خان نے پاگلوں کی طرح ثوبانہ کو ڈھونڈا مگر وہ نہ مل سکیں، پھر وہ سارا غصہ فاطمہ بی بی کے وجود پہ اتر تک۔ عمر خان نے ان کی کلائی پہ جلتے سگریٹ سے ثوبانہ کا نام لکھا۔ وہ تکلیف سے چلاتی رہیں۔ چیخ چیخ کے سب کو مدد کے لیے پکارتیں، مگر کسی کی ہمت نہ تھی کہ عمر خان کا ہاتھ روک سکتے۔ ان کی کلائی پہ لگا وہ زخم سلون کا موسم ہونے کی وجہ سے بگڑ گیا، یہاں تک فاطمہ بی بی کو اسپتال جانا پڑا۔

اس رات زیاد خان بری طرح روتا رہا۔

عمر خان سے اپنے خون کا بلکنا دیکھا نہ گیا تو ملازمہ سے اسے لے لیا۔

"بابا! اماں پاس جانا ہے۔" ساڑھے تین سال کا رو رہے روتے ایک ہی ضد کر رہا تھا۔

"اچھا! میں اپنے بچے کو صبح لے جاؤں گا۔" عمر خان نے سلانا چاہا، مگر اس کی ایک ہی ضد تھی۔

"مجھے ابھی جانا ہے نہیں تو اماں بڑی بی بی کی طرح مر جائیں گی۔"

بادل نخواستہ عمر خان کو اٹھنا پڑا۔ مگر وہاں آ کر پہلی دفعہ عمر خان کو اپنے بدصورت رویہ کا احساس ہوا، جب نرس فاطمہ بی بی کے زخم سے سرنج کے ذریعے پیپ نکال رہی تھی اور وہ بری طرح تڑپ رہی تھیں۔

وہ ساری رات حویلی واپس آ کر عمر خان سے سویا نہ گیا۔

بارہ دن بعد وہ اسپتال سے واپس حویلی آئیں تو اس دن کے بعد عمر خان نے ان سے ایک چپ کا رشتہ باندھ لیا لیکن پھر وقت نے وہ دن بھی عمر خان کو دکھایا کہ انہیں محسوس ہونے لگا کہ ان کی نظریں حویلی میں داخل ہوتے ہی فاطمہ بی بی کو تلاشنے لگتیں۔ مگر اب ان کے سامنے پہلے والی وہ فاطمہ نہیں تھیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ عمر خان کی ذمہ داریوں سے بھی غافل نہ رہی تھیں۔ ان کے تمام کام انہیں وقت پہ ملتے۔ وہ کب چائے لیتے تھے، کب باہر جاتے تھے، کب انہیں سونا ہوتا تھا سب فاطمہ بی بی کو پتا تھا اور انہوں نے اپنے فرض میں ایک دن بھی کوتاہی نہ کی۔ انہیں اب یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک قدم بھی عمر خان کی طرف بڑھاتیں تو وہ یقیناً "مایوس نہیں ہوتیں" مگر اب خواہشوں نے کفن اوڑھ لیا تھا۔

"ارے اماں... آپ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں۔" لالئی واپس آئی تو ماں کو وہیں بیٹھے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔" بہانہ بنایا اور کمرے سے نکل گئیں۔

"کاش! آپ لوگوں کے لیے میں کچھ کر سکتی۔ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ بابا کو کسی سے محبت تھی اور



جب ان سے چھین لی گئی اور زبردستی ان کی شادی کر دی گئی مگر اب آپ دونوں سب بھول جاتے۔ ہماری خاطر کہ ہم آپ دونوں کو ساتھ دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں۔" وہ تکیے پہ سر رکھ کر بولی۔

☼ ☼ ☼

"ماما... ماما!" حسب عادت یونیورسٹی سے واپسی پہ شبیر گیٹ سے ہی ثوبانہ شاہ کو آوازیں دینا شروع ہو گیا۔ کئی بار اس بات پہ ثوبانہ شاہ سے ڈانٹ بھی کھا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید شور شرابا کرتا وہ فوراً کمرے سے نکل کر باہر آ گئیں۔

"آ گئے میرے شہزادے!" انہوں نے آگے بڑھ کے اس کا ماتھا چوما۔ شبیر نے ہمیشہ کی طرح انہیں اپنے دبلے اور مضبوط بازوؤں میں گھما ڈالا۔ وہ ایسا ہی دیوانہ تھا۔

"ارے... رے شبیر! میری ہڈیاں اتنی مضبوط نہیں، دوا سے ہلکا سا دھکا دے کر بولیں۔

"ارے آئرن لیڈی! آپ تو ہم جیسوں کو مات دیتی ہیں۔ بلکہ میں نے سنا ہے کہ لیڈیز آر نائی آفٹر فورٹی۔ سب بے تکی ہانکی۔

"یہ ہمارے بارے میں نہیں بلکہ تم جیسے بدمعاشوں کے بارے میں بولا گیا ہے۔" انہوں نے اس کا کان مروڑتے ہوئے کہا تو وہ بلبلا اٹھا۔

"اف ماما..."

"یہ بتاؤ کہ یہ تمہارا بھائی کہاں ہے؟"

"ماما! آ رہا ہے... راستے میں ہے۔" اس نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

"ماما جانی! بہت زور کی بھوک لگی ہے... پکا کیا ہے؟" شبیر کپڑے بدل کے سیدھا کچن میں آ گیا۔

"کچھ اچھا ہی بنا ہے۔ تم ٹیبل پہ بیٹھو، میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ سلاد کی پلیٹ اسے پکڑاتے ہوئے بولیں، مگر وہ ٹیبل کے بجائے دم پہ رکھے دیگچے کی جانب بڑھا تو ثوبانہ شاہ اس کے ارادے بھانپ گئیں۔

"خبردار شبیر... ڈھکن نہ اٹھانا سارا دم خراب ہو جائے گا۔" اس کے ہاتھ پہ چپت لگاتے ہوئے بولیں۔

"دم خراب نہ ہو، بھلے بندے کا دم نکل جائے۔" وہ منہ بگاڑ کے بولا۔

"ویسے ماما..." وہ یکدم نئی توانائیوں سے پلٹا۔ "جو خوشبو بتا رہی ہے اگر وہی ڈش ہے تو ماما زندہ باد۔"

"جی بالکل، تمہاری پسندیدہ بریانی ہے۔" انہوں نے مزید اس کا ضبط آزمانے کا ارادہ ترک کیا۔

"زبردست ماما۔" وہ چہکا۔

ٹیبل پہ کھانا لگاتے ہوئے ثوبانہ شاہ کی نظر خاموش طبع فیض پہ جا پڑی۔ سفید شلوار قمیص میں نکھرا نکھرا کسی ریاست کا بانکا شہزادہ لگ رہا تھا۔ اس کے چھ فٹ کو چھوتے قد کاٹھ پہ شلوار قمیص بجتی بھی خوب تھی۔

"وہ فیض..." وہ بلا ارادہ ہی ممتا کے جذبے کی تسکین کے لیے اسے پکار بیٹھیں۔

"جی ماما..." وہ ٹی وی کی آواز آہستہ کرتے ہوئے بولا۔

"جانو... فریج سے دہی اور کولڈ ڈرنک نکال کر ٹیبل پہ رکھ دو اور اس ندیدے کو بھی بلاؤ۔"

"جی..." وہ تابعداری سے کہہ کے فریج سے چیزیں نکالنے لگا اور ساتھ ساتھ اسے آوازیں بھی دینے لگا۔

"ارے واہ... کیا خوشبو ہے۔" شبیر نے کہا تو فیض نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے فوراً بریانی کی ڈش اٹھائی۔ "یہ لیں ماما... ڈالیں۔"

ثوبانہ شاہ کے بعد خود آرام سے بریانی اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس کا ضبط آزمانے لگا۔ حد تو تب ہوئی جب اس کا پسندیدہ پیس بھی نکال لیا۔

"ماما... اب دیکھیں نا..." وہ چڑ گیا۔

"یہ لو جناب..." فیض نے اپنی پلیٹ اٹھا کے اس کی طرف بڑھا دی۔

"اب اتنے اچھے نہ بنو... وہ میں خود ڈال لوں گا۔" اس نے شکریہ کے ساتھ پلیٹ لوٹائی۔

"ارے جگر۔ یہ میں نے تمہارے لیے ہی نکالے ہیں۔" فیض نے محبت سے کہا اور اپنے لیے پلیٹ میں چاول ڈالنے لگا۔

"واہ ماما۔ زبردست۔" دونوں نے بے ساختہ ایک ساتھ کہا۔

"بوائز! مسکہ نہیں چلے گا۔"

"ایک تو ماما کو ٹین ایج لڑکیوں کی طرح یقین دلانا پڑتا ہے۔" شبیر کی زبان تو کبھی ہی چڑے کی بھلا کیسے نہ پھسلتی۔

فیض اور ثوبانہ شاہ دونوں ایک ساتھ مسکرا دیے۔

"ماما! محترم کا ٹین ایج لڑکیوں کے معاملے میں تجربہ تو دیکھیں۔" فیض نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے چھیڑا۔

"بھائی کی کمپنی کا کچھ اثر تو ہونا تھا۔" وہ کندھے اچکا کے بولا۔

"ویری فنی۔" فیض نے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ٹیبل سے برتن اٹھانے میں ثوبانہ شاہ کی مدد کرنے لگا۔

"ماما! میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر آپ کی بہو میں آپ جیسا کھانا پکانے کی صلاحیت نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔" شبیر نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

"تو ہم اس کے آنے سے پہلے ہی اس کے جانے کا بندوبست کردیں گے۔" فیض نے بنا ایک لمحہ ضائع کیے جواب دیا تو ثوبانہ شاہ مسکرا دیں جبکہ شبیر کے منہ کا ذائقہ ہی بدل گیا۔

"فیض! تم تو چپ ہی رہا کرو۔ وہ کیا ہے کہ اونٹ بولے گا تو زیرہ ہی گرائے گا۔ میری آنے والی کے بارے میں فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔" شبیر نے کشن واپس اچھالتے ہوئے کہا۔

"بڑی خوش فہمی ہے کہ پہلے تیری آئے گی۔" فیض نے کہا۔

"کیوں۔ پورے پانچ منٹ بڑا ہوں تم سے۔"

اس مقام پہ شبیر کو اپنی خوش قسمتی قابل رشک لگی۔

"جی نہیں۔ ماما نے ایک دن خود کہا تھا کہ پہلے شبیر کی بھابھی آئے گی اور کان کھول کے سن لو کہ اس کے سامنے اس قسم کی اوٹ پٹانگ حرکتیں نہ کرنا ورنہ میں بالکل لحاظ نہیں کروں گا۔" ثوبانہ شاہ نے حیرت سے فیض کو دیکھا جو بہت کم اس موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔

"ماما! دیکھ رہی ہیں اسے۔ کسی غیر کی خاطر مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔ ابھی وہ محترمہ آئی نہیں تو یہ حال ہے، جو بنفس نفیس موجود ہوئیں تو کیا ہوگا۔" اس نے ماں کو شامل کیا۔

"ہاں بالکل! دیکھ بھی رہی ہوں اور سن بھی رہی ہوں۔"

"ویسے آپس کی بات ہے کہ خدا میری ماں کو سلامت رکھے ان جیسی لذت تو مل ہی نہیں سکتی۔" شبیر نے یک دم کہتے ہوئے ثوبانہ شاہ کے ہاتھ چوم لیے اور پھر انتہائی عقیدت سے آنکھوں سے لگالیے۔

ثوبانہ شاہ کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ زندگی تو ختم ہوچکی تھی۔ وہ دونوں ہی تو ان کی پیاسی زندگی پہ رم جھم کی طرح برسے تھے اور انہیں ایک نئی آس میں تھم کی زندگی گزارنے کی۔

"ماما۔" فیض نے پکارا تو وہ نماز کا کہہ کر فوراً" اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ فیض نے فوراً" شبیر کی جانب دیکھا۔

"شبیر! ماما کو کیا ہوجاتا ہے، وہ اکثر ہنستے ہنستے دکھی ہوجاتی ہیں۔"

"کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ ماما نے اپنے اندر کوئی طوفان چھپا رکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے کوئی بہت بڑا زخم کھایا ہوا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" فیض کہتے ہوئے گہری سوچ میں چلا گیا۔

"بہرحال اللہ ہماری ماں کو سلامت رکھے۔" شبیر نے کہا تو فیض نے فوراً" آمین کہا۔

☼ ☼ ☼

"ساریہ! اٹھو بھئی اتنی دیر ہوگئی ہے۔" لائبہ واحدی اس کے کمرے میں آئیں تو اسے بدستور سوتے دیکھ کر حیران ہوئیں۔



عام طور پہ وہ چھٹی والے دن بھی جلدی اٹھ جاتی تھی۔ آج دس بجنے والے تھے۔ انہوں نے سلک کے خوب صورت پردے کھڑکیوں کے آگے سے ہٹائے تو روشنی جیسے ان ہی کی دعوت کی منتظر تھی۔ جھٹ سے اندر آدھمکی۔ ساریہ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ فوراً" آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے پھر موبائل اٹھا کے وقت دیکھا تو یقین نہ آیا۔

"اوہ۔ نو۔ میں اتنی دیر تک سوتی رہی، سوری ماما!" وہ بالوں کی پونی بناتے ہوئے بیڈ سے اتری۔

"اب منہ ہاتھ دھو کے فوراً" آجاؤ۔" وہ دھیرے سے مسکرائیں اور باہر نکل گئیں۔

"کتنے ظالم ہو تم زیاد خان میرا سونا جاگنا۔ سب پہ قابض ہوگئے ہو۔ میری نیند تک پر قبضہ جما بیٹھے ہو۔"

بالوں میں برش کرتے ہوئے وہ تصور ہی تصور میں زیاد خان سے شکوہ کرنے لگی اور پھر خیالوں کو جھٹک کر لان میں آگئی۔ جہاں اس کی توقع کے عین مطابق پاپا بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم پاپا جانی۔" اور ساتھ ہی پھولوں کی گوڈی کرتے مالی چاچا کو بھی سلام کیا۔

"کیسی ہے ہماری ڈاکٹر صاحبہ۔ لگتا ہے خوب گہری نیند سوئیں۔" وقار واحدی نے محبت سے پوچھا۔

"جی پاپا۔ آج واقعی کافی تھک گئی تھی۔ وقت کا اندازہ ہی نہیں رہا۔" وہ سر جھٹک کر بولی جیسے ابھی بھی نیند کے خمار میں ہو۔

"مگر بیٹا وقت کو کبھی اندازے سے نہ گزارنا۔ اس کے ایک ایک پل کی خبر رکھنا کیونکہ اس کے گزرنے کا بالکل پتا نہیں لگتا۔" انہوں نے جس حوالے سے بات کی تھی وہ بخوبی سمجھ گئی تھی۔

"جی پاپا۔" اس نے سر جھکا کے کہا۔

"ساریہ بیٹا! میں نے آپ سے جب بات کی تھی تو آپ نے وقت مانگا تھا۔ وقت کیوں مانگا۔ میں نے تفصیلاً" نہیں پوچھا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں وجہ نہیں جانتا تھا، بلکہ مجھے اپنی بیٹی پہ اعتبار تھا کہ وہ کوئی غلط فیصلہ نہیں کرے گی۔ میں اب بھی نہیں پوچھوں گا مگر جو بھی فیصلہ کرنا وقت پہ کرنا۔"

"جی پاپا! میں آپ کو کبھی ہرٹ نہیں کروں گی۔" آپ کی محبت پہ دل بھر آیا تھا اور میرا یقین رکھیے گا کہ میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی۔"

"مجھے اپنے بچوں پہ یقین ہے۔"

وہ اخبار کی جانب متوجہ ہوئے تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کی نظریں نیلے گگن پہ جا ٹھہریں۔ جہاں نیلے آسمان کو کالے بادل دھیرے دھیرے گھیر رہے تھے۔

موبائل کی گھنٹی نے سوچوں کا تسلسل توڑا۔ توقع کے عین مطابق زیاد ہی تھا۔ "ہاں جناب! کہاں ہیں آپ۔" اس نے شگفتگی سے پوچھا۔

"جانتے تو ہو کہ چھٹی کا دن میرا میرے اپنوں کے لیے ہوتا ہے۔"

"تو ہم کیا غیر ہیں؟"

"بظاہر تو ہیں۔ اب دل کے حال تو خدا ہی جانتا ہے کہ دل نے کس سے کیا رشتہ باندھ لیا ہے۔ میرا آپ سے کیا رشتہ ہے۔" وہ اسٹائل سے بولی۔

"ان شاء اللہ جلد ہی وہ رشتہ سب کے سامنے بھی بندھ جائے گا۔"

"تو پھر تم اپنے پاپا سے بات کرونا۔" ساریہ اصل بات کی طرف آئی۔

"کیا بات۔" وہ جان بوجھ کے معصوم بنا۔

"زیاد۔ پلیز میں بہت سیریس ہوں۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔

"ساریہ! کیا مجھ پہ اعتبار نہیں ہے۔" زیاد اس کے رونے پہ پریشان ہوگیا۔

"تمہارے چھن جانے کا خوف میرے حواسوں پہ سوار ہونے لگا ہے۔ تم لوگوں کے قبیلے اور رسم و رواج۔" ذہن کے کسی کونے میں ثوبانہ خالہ کا انجام خوف کی صورت بیٹھا تھا۔ وہ کبھی بھی زیاد خان کو نہ بتا سکی کہ اس کی پیاری خالہ بھی اس جیسے ہی قبیلے کی

دی تھیں۔
"ساریہ! جو چھین لیتے ہیں انہیں بھی چھن جانے کا خوف ہوتا ہے۔ تم نے بھی تو چھینا ہے نا مجھے مجھ سے۔ اب حفاظت بھی کرو۔"
"گھر والوں سے کب بات کرو گے۔" اس نے دوبارہ پوچھا۔
"سوچ رہا ہوں نیکسٹ ویک اینڈ پہ گاؤں جانے کا۔" اب کے سنجیدہ جواب آیا۔
"وہاں تو جائیں گے نا۔"
"ماننا تو پڑے گا ورنہ وہ مجھے کھو دیں گے۔"
"اللہ نہ کرے کہ ایسا وقت آئے۔" وہ گھبرا گئی۔
"زیاد! آج پاپا نے ڈھکے چھپے لفظوں میں جو کہا ہے اس کے بعد میرا دل ڈرنے لگا ہے۔ گھر والے اب میرے مستقبل کے حوالے سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ اس لیے میرا دل گھبرا رہا تھا۔" ساریہ نے کہا۔
"ساریہ! بس تم اتنا جان لو کہ تمہیں اب موت کے علاوہ مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"
"اور زیاد خان! تم سے میری زندگی مشروط ہے۔ میں تم بن کچھ بھی نہیں ہوں۔" اس سے آگے نہ اس سے کچھ سنا گیا اور نہ بولا گیا۔

☼ ☼ ☼

"بابا! کل آپ زیاد لالا کی شادی کے متعلق بات کر رہے تھے۔" لالئی ٹی وی کے سامنے بیٹھے عمر خان کے سامنے قالین پہ ہی بیٹھ گئی۔
"ہاں جی بالکل کی تھی۔" وہ مسکرائے اور ساتھ ہی ٹی وی بند کر کے اس کی جانب متوجہ ہوئے۔
"تو آپ نے لالا سے پوچھا۔" بھائی کے معاملے میں ہر بہن کے چہرے پہ ایسی ہی خوشی دمکتی تھی' جو اس وقت لالئی کے چہرے پہ دیکھی جا سکتی تھی۔
"جی بالکل کی تھی' کہہ رہا تھا کہ وہ ویک اینڈ پہ آ کے خود بتائے گا۔" عمر خان نے کہا تو وہ شرارت سے ہنسنے لگی۔
"مجھے پتا ہے وہ آ کے کیا بتائیں گے۔" اس کی بات عمر خان کے ساتھ ساتھ قریب سے گزرتی فاطمہ بی بی بھی چونکیں۔
"کیا! آپ بھی ادھر آئیں نا۔" لالئی نے ہاتھ پکڑ کے عمر خان کے بالکل سامنے والے صوفے پہ بٹھا دیا۔
عمر خان اور فاطمہ بی بی کی نظریں بے ساختہ مل کے جھک گئیں۔ دکھ کی ایک ہلکی سی لہر نے ان کے وجود کا احاطہ کر لیا۔
"اماں! پتا ہے لالا کو کون پسند ہے۔"
"کون۔" فاطمہ بی بی نے پوچھا۔
"مرجانہ۔" وہ کہہ کے عمر خان کی طرف مڑی۔
"تمہیں کس نے بتایا۔" عمر خان نے پوچھا۔
"خود مرجانہ نے بابا۔ ملالئی بھی جانتی ہے۔" وہ جوش میں بول گئی۔
"بابا! اس سے پہلے کہ لالا آ کے بتائیں۔ ہم لالا کو نہ سرپرائز دے ڈالیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تو فاطمہ بی بی نے اسے ٹوک دیا۔
"نہیں بیٹا... زیاد خان کو آنے دو اور تسلی سے پوچھ کے بات ہو گی۔ شادی بیاہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ عمر بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔" انہوں نے سمجھایا۔
"لالئی کسی بنیاد پہ بات کر رہی ہے فاطمہ!" عمر خان کا یہ سن کر کے ان کا بیٹا ان کے جان سے پیارے بھائی کے گھر رشتہ جوڑنا چاہ رہا ہے سیروں خون بڑھ گیا تھا۔
"بابا! ابھی بات کر لیں نا لالا سے۔" لالئی ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کے حق میں نظر آ رہی تھی۔ "میں ابھی فون ملاتی ہوں۔" وہ خوشی کے ان لمحوں کو فوراً حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ اس حویلی میں خوشیوں کا قحط تو ہمیشہ سے ہی تھا۔ ان کے بچوں کو ارمان ہی تھا کہ کبھی وہ بھی اپنے اماں' بابا کو ایک ساتھ ہنستے دیکھیں۔ وہ تو بات بھی کئی کئی دنوں بعد اور وہ بھی ضرورتاً کرتے تھے۔
عمر خان کو وقت کے ساتھ ساتھ اس بات کا احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ اپنی محبت کے کھو جانے کے صدمے میں انہوں نے جس کو ٹھوکروں میں رکھا تھا' وہ



بی بی عام چیز نہیں تھا۔ اگر وہ اسے قسمت کا لکھا سمجھ کے قبول کر لیتے اور خدا کی رضا میں راضی ہو جاتے تو آج اتنے محروم نہ ہوتے۔ زندگی یوں مسافرانہ نہ ہوتی۔ بلکہ زخموں پہ مرہم لگ ہی جاتا۔
"یہ لیں بابا۔" لالئی کی آواز پہ جیسے دونوں اپنی اپنی سوچوں کے سمندر سے نکلے۔
فاطمہ بی بی نے انتہائی دکھ سے اس ٹوٹے پھوٹے شخص کو دیکھا۔ جس نے ان کی بھی ساری زندگی رائیگاں کر دی اور خود بھی نامراد رہا۔ "بیٹا جی! اسے اپنی کسی دوست میں انٹرسٹ ہے اور وہ اسی سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ اب ہم زبردستی تو نہیں کر سکتے نا۔" انہوں نے زیاد سے فون پر بات کرنے کے بعد مردہ سی آواز میں بیٹی کو سمجھایا۔
"مگر مرجانہ..." لالئی کی آواز رندھ گئی۔ "بابا! وہ تو لالا سے بہت پیار کرتی ہے۔"
فاطمہ کے دل پہ چوٹ لگی۔ انہیں لگا کہ ایک اور فاطمہ جنم لے رہی ہے۔ عمر خان کے پاس اس درد کا کوئی علاج نہ تھا۔ اس لیے وہ چپ رہے۔
"لالئی! اسے سمجھانا بچے کہ رشتے جبر کی زنجیر سے بندھ تو جاتے ہیں مگر نبھائے نہیں جا سکتے۔ اس درد سے خود کو بچانا ہی عقل مندی ہے۔" وہ کڑی دھوپ میں چلی تھیں۔ وہ کیسے پاؤں کے چھالوں کی تکلیف بھول سکتی تھیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ شکووں نے بہت کم ان کے لبوں کی حد توڑی تھی۔
عمر خان نے تڑپ کے انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں جیسے فاطمہ بی بی پہ جم سی گئیں۔ اس لمحے فاطمہ بی بی کے ساتھ عمر خان بھی لالئی کی وہاں موجودگی کو بھول گئے۔ لالئی اپنی ہی تکلیف میں تھی کہ وہ مرجانہ کے بہت قریب تھی۔ غائب دماغی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
"خان! کیا آپ نے زیاد خان کی بات مان لی ہے؟"
"کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا فاطمہ... کیا میں زیاد کو محروم کر کے ایک دفعہ پھر آپ کا مجرم نہ بن جاتا۔" ان کی زبان اور آنکھیں دونوں سوالیہ تھیں۔
"میں نے کبھی آپ کو اپنا مجرم نہیں گردانا خان! یہ قسمت کے کھیل ہیں۔" وہ نظریں چرا کے بولیں کہ اس شخص سے نظریں ملانا کوئی آسان کام تھا۔
"فاطمہ! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔"
"خان! آپ نے میری ممتا کو آزمائش میں نہ ڈال کر میرے ساتھ میری بڑی نیکی کی ہے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گئیں۔ حالانکہ وہ ارادتاً ایسا نہیں کرتی تھیں۔
"کیا مطلب... کب کی میں نے تمہارے ساتھ کوئی نیکی۔" وہ متعجب ہوئے۔ دماغ پہ بہت زور دیا۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ انہیں ایک بھی نیکی یاد نہ آئی تھی۔ جو انہوں نے فاطمہ بی بی کے ساتھ کی ہو۔
"خان! آپ کو وہ نیکیاں کبھی یاد نہیں آئیں گی کہ وہ آپ سے سرزد ہو گئی تھیں۔ بابا جان کی خواہش پہ میری گود میں اولاد کی خوشی آپ نے ڈالی۔ ثوبانہ کی محبت میں آپ نے مجھے اس راہ پہ چلنے سے روکا' جس کی کوئی منزل نہ تھی۔ میں اس دن بہت مضبوط ہو گئی تھی۔" وہ اپنی کلائی سے آستین اوپر کرتے ہوئے بولیں تو عمر خان نے کلائی پہ جلتے سگریٹ سے لکھے گئے ثوبانہ کے نام کو دیکھ کر اذیت سے آنکھیں موند لیں۔ سارا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا' جب وہ رو رو کے' تڑپ تڑپ کے فریادیں کر رہی تھیں اور عمر خان اپنی محبت کے چھن جانے کے صدمے میں انسانیت تک روند رہے تھے۔
"اور اب زیاد خان کی بدولت ایک اور نیکی میرا مقدر بنی کہ آپ نے میری ممتا کو اذیت سے بچایا ہے۔"
وہ کہہ کے اٹھیں تو عمر خان شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔
"فاطمہ! میرے جرم بے حساب ہیں' مجھے تسلیم۔ مگر ان کی کوئی معافی بھی تو ہو گی۔"
"خان! زیادتی آپ کے ساتھ تھی۔ آپ کیسے مجرم

ہو سکتے ہیں۔"
"میں خود کو صرف دو لوگوں کا مجرم سمجھتا ہوں۔ اس کے سامنے مجرم ہوں کہ اس کا بھرم نہیں رکھ پایا اور تمہارے ساتھ کیے گئے جرائم کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔ اس کو تو صرف محبت نہیں ملی نا۔ تم پہ تو میں نے زندگی تنگ کر دی۔ تمہیں تو میں نے جیتے جی مار ڈالا۔" انہوں نے تسلیم کیا۔
"میری طرح یکطرفہ محبت کرنے والے اپنے لیے گھانے کا سامان خود کرتے ہیں سو میں نے اسے مقدر کا لکھا سمجھ کے قبول کر لیا۔" کہتے ہوئے فاطمہ بی بی کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔
"میں نے اگر اس سے محبت کی ہے تو تم سے عشق ہوا ہے مگر یقین دلانے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جتنا تمہیں تڑپایا ہے اس سے زیادہ خود تڑپا ہوں میں۔" عمر خان کا دل لہو رونے لگا۔
"آپ کا دل جب بھی اس سے بے وفائی کرنے لگتا ہے خان! تو میری محبت بین کرتی ہے۔ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ آپ کی محبت کی حق دار صرف اور صرف وہ ہے عمر خان!"
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے وہ وہاں سے جا چکی تھیں۔
"میں نے اس سے بہت محبت کی مگر تم میرے دل میں خود بخود آن بسی ہو فاطمہ بی بی! کیسے یقین دلاؤں تمہیں۔ تمہیں خود سے دور کر کے احساس ہوا کہ مجھے تمہاری ضرورت پہلے سے زیادہ ہے۔ میں کم ظرف تھا۔ تم اعلا ظرفی کا مظاہرہ کر لو۔ معاف کر دو مجھے اور میرے وجود میں گاڑی گئی ساری کیلیں نکال دو کہ اب صرف اور صرف تم ہی یہ کر سکتی ہو۔ اس جادو کا توڑ صرف تمہارے پاس ہے جو عمر خان کی مردہ روح کو زندہ کر سکتا ہے۔" آج انہوں نے اپنے اندر اعتراف جرم کر لیا۔ مگر اب فیصلے کا حق ان کے پاس نہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جبار خان کو زیاد کے بارے میں بتاتے ہوئے انہیں شدید افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خان لالا کو بھی امید تھی کہ وہ زیاد خان کے لیے مرجانہ کی بات کریں گے۔
"خان لالا! میری خواہش تو کچھ اور تھی مگر۔" ان سے جملہ مکمل نہ ہو سکا۔
"عمر! رشتے تو نصیب سے بنتے ہیں۔ خواہشوں پہ بنتے تو آج تم یوں نامکمل اور فاطمہ بی بی یوں نامراد نہ ہوتیں۔" عمر خان نے خان لالا کے ہاتھ چوم لیے۔
"کاش خان لالا! میں کبھی تو آپ کی محبت کا حق ادا کر پاتا۔"
"عمر! محبتوں کا حق اولاد کے جذبے گروی رکھ کر ادا نہیں کیا جاتا اور دوسری اہم بات کہ میں نے تم پہ کوئی احسان نہیں کیا۔ تم میرے بھائی ہو اور بس۔" انہوں نے بھائی کو احساس شرمندگی سے نکالنا چاہا۔
اسی دوران بھابھی بھی آ گئیں اور چائے کا کپ عمر خان کی طرف بڑھایا۔
"شکریہ بھابھی!"
"کب جا رہے ہو شہر عمر خان! زیاد خان کا رشتہ لے کے۔" ان کے لہجے میں واضح کاٹ تھی جو عمر خان کے ساتھ ساتھ خود جبار خان نے بھی محسوس کی۔
"بھابھی! مجھے افسوس ہے۔" عمر خان نے سر جھکا کے کہا۔
"کس بات کا افسوس عمر خان۔ بھلا اس سلسلے میں دونوں خاندانوں کے درمیان کوئی بات طے تھی؟" جبار خان نے سختی سے کہا۔ ان کے لہجے کی سختی پہ ارشین جان نے زبان دانتوں تلے دبا لی۔
دروازے میں کھڑی مرجانہ کی تو سانس رکنے لگی۔ اس نے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے سسکیوں کو بمشکل روکا اور اندھا دھند بھاگی اور سینٹر ٹیبل سے جا ٹکرائی۔ کرسٹل کا بھاری گل دان اس کے سر پر لگا اور وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ربط خان کے بازوؤں میں جھول گئی۔ ربط خان کی آوازیں حویلی کے در و دیوار سے ٹکرانے لگیں۔
دیکھتے ہی دیکھتے سب وہاں پہنچ گئے۔ کوئی سمجھ نہیں



[illegible] کیا ہوا تھا۔ ارشین جان تو دہاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔
"گاڑی نکالو کرم داد۔" ربط اسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے پوری قوت سے چیخا۔
سب کے لبوں پہ اس کے لیے دعائیں تھیں۔ جبار بی بی اور للی بھی روتے ہوئے وہاں پہنچیں۔
"ربط خان! کیا ہوا ہے۔ کہاں چوٹ آئی ہے مرجانہ کو۔" فاطمہ بی بی کا ریڈور میں بے چینی سے ٹہلتے ربط سے پوچھا۔
"ربط! میری بچی۔" ارشین جان نے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔
"اماں! اللہ سے دعا کریں۔" وہ بتاتے ہوئے رو پڑا۔ اسے اپنی بہن اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔
عمر خان کو لگا کہ آج قدرت نے انہیں ایک اور بے گناہ کا مجرم بنا ڈالا تھا۔ تقریباً" تین گھنٹے بعد اسے ڈاکٹر نے ایمرجنسی سے کمرے میں شفٹ کیا۔ اس کا پورا چہرہ پٹیوں میں جکڑا تھا۔
شیشے کے کئی ٹکڑے اس کے چہرے پہ بری طرح لگے تھے۔
عمر خان ہسپتال میں تھے کہ زیاد خان آ گیا وہ کچھ دیر پہلے ہی گاؤں پہنچا تھا۔ وزیر نے اسے جو بتایا تھا اس نے اس کی جان نکال دی تھی۔ وہ سیدھا ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔
"ڈاکٹر زیاد۔ مریضہ کا چہرہ بری طرح زخمی ہوا ہے۔ ہم نے بہت احتیاط سے چہرے کی صفائی کی ہے۔ جب پٹی اترے گی تو صحیح صورت حال کا اندازہ ہو گا۔" ڈاکٹر کا بیان کچھ ایسا حوصلہ افزا بھی نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ باہر جا کے سب کو کیسے سمجھائے گا مگر ہمت تو کرنی تھی۔
"زیاد خان! ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ باہر آیا تو ربط بھاگ کے اس تک پہنچا۔
"ربط! مرجانہ کی حالت تھوڑی اسٹیبل ہو تو اسے شہر کے کسی اچھے ہسپتال شفٹ کرنا پڑے گا۔ چہرے کا معاملہ کافی نازک ہوتا ہے۔ اس میں رسک نہیں لیا جا سکتا۔" اس نے کچھ بھی چھپانا مناسب خیال نہ کیا۔
"زیاد! ابھی لے چلتے ہیں۔"
"ربط! اسے ہوش آنے دو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا فیصلہ کیا جائے۔" زیاد کہہ کے ارشین جان کے پاس آ گیا۔ کتنی دیر انہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر کے تسلیاں دیتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"فیض۔ فیض۔!"
دھیرے دھیرے کوئی اسے پکارے جا رہا تھا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ عجیب الخلقت مخلوق۔ کسی کی آنکھیں اتنی بڑی کہ وحشت ہو رہی تھی اور کسی کا تن ہی سر سے غائب تھا۔ طرح طرح کے بھیانک چہرے اس کے گرد دائرہ بنا کے محو رقص تھے۔ ہر کوئی اسے پکار رہا تھا۔
"ادھر آ جاؤ فیض۔ فیض میری جان میری طرف دیکھو۔ میں یہاں ہوں۔ ادھر تو آؤ۔ آ جاؤ فیض۔"
فیض مڑتا تو سمت بدل جاتی۔ وہ دیوانہ وار دوڑنے لگا سانسیں پھولنے لگیں۔ خوف سے آواز بند ہو گئی۔ وہ چیخنا چاہ رہا تھا۔ وہ اپنی مدد کے لیے کسی کو بلانا چاہ رہا تھا لیکن۔ پورا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح شبیر کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ فیض کے سامنے آ گیا مگر فیض کا وجود پتھر ہو گیا۔ وہ آگے بڑھنا چاہ رہا تھا مگر ایک قدم اٹھانے کی سکت نہ تھی۔
پیچھے سے آنے والی آوازوں پہ وہ مڑنا نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ جب بھی پیچھے مڑتا تھا وہ پتھر کا ہو جاتا تھا۔
"نہیں۔ نہیں۔ میں نہیں مڑوں گا۔ میں پتھر کا ہو جاؤں گا۔" اس کے گلے میں کانٹے چبھنے لگے۔ وہ چیخنا چاہ رہا تھا اور کوئی طاقت اس کا گلا دبائے جا رہی تھی۔ پھر وہ پوری قوت سے چیخا۔
"فیض۔ فیض۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تم ٹھیک تو ہو۔"
شبیر کی آواز پہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خوف زدہ ہو کے اس سے لپٹ گیا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔
"فیض! تم ٹھیک تو ہو۔" شبیر نے اسے جھنجوڑا۔

"ہوں میں ٹھیک ہوں۔" تھوڑا سنبھلنے کے بعد وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
ثوبانہ شاہ بھی ہانپتی کانپتی اس کے کمرے تک پہنچیں۔
"ماما... ماما۔" مہربان وجود پہ نظر پڑی تو ان سے لپٹ گیا اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے مضبوط پناہوں میں آگیا ہو۔
"کیا ہوا میری جان۔ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تھا۔" وہ اس کی حالت دیکھ کے بری طرح گھبرا گئیں۔
شبیر نے گلاس میں پانی انڈیلا اور زبردستی اس کے منہ سے لگایا۔ فیض کے ہونٹ بالکل سفید پڑ چکے تھے۔ کافی دیر بعد اس کی حالت ذرا سنبھلی تو شبیر نے فیض کا ہاتھ تھام لیا اور مسکرانے لگا۔
"ماما! میرا جی چاہتا ہے کہ کل سے اس راج دلارے کو اپنی گود میں سلایا کروں۔"
"بکومت۔" ثوبانہ شاہ نے اسے گھورا۔ "بھائی کو ریلیکس ہونے دو۔" وہ مسکرا دیا۔
یہ خواب فیض کے ساتھ جوان ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی شخصیت میں ایک خلا رہ گیا تھا۔ اسے اپنی ذات ادھوری لگتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا آدھا حصہ کہیں اور تھا۔ کچھ ایسا ہے جو خواب بن کے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے لیکن وہ جو کچھ بھی ہے بہت وحشت ناک ہے۔ اسے آنے والے وقت سے ڈر لگتا تھا۔
"اب ٹھیک ہو نا فیض۔" ثوبانہ نے اس کا ہاتھ تھام کے محبت سے پوچھا۔
"جی ماما! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"
"آئیں ماما! میں آپ کو کمرے میں چھوڑ آؤں۔" شبیر ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔
وہ رات پھر رت جگا لے کے ثوبانہ شاہ کے کمرے میں اتری۔
"فیض میری جان! ماں کے جلے ہوئے خوابوں کی راکھ تیرے وجود میں کیسے مٹی بن کے داخل ہو گئی ہے۔ سنگ تو میرے وجود پہ گرے تھے۔ پھر تو کیوں ہو جاتا ہے۔ اذیت تو میں نے جھیلی تھی تیرا وجود کیوں زخمی ہو جاتا ہے۔ چوٹیں تو میرے جسم پہ لگی تھیں لہو لہو تیرا وجود کیوں ہو جاتا ہے۔
کاش! میں سنبھل جاتی۔ ان کا مان نہ توڑتی۔ کاش! میں رک جاتی۔ کاش! مجھے عمر خان سے محبت نہ ہوئی ہوتی۔ اس حقیقت سے نظریں نہ چراتی کہ ماں کی مرضی کے بغیر حاصل ہونے والی محبت کی حیثیت پانی کے بلبلے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پل میں ٹوٹ کے بکھر جاتی ہے۔ سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ پھر انسان ساری عمر میری طرح سفر میں رہتا ہے۔"
کم از کم ثوبانہ شاہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر کبھی کبھی احساس ہوتا کہ وہ بھی تو بہت بے درد ہو گئی تھیں۔ کس بری طرح ڈیڈی کا مان توڑا تھا۔ ان کے انکار کے بعد کس دھڑلے سے کورٹ میرج کر لی تھی۔
ان کی بہن نے اپنے آٹھ ماہ کے بلکتے ہوئے بیٹے کو سنبھالتے ہوئے انہیں سمجھایا تھا۔
"ثوبانہ! رشتے ایسے نہیں بنتے کہ دو بندے کاغذ کے بے جان ٹکڑوں پہ دستخط کر آئیں۔ اس کے لیے دلوں کی رضامندی چاہیے ہوتی ہے۔"
"آپی لیلیٰ تو ہم دونوں کے راضی ہیں تو پھر ڈیڈی کیوں نہیں مان جاتے۔ کم از کم اب تو اسے تسلیم کر لیں۔ اب تو رشتہ بھی بندھ چکا ہے۔ ہم دونوں نے شادی کر لی ہے۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔ کتنا غرور تھا اس وقت ان کے لہجے میں۔
"ڈیڈی کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ان کی اس شہر میں برسوں سے بنائی ہوئی عزت ہے۔ تم اس سے طلاق لے لو۔ خدا کے لیے۔" آپی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
"ڈیڈی! طلاق کے بجائے مجھے اس کے سنگ رخصت کیوں نہیں کر دیتے۔ عزت ہی بچانی ہے تو۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی تھیں۔
"ماں باپ کو بھی تو اولاد کی خوشیوں کی پروا ہونی چاہیے۔ کیا اولاد کو اپنی خوشی اور اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا کوئی اختیار نہیں۔"



"اور ان کا اولاد پہ کوئی حق نہیں جنہوں نے اسے پال کے جوان کیا، پڑھایا لکھایا۔" لائبہ واحدی کے ہونٹوں پہ دکھتی ہوئی مسکراہٹ ابھری۔
"تو کیا ان ساری قربانیوں کا خراج اولاد کے دل کی خوشیاں ہیں۔"
"انہیں تمہاری خوشیوں سے کوئی بیر نہیں ثوبانہ۔ وہ صرف تمہیں ڈوبنے سے بچانا چاہتے ہیں مگر تم نے بہت جلدی فیصلہ کر لیا۔"
"آپی! عمر خان سچا ہے، اس لیے اس نے مجھ سے نکاح کیا ہے۔ عیاش لوگ نکاح کے بندھن نہیں باندھا کرتے۔ مقدس رشتے نہیں جوڑا کرتے۔" وہ فخریہ گویا ہوئی۔
"رشتے تو بندھ ہی جاتے ہیں ثوبانہ... دعا کروں گی کہ وہ اس رشتے کا بھرم بھی رکھے۔"
"وہ ایسا کرے گا آپی!" ثوبانہ کو اندھا اعتماد تھا۔
"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ تمہارا بھرم کبھی نہ ٹوٹے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تم نے ایک رشتے کے لیے بہت سے رشتے کھو دیے ثوبانہ!" لائبہ واحدی نے بھیگی آواز میں کہا۔
"آپی! جن رشتوں کے کھونے کی بات آپ کر رہی ہیں وہ پہلے بندھا گئے ہیں۔ نہیں بندھے۔ ڈیڈی اپنے نام کو میری ولدیت کے خانے سے کبھی نہیں نکال سکتے۔ روز قیامت مجھے میری ماں کے نام سے ہی پکارا جائے گا۔ آپ لوگوں سے میرا رشتہ تو ہمیشہ رہے گا۔ البتہ اپنی محبت کھو دیتی تو تمام عمر ڈھونڈتی رہتی۔" ان کے لہجے سے کسی کی محبت کا نشہ جھلک رہا تھا۔
"ثوبانہ! محبت تو تم نے پالی مگر ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت ہمیشہ کے لیے کھو دی۔ جاؤ اور اپنی فتح کا جشن مناؤ۔ اپنے آپ کو اپنی ہی دعاؤں میں رخصت کر لو۔ اپنے سر پہ قرآن کی چھاؤں ضرور کرنا کہ اس کی ضرورت ہر لمحہ پڑتی ہے۔ ابھی اپنی خوشیوں نے شاید تمہیں سب کچھ بھلا رکھا ہے۔" لائبہ کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔
"آپی! آپ ڈیڈی کو سمجھائیں نا وہ کل آئے گا۔ اب وہ میرا شوہر ہے۔ اسے تسلیم کر لیں۔" انہوں نے آخری کوشش کرنا چاہی مگر شدید ناکامی ہوئی۔ عثمان شاہ طیش میں آگئے اور اسی وقت اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ گڑگڑائیں، روئیں تڑپیں لیکن کوئی کچھ نہ کر سکا۔ وہ گھر سے یوں نکل گئیں جیسے آنکھ کا آنسو۔

☼ ☼ ☼

"کہاں ہو تم زیاد۔ دو دن سے تمہیں ٹرائی کر رہی ہوں۔ خیریت تو ہے۔" ساریہ نے جیسے ہی محسوس کیا کہ دوسری طرف فون اٹھا لیا گیا ہے تو بنا رکے بولی۔
"خیریت ہی تو نہیں ہے ساریہ!"
"یا اللہ خیر۔ زیاد کوئی بری خبر نہ سنانا۔" وہ گھبرا گئی۔
"ساریہ۔" وہ رکا تو جیسے ساریہ کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔ "ساریہ! میری کزن مرجانہ بہت بری طرح زخمی ہو گئی ہے۔" جانے وہ اس کے ظاہری زخموں کی بات کر رہا تھا کہ یا وہ جو دل پہ کھا بیٹھی تھی۔
"کیسے زیاد... کیسے زخمی ہو گئی ہے۔" ساریہ جانتی تھی کہ زیاد کو مرجانہ بالکل اپنی بہن لالئی کی طرح عزیز تھی۔
"شیشے کی ٹیبل سے ٹکرا کر زخم کھا بیٹھی ہے۔ اس کے چہرے پہ بہت بری طرح زخم آئے ہیں۔ سب پریشان ہیں۔"
"اوہ... سو سیڈ..."
"ساریہ! میں اس وقت ہسپتال میں ہوں۔ تم سے بعد میں بات کروں گا۔" زیاد نے کہہ کے فوراً لائن کاٹ دی۔ اس وقت وہ خود سے بھی بھاگ رہا تھا۔
آج لالئی نے کیا انکشاف کر ڈالا تھا کہ زیاد خان کا پورا وجود سنگ اٹھا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مرجانہ اسے چاہنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ اپنا سر دیوار سے دے مارے۔ بابا نے بھی اسے حیران کر ڈالا کہ وہ خان لالا سے اس کے اور ساریہ کے رشتے کی بات کرنے گئے تھے کہ یہ سب ہو گیا۔ گویا کہ بابا کو اس کی پسند پہ کوئی اعتراض نہ تھا لیکن مرجانہ... خدایا!

یہ کیا پاگل پن ہے۔ وہ بے وقوف لڑکی ایسا کیسے سوچ سکتی ہے۔ میں نے اسے کبھی اس انداز سے نہیں دیکھا۔ نہ ہی اسے کوئی محبت بھری امید دلائی۔"

ان حالات میں وہ ساریہ سے بھی کھل کے کوئی بات نہ کرسکا۔ جب تک اس کی بابا سے کوئی حتمی بات نہ ہوجاتی، وہ اس سے کیا کہتا۔ دل کے اندر یہ احساس بھی بہت اطمینان بخش تھا کہ بابا کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بابا جان کا خان لالا سے بہت گہرا قلبی رشتہ تھا۔ وہ دونوں یک جان دو قالب تھے۔ اس لمحے ان کا درد کسی طرح بھی خان لالا اور ان کے خاندان سے کم نہ تھا۔ خود اسے بھی عجیب پشیمانی نے گھیر رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بابا زندگی کے جن تلخ تجربوں سے گزرے ہیں اس کے بعد وہ کبھی زیاد خان کو مجبور نہیں کریں گے۔

"کسی کی خوشیاں کسی کی زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہیں۔ اے خدا محبت خود بخود کیوں دلوں میں بسیرا کرلیتی ہے اور اگر ساریہ کے دل میں میری محبت کا بیج بویا تھا تو پھر مرجانہ کو یہ درد کیوں دے دیا۔"

ہسپتال آنے کا حوصلہ تو نہیں تھا مگر یہ اس کی ڈیوٹی بھی تھی اور فرار کا کوئی راستہ تھا بھی نہیں۔ سوائے ربیط خان کے اس نے سب کو زبردستی گھر بھیج دیا۔

"ربیط۔ تم بھی آرام کرلیتے۔ میں ہوں نا یہاں۔"

"زیاد! وہ ٹھیک تو ہوجائے گی نا۔ ڈاکٹر اس کے چہرے کے زخموں کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ اس کا چہرہ ٹھیک تو ہوجائے گا نا۔" وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔

"ربیط! ڈریسنگ کھلے گی تو سب کلیئر ہوگا۔ تم اللہ سے دعا کرو۔ وہ سب بہتر کرے گا۔" وہ اسے حوصلہ دے کے اس کے روم کی طرف آگیا۔ سوائے آنکھوں کے پورا چہرہ سفید پٹیوں میں جکڑا تھا۔ غیر متوقع طور پہ وہ اس وقت ہوش میں تھی۔

"مرجانہ۔ کیسی ہو۔" ہمت کرکے اس کے قریب آیا اور تھوڑا اس پہ جھک کے پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

وہ تو زیاد خان کو چھوٹی سی نازک سی گڑیا لگی۔ جسے دیکھ کر بے ساختہ پیار آتا تھا۔ سرخ و سفید رنگت پہ نیلی نیلی آنکھیں گھماتی پیاری سی باربی ڈول۔ اسے بالکل لالئی اور ملالئی کی طرح عزیز تھی مگر اسے اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ وہ بے جان گڑیا نہیں بلکہ جیتی جاگتی لڑکی تھی۔

"مجھے کیا ہوا ہے۔ میرا چہرہ۔" اس نے جونہی ہاتھ چہرے کی طرف لے جانے چاہے، زیاد اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ فوراً اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"ارے تمہیں ڈرپ لگی ہے، ہاتھ مت ہلاؤ۔"

"مجھے کیا ہوگیا ہے۔" وہ تڑپ تڑپ کے رودی۔

"میری طرف دیکھو مرجانہ۔" زیاد خان نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کے اپنی طرف مڑنے کے لیے کہا تو ایک لمحے کے لیے وہ اس سے نظریں ملا پائی اور ساون کی جھڑی آنکھوں کو جھل تھل کرگئی۔

"تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ گی۔ صرف چند دنوں کی بات ہے۔" اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

"مرجانہ۔ ناراض ہو مجھ سے۔" زیاد چاہتا تھا کہ اس کے اندر سے اس غبار کو ہلکا کرے، جو اس کے دل پہ بوجھ بنا ہوا تھا۔

"ادھر دیکھو۔ میری طرف۔" اس نے پھر پکارا مگر اس کا چہرہ بدستور دوسری طرف ہی رہا۔

"مرجانہ! یقین جانو، میں نے ہمیشہ تمہیں لالئی اور ملالئی کی طرح سمجھا ہے۔ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں بھلا آپ سے کیوں ناراض ہوں گی۔" کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

"دیکھو مرجانہ! زندگی میں ہر چیز حسب خواہش نہیں ملتی۔ جو نصیب میں نہ ہو، اسے چھینا نہیں جاسکتا۔"

میں نے ایسا کیا مانگ لیا تھا کہ میری دعا رائیگاں ہوگئی۔ نامراد لوٹ آئی۔ کیا ہوجاتا اگر آپ مجھے مل جاتے۔" اسے بولتے ہوئے تکلیف ہورہی تھی۔



"کیا پتا کسی اور نے مجھے تم سے زیادہ شدت سے چاہا ہو۔" زیاد نے دھیمے لہجے میں کہا۔ تو وہ افسردگی سے مسکرادی۔

"کوئی آپ کو مجھ سے زیادہ نہیں چاہ سکتا۔ ہاری میں اس لیے ہوں کہ اس کی دعاؤں کے پیچھے آپ کے بابا تھے۔" زیاد خان کو اس کے انداز گفتگو پہ حیرت ہوئی کہ وہ اتنی گہری باتیں بھی کرسکتی تھی۔

"مرجانہ! میں نے تمہیں حقیقتاً لالئی کی طرح سمجھا ہے۔ اب تم لاکھ کچھ اور سوچو مگر میرے دل نے جو رشتہ باندھا ہے اس کے تقدس میں کوئی فرق نہیں آنے دوں گا۔"

مرجانہ نے اذیت سے چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب آگئے اور اسے سکون کا انجکشن دے دیا جو اس کے لیے بہت ضروری تھا۔

ساریہ نے اسے دوبارہ فون کرکے بابا سے بات کرنے کا کہا مگر اس کے بات کرنے سے پہلے ہی بابا نے اس سے خود ہی بات کرلی اور اسے اپنی رضامندی دے دی۔

"بابا! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" بادامی شلوار قمیص میں اپنی بلند قد و قامت سے بے نیاز وہ ننھے بچے کی طرح عمر خان کی گود میں سر رکھ کر بولا۔

عمر خان نے پدرانہ شفقت سے بھرا ہاتھ اس کے سلیقے سے بنے گھنے بالوں پہ پھیرا۔

"چلو شکر ہے، کسی کو تو مجھ سے سکھ ملا۔" وہ ہلکے سے ہنس کے بولے۔

"بابا! آپ کا وجود تو ہمارے لیے سر پہ ٹھنڈا سایہ ہے۔ خود تمام عمر آپ تپتی دھوپ میں جھلستے رہے مگر ہمیں دھوپ کی شدت سے بچائے رکھا۔ کاش! میں آپ کے لیے کچھ کرسکتا۔" زیاد خان ان کے دکھوں سے ناآشنا تو نہیں تھا۔

"زیاد! تم نے اپنی ماں سے بات کی؟"

"ابھی تو آپ سے ہی بات ہوئی ہے۔" وہ ربھک کے بولا تو عمر خان نے اس لمحے ہاتھ اٹھا کے اس کی خوشیوں کے لیے ڈھیروں دعائیں کرڈالیں۔

"شکر ہے پاک پروردگار! تو نے میرے بیٹے کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ میں اس دکھ کی اذیت سہہ چکا ہوں اس لیے اس تکلیف سے واقف ہوں۔ اے اللہ! تو اس معصوم کے دل پہ بھی مرہم رکھ دے جو اس وقت دم ہونے کی اذیت سے گزر رہی ہے۔"

انہوں نے ہاتھ اٹھائے تو مرجانہ کا معصوم چہرہ نظروں کے سامنے آگیا۔ وہ بھی تو ان کی اولاد تھی۔ اس کی تکلیف بھی تو انہیں اپنے دل پہ محسوس ہورہی تھی مگر وہ مجبور تھے۔

☼ ☼ ☼

"یار! قسم سے لائف کا گولڈن پیریڈ یونیورسٹی کے یہ کچھ سال ہوتے ہیں۔ کیا شان ہوتی ہے بندے کی۔ نور ہی بدل جاتی ہے۔"

عثمان نے سامنے گزرتی چند لڑکیوں پہ نظر جاتے ہوئے کہا تو سمیع اللہ نے اس کی بات کی تائید کردی۔ فیض نے گھورتے ہوئے انہیں دیکھا جن کے خیالات کے حق میں شبیر بھی سرہلا رہا تھا۔

"کچھ تو شرم کرو۔ بکواس کرنا تم لوگوں نے اپنی ہابی ہی بنالی ہے۔"

"یار! کم از کم اس عمر کو تو انجوائے کرنے دو۔ آگے کون سی زندگی پھولوں کے ہار لیے کھڑی ہے۔ پھر ہم ہوں گے اور یہ زندگی کے مشکل مرحلے۔ کبھی رودیں گے اور کبھی ہنس پڑیں گے۔"

"بھائیوں! اس کے اندر تو کسی بوڑھے سادھو کی روح سرایت کرگئی ہے۔ اسے نہ تو گلاب جیسے مہکتے وجود اپنی طرف متوجہ کرسکتے ہیں اور نہ بہار کے رنگوں سے اسے کوئی مطلب ہے۔ بلکہ خوب صورت لوگوں سے تو اسے الرجی ہے۔" شبیر نے دکھی انداز اپناتے ہوئے کہا۔

"یہ تو واقعی کافی پریشان کن معاملہ ہے۔" عثمان نے کہہ کے سب کی جانب دیکھا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس کے بجائے تم

میں سے کوئی میرا بھائی ہوتا تو دنیا دیکھتی کہ ہم کس بلندی تک جاتے۔" شبیر پہ فیض کا زور دار ہاتھ پڑا۔ وہ بلبلا کے رہ گیا۔

"تم لوگ کیفے پہنچو میں ذرا لائبریری سے ہو کے ابھی آیا۔" فیض نے کہا تو ان سب کا منہ بن گیا۔

"ہمیشہ اس کی عادت ہے جب کبھی ریلیکس ہونے کا موڈ بنتا ہے یہ کہیں نہ کہیں جانے کا شوشا چھوڑ دیتا ہے۔" شبیر نے غصے سے کہا۔

فیض اس کی بات سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا اس لیے لائبریری کی طرف بڑھ گیا اس کا ارادہ تھا کہ وہ کتاب ایشو کروا کے واپس آجائے گا۔ مگر کچھ عجیب صورت حال سے دوچار ہو گیا۔ ابھی وہ راہداری میں داخل ہی ہوا تھا کہ اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ دل جیسے بیٹھا چلا جا رہا تھا۔ ہلکے ہلکے پسینے آنے لگے۔

"ایکسوزمی فیض!" سو فیصد وہی آواز تھی۔ فیض کو وہم سا لگا مگر اس دوران دوبارہ اسی آواز نے اس کا نام پکارا۔ جونہی فیض مڑا پتھر کا ہو گیا۔

"کبھی ایسا ہوا ہے کہ خواب حقیقت بن جائیں؟" سوچنے کے قابل ہوا تو پہلا سوال خود سے کیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں ہو جاتا ہے ایسا۔۔۔ کم از کم میرے ساتھ تو ہو گیا ہے۔" کوئی اس کے اندر چیخا۔

خوف سے فیض نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھ لیے۔

شمائلہ اور عائلہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس کی نازک مزاجی پہ حیران ہوئیں۔

"ارے فیض! کیا ہوا۔" ارد گرد کھڑے کئی یونیورسٹی فیلوز ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے۔

رش لگتے دیکھ کر وہ دونوں وہاں سے نکل گئیں۔

اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ شدید خوف سے جیسے اس کی آواز ہی بند ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا مگر آواز بالکل بند ہو چکی تھی۔

"فیض! تم ٹھیک تو ہو۔"

"کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔"

"تھوڑا پانی پیو۔" کسی نے کہا۔

فیض نے پانی پیا تو تھوڑی حالت سنبھلی۔

"کیا ہوا ہے۔۔۔؟" نجانے شبیر کو کیفے میں کس نے اس کی طبیعت کی خرابی کا بتا دیا تھا۔ باقی گروپ بھی ان کے ساتھ تھا۔

"فیض۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔" اس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" اس نے بمشکل جواب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر جواب نہ ملا تو شبیر کی حالت اس سے زیادہ خراب ہو جائے گی۔

"ہٹو۔۔۔ شبیر۔۔۔ فیض یہ جوس پیو۔" عثمان جلدی سے جوس لے آیا۔ وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔

"چلو۔۔۔ اٹھو۔" سمیع اللہ نے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے خود اٹھنا چاہا مگر سر بری طرح چکرانے لگا۔ وہ بمشکل گاڑی تک آیا۔

"عثمان! کیوں نہ ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے لیں۔" شبیر نے کچھ دیر بعد کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں ایک اچھے ڈاکٹر کو میں جانتا ہوں بڑے بھائی کے کلاس فیلو تھے۔ میں ابھی بات کر لیتا ہوں۔" امجد نے حسب خدمات پیش کیں۔

گھر آ کے فیض خود پہ قابو پا چکا تھا۔ ان سب نے مل کر ثوبانہ شاہ سے فرمائشی کھانا پکوایا۔ شام کو سب گئے تو شبیر کے پژمردہ سے انداز کو ثوبانہ شاہ نے بھی محسوس کیا کہ اس کے اندر ہمیشہ والی زندہ دلی نہیں تھی۔

رات شبیر ثوبانہ شاہ کو ٹیبلٹس دینے گیا تو انہوں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"میرا خیال ہے اب میں اپنے شہزادے کے لیے ایک پیاری سی دلہن لے آؤں۔ جو میرے بیٹے کا خیال رکھا کرے۔" ثوبانہ شاہ نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"اور اگر اس نے الٹا آپ کے شہزادے کو تنگ کرنا شروع کر دیا تو۔۔۔" وہ ماں کی خاطر نارمل ہونے لگا۔

"اللہ نہ کرے۔ میں تو بہت چن کے چاند سی بہو لاؤں گی۔"



"ماما! میں نے کبھی خوب صورتی کو معیار نہیں جانا۔ لڑکی جب بھی دیکھیں بس یہ دیکھیے گا کہ وہ ہو گھریلو سی ہو۔ کھانے اچھے بنائے اور رشتے نبھا سکے۔ شکل و صورت تو خدا کی دین ہوتی ہے۔" وہ شاید زندگی میں پہلی دفعہ اتنا سنجیدہ ہوا تھا۔

دروازے میں کھڑے فیض کو اس کے سوچنے کے انداز پہ حیرت ہوئی۔ وہ تو اسے بہت زیادہ لاپروا سا ہر خوب صورت چہرے پہ فدا ہو جانے والا لگتا تھا۔

"ارے میرا بیٹا اتنا سمجھ دار ہے۔۔۔ ہے نا فیض!" ثوبانہ شاہ نے دروازے پہ کھڑے فیض کو بھی شامل کیا۔

"ماما! اس کے لیے کوئی لڑکی بھی تو دیکھنی شروع کریں۔ گھر میں ان دونوں کا شور شرابا ہو اور ہم دونوں ان کے جھگڑوں کو خوب انجوائے کریں۔" فیض نے کہا تو جھٹ بولا۔

"اللہ نہ کرے کہ ہمارے درمیان کوئی لڑائی جھگڑا ہو۔ میں تو اسے بہت پیار اور احترام دوں گا۔ میں تو بہت پرسکون سے گھر کی خواہش رکھتا ہوں اور پھر میں بہت سنجیدگی سے اپنے گھر پہ توجہ دوں گا۔" وہ آنکھیں موندتے ہوئے ایک جذب سے بولا۔

"ان شاء اللہ میں اپنے بیٹے کے لیے ایسی ہی دلہن لاؤں گی جو میرے شبیر کا دل اور گھر دونوں آباد کرے۔" ثوبانہ شاہ کو اپنے بیٹے کی اتنی اچھی سوچ پہ مسرت ہوئی اور اس کے لیے ڈھیروں دعائیں کر ڈالیں۔

"ماما! اب آپ سو جائیں۔۔۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" شبیر نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

شب بخیر کہہ کے دونوں اپنے کمرے میں آئے تو شبیر اس کی طرف مڑا۔

"کیا ہوا تھا جب تم لائبریری گئے تھے۔"

"شبیر! میں وہاں اپنے خواب کی تعبیر سے ٹکرا گیا تھا۔ مگر وہی چہرہ خواب میں تو بہت ہی ڈراؤنا ہوتا ہے لیکن وہ تو۔۔۔" وہ کہتے ہوئے رک گیا۔

"کون سا چہرہ۔۔۔؟" شبیر فوراً اٹھ بیٹھا۔

"جو بچپن سے میرے خواب میں آتی ہے مگر وہ تو بہت پیاری سی ایک لڑکی ہے۔" فیض کی نظروں کے سامنے شمائلہ کا چہرہ گھوم گیا۔

"کون تھی وہ۔۔۔!" شبیر نے پھر پوچھا۔

"شبیر! وہ وہی تھی۔۔۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ وہی تھی جو میرے خواب میں آتی ہے مگر وہاں وہ بدصورت اور خوفناک چہرے والی مخلوق لگتی ہے۔ میں اس سے وہاں راہداری میں ٹکرا گیا تھا۔"

"اوہ تو یہ کارنامہ انجام دیا ہے محترم نے۔ شرم تو نہیں آئی ایک لڑکی سے ٹکرا کے یہ حال ہوا ہے محترم کا۔" شبیر ہنس پڑا۔

"نہیں شبیر! میں الجھ گیا ہوں۔۔۔ میں جب خواب میں اس کے پکارنے پہ پلٹتا ہوں تو پتھر کا ہو جاتا ہوں۔ خیر پتھر تو میں آج بھی ہو گیا تھا۔" اسے شبیر سے کچھ بھی چھپانے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔

"تو اس کے پاؤں بھی تو دیکھ۔ کوئی چھلاوہ چڑیل تو نہیں تھی۔" شبیر نے بات مذاق میں کی مگر جواب بہت سنجیدگی سے آیا اور شبیر سن کے پریشان بھی ہو گیا۔

"شبیر! خواب میں وہ جو بھی لگتی تھی مگر آج اسے جب یونیورسٹی میں دیکھا تو یقین کرو وہ بہت ہی اچھی لگی مجھے اور سچی بات ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ مجھے پہلی ہی نظر میں اس سے پیار ہو گیا ہے۔ مجھے شدت سے کل دوبارہ اسے دیکھنے اور ملنے کا دل کر رہا ہے۔" اس نے صاف دل کی بات کہہ دی۔ وہ ہلکا سا ہنس کے اپنے بیڈ پہ آ کے لیٹ گیا۔

شبیر کے کانوں میں کسی کا کہا ہوا جملہ گونجنے لگا۔

"کبھی کبھی خواب ماضی اور مستقبل کے درمیان زنجیر ہوتے ہیں۔ انہیں اگنور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ آنے والے وقت کا اشارہ دیتے ہیں۔" وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"سو گئے شبیر۔۔۔" اس کے بعد فیض نے دو تین آوازیں دیں مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا کہ جیسے سو گیا ہو۔ وہ ساری رات نہ سو پایا۔ اس نے وہ رات جاگتے ہوئے گزاری۔ صبح سر درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔

فیض کو چھٹی کرنے کا کہا تو اس نے صاف انکار کر

دیا۔ شبیر اس کے انکار پر تپ گیا۔ شبیر کے ساتھ ساتھ ثوبانہ شاہ کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا وہ تو اس کے بغیر کبھی اسکول کالج یا یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔

شبیر فوراً اٹھ کھڑا ہوا کہ اسے فیض کو اس سے بچانا تھا۔ یہ جو سب اتنا اچانک ہو رہا تھا' وہ شبیر کو ڈرا رہا تھا۔

لیکن برا تو فیض کے ساتھ ہوا جو شبیر کو لے دکھانے کے لیے ایک ایک ڈپارٹمنٹ گھما رہا تھا مگر نہ وہ نظر آئی اور نہ کوئی پتا ملا۔

"مجھے یقین ہو گیا ہے وہ کوئی اور مخلوق تھی۔" شبیر نے کہا تو وہ چپ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

زیاد کے بابا جان اس رشتے پر راضی ہیں۔ مرجانہ ٹھیک ہو جائے تو وہ باقاعدہ ان کے گھر رشتہ لے کر آئیں گے۔

گھر میں سب نے یہ خبر خوشی سے سنی۔ ڈیڈی کو اس کی پسند پہ قطعاً" کوئی اعتراض نہ تھا۔ اسی شام فیض اور شبیر بھی ثوبانہ شاہ کے ساتھ آ گئے اور اس کی تو شامت آ گئی۔ عبید بھائی اور راحیلہ بھابھی کے شرارت بھرے جملے اور فیض اور شبیر کے جملے وہ تو جیسے رو دینے والی ہو رہی تھی۔ بالآخر ثوبانہ شاہ کو ہی اس کی مدد کرنی پڑی۔

"بس بھئی۔۔۔ خبردار! اب کسی نے میری بچی کو تنگ کیا تو۔۔۔"

"ارے ارے۔۔۔ بچی تو دیکھو۔۔۔ ساڑھے چھ فٹ کے پٹھان کو قابو کر لیا ہے اور ابھی بچی ہی ہے۔" شبیر کی بات پہ ثوبانہ شاہ کا دل ایک دم بدلا۔

وہ تو صرف اس حد تک واقف تھیں کہ زیاد' ساریہ کی طرح ڈاکٹر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اب لڑکے والے رشتہ لانا چاہ رہے ہیں اور بس۔۔۔ لڑکا کون تھا۔۔۔ کہاں کا تھا۔ انہیں ابھی کچھ علم نہ تھا۔

لیکن پانچ دن کے بعد جب زیاد خان' ساریہ کے گھر کے گیٹ سے داخل ہو رہا تھا تو ثوبانہ شاہ چکرا کے رہ گئیں۔ اس کے ساتھ داخل ہونے والے شخص کو وہ

اگر بھولنا بھی چاہتیں تو بھلا کیسے بھولتیں۔ وہ ان کا مجازی خدا تھا۔ وہ عمر خان تھے' جن کے ساتھ ایک کاغذی رشتہ وہ آج تک نبھا رہی تھیں۔ وہ رشتہ انہوں نے سب کچھ ہار کے باندھا تھا۔

"ثوبانہ! آؤ ذرا ڈرائنگ روم میں۔۔۔ مہمان آ گئے ہیں۔" لائبہ واحدی کی آواز پہ وہ چونکیں۔

"ہوں۔ ہاں۔۔۔ کون کون آیا ہے۔" اس نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"زیاد اور اس کے بابا ہیں۔ اور دیکھا ان باپ بیٹے کو ابھی تک نہیں پہنچے۔" لائبہ واحدی نے پریشانی سے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپی! میرا ملنا کیا ضروری ہے جب اس کی ماں وغیرہ آئیں گی' تب مل لوں گی۔" اس نے حواس بحال کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں بھئی۔۔۔ زیاد سے بھی تو مل لو۔۔۔ اور میں ذرا کچن دیکھ لوں۔"

"اچھا آپ چلیں میں آتی ہوں۔"

"خدایا! میری عزت رکھ لے کہ میں بہت گنہگار ہوں اور اس بچی ساریہ کی خوشیوں کی حفاظت بھی کرنا۔" وہ جھولی پھیلا کے اوپر دیکھنے لگیں۔

"تم ایک دفعہ پھر شکار کھیلنے جنگل کے بجائے شہر کی طرف آ نکلے ہو عمر خان! اب ایک معصوم کو تم لوگوں کی ظاہری خوب صورتی آکٹوپس کی مانند قابو کر لے گی اور پھر اسے کسی رسم کی بھینٹ چڑھا لیتا ہوں کہ زندگی اس پہ شجر ممنوعہ ہو جائے۔ ایک اور معصوم دل شکار بنے گا لیکن اس بار میں تمہیں اتنی آسانی سے اپنی بچی کا شکار نہیں کھیلنے دوں گی۔"

ذہنی تناؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اور پھر نجانے کیا ہوا۔ جب ہوش آیا تو وہ ہسپتال کے بیڈ پہ تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اماں! آپ بابا سے فون کر کے پوچھتیں تو سہی کہ وہاں کیا بات ہوئی۔ بابا کی ان لوگوں کے بارے میں کیا رائے ہے اور ان لوگوں نے کیا کہا۔"



لالئی نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ رشتے جبراً نہیں کیے جاتے۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اس کے جان سے پیارے لالا کو اس کی خوشی مل جائے اور اس کے ساتھ اماں اور بابا بھی ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔

"لالئی! بچے تم خود ہی پوچھ لو نا۔" انہوں نے الجھتے ہوئے کہا مگر آج وہ ضد پکڑ گئی۔

"اماں! اچھا لگے گا میرا بابا سے پوچھنا۔ یہ تو بڑوں کے معاملات ہیں۔" ساتھ ہی اس نے عمر خان کا نمبر ملا کے فاطمہ بی بی کی طرف بڑھا دیا جسے مجبوراً انہیں تھامنا پڑا۔

"ہیلو۔۔۔" عمر خان کی آواز ماؤتھ پیس میں گونجی۔

"ہیلو۔۔۔ خان! میں۔۔۔ کیسے ہیں آپ۔"

لالئی چپکے سے اٹھ کے باہر نکل گئی۔

"کیسی ہو فاطمہ۔۔۔!" عمر خان کو یقین نہ آیا کہ وہ انہیں فون کریں گی۔

"شکر ہے اللہ کا۔۔۔ وہاں تو سب ٹھیک ہے نا۔۔۔"

"بالکل ٹھیک ہیں۔۔۔ سب لوگ بہت اچھے ہیں ۔۔۔ ہمیں اپنے بیٹے کی پسند دل سے پسند آئی ہے۔" وہ بہت خوش تھے۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔۔۔ تو پھر بات کی آپ نے۔"

"بات تو آپ ہی کریں گی آ کے۔۔۔ ہم نے تو مل لیا ۔۔۔ اور اوکے کی رپورٹ ہے اور اس وقت بات کرنے کی پوزیشن بھی نہیں تھی۔ ساریہ کی خالہ کو ہارٹ کا کچھ پرابلم ہو گیا تھا کل ان ہی کے گھر میں۔۔۔ اس لیے اس پریشانی میں بات کرنا مناسب نہیں لگا۔" انہوں نے تفصیلاً" بتایا۔

"اب کیسی طبیعت ہے ان کی۔" فاطمہ بی بی نے پوچھا۔

"زیاد خان ہی ملا ہے۔۔۔ جب آپ آئیں گی تو مل کے دیکھنے چلے جائیں گے۔"

"اچھا چلیں پھر بات ہو گی' میں نے اسی لیے فون کیا تھا۔"

"کاش! یہ فون آپ نے میرے لیے کیا ہوتا۔" ایک آہ سی دل سے نکلی۔

"اگر آپ نہ بھی بتاتیں تو میں جانتا تھا کہ آپ نے یہ فون کس لیے کیا ہے۔ مجھے کبھی یہ خوش فہمی نہیں رہی کہ آپ مجھ سے کوئی رابطہ کریں گی۔" وہ کہے بنا نہ رہ پائے۔

"کک۔۔۔ کیا مطلب' خان! کیا مجھ سے کوئی غلط بات ہو گئی ہے؟"

"فاطمہ! کیا آپ نہیں جانتیں کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ ہر وقت' ہر لمحہ اور ہر قدم پہ۔۔۔" جب انسان کو اس بات کا پتا ہوتا ہے کہ وہ جس سے مخاطب ہے وہ صرف اسے سن سکتا ہے' دیکھ نہیں سکتا تو وہ ہر بات کہہ دینے کا حوصلہ کر لیتا ہے۔ عمر خان نے بھی کچھ ایسا ہی کیا۔

"خان! میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وقت کے ساتھ گھر میں رکھی بے جان چیزوں سے بھی انسیت ہو جاتی ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ تلخی سے مسکرائیں۔

"شاید وقت میرے ہاتھوں سے نکل چکا ہے فاطمہ ۔۔۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں بہت تھک چکا ہوں۔" وہ مایوسی سے بولے۔

"خان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ پریشان لگ رہے ہیں۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائیں۔

"فاطمہ۔۔۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میری محبت' میری نفرت سے جیت گئی ہے۔" فاطمہ بی بی نے ریسیور رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ دل اپنی گہرائی میں چھپے راز کو کھول دے۔

فون رکھنے کے بعد وہ عمر خان کے بارے میں سوچنے لگیں۔ وہ بہت پریشان ہو گئی تھیں کہ اب عمر خان کا لہجہ بہت جھکنے لگا۔ ان سے رشتہ تکلف کے پردوں میں کہیں کھو گیا تھا ورنہ ہر ممکن کوشش کرتیں کہ ان کے کہے ان کہے ہر زخم کا مرہم بن جاتیں۔

"اماں! ابا کیا کہہ رہے تھے بابا۔۔۔" کچھ دیر بعد لالئی کمرے میں آئی اور فاطمہ بی بی کے سامنے بیٹھ گئی۔
"کہہ رہے تھے کہ وہ لوگ اچھے ہیں۔ خان کو پسند آئے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگیں۔
"اماں! آپ کیا سوچ رہی تھیں۔" لالئی نے گہری نظروں سے ماں کے چہرے کا محاصرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ شاید ماں کے چہرے پہ کچھ ڈھونڈنا چاہ رہی تھی لیکن اسے وہاں صرف گہری سوچ ہی نظر آئی۔ سنجیدگی کے گہرے بادل تھے جنہوں نے اس کی ماں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔
"اماں! دیکھیں بابا بالکل بھی روایتی پٹھانوں کی طرح نہیں ہیں۔ اپنی ضد پہ اڑ جانے والے۔" لالئی نے کہا تو فاطمہ بی بی مسکرا دیں۔
"کہتے ہیں کہ مر اس لیے گئے کہ سانس نہیں بچی تھی۔ تمہارے بابا بھی اس لیے مختلف ہیں کہ ان کے پاس لڑنے کے لیے ہتھیار نہیں بچے تھے۔"
"اور جس محاذ پہ لڑے اس پہ سوائے زخموں کے کچھ بھی ان کا نصیب نہ بن سکا۔ آپ نے بھی تو انہیں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی تنہائی کا بھی احساس نہ کیا۔" وہ ماں سے شکوہ کر بیٹھی۔
"میں ضرور خان کے رستے ہوئے زخموں پہ مرہم رکھتی اگر میرا اپنا وجود زخموں سے چور چور نہ ہوتا۔ اگر خان کے ہاتھ کچھ نہیں لگا تو میرے دریدہ دامن میں جھانک لو۔ سوائے پریشانیوں، زخموں اور تکلیفوں کے کچھ نہیں پاؤ گی۔" وہ تلخ ہو گئیں کہ وہ باپ کی محبت میں یکطرفہ ہو رہی تھی۔
"آئی ایم سوری اماں۔۔۔ مگر میں کیا کروں۔ میں آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ آپ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔" اس نے ان کے چہرے کا محاصرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ نظریں چرا گئیں۔
"تم ذرا مرجانہ کی طرف چکر لگاؤ۔۔۔ میں تھوڑا آرام کروں گی۔" وہ اسے وہاں سے ہٹانا چاہ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ دل کا حال کھل جاتا۔

وہ مرجانہ کی طرف آئی تو وہ بالکل گم صم بیٹھی تھی۔
"ایسے مت کرو مرجانہ۔۔۔ یہ سب نصیب کے کھیل ہیں۔ اسے تسلیم کر لو۔ ہم لڑکیاں جگنوؤں کو پکڑتے پکڑتے بہت دور نکل جاتی ہیں۔ یہ دیکھے بنا کہ کوئی ہمارے ساتھ بھی ہے کہ نہیں۔" لالئی اس کے اداس چہرے کو ہاتھوں میں تھام کے رو پڑی۔
"لالئی! تم جانتی ہو کہ وہ میرے ساتھ تھا۔ وہ اب بدلا ہے۔ اسے مجھ سے کیسے کوئی چھین سکتا ہے۔ میں نے اسے اپنی ہر دعا میں مانگا ہے۔ کیا میں اتنی گنہگار تھی کہ میرے رب نے میری دعائیں لوٹا دیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی اور لالئی اس کے دکھ میں اس کے ساتھ تھی اس بات سے بے خبر کہ دروازے میں کھڑے ربیط خان کے دل کے اندر کیا طوفان برپا ہوا تھا۔
ایک قیامت تھی جو ربیط خان کے دل پہ مرجانہ کے ایک ایک آنسو سے گر رہی تھی۔
"اگر میری بہن رو رہی ہے زیاد خان! تو مسکراہٹ تمہاری بہن کے ہونٹوں کو بھی نہیں چھوئے گی۔" شاک تو ربیط خان کو بھی یہ سن کے لگا تھا کہ زیاد خان کسی اور کو زندگی کا ساتھی بنانے کا سوچ رہا ہے۔ مرجانہ اور لالئی کی باتوں کو اتفاقاً سن کے اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ مرجانہ، زیاد خان کو پسند کرتی ہے۔ اب دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ حالانکہ اس کا لالئی سے رشتہ اس کی بے تحاشا محبت کی بنا پہ کچھ ماہ پہلے طے ہوا تھا۔
"اگر زیاد خان کو مجھ سے محبت نہیں تھی تو اس کے ہر ہر انداز میں وہ بے قراریاں کیوں تھیں۔۔۔ دیکھو لالئی! تم گواہ ہو نا کہ زیاد کو مجھ سے محبت تھی۔۔۔ اس کے انداز کیسے ہوتے تھے۔۔۔ کیا کسی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے۔۔۔ وہ صرف محبت تھی۔ وہ اب بدل رہا ہے لالئی۔۔۔ اسے بتانا لالئی! میں اس کے بنا مر جاؤں گی۔۔۔ میں اس کے بنا مر جاؤں گی۔۔۔" وہ لالئی سے لگ کر تڑپ تڑپ کے رونے لگی۔
ربیط خان کا جیسے کوئی چھری سے دل کاٹ رہا تھا۔



وہ اس وقت صرف ایک ہی لائن پہ سوچ رہا تھا اور جب اپنے خیالوں میں کھوئی کھوئی لالئی واپس جا رہی تھی تو وہ اس کے سامنے آ گیا۔ یوں پہلی دفعہ ہوا تھا کہ وہ دونوں یوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے تھے، ورنہ تو موبائل پہ ہی بات ہوتی تھی۔
لالئی کا دل شرم سے ضرور دھڑک جاتا اگر ربیط خان کی آنکھوں میں محبت کی ہلکی سی بھی رمق ہوتی۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے اس کے سامنے تھا۔
"ربیط۔۔۔" اس کی آواز گلے ہی میں گھٹ کے رہ گئی۔۔۔ کچھ ہونے کا احساس ہونے لگا۔
"اب سے پہلے مجھے تم سے محبت تھی لالئی۔۔۔ اب تم میرا انتقام ہو۔ اگر چاہو تو اپنے بھائی کو بھی بتا دینا۔۔۔ کیونکہ مجھے بغیر بتائے جنگ لڑنے کا مزا نہیں آئے گا۔ اسے صرف اتنا بتا دینا کہ زخم لگانا مجھے بھی آتا ہے۔"
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ربیط!" لالئی کی تو جیسے سانسیں رکنے لگی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے تو صرف محبت بھرے پھول جھڑتے تھے۔
"میں نے بہت آسان زبان میں بات کی ہے۔ نہ سمجھنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔" وہ سنگدلی سے بولا۔ اس نے بے بسی سے ہونٹ کاٹ ڈالے۔
ربیط خان کی نظروں سے اس کے کٹے ہونٹ سے نکلنے والا خون چھپ نہ سکا مگر وہ پتھر ہو چکا تھا۔
"ربیط۔۔۔ مرجانہ اور زیاد لالا کے درمیان محبت یکطرفہ ہے۔" وہ بمشکل کہہ پائی۔
"میرے اور تمہارے درمیان بھی سب کچھ یکطرفہ ہی ہو گا۔۔۔ میں صرف تیر چلاؤں گا اور تم سب تڑپو گے۔" وہ خونخوار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
وہ اس کی نظروں کے انداز سے تڑپ کے رہ گئی۔
"آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں ربیط۔۔۔ چاہا ہے ہم نے ایک دوسرے کو۔۔۔"
"ہماری محبت مرجانہ کے آنسوؤں میں کھو گئی ہے۔ سب خواب مٹی ہو گئے ہیں۔ چکنا چور ہو گئے ہیں۔ اب صرف نفرت ہے۔ محبت ہم نے چھپ کے کی تھی لالئی! مگر نفرت بہت کھل کے کروں گا میں۔ سب اس آگ میں جلیں جس میں میں اور میری بہن جل رہے ہیں۔"
وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا اور وہ ہارے ہوئے قدموں سے واپس حویلی آ گئی۔ اب پاس بچا ہی کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیوں آ گئے ہو تم دوبارہ میری ٹھہری ہوئی زندگی میں ہلچل مچانے۔ پہلے میں اور اب میری ہی بیٹی پہ تیر پھینکنے آ گئے ہو۔ عرمت کھیلو بار بار ہماری زندگیوں سے۔۔۔ بخش دو ہمیں۔"
ہسپتال کے بیڈ پہ ثوبانہ شاہ بے بسی سے رو دیں۔
"دیکھو میں نے اپنی محبت کا بھرم کس شان سے رکھا ہے۔ آپی مجھ سے اس بات پہ کتنا عرصہ ناراض رہیں کہ میں اپنے ساتھ جڑے اس اذیت ناک رشتے کو توڑ کیوں نہیں دیتی۔ لیکن میں ایسا نہیں کر پائی۔ میں آج بھی تمہارے نام سے منسوب ہوں۔ میں آج بھی تمہاری بیوی ہوں۔ کوئی ایسا دیوانہ بھی ہوتا ہے۔ میرا وجود پیاسا کا پیاسا ہی رہا۔ کسی رشتے کی تکمیل نہ ہو پائی۔۔۔ ہر رشتہ ہی ادھورا رہا۔ نہ مکمل بیوی بنی اور نہ ہی ماں بن سکی۔۔۔ میں تمام عمر تمہارے ساتھ رشتہ جوڑ کے بھی بیوہ ہی بنی رہی۔ اب کیوں آئے ہو۔۔۔ زندگی تو گزر گئی۔۔۔ اب موت کو تو آرام سے آنے دیتے۔ یاد رکھنا عمر خان! کہ زخم خوردہ عورت ناگن بن جاتی ہے۔ اب میں زخم کھاؤں گی نہیں۔۔۔ اب میں اتنی آسانی سے اپنا استحصال ہونے نہیں دوں گی۔
لیکن میرے سارے دکھوں سے آشنا۔۔۔ لائبہ آپی۔۔۔ وہ یہ سب کیسے سہہ پائیں گی۔۔۔ نہیں انہیں ساریہ کی خاطر سب سہہ لوں گی۔ میں اس کی آنکھوں کے دیپ بجھا نہیں سکتی۔ میں اب ساریہ کی خاطر اور زخم کھاؤں گی۔" ان کی آنکھوں سے چپ چاپ آنسو بہہ رہے تھے۔
اس شام وہ گھر لوٹ آئیں۔ فیض اور شبیر نے بیڈ

ان کے کمرے میں ہی لگا لیے۔ ثوبانہ شاہ نے لاکھ احتجاج کیا مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔

وہ ساری رات ثوبانہ شاہ نے جاگتے کاٹی۔

”میں جب لوٹ آئی تھی تو میرے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔ میرا سر جھکا ہوا تھا تو پھر اتنی سنگدلی کیوں پروردگار۔۔۔ کیوں میرے دریدہ دامن میں وہ معافی کے چند سکے نہ ڈال سکے۔۔۔ میں ان کا بھرم نہ رکھ پائی یہ مجھے تسلیم۔۔۔ لیکن وہ تو میرے ماں باپ تھے ان کا دل کیسے اتنا چھوٹا ہو گیا۔ میں نے ہاتھ جوڑے۔۔۔ پاؤں میں گر گئی مگر۔۔۔ ڈیڈی نے ہنس کے صرف اتنا کہا۔ ”مجھے اندازہ نہ تھا کہ روز حساب اتنی جلدی آجائے گا۔

میں نے بھی ایسے ہی تمہارے قدموں میں گر گر کے تمہیں اپنی عزت کا واسطہ دیا تھا۔۔۔ نکل جاؤ میرے گھر سے بالکل اسی طرح جیسے پہلے بنا سوچے سمجھے نکل گئی تھیں۔“ وہ مایوسی سے پلٹی۔۔۔ ماں کی جانب آس بھری نظروں سے دیکھا مگر شوہر کی حکم عدولی ان کے لیے ناممکن تھی آنسو برستی آنکھوں سے رخ پھیر لیا۔ بڑی آس سے لائبہ آپی کی جانب دیکھا مگر وہ جانتی تھیں کہ اگر وہ ذرا سا نرم پڑیں تو ان کا تعلق بھی باپ کے گھر سے ہمیشہ کے لیے کٹ جائے گا۔

وہ ٹوٹے قدموں سے گھر سے دوبارہ نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

”آپی مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ ثوبانہ نے بالآخر ہمت کی۔

”آپی۔۔۔“ وہ بہن کے گلے لگیں اور کچھ نہ چھپا سکیں۔

”عمر خان۔۔۔ زیاد کا باپ ہے تم۔۔۔ تمہارا مطلب ہے کہ۔“ بے ترتیب اور نامکمل جملے کے اندر واضح مطلب تھا۔

”آپی لوہ کیوں آگیا ہے۔ اب کیا بچا ہے میرے پاس لوٹنے کے لیے اگر آ ہی گیا تھا تو ساریہ کیوں درمیان میں آگئی۔ میں نے حساب لینا تھا اس سے بے وفائی کا۔“

”میں تمہیں ساریہ کی وجہ سے پیچھے نہیں ہٹنے دوں گی کیونکہ یہ ساریہ کی زندگی کا بھی سوال ہے۔۔۔ اب حساب کا دن آ ہی گیا ہے تو عمر خان کو جواب دینا ہی پڑے گا۔ تم نے اس کی محبت میں جوگ لیے رکھا اور وہ وہاں کسی اور کے ساتھ سکون بھری زندگی گزارتا رہا۔ تم ادھوری اور نامکمل رہیں اور وہ وہاں کسی اور کے ساتھ زندگی کی بہاریں لوٹتا رہا۔ بچے پیدا کیے۔“ ثوبانہ نے سر جھکا لیا۔

”اس شخص سے محبت کا دعوا تھا تمہیں؟“

”آپی میں تب نہیں ٹوٹی تھی۔ اب ٹوٹ گئی ہوں۔ میں ہار گئی ہوں آپی۔۔۔ میری محبت ہار گئی ہے۔“

”مگر میں تمہیں ہارنے نہیں دوں گی۔ وہ مظلوم نہیں بلکہ ظالم ہے اور ہر ظالم وقت کی گرفت میں آتا ہے۔ اسے حساب دینا پڑے گا۔ تم اب بھی اس کی بیوی ہو۔ جس طرح اس عورت نے تمہیں اپنے راستے سے ہٹایا۔ تمہاری زندگی ٹھوکروں میں رکھی۔۔۔ اب تم اس کا سارا مان اور غرور خاک میں ملا دو۔“

”لیکن آپی میرے بچے۔۔۔“

”فخر سے سب کو بتانا کہ یہ عمر خان کے بچے ہیں۔ عمر خان اپنے بچوں کے لیے سب کچھ کرے گا مجھے یقین ہے۔“

”آپی! اگر زیاد خان ماں کی خاطر پیچھے ہٹ گیا تو ساریہ دکھی ہو جائے گی۔“

”ساریہ کو تکلیف تو ہو گی۔ اچھا ہے شروع ہی میں بات کلیئر ہو جائے۔ ویسے وہ شخص بیٹے کی خوشی کی خاطر کچھ بھی کرے گا ایک ملاقات میں مجھے یہ تو اندازہ ہو ہی گیا ہے۔“ ان کی نظروں کے سامنے عمر خان کا انداز محبت گھوم گیا۔

”بس تم وہ کرتی جاؤ جو میں تمہیں کہوں گی۔“ حنیف اور شبیر کے مارکیٹ سے لوٹنے تک وہ سب کچھ پلان کر چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

”فاطمہ! ساریہ کے گھر والوں کا فون آیا تھا۔ انہیں زیاد خان کا رشتہ منظور ہے۔“ عمر خان نے سب سے پہلے خوشخبری فاطمہ بی بی کو سنائی۔

”بہت بہت مبارک ہو خان!“ وہ بے تحاشا خوش ہو گئیں۔

”آپ کو بھی مبارک ہو۔۔۔ اب جلدی سے یہ خوشخبری آپ خود زیاد خان کو بھی سنا دیں۔“ وہ اپنا موبائل نمبر ملا کے فاطمہ بی بی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

کچھ دیر بعد زیاد خان لائن پہ تھا۔

”ہیلو زیاد۔۔۔ مبارک ہو تمہیں۔۔۔ ابھی ابھی ساریہ بیٹی کے گھر سے فون آیا تھا۔ ان لوگوں نے ہاں کر دی ہے۔“ فاطمہ بی بی کی آواز خوشی سے کانپنے لگی۔

”امی! یہ سب آپ لوگوں کی دعاؤں کی بدولت ہوا ہے۔“ وہ اپنی خوشی چھپا نہ پایا۔

”اللہ میرے بچوں کے راستے آسان کرے۔“ انہوں نے دعا دی۔

رات عمر خان اپنے کمرے میں آئے تو انہیں عجیب سرشاری سی تھی۔ آج انہوں نے فاطمہ بی بی کے چہرے پہ خوشیاں رقصاں دیکھی تھیں۔ آج دل نے اپنے گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی طرف پہلا قدم بڑھایا تھا۔

”کاش میں نے فاطمہ بی بی تمہیں اپنے آپ سے اس کمرے سے اتنی بے دردی سے نہ دور کیا ہوتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کی رات مجھے یہ سکون بھی ہے کہ فاطمہ کو مجھ سے کوئی سکون تو ملا۔“

نجانے رات کا کون سا پہر تھا کہ خان لالہ کا فون آگیا کہ فاطمہ بی بی کی والدہ انتقال کر گئیں۔

”خان لالا! آپ جانتے ہیں کہ میرا ان سے ہر تعلق ختم ہو چکا ہے۔“ عمر خان کے لہجے میں وہ پہلے والی سختی نہ تھی مگر وہ اپنی بات پہ پھر بھی جمے ہوئے تھے۔

”عمر! فاطمہ سے تمہارا تعلق ہے اور فاطمہ کا تعلق ہر رشتے سے ختم ہو جائے مگر ماں سے رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔“

”خان لالا! میں انہیں وہ سب معاف کر سکتا ہوں جو انہوں نے میرے ساتھ کیا مگر جو کچھ انہوں نے فاطمہ کے ساتھ کیا ہے۔ وہ ناقابل معافی ہے۔“

”اس کا فیصلہ تم فاطمہ بی بی کو کرنے دو۔ کیا تم اس کو اس موقع پہ روک کے اس کے ساتھ ایک اور زیادتی نہیں کرو گے۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔

”خان لالا! میں کیا کروں میرا دل نہیں چاہتا کہ ان کی شکل تک دیکھوں۔۔۔ میرے ساتھ انہوں نے جو بھی کیا مگر کیا فاطمہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا حساب نہیں ہونا چاہیے۔“

”اب اس حساب کتاب کا وقت گزر چکا ہے عمر۔۔۔ فاطمہ کے ساتھ ان کے ساتھ ساتھ تم نے بھی تو ظلم کیا ہے۔۔۔ کون کون حساب دے گا۔۔۔ اب تم فاطمہ بی بی کو اپنا حساب کتاب خود کرنے دو۔“ انہوں نے سختی سے کہہ کے عمر خان کو خاموش کر دیا۔

وہ فون بند کر کے فاطمہ بی بی کے کمرے کی طرف بڑھے۔ رات کے اس پہر عمر خان کو اپنے کمرے کے دروازے پہ دیکھ کر وہ لحظہ بھر کو چونکیں۔

”کیا بات ہے خان۔۔۔“ فاطمہ بی بی نے ان کے چہرے پہ الجھے ہوئے سوالوں کو پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں۔

”فاطمہ دراصل۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔ آپ کی والدہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ بالآخر انہوں نے کہہ ہی دیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خان۔“ فاطمہ بی بی کی آواز کانپی اور آنسوؤں نے دکھ کی شدت کا اظہار کر دیا۔

”کیا آپ مجھے وہاں جانے کی اجازت دیں گے؟“ انہوں نے ڈرتے ڈرتے عمر خان سے پوچھا۔ جواب حسب امید تھا۔

”آپ چلی جائیں۔“

”خان۔۔۔“ وہ کچھ نہ کہہ پائیں۔ اس وقت بحث کرنے کا فائدہ نہ تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ انہیں جانے کی اجازت مل گئی تھی ورنہ باپ کا چہرہ بھی نہ دیکھ پائی تھیں۔

ماں کے جھریوں زدہ چہرے نے فاطمہ بی بی کی خاموشی کو آنسوؤں میں بدل دیا۔ ہر کوئی ان سے گلے لگ کے بین کر رہا تھا۔ جنازے کے بعد۔

بھابھی نے عمر خان کے آگے ہاتھ جوڑ ڈالے کہ انہیں قل تک چھوڑ دیں مگر وہ پتھر بنے رہے۔ وہ لالا کے مجبور کرنے پر خود بھی آ گئے تھے۔

"اتنا بھی غنیمت جانیں۔" لہجے میں صرف زہر تھا۔ فاطمہ بی بی نے سر جھکا لیا۔

دلاور لالا آگے بڑھے اور ایک فائل فاطمہ بی بی کے ہاتھوں میں تھمائی تو عمر خان کے اندر تو طوفان ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے جھٹکے سے فائل فاطمہ بی بی کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

"عمر خان! یہ فاطمہ بی بی کے حصے کی جائیداد کے کاغذات ہیں۔" دلاور خان نے وضاحت کی۔

"جانتا ہوں۔۔۔ مگر تم شاید یہ بھول گئے ہو کہ تم فاطمہ کو بازار میں قیمت لگوانے نہیں لائے تھے۔ تم نے اس کی دو کوڑی بھی قیمت نہیں لگنے دی تھی۔ مفت میں بازار میں لا بٹھایا تھا۔ اب اس پتھر کی قیمت چکانے کا خیال تمہیں کیوں آیا۔ اب اس کی قیمت تمہاری اوقات سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے انہیں سنبھال کے رکھو۔" وہ انتہائی زیادہ غصے میں اپنا ضبط کھو بیٹھے۔

فاطمہ بی بی کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ رنگت ہلدی کی مانند اور ہونٹوں پہ لرزہ نمایاں تھا۔ بھابھی بمشکل انہیں سنبھالے ہوئے تھیں۔

"میں شرمندہ صرف اپنی بہن سے ہوں عمر خان ۔۔۔ جس کے ساتھ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے۔۔۔ تم مجھے قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ تمہارے خاندان والوں نے بہت عزت سے میری بہن کا رشتہ کیا تھا۔ ہماری عزت بھی داؤ پہ لگی تھی۔ پھر بھی ہم تم سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتے ہیں۔" دلاور خان نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"ہم دونوں سے پہلے تم اور تمہارے منصف اس کے خدا کو جواب دہ ہو۔ جس نے تمہارے ہاتھ میں انصاف کا ترازو دیا تھا اور تم نے اس میں دو انسانوں کو تول دیا۔ تم لوگ بھول گئے تھے کہ جب منصف بے انصافی پہ اتر آئے تو عرش عظیم کے چوبارے بھی ہل جاتے ہیں۔"

جبار خان نے آگے بڑھ کے عمر خان کو تھاما جن کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ "میں نہیں جانتا دلاور خان! کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی مگر یہ یاد رکھنا کہ وہ میرے نام سے جڑی ہوگی۔۔۔ سو تمہاری بہن کی قسمت کا فیصلہ وہی کرے گی۔ اب ترازو اس کے ہاتھ میں میں خود دوں گا۔ وہ اب بھی میری زندگی کی مالک ہے۔"

کیا کیا طوفان نہ فاطمہ بی بی کے وجود میں برپا ہوئے تھے۔ ایسی آگ لگی تھی کہ سب کچھ جل کے راکھ ہو گیا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ وہ پھر بھی کھڑی تھیں۔

دلاور خان نے عمر خان کے جانے کے بعد انہیں تھام کے گاڑی میں بٹھایا۔ اس کے بعد کسی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ سارا راستہ گہری خاموشی میں کٹا۔ موت کا سا سناٹا چھایا تھا۔ البتہ آج ایک آخری آس بھی ٹوٹ گئی تھی۔ فاطمہ بی بی کی کاش موت یا زندگی جو بھی سزا سنائی تھی عمر خان اپنے منہ سے سناتے۔ ایک دفعہ پھر وہ یوں بے قیمت نہ ہوتیں۔

☼ ☼ ☼

حویلی میں قدم آج اپنا ہی ساتھ نہ دے رہے تھے۔ بار بار لڑکھڑائے جیسے پھانسی گھاٹ کی طرف جانے والے قیدی کی دھڑکنیں جواب دے رہی ہوں۔ آج ہر چیز انہیں پرائی لگ رہی تھی۔ ساری آسیں جو ٹوٹ گئیں۔

عمر خان اپنے کمرے میں چلے گئے تو جبار خان نے پریشانی سے فاطمہ بی بی کی جانب دیکھا جن کے چہرے پہ واضح شکست تھی۔

"فاطمہ! کبھی کبھی ہم جو بات کرتے ہیں اس کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو سمجھ لیا جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں عمر خان کو اس نے جو بھی کہا ہے صرف ۔۔۔"

"لالا! میں نے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ میں تو ساری زندگی دوسروں کے فیصلوں پہ ہی سر جھکاتی رہی ہوں۔ کبھی اپنے بھائی کے کبھی خان کے اور اب ثوبانہ عمر خان کے۔۔۔ میرے لیے یہ حالات نئے تو نہیں ہیں۔ بہن کا یہ فیصلہ بھی سر آنکھوں پہ۔" وہ جو بول رہی تھیں، عمر خان کے کمرے کے کھلے دروازے سے بخوبی عمر خان کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ جن کا پورا وجود کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ وہ جذبات میں جو بول گئے تھے، ان کے اپنے دل کو بھی تو لہولہان کر گیا تھا۔

"لالا! آپ کے لیے چائے لاؤں۔" فاطمہ بی بی نے پوچھا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"نہیں! اب چلوں گا۔ اللہ حافظ۔۔۔" ان کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئیں۔

اس کے بعد انہوں نے زیادہ تر اپنے کمرے کو ہی ٹھکانہ بنا لیا۔ لائبہ محسوس تو کر رہی تھی مگر لاکھ کوشش کے باوجود وجہ جاننے سے قاصر رہی۔ پھر ایک ہی خیال آیا کہ اماں کو نانو کی وفات کا صدمہ ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں جو صبح ہنستے ہنستے گئے تھے لوٹے تو یوں تھے کہ جیسے دونوں کے درمیان کچھ ہو گیا تھا۔ ناراض ناراض سے۔۔۔ ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے۔۔۔ شبیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"فیض! کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں ماما۔۔۔" اس نے ٹالنا چاہا مگر وہ ان کی ماں تھیں ان کی سانسوں کی رفتار سے بھی واقف۔۔۔ وہ اس پہ کیسے یقین کر لیتیں کہ سب ٹھیک ہے۔

"ادھر دیکھو۔۔۔ میری طرف۔۔۔"

"ماما۔۔۔ شبیر ناراض ہو گیا ہے۔" وہ زیادہ دیر چھپا نہ پایا۔

"کیوں۔۔۔ وہ تو کبھی ناراض نہیں ہوتا۔" انہیں دھڑکا لگا۔

"یہ آپ اسی سے پوچھ لیں۔۔۔" فیض نے کہا تو وہ دوڑ کے اس کی جانب چلی آئیں۔

"شبیر میرے بچے۔۔۔ ایسا کیا ہو گیا ایک دوسرے پہ جان دینے والے بھائیوں کے بیچ۔" وہ اس کا چہرہ تھام کے محبت سے پوچھنے لگیں۔

"ماما اس سے کہہ دیجیے گا مجھ سے بات نہ کرے۔" وہ خلاف عادت بہت زیادہ غصے میں تھا۔

"میری جان مجھے بات بھی تو پتا چلے۔" وہ زچ ہو کے بولیں۔

"ماما اس نے مجھے موبائل گم ہونے پہ بری طرح ڈانٹا ہے۔ میں اگر ہر وقت ہنستا ہوں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میری کوئی عزت ہی نہیں ہے۔ سب دوستوں کی موجودگی میں بنا یہ سوچے کہ میری کتنی انسلٹ ہو رہی ہے۔۔۔" وہ پھٹ پڑا۔

"یہ تو اس نے بہت برا کیا۔۔۔ ایک معمولی چیز کی خاطر بھائی کا دل توڑ دیا۔ اس نے غلط کیا ہے۔"

شبیر بے چینی سے چہرے پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ ثوبانہ شاہ نے اس سے پہلے کبھی اسے اس طرح کے ذہنی دباؤ میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ فیض کی طرف آئیں تو چپ چاپ سا بیٹھا تھا۔

"بیٹا! میرا دل نہیں مانتا کہ تم نے صرف موبائل گم ہو جانے پہ بھائی کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی اور وجہ ہے۔" وہ آہستگی سے بولیں تو وہ گھبرا گیا۔

"اور وجہ سے کیا مراد ہے آپ کی۔ بھلا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" اس کی آواز اس کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"فیض! کیا ایک موبائل تمہیں بھائی سے زیادہ عزیز تھا۔"

"ماما! میں اب سوری کر تو رہا ہوں مگر مان ہی نہیں رہا۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"کیونکہ جن سے محبت ہوتی ہے ان کا لہجہ بدل جائے تو انسان کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بے جان چیزیں انسانی جذبوں سے زیادہ اہم نہیں ہوتیں۔ تمہیں کم از کم دوستوں کے سامنے اسے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔ انسان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔" انہوں نے سمجھایا تو ندامت کا احساس شدت سے جاگا۔

"یقیناً" میں نے غلط کیا ہے ملا! مگر اس میں میرے بہت امپورٹنٹ نمبرز تھے۔" وہ انہیں کیسے بتاتا کہ کتنی مشکل سے اس نے اپنے خوابوں میں آنے والی کا نام اور فون نمبر کلرک سے سوبہانے کرکے لیا تھا۔

"بیٹا! قیمتی سے قیمتی چیز بھی ٹوٹ جاتی تو پھر حاصل کی جاسکتی ہے مگر انسان کا دل ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں مل سکتا اور ہمارے پاس تو گنے چنے چند ہی رشتے ہیں۔ ان کا بھرم تو نہیں ٹوٹنا چاہیے۔"

"سوری ملا۔۔۔" اسے شرمندگی نے گھیر لیا۔ اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا۔

"یہ سوری جاکے اس سے کہو جسے ناراض کیا ہے۔ جو تمہارے دکھ سکھ کا ساتھی ہے۔" وہ مسکرائیں۔ مگر لگتا تھا کہ اس کی عزت نفس بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے لاکھ کہنے پہ بھی کمرے کا دروازہ نہیں کھولا۔

ساری رات فیض نے ٹی وی لاؤنج میں گزار دی۔ شبیر فجر کی نماز کے لیے اٹھا تو اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر ناراضی کہیں دور جا بھاگی۔

"فیض یہ کیا۔۔۔ تم ساری رات یہاں بیٹھے رہے۔" وہ جھنجلا کے بولا۔

"آئی ایم سوری شبیر۔۔۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہیں بری طرح ہرٹ کیا ہے۔" فیض نے اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا تو وہ اپنی پرانی جون میں لوٹتے ہوئے بولا۔

"بس زیادہ جنٹلمین بننے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ جاکے نماز پڑھو۔"

"شبیر! مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تم جو مرضی سزا دے دو۔"

"سزا تو تم نے سہہ لی ساری رات یہاں بیٹھ کے۔" وہ مسکرایا تو فیض نے اسے گھور کے دیکھا۔

"یہ سزا تو ماما نے بھی کاٹی ہے۔ انہوں نے بھی رات کھانا نہیں کھایا۔"

"واٹ۔۔۔" اگلے ہی پل وہ ماں کے کمرے کی جانب دوڑ لگا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو زیاد۔۔۔ کیسے ہو۔" ساریہ نے پوچھا تو وہ اس کی بے قراریوں کا مزا لینے لگا۔

"بزی ہوں' ہزاروں کام ہیں یہاں۔"

"اور میں کہاں ہوں۔۔۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"یہاں ہو۔۔۔ اور بھلا کہاں ہو سکتی ہو۔" وہ اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔

"کہاں۔۔۔" وہ الجھی۔

"بھئی اب ہاتھ رکھ کے بھی بتا دیا مگر تمہیں سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ بھرپور شرارت کے موڈ میں تھا۔

"اب سائنس نے اتنی ترقی بھی نہیں کی کہ مجھے موبائل پہ آپ کے اشارے بھی سمجھ آجائیں۔" وہ اس کی شرارت کو سمجھ گئی۔

"ساریہ! تم صرف اور صرف میرے دل میں رہتی ہو۔ میں نے اپنے آپ کو تمہاری محبت کے جذبوں کی زنجیروں میں باندھ لیا ہے۔ اب بھلا میں کہاں جاسکتا ہوں اس قید سے نکل کے۔"

"کب واپس آؤ گے۔۔۔ میں تمہیں مس کر رہی ہوں۔ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں گئے ہوئے۔"

ڈیر! میں ان شاء اللہ اب جلد ہی آؤں گا' دراہتمام سے آؤں گا۔ یہ مرجانہ کا مسئلہ ذرا سیٹل ہو جانے دو۔" وہ لمبی سانس لے کے بولا کہ وہ اسے کیا بتاتا کہ مرجانہ اس کی محبت پہ اپنا حق جتانا چاہ رہی ہے۔

"اب کیسی ہے مرجانہ۔۔۔"

"کافی بہتر ہے مگر ابھی اس کے چہرے کے زخم تازہ ہیں۔" زخم تو اس کے دل کے لٹنے کے بھی تازہ تھے مگر یہ وہی جانتی تھی۔

"کیا زیادہ زخم ہیں چہرے پہ۔۔۔"

"ہاں دو زخم ایسے ہیں جو بالکل سامنے ہیں۔ ان کے لیے میں نے ڈاکٹر امجد سے وقت لیا ہے۔ ہو سکتا ہے ایک دو دن تک ہم لوگ آجائیں۔"

"اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔" فون بند کرکے وہ عمر خان کے کمرے کی طرف چلا آیا۔



"بابا! ربط مرجانہ کو لے کر شہر ہسپتال چلا گیا ہے۔ میں بھی چلا جاتا ہوں۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ ضرور جاؤ اور سنو اپنی ماں سے تم نے بات کی کہ وہ کب جانا چاہیں گی ساریہ کے گھر تمہارے رشتے کے سلسلے میں۔" خود تو اپنے پر کاٹ چکے تھے اب بلاواسطہ ہی تعلق جوڑتا تھا۔

"بابا! آپ خود ہی اماں سے بات کرلیں نا۔" وہ سر جھکا کے بولا۔

"بیٹا پلیز' آپ جاؤ اور اپنی ماں سے سارا پروگرام طے کرکے مجھے بتادو۔۔۔"

"جی اچھا۔۔۔" وہ اٹھا اور ماں کی طرف چلا آیا۔

"اماں۔۔۔ آپ اور بابا کم از کم اولاد کے لیے تو ایک دوسرے سے بات کرسکتے ہیں۔" وہ اذیت سے آنکھیں موندتے ہوئے بولا۔

"بیٹا۔۔۔ میں کرلوں گی خان سے بات۔۔۔ اور ایک آدھ دن میں چلیں گے ان کے گھر۔" زیاد خان کی خاطر انہیں یہ بھی منظور تھا۔

☼ ☼ ☼

آج صبح کتنے دنوں بعد وہ ناشتے کی میز پہ آئیں۔ عمر خان نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ لالئی نے اپنے قدم واپس موڑ لیے جب ان دونوں کو بیٹھے دیکھا تو۔

"آئی ایم سوری فاطمہ۔۔۔ میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔ میرا ہرگز وہ مطلب نہیں تھا جو میں وہاں بول گیا۔ بس اس لمحے بہت غصہ آگیا تھا۔"

"خان! میں نہیں سمجھتی کہ میں اتنی اہم ہوں کہ آپ کو مجھے اپنے کہے کی وضاحت دینی پڑے۔ آپ مالک ہیں۔۔۔ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں گویا ہوئیں۔ عمر خان بنا کوئی بات کیے انہیں دیکھے چلے گئے۔

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔" فاطمہ بی بی نے انتہائی اعتماد سے پوچھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ تم اور کتنے زخم سہنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ نہ ٹوٹتی ہو اور نہ ہی بکھرتی ہو۔۔۔ اب بھی ایک چٹان کی طرح جمی ہو۔" وہ فاطمہ بی بی کے چہرے کا محاصرہ کرتے ہوئے بولے۔

"نہیں خان! اب بہت کمزور ہو گئی ہوں۔"

"فاطمہ! مجھے معاف کردو۔"

"خان! مجھے میری اوقات میں رہنے دیں۔" وہ دوسری جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔

"میری زندگی کا فیصلہ اب اگر کوئی کرسکتا ہے تو وہ ثوبانہ عمر خان ہوگی اور میری دعا ہے کہ اللہ اسے آپ کے نام کے ساتھ ہمیں ملائے۔" اب کے انہوں نے عمر خان کی آنکھوں میں دیکھ کے کہا مگر تمام تر حوصلوں کے باوجود وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو نہ چھپا پائیں۔

"فاطمہ! کسی کو چاہنا اپنے اختیار میں تو نہیں ہوتا نا! میں نے اگر اس کا ہاتھ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے تھام ہی لیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔" وہ بے بسی سے بولے۔

"میں نے کبھی آپ کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ شکوہ ضرور ہے کہ نہ اس کا بھرم رکھا اور نہ میرا۔"

"میں مانتا ہوں فاطمہ! کہ میں ایک ہارا ہوا انسان ہوں۔ میں زندگی کی جنگ میں بہت بری طرح ناکام ہوا ہوں مگر میں نے ہتھیار بھی توڑ ڈالے ہیں۔ کیا میرے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔" عمر خان کا لہجہ مکمل طور پہ شکستہ تھا۔

"خان، ہم تینوں میں سے مظلوم کون ہے۔۔۔ ظلم کس کے ساتھ ہوا ہے۔۔۔ الزام کس کے سر ہے۔" وہ تلخ ہو گئیں۔

"صرف اور صرف میرے سر۔۔۔ میں ہوں ظالم۔۔۔ مجھے معاف کردینا۔۔۔ وہ بھی ملی تو ہاتھ جوڑ کے معافی مانگوں گا۔ تمہارے سامنے بھی یہ ہاتھ جڑے ہیں فاطمہ۔۔۔" کہتے ہوئے عمر خان نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

کبھی کبھی ان کے لہجے سے وہ تاثر ابھرتا تھا کہ جو فاطمہ بی بی کو اندر تک سرد کردیتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ

پڑجاتی تھیں کہ اس ٹوٹے پھوٹے شخص کو اپنا کمزور سا سہارا دے ڈالیں مگر پھر سنبھل جاتیں۔
"فاطمہ! میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کی حق تلفی نہ ہو مگر۔"
"خان میری حق تلفی ہوئی ہے۔۔۔ ہمارو دن۔۔۔ ہر وہ لمحہ جس پہ میرا حق تھا۔ میرے خوابوں کو میری آنکھوں سے چھین کر بے توقیر کیا گیا۔ کیا گناہ تھا میرا! اس کے علاوہ کہ جس سے رشتہ بندھا اس کے خواب ہی تو آنکھوں میں سجائے تھے۔ رشتہ طے بھی کس نے کیا تھا۔ آپ کے والد محترم نے۔۔۔ ان کے غلط فیصلے کی سزا میں نے آج تک سہی ہے۔" پہلی دفعہ وہ سب لحاظ بالائے طاق رکھ کر بات کر رہی تھیں۔
"مجھے سب تسلیم ہے فاطمہ کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔۔۔ میرا سر اسی لیے ہی تو جھکا ہے۔"
"خان! مجھے آپ کا جھکا سر دیکھنے کی بھی خواہش نہیں رہی۔"
"فاطمہ! وہ میری جوانی کا ایک سپنا تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی مگر تم حقیقت ہو۔۔۔ یقین جانو کہ میں تمہیں اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔" وہ جواب میں طنزاً" مسکرائیں۔
"کاش! میرے لفظ اتنے معتبر ہوتے کہ قبولیت کی سند پاتے۔" حسرت بھرے لہجے میں کہا تو وہ بات بدل گئیں۔
"خان۔۔۔ میں نے زیاد خان کے سلسلے میں بات کرنی تھی کہ اب ہم کب جائیں گے رشتہ لے کے؟"

"ہاں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ کل چلتے ہیں۔" وہ جیسے گہری نیند سے جاگے تھے۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ کل صبح جلدی نکلیں گے۔"
"فاطمہ! خان لالا چاہ رہے ہیں کہ ایک دو ماہ کے اندر لائبہ اور ربط خان کی شادی بھی ہو جائے۔" وہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔
"یہ تو اچھی بات ہے، پھر آپ نے کیا سوچا؟"
"دیکھتے ہیں۔۔۔ یہ زیاد خان کا معاملہ طے ہو تو پھر بات کرتے ہیں۔"
وہ خاموش ہو گئیں۔ عمر خان نے سامنے اخبار پھیلا لیا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔۔۔" شمائلہ، عائلہ کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ مردانہ آواز پہ چونک اٹھی۔
"جی آپ کون۔" اس نے گھبرا کے اپنی چادر کو اور سختی سے اپنے گرد لپیٹا۔
"میں فیض ہوں اور آپ سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔"
"کیسی بات؟" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔
"شمائلہ میں دراصل۔۔۔" اس کی اپنی زبان بھی لڑکھڑا گئی۔
"میں چلتی ہوں۔" وہ فوراً" اٹھی مگر وہ اس کے سامنے آ گیا۔
"پلیز شمائلہ۔۔۔ میں نے بہت ہمت کی ہے یہاں تک آنے میں۔۔۔"
"مگر کیوں۔۔۔"
"کیونکہ میں ایک نظر میں اپنا دل ہار بیٹھا ہوں۔ مجھے لگی لپٹی رکھنی نہیں آتی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس دن جب۔۔۔ راولاری میں آپ کو دیکھا تھا تو اب تک سنبھل نہیں پایا۔ آپ میرے حواسوں پہ چھا گئی ہیں۔ آئی رئیلی فیل ان لو فار یو۔"
اس انکشاف پہ شمائلہ کا دل پہلے پھیلا اور پھر سکڑا۔ اس نے حیرت سے اس لڑکے کو دیکھا جو دل ہتھیلی پہ لیے اس کے سامنے تھا۔ وہ لمبا تھا کہ کسی کا بھی آئیڈیل ہو سکتا تھا۔ شمائلہ نے کبھی اس بات کا دعوا نہیں کیا تھا کہ وہ بہت ثابت قدم ہے۔ اسے تو ہمیشہ خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ ایک شاندار شخصیت کا مالک شخص اس کا آئیڈیل بھی تھا۔۔۔ کیا وہ فیض جیسا نہیں تھا۔۔۔ ابھی تو یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔
بس اس کے سپنوں میں ایک شہزادہ تھا جس کے سنگ وہ ہواؤں میں بنا پروں کے بس اڑتی ہی چلی جاتی تھی۔ وہ اڑتے ہوئے اس سے خواہش کرتی تھی کہ وہ اسے دیکھے۔۔۔ یوں کہ وہ سمٹنے کا ہنر ہی بھول جائے اور جب بکھرے تو وہ اسے اپنی پوروں سے چن چن کے پھر جوڑ دے۔ اس کے سنگ جگنوؤں اور تتلیوں کے دیس گھومتی رہے اور زندگی یوں ہی گزر جائے۔۔۔
مگر کتنا فرق تھا خوابوں اور حقیقت کی دنیا میں۔ خواب دیکھتے اسے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔۔۔ لیکن اسے مجسم دیکھ کے دل سوکھے پتے کی مانند لرزنے لگا تھا۔
"شمائلہ! یقین جانو میں نے بہت کم وقت میں تمہیں بہت زیادہ سوچا ہے۔ مجھ سے چاہتے ہوئے بھی نظریں نہیں چرا پاؤ گی تم۔" فیض نے کہتے ہوئے اس کو اپنی نظروں کے حصار میں لے لیا۔ اس کا گلابی چہرہ، کانپتے ہونٹ اور لرزتی پلکیں فیض کے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر رہی تھیں۔
"شمائلہ۔۔۔ مجھے جواب چاہیے۔" فیض نے پوچھا تو وہ بنا جواب دیے آگے نکل گئی۔
اس سے منہ پھیر تو آئی تھی مگر دل کی دھڑکنوں کا کیا کرتی جو بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔
اس کی عمر بھی ایسی تھی کہ محبت کی دھیمی دھیمی آنچ اس کے وجود کو پگھلانے لگی تھی۔ وہ تو ہمیشہ سے ایسے ہی سپنے دیکھتی تھی۔
اسے فیض پہ غصہ نہیں آ رہا تھا۔ عجیب سی کشمکش میں دل پھنس گیا تھا۔
ہاسٹل آئی تو نجانے کیا ہوا پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ اسے خود پہ حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس کی اتنی باتیں بھلا سنتی کیوں رہی تھی۔ کیوں نہ پہلے ہی قدم پہ اسے روک دیا۔ اظہار محبت پہ ہاتھ کیوں نہ اٹھا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔
یہ راہ غلط ہے۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور ہوٹلوں میں پلنے والی محبتیں سراسر گھاٹا ہوتی ہیں۔
عائلہ نے حیرت سے اسے دیکھا آنسو تھے کہ گلابی رخساروں کو بھگوئے جا رہے تھے۔
اس سے زیادہ دیر صبر نہ ہو سکا وہ اس کے پاس جا بیٹھی۔
"عائلہ۔۔۔" وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔
"کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔" وہ اس کا ترشنا دیکھ کے گھبرا گئی۔
"وہ فیض آیا تھا۔۔۔ کہہ رہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔" ہچکیوں کے درمیان اس نے بمشکل اپنی بات کی۔
"فیض جو ایم بی اے ڈپارٹمنٹ میں ہے؟ اس کا جڑواں بھائی بھی ہے شبیر۔ اسی کی بات کر رہی ہو نا؟" عائلہ نے تصدیق چاہی۔ حالانکہ وہ اسی دن فیض کی نظروں میں بے قراری دیکھ چکی تھی۔
"ہاں وہی جو اس دن ملا تھا۔۔۔ راولاری میں۔"
"اسے تم سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔ واوونڈرفل۔۔۔ ویسے آپس کی بات ہے اس سے بات کرنے کے لیے لڑکیاں مری جاتی ہیں۔ اس سے قریب ہونے کے لیے جتن کرتی ہیں اور تم رو رہی ہو۔ ارے پاگل! اتنا زبردست بندہ ہاتھ لگ رہا ہے تمہارے۔" وہ رک کے بولی۔
"فضول باتیں مت کرو۔" اسے اس کے جواب پہ غصہ آ گیا۔
"ہاں جناب! نخرہ تو بنتا ہے آپ کا۔۔۔ بندہ حسن کی دولت سے مالا مال ہو تو بنتا ہے۔۔۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو۔۔۔ اس سانولی سلونی رنگت پہ میک اپ کا سہارا بھی نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔"
"انسان کی سیرت اچھی ہونی چاہیے۔۔۔ وہ اس کا کمال ہوتا ہے۔ اچھی صورت تو اس مصور کائنات کا کمال ہوتا ہے۔"
"چھوڑو اس بات کو۔ اور اپنے مسئلے پہ آؤ۔۔۔" عائلہ نے کہا۔ "یہ بھی حقیقت ہے کہ محبت قسمت کی دیوی کی مانند ایک بار ہی مہربان ہوتی ہے۔"
"لیکن مجھے اس سے محبت نہیں کرنی۔"
"دیکھو ڈیر! تم اس بات کا فیصلہ تو کر سکتی ہو کہ تمہیں اس سے شادی نہیں کرنی مگر تمہیں اس بات پہ قطعاً" اختیار نہیں کہ تمہیں اس سے محبت نہیں

کرنی۔ یہ کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔" اس نے سمجھایا۔

"مگر مجھے اس سے محبت بھی نہیں ہے۔"

"اچھا؟" نائلہ نے بے یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ شائلہ نظریں چرا گئی۔

☼ ☼ ☼

"لالا۔۔۔ آپ کل جا رہے ہیں نا واپس۔۔۔" لالئی نے پوچھا۔

"ہوں۔۔۔ آج رات بابا لوٹ آئیں تو کل صبح نکلوں گا۔۔۔ پہلے ہی ہسپتال سے کافی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔" وہ اخبار بند کر کے میز پہ رکھتے ہوئے بہن کی طرف مڑا۔

"اور خوشخبری سنانے کی بھی جلدی ہو گی۔" وہ مسکرائی۔

"وہ تو سنا بھی دی۔"

"کیا کہ رہی تھیں سارہ بھابھی۔۔۔۔" لالئی کے لہجے میں نام لیتے ہی مٹھاس بھر آئی۔

"ظاہر ہے خوش تھی۔"

"لالا! وہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہاں کے حالات۔۔۔ میرا مطلب ہے مرجانہ۔۔۔ اس کے بارے میں بھی تو سوچیں۔"

"لالئی! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔۔۔ تم جانتی ہو میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میری کزن ہے، چھوٹی بہن سمجھ کر میں نے اس کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھا۔ اور وہ پتا نہیں کیا سمجھ بیٹھی۔"

"مگر لالا! وہ تو بالکل سب سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ آپ کو اسے واپس زندگی کی طرف لانا ہو گا۔ وہ یقیناً آپ کی بات نہیں ٹالے گی۔" لالئی نے زیاد خان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"لالئی! میں اس کی یکطرفہ محبت کے پاگل پن پہ اسے کیا سمجھاؤں۔۔۔"

"لالا! اس کی محبت یکطرفہ تھی۔۔۔ مگر نقصان یکطرفہ نہیں ہے۔ ہم سب نقصان اٹھائیں گے۔" اس کا دل کہتے ہوئے رو پڑا۔ سب سے بڑا نقصان تو وہ خود اٹھا چکی تھی، ربط کی محبت انتقام میں بدلتے دیکھ کے۔

"لالئی تم بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ میں خود ٹوٹ رہا ہوں۔۔۔ مجھے اپنی خوشی زنگ آلود ہوتی نظر آ رہی ہے۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد زیاد خان مردہ قدموں سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

جس کے حویلی میں نہ ہونے کی دعا مانگی تھی وہ سامنے تھی۔

تایا جی اور ربط کسی جرگے میں گئے ہوئے تھے اور تائی اماں شاید نماز پڑھ رہی تھیں۔

"آپ۔۔۔۔" اس کی ہرنی جیسی آنکھیں حیرت لیے ہوئے تھیں۔

"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔۔۔"

"بہتر ہے۔۔۔"

"ناراض ہو مجھ سے۔۔۔" ہمت کر کے زیاد خان نے بات شروع کی۔

"نہیں۔۔۔"

"حالت دیکھو اپنی۔۔۔ کس سے انتقام لے رہی ہو۔"

"خود سے۔۔۔ اپنے غلط اندازوں کی سزا خود ہی کو دے سکتی ہوں۔" کہہ کے ہمیشہ کی طرح اپنے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا ناخن دانتوں سے کاٹنے لگی مگر آج اسے زیاد نے ہمیشہ کی طرح ٹوک کے نہ کہا کہ تمہاری یہ انگلی گھس جائے گی۔

"آئی ایم سوری مرجانہ۔۔۔ کاش! یہ دکھ تمہیں مجھ سے نہ ملا ہوتا۔"

وہ اس کے چہرے پہ زخموں کے نشان دیکھ کے تڑپ اٹھا تھا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت پھیکی پڑ چکی تھی اور خوب صورت چاند چہرے کو گرہن لگ چکا



"میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ اتنی اچھی لڑکی کو میری وجہ سے تکلیف پہنچے۔ مرجانہ! میرا یقین کرو میں نے تمہیں صرف ایک ہی نظر سے دیکھا تھا اور وہ تم جان چکی ہو۔ تم میری نازک سی پیاری سی گڑیا جیسی۔۔۔" زیاد نے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کی ہتھیلیاں نم تھیں۔ آنکھیں چھلکنے کو تیار۔

"زیاد کیا چاہتے ہیں آپ۔۔۔" اس نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم زندگی کی طرف لوٹو۔۔۔ بھول جاؤ سب۔۔۔ یقین کرو تمہارا نصیب کوئی بہت اچھا شخص ہو گا۔ اسی لیے اس رب نے مجھے راستے سے ہٹا دیا۔" اس نے ہمت نہ ہاری۔

"مان لیا۔۔۔"

"میں نے سینئر ڈاکٹرز سے بات کر لی ہے۔"

"میں نے کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھانا۔ یہ زخم میری زندگی کا حاصل ہیں۔۔۔ میں نے ان ہی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔" وہ صاف منکر تھی۔

"مت کرو ایسی فضول باتیں۔۔۔ میں تمہیں یوں زندگی برباد نہیں کرنے دوں گا۔ یہ پاگل پن ہے۔۔۔" وہ چیخ اٹھا۔

"مجھے اپنا پاگل پن بھی جان سے قبول ہے۔ یہ میری زندگی ہے جیسے مرضی گزاروں۔ آپ کو اس سے کیا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"تم یہ زندگی میرا نام لے کے برباد کر رہی ہو جو مجھے منظور نہیں۔" وہ زچ ہوا۔

"آپ کا نام لے کے آباد کرنے کی خواہش کی تھی۔ کیا ملا۔۔۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی تو وہ بھڑک اٹھا۔

"تم ایسا نہیں کرو گی۔۔۔"

"آپ مجھے روک نہیں سکتے۔" وہ اپنی کہی ہوئی پہ مصر رہی۔

"تم مجھے رسوا کرنا چاہتی ہو؟"

"جو مرضی سمجھ لیں۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔" وہ سب لحاظ بھول گیا۔

"جہنم میں صرف میری بہن ہی نہیں، تمہاری بہن بھی جائے گی زیاد خان! وہاں لے جا کے ماروں گا جہاں دو گھونٹ پانی بھی نہیں ملے گا۔ ایسے ہی وہ بھی تڑپے گی۔"

زیاد خان کے منہ سے نکلا ہوا آخری جملہ مرجانہ کے کمرے کی جانب آتے ربط خان کو آگ لگا گیا۔ زیاد اپنی جگہ سن رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"ماما! یہ کس کی تصویر ہے؟" ثوبانہ کمرے میں داخل ہوئیں تو شبیر کو اپنی الماری کے سامنے کھڑا پایا۔ اور اس کے ہاتھ میں پکڑی تصویر دیکھ کے ثوبانہ شاہ کا رنگ فق ہو گیا۔

"شبیر۔۔۔" ان کی آنکھوں کے ساتھ ان کی آواز بھی پھٹ گئی۔

"ماما۔۔۔ کون ہیں یہ؟" اس نے سوال دہرایا۔

"ماما۔۔۔" بدلے میں اسے جواب تو کیا ملتا ایک زوردار چانٹا نصیب ہوا۔ دروازے پہ کھڑے فیض کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے چھوٹ گئی۔

شبیر سمجھ ہی نہ پایا کہ یہ کیا ہوا تھا۔ وہ گال پہ ہاتھ رکھے ثوبانہ شاہ کو دیکھتا چلا گیا۔

"تم نے میری الماری کیوں کھولی؟" کہتے ہوئے انہوں نے تصویر اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھیں۔

فیض نے ثوبانہ شاہ کو صوفے پہ بٹھایا۔ شبیر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ فیض ماں کے رویے پہ خود بھی پریشان تھا۔

"ماما! یہ پانی پی لیں۔" فیض نے گلاس آگے بڑھایا تو انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ماما پلیز۔۔۔"

"کیوں کھولی اس نے میری الماری۔۔۔" ان کی زبان پہ ایک ہی سوال تھا۔

"اچھا آپ ریلیکس کریں میں سمجھاؤں گا اسے۔

آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" فیض نے بمشکل انہیں نارمل کیا اور بیڈ تک لے کے آیا۔

"ٹھیک ہوں میں۔۔۔ جاؤ اب تم۔" وہ پیٹھ موڑ کے لیٹ گئیں تو وہ اپنے کمرے میں آگیا۔

لیکن وہ پورے گھر میں ہی نہیں تھا۔

"اس نے شبیر کا نمبر ملایا۔ گھنٹی مسلسل جا رہی تھی مگر وہ اٹھانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

فیض بھی ڈھٹائی سے ملاتا رہا۔ بالآخر اس کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دے ہی گئی۔

"ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، جلدی آجاؤ۔"

"آرہا ہوں۔۔۔"

"واپس آیا تو روٹھا روٹھا بیٹھا رہا۔ ثوبانہ کی ٹیبلٹس نکال کے ان کی طرف بڑھائیں۔

"ماما! دوا کھالیں۔"

"نہیں لینی مجھے دوا۔۔۔" ثوبانہ شاہ نے غصے سے کہہ کے منہ پھیر لیا اور دوا کھانے سے بھی انکار کر دیا۔

"چلیں ماما! یہ تو اندازہ ہو گیا کہ کچھ بے جان چیزیں آپ کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔" وہ انتہائی غصے سے کہہ کے کمرے سے نکل گیا۔

فیض کی جان سولی پہ لٹکی ہوئی تھی۔ فیض ان کے اتنے شدید ردعمل پہ حیران تھا۔ لیکن پھر بھی ثوبانہ شاہ کو لے کے وہ ٹیبل پہ آگیا۔

ثوبانہ شاہ نے انکھیوں سے اپنے لاڈلے کو دیکھا۔ وہ روٹھا روٹھا اور بھی پیارا لگ رہا تھا۔ وہ نجانے کس خوف کے پیش نظر اس سے اتنی زیادتی کر گئی تھیں۔ صبر نہ ہوا اور اس کو اپنے کمزور سے بازوؤں میں بھر لیا۔

"آئی ایم سوری میری جان۔۔۔ میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔"

ثوبانہ شاہ اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولیں تو وہ ان کا ہاتھ تھام کے دیوانوں کی طرح چومنے لگا۔

بظاہر تو سب نارمل ہو گیا تھا مگر ایک پھانسی سی فیض اور شبیر کے دل میں رہ گئی تھی۔ دوسری طرف ثوبانہ شاہ تھیں جن پہ وہ رات قیامت بن کے آئی تھی۔ وہ

ماضی میں نہیں جھانکنا چاہتی تھیں۔ ان کا ماضی سے رشتہ بہت دردناک تھا۔ ان سے تعلق رکھنے والے ہر فرد نے ان کی زندگی کو آزمائش میں ڈال تھا۔ نیند کی گولی کھا کے بھی سکھ کی نیند نہ آئی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ ان کی آنکھ کھل گئی۔ دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ پورا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ جب طبیعت کسی طرح نہ سنبھلی تو موبائل پہ شبیر کو بیل دی۔

دو منٹ میں دونوں ان کے پاس تھے۔

شبیر نے گھبرا کے ان کی زبان کے نیچے گولی رکھی اور زبردستی اسپتال لے آئے۔

ساریہ اس وقت ڈیوٹی پہ ہی تھی۔ انہیں آئی سی یو میں شفٹ کر لیا گیا تھا۔ شبیر ساری صورت حال کا ذمہ دار خود کو ہی گردان رہا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔۔۔ خالہ جانی کی حالت اب بہتر ہے۔ انجائنا کا اٹیک تھا۔" ساریہ نے خیر کی خبر سنائی تو دونوں کے چہرے کا رنگ بدلا۔ صبح ان کی حالت کافی بہتر تھی۔ ڈاکٹرز نے ملنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

زیاد خان کی ڈیوٹی بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ رات ہی ڈیوٹی پہ پہنچا تھا۔

"ویسے خالہ جانی! آپ جیسی بہادر خاتون کے ساتھ یہ مسئلے اچھے نہیں لگتے۔" وہ ان کا بی پی چیک کرتے ہوئے بولا۔ ثوبانہ شاہ نے تھکی تھکی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

اس کی شکل ہو بہو عمر خان جیسی ہی تھی۔ وہی قد کاٹھ۔۔۔ وہی پشتو لہجہ۔۔۔ کھڑے کھڑے نقش۔۔۔ اپنے سحر میں جکڑنے والے۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں بہادر ہوں۔" ثوبانہ شاہ نے بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا جو دوا کے زیر اثر بند ہو رہی تھیں۔

"ساریہ نے۔۔۔ وہ تو آپ کو اپنا آئیڈیل مانتی ہے۔"

"تب ہی میرے نقش قدم پہ چل رہی ہے۔"



سوال بظاہر بہت سادہ سا تھا۔

"جی بالکل۔۔۔" وہ ویکسین ڈرپ میں ڈالتے ہوئے مسکرایا۔

"اللہ نہ کرے۔۔۔" دل میں فوراً کہا۔

"تمہارا آئیڈیل کون ہے بیٹا!" نجانے کیوں ثوبانہ شاہ نے یہ سوال پوچھا تھا۔

"ون اینڈ اونلی میری پیاری ماں۔۔۔ بہت بہادر، بہت مضبوط۔۔۔ ہر طوفان سے ٹکرا جانے والی۔"

"اچھا۔۔۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولیں۔

"جب آپ ان سے ملیں گی تو دیکھیے گا کہ وہ کیسے سب کو اندر تک جان لینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ شی از سوناکس۔" اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

"اوئی اللہ۔" ان کے لبوں سے سسکی نکلی۔

"بہت درد ہوا ہے کیا۔" اس نے ہلکے سے ان کا بازو ملتے ہوئے پوچھا۔

"بہت۔۔۔" ثوبانہ شکر ادا کیا کہ انجکشن نے بھرم رکھ لیا تھا۔

"اب ٹھیک ہیں۔۔۔" اس نے پوچھا تو وہ مسکرا دیں۔

صبح لائبہ آئیں تو ہسپتال کے بیڈ پہ پڑی پیلی رنگت اور ویران آنکھیں دیکھ کے رو پڑیں۔

"ثوبانہ! ایسا ملا تمہیں محبت کر کے۔۔۔؟" ان کا سوال غیر متوقع تھا۔ ثوبانہ شاہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

"کتنا روکا تھا تمہیں سب نے۔۔۔ سب کچھ اس درد کے بدلے لٹایا تھا۔"

"آپی! جو اس نے کیا وہ اس کی محبت۔۔۔ اور جو میں نے کیا وہ میری محبت تھی۔"

"اللہ یقیناً تمہیں تمہارے صبر کا بدلہ دے گا۔"

"آپی! اس دن شبیر کے ہاتھ وہی تصویر لگ گئی ہے۔ وہ مجھ سے جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ کون ہیں۔ میں نہ شیر رہی تھی اور نہ آسمان پہ۔"

"کتنی دفعہ تمہیں کہا ہے اسے ضائع کر دو۔ کس نے سنبھال کے رکھی ہوئی ہے۔" انہوں نے ہلکے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"نجانے کیوں اتنا اہم ثبوت ضائع کر کے مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی کروں گی۔"

"اچھا تم پریشان نہ ہو۔۔۔ اللہ بہتر کرے گا۔" انہوں نے حوصلہ دیا۔

وہ تو بہن کی باتوں پہ سنبھل گئی تھیں مگر دروازے پہ کھڑے شبیر کی الجھنیں مزید بڑھ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"خان لالا! ہمیں پہلے زیاد کی بات تو پکی کرنے دیں۔" عمر خان، جبار خان سے کہنے لگے جو آنے والے جمعہ پہ ربیط اور لالئی کا نکاح کروانا چاہ رہے تھے۔

"عمر خان! میں اب تھکنے لگا ہوں۔ اب دل چاہتا ہے کہ میری حویلی آباد ہو۔ اب تو مرجانہ نے بھی ہنسنا چھوڑ دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لالئی آجائے تو شاید اس کا دل بھی بہل جائے۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔" عمر خان نے پہلی دفعہ جبار خان کو مایوس دیکھا تھا۔

"خان لالا! میں مرجانہ کا مجرم خود کو گردانتا ہوں۔ کاش! زیاد میری کہانی نہ دہراتا۔"

"مرجانہ کی یک طرفہ سوچوں پہ کوئی قصوروار نہیں ہے اور نہ ہی تمہاری کہانی دہرائی گئی ہے۔ تمہاری فاطمہ بی بی سے باقاعدہ منگنی ہو چکی تھی۔ جبکہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" انہوں نے عمر خان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"چلیں! جیسے آپ کی مرضی، مجھے منظور ہے۔" عمر خان نے کہا۔

"تو پھر آج جمعہ ہے اور آنے والے جمعے کو ہم دونوں بچوں کا نکاح کر دیتے ہیں۔" جبار خان نے پروگرام بتایا۔

"اس دوران تم زیاد کے سلسلے کو بھی آگے بڑھاؤ۔"

"ٹھیک ہے لالا۔۔۔ میں گھر میں بات کر لیتا ہوں۔" عمر خان جبار خان کو گاڑی تک چھوڑنے آئے تو

ہمیشہ کی طرح انہوں نے عمر خان کو گلے لگا کے اپنی محبت کا احساس دلایا۔

واپس آئے تو فاطمہ بی بی کے کمرے پہ دستک دی۔

"خان آپ... آئیں۔" وہ ایک طرف ہو کے بولیں۔

"فاطمہ! ایک کپ چائے پلوا دیں۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولے تو انہوں نے ملازمہ کو دو کپ چائے لانے کا کہا اور ان کے سامنے والے صوفے پہ آ کے بیٹھ گئیں۔

"فاطمہ! خان لالا چاہ رہے ہیں کہ آنے والے جمعے کو بچوں کے نکاح کا فرض ادا ہو جائے۔" انہوں نے بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں۔" ملازمہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے انہوں نے فاطمہ بی بی کو گہری سوچ میں گم دیکھ کے پوچھا۔

"مجھے آرشین بھابھی اس رشتے پہ زیادہ خوش نظر نہیں آتیں۔" ملازمہ کے جانے کے بعد وہ بولیں۔

"اچھا..."

"ظاہر ہے خان! وہ مرجانہ کے ساتھ ہونے والے حادثے کا ذمہ دار ہمیں ہی سمجھ رہی ہیں۔"

"یہ سب تو قسمت کی بات ہے... ہم اس میں بے بس ہیں۔ اللہ اس کے لیے بھی بہتر کرے گا۔ وہ بھی ہمارا خون ہے، ہمیں اس کی اس حالت کا افسوس ہے۔" انہوں نے دعا کی۔

"خان! آپ اپنی زندگی کی بربادی کا ذمہ دار کہاں تک مجھے سمجھتے ہیں؟"

عمر خان کے لیے انتہائی غیر متوقع سوال تھا۔ وہ حیرت سے فاطمہ بی بی کے جھکے چہرے کو دیکھے گئے۔

"جہاں تک آپ مجھے اپنی زندگی کی بربادی کا ذمہ دار سمجھتی ہیں۔" عمر خان نے جواب میں جلتا ہوا تیر فاطمہ بی بی کے کلیجے میں مارا تھا۔

"خان! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ ایک دفعہ پھر میرے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔"

"کس نے کس کے ساتھ زیادتی کی ہے، اس بات کو چھوڑو۔ مت پڑو اس حساب کتاب میں۔" وہ ہلکے سے چیخ اٹھے۔

"خان! آپ کا دامن اگر صاف ہے تو اس لیے کہ میں نے آپ کی ہر زیادتی کو معاف کیا ہے۔ آپ اگر آج بھی مجھے قصور وار سمجھتے ہیں تو میں ہاتھ جوڑ کے آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ نے تو زیاد کو خوشیاں دے کے کفارہ ادا کر دیا ہے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گئیں۔

ان کی بات پہ عمر خان کے پورے وجود میں جیسے آگ لگ گئی۔ وہ منہ زور طوفان کی مانند بپھر گئے۔

"ہاں... میں نے تو کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اب آپ کی باری ہے۔ اپنے حساب پہ غور کیا ہے کبھی۔ آپ نے کتنا کفارہ ادا کرنا ہے۔ ایک ایک دن کا... ہر ہر رات کا... جب آپ پہ میرا حق تھا اور آپ نے اسے جھٹلایا۔ تم نے میری ساری زندگی رائیگاں کر دی۔ میں تمہارا شوہر ہوں جس کی حق تلفی کرنے پہ تمہیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہو گا۔ چھوڑو اس بات کو کہ کس کی کہاں حق تلفی ہوئی اور کس کو کتنا کفارہ ادا کرنا ہے۔ مجھے میری سزا سناؤ۔"

ان کے لہجے کی کاٹ کسی تلوار سے کم نہ تھی۔

"مجھ سے غلطی ہوئی تھی گناہ تو نہیں کہ جس کی سزا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ آپ نے میری خطا کو میرا ناقابل تلافی گناہ بنا دیا ہے۔ ہاں... میں بزدل تھا اس لیے تمہارے آگے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ رہا ہوں۔ بہادر ہوتا تو دھڑلے سے تمہیں تم سے چھین کے اپنی زندگی آباد کر لیتا۔" کہتے ہوئے انہوں نے فاطمہ بی بی کو اپنے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

"مگر ایک بات یاد رکھنا فاطمہ! ایک ترازو روز قیامت بھی ہو گا جس کے ایک پلڑے میں میری غلطی اور دوسرے میں تمہاری تمام کوتاہیاں ہوں گی۔ کون گناہ گار ہے اور کون مظلوم... فیصلہ تب ہو گا۔"

"خان!" فاطمہ بی بی عمر خان کا یہ روپ دیکھ کے ساکت رہ گئیں۔

"کاش! میں بھی روایتی پٹھانوں کی طرح اپنی انا اور خودداری کو سینے پہ میڈل کی طرح سجا لیتا... بار بار تمہاری طرف یہ سوچ کے نہ بڑھتا کہ خدا تمہیں میرے حق میں بخش دے۔" کہتے ہوئے انہوں نے فاطمہ بی بی کو جھنجوڑ ڈالا۔

"بس احساس گناہ اور معافی کے خوف سے آپ میری جانب بڑھے ہیں؟ میں آج بھی وہیں کھڑی ہوں جہاں سے چلی تھی۔" وہ امید کی سیڑھی سے بری طرح گری تھیں۔

"خان! آئندہ میری طرف یہ سوچ کے مت بڑھیے گا کہ میں روز قیامت آپ کا گریبان پکڑوں گی۔ میں نے ہر لمحہ آپ کے لیے صرف دعائیں ہی کی ہیں۔ میرا اور آپ کا کوئی حساب نہیں ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولیں۔

"فاطمہ! آج بہت کھل کے کہتا ہوں کہ اس سے محبت کی مگر تم سے عشق کیا ہے۔ غلطی نہ اس کی تھی اور نہ تمہاری... تم دونوں میری بزدلی کی بھینٹ چڑھ گئیں... مجھے تم دونوں کی محبت نے ڈسا ہے۔" اس سے زیادہ اقرار وہ کیا کرتے۔

اس کے بعد عمر خان سے وہاں ٹھہرا نہ گیا اور تیزی سے وہاں سے نکل گئے۔

وہ رات فاطمہ بی بی پھر سو نہ پائیں اور جب صبح لالئی نے بتایا کہ بابا نے آج ناشتا بھی نہیں کیا تو وہ ناشتا لے کر ان کے کمرے میں گئیں۔

لالئی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ آج عرصہ دراز بعد اس نے اماں کو بابا کے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے دیکھا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خوشی سے دیوانی ہی ہو جاتی۔

وہ ملالئی کو بتانے بھاگی۔

آج اتنے سالوں بعد عمر خان کے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس شخص کی قربت کے لیے وہ ترستی رہی تھیں اور اس نے کتنا ذلیل کر کے انہیں اس کمرے سے بے دخل کیا تھا۔ ذرے گواہ تھی جس نے فوراً منتشی ملالئی کو اٹھایا تھا اور فاطمہ بی بی کو سہارا دے کے اٹھایا تھا۔ ان کے ماتھے پہ لگے زخم سے خون کو صاف کیا تھا۔ دروازہ ہلکے سے بجایا جو چرمرا کے کھل گیا جیسے ان کی آمد کا ہی منتظر ہو۔

"اس کمرے سے آج کے بعد ہی تعلق ختم سمجھو۔ یہ کچھ سال جو میں نے مجبوری میں تمہیں ساتھ رکھا، انہیں خیرات سمجھ کے جھولی میں ڈال لو۔ مجبوری تھی کہ تم جیسی سے اولاد بابا جان کی خواہش تھی۔ اسی لیے بنا مول تول کے تمہیں بازار سے اٹھا لایا تھا کہ تمہارے بھائی بازار میں تمہیں لیے بیٹھے تھے۔ ان چاہے کھلونے سے کچھ دن ہی کھیلا جاتا ہے۔ اب اس کمرے میں قدم رکھا تو ذلالت اور بے غیرتی کی حد ہو گی اور میں سمجھ جاؤں گا کہ تمہیں خود یہ اتنا بھی..."

آگے عمر خان نے ہر وہ نازیبا بات کہی جو وہ کہہ سکتے تھے۔ ماضی پھر آن کھڑا ہوا۔

اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو وہ یقیناً اس لمحے کر ڈالتیں۔ زمین پھٹنے کی دعائیں مانگتی رہیں۔ روتی اور تڑپتی رہیں۔

جب ماضی کی تصویر ذہن کے پردے پہ آن جمی تو ایسا طوفان اٹھا کہ چکرا کے گریں۔

گرنے کی آواز پہ عمر خان بھی بھاگ کے باہر آئے۔

"فاطمہ..." وہ بری طرح گھبرا گئے۔

عمر خان کے کمرے میں وہ پہلے بھی لاش کی مانند ہی آئی تھیں۔ اب بھی بے ہوشی کی ہی حالت میں وہاں تک آئی تھیں۔

ان کا بی پی کافی ہائی ہو گیا ہے۔ وقتی طور پہ نیند کا انجکشن لگا دیا گیا تھا۔

"کیا جادو کرتی ہو فاطمہ بی بی! مجھے اپنے سحر میں ایسا جکڑا ہے کہ میں ثوبانہ کے جدائی کے صدمے کو بھی بھول گیا ہوں۔ اب تو تمہاری تکلیف پہ اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔"

"بابا! اماں بالکل ٹھیک ہیں۔" لالئی کی آواز نے انہیں خیالوں سے چونکا دیا۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

دسویں اور آخری قسط

صائمہ اکرم چوہدری

# دیمک زدہ محبت

سکینہ، جمیلہ مائی اور اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بیٹی ہے، جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کبڑے پن کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگاتار علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کرا دلوا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگتی ہے۔ سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی مریضہ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکولوجسٹ ہے اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ رامس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم ماہم کو پسند کرتا ہے مگر سوات آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھنچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن ثمن، عائشہ کے کزن انفر کی بیوی ہے اور ڈینٹسٹ ہے۔

رامس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خودکشی کی کوشش کرتا ہے لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد رامس اور ماہم ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کمپیٹیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور کی ساتھی ڈاکٹر زویا کو ان کا سکینہ پر مہرباں ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی ناپسندیدگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی وقتاً فوقتاً سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔ نعت کمپیٹیشن میں سکینہ کی ملاقات موحد اور عائشہ سے ہوتی ہے۔ عائشہ کی پینٹنگز سے متاثر ہو کر علی اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ مگر ماہم کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔

## ناولٹ

آئی سی یو کے شیشے کے پار کھڑے تمام لوگوں کی نظریں سکینہ کے بے جان وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ جسے وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا۔ اس دن مسز ماریہ واپس آئیں تو سکینہ کا بے جان جسم دیکھ کر وہ بالکل ہی حواس باختہ ہو گئیں۔ انہوں نے بھاگ کر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو بلایا۔ کچھ ہی منٹوں میں یہ خبر پورے وارڈ میں پھیل گئی۔ ڈاکٹر خاور خود اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت ہلدی کی طرح زرد تھی۔

"اوہ مائی گاڈ۔!" سٹی اسکین کی رپورٹ ڈاکٹر خاور کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے چہرے پر پھیلنے والی واضح مایوسی جمیلہ مائی اور اللہ دتا سے نہیں چھپ سکی۔

"سر! مریض کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا ہے۔" ایک جونیئر ڈاکٹر نے قریب آکر اطلاع دی۔ ڈاکٹر خاور صرف سر ہلا کر رہ گئے۔ ان کی نظریں رپورٹ پر تھیں۔

"پتر! خیر تو ہے ناں؟" اللہ دتا کمہار نے خوف زدہ نگاہوں سے ڈاکٹر خاور کو دیکھا۔ جن کے چہرے پر پہلی دفعہ انہوں نے واضح مایوسی دیکھی۔

"بابا دعا کریں۔" ڈاکٹر خاور مختصراً بولے۔

"کیا مطلب بیٹا۔ رپورٹ تو ٹھیک ہے ناں۔" اللہ دتا پریشان ہو گئے۔

"بعض اوقات انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا اب اس سے آگے ہم ڈاکٹر بھی بے بس ہیں۔" ڈاکٹر خاور نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے۔

"جیسے میرے رب کی مرضی۔" اللہ دتا کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے پر انہوں نے چونک کر اپنے سامنے کھڑے دیہاتی کو دیکھا۔ جس نے صبر کا دامن اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ ڈاکٹر خاور کو اپنی مایوسی پر شرمندگی ہوئی۔ انہوں نے سامنے بینچ پر بیٹھی جمیلہ مائی کو دیکھا' ان کی آنکھیں بند اور ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے بڑے تسلسل سے نیچے گر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میں زندگی میں پہلی دفعہ اس مقام پر آیا ہوں جب مجھے حقیقت میں رونے کے لیے ایک کندھے کی ضرورت ہے۔"

رات کو دو بجے عائشہ کے سیل پر آنے والے اس ٹیکسٹ نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ جو ابھی ایک پینٹنگ مکمل کرنے کے چکروں میں وقت دیکھنا ہی بھول گئی تھی۔ اپنے سیل فون پر آنے والی میسج ٹون نے اسے بے اختیار وال کلاک کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"اس وقت خاور علی کا ایسا میسج۔" وہ ایک دم گھبرا ہی گئی۔ اس نے بے اختیار ان کا نمبر ملایا جو پہلی ہی بیل پر اٹھا لیا گیا۔

"کہاں ہیں آپ؟" عائشہ کے لہجے میں بہت سے اندیشے پنہاں تھے۔

"اسپتال میں' اپنے آفس میں۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے کی نمی وہ اتنی دور بیٹھ کر بھی محسوس کر گئی۔

"خیریت ؟ کیا آج آپ کال پر ہیں ؟ طبیعت ٹھیک ہے؟ ماما کیسی ہیں ؟" اس نے بے چینی سے ایک ساتھ کئی سوال کیے۔

"سب ٹھیک ہیں' لیکن میں ٹھیک نہیں ہوں۔" وہ بولے تو ان کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔

"کک۔ کیا ہوا خاور ؟" عائشہ کا دل بے ہنگم انداز سے دھڑکا۔

"پتا نہیں' لیکن میرا دل کر رہا ہے کہ میں زمین پر بیٹھ کر کسی ضدی بچے کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رو دوں۔" وہ قنوطیت کی انتہا پر تھے۔

"کیا ہو گیا ہے ؟ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے یہ باتیں بھلا آپ کو زیب دیتی ہیں۔" عائشہ نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

"کیا ہم ڈاکٹر انسان نہیں ہوتے' کیا ہمارے سینے میں سیمنٹ سے بنا دل ہوتا ہے' تم لوگ ہم ڈاکٹروں سے یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ ہم چلتے پھرتے مشینی روبوٹ بن جائیں۔ ہمارے دل پھٹ جائیں' سینہ زخمی ہو جائے' آنکھیں لہولہو ہو جائیں' لیکن ہمیں رونے کی اجازت نہیں' کیونکہ ہم ڈاکٹر ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسے۔ ان کی ہنسی میں ٹوٹے کانچ کی جھنکار تھی۔ عائشہ کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔

"اگر آپ کہیں تو میں ہسپتال آجاؤں۔" وہ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اتنا ہی بولی۔

"نہیں۔ رات کے اس پہر آپ کا آنا مناسب نہیں۔" ان کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔

"پھر بتائیں کہ کیا ہوا ہے ؟" عائشہ پریشان ہوئی۔

"ایسا لگتا ہے جیسے دکھ اور اذیت سے دل کی تاریں ٹوٹ جائیں گی میرا پورا وجود ایک قیامت خیز زلزلے کے زد میں ہے۔ میں بظاہر بالکل ٹھیک ہوں' لیکن مجھے معلوم ہے کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

"ڈاکٹر خاور!" عائشہ گھبرا گئی۔

"مجھے ڈاکٹر خاور مت کہا کرو عائشہ! میں تمہارے لیے علی ہوں۔ میں تم سے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کبھی نہیں ملا۔ مسیحائی میرا پروفیشن اور عشق سہی' لیکن میرے اندر ایک عام سا شخص بستا ہے۔ جو ایک عام آدمی کی طرح چھوٹے سے دکھ پر پریشان ہو جاتا ہے۔ جسے شاخ پر اگنے والی معمولی سی کونپل بھی خوشی دے دیتی ہے۔ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹروں کے دل کے ارد گرد کوئی لوہے کا خول ہے۔ ان پر کوئی چیز اثر نہیں کر سکتی۔ کم از کم اپنی نظروں میں تو تم مجھے ایک عام سا انسان رہنے دو۔" ان کی وضاحت پر وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

"لیکن آپ مجھے بتائیں تو سہی' ہوا کیا ہے ۔ ؟" عائشہ خود کو پوچھنے سے نہ روک پائی۔

"سکینہ ٹھیک نہیں ہے عائشہ۔" عائشہ حیران ہوئی۔

"کیا ہوا اس معصوم لڑکی کو؟" اسے افسوس ہوا۔

"برین ہیمبرج۔" انہوں نے جواب دیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ اس کا تو صبح آپریشن نہیں تھا؟"

"اسے شاید ہم ڈاکٹروں کی صلاحیتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے وہ ہمیں کسی مشکل میں ڈالے بغیر کومے میں چلی گئی۔" وہ دکھ سے بولے۔

"لیکن اچانک کیسے؟"

"آج شام اس کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔" انہوں نے وجہ بتائی تو وہ ایک لمبا سانس لے کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ صبح سویرے ناشتہ کرتے ہی ہسپتال پہنچی تھی سامنے ڈاکٹر خاور کے ساتھ کھڑی لڑکی کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ بلاشبہ وہ لڑکی تھی جس نے کئی ماہ تک اس کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون غارت کیے رکھا تھا۔ وہ دونوں آئی سی یو کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کے دائیں بازو میں سفید اوور آل تھا جسے اس نے اپنے بازو پہ فولڈ کر کے ڈال رکھا تھا۔

"السلام علیکم۔" عائشہ نے ڈاکٹر خاور کی رت جگے کی عکاسی کرتی سرخ آنکھوں میں جھانکا۔ سرخ رنگ کے ڈورے اسے پریشان کر گئے۔

"وعلیکم السلام !" ڈاکٹر خاور بمشکل مسکرائے۔

"عائشہ' یہ ڈاکٹر علینہ ہیں' بہت اچھی نیورو فزیشن' میرے فرینڈ ڈاکٹر علی سکندر کی مسز ہیں۔" ڈاکٹر خاور نے تعارف کرایا۔ "اور علینہ بھابھی' یہ عائشہ ہے' میری بہت اچھی دوست۔"

"عائشہ عبدالرحیم جو بہت اچھی مصورہ ہیں۔" ڈاکٹر علینہ نے بڑے دوستانہ انداز سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تو عائشہ مسکرا دی۔ "بھئی بہت ذکر سنا تھا تمہارا۔"

"سکینہ کیسی ہے۔؟" عائشہ نے بے تابی سے پوچھا تو دونوں ایک دم ہی سنجیدہ ہوئے۔

"بس دعا کرو' اب دعا کے علاوہ سکینہ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" وہ ڈاکٹر خاور کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس بینچ کی طرف آگئی جہاں اللہ دتا کمہار اور جمیلہ مائی بیٹھے تھے۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائے۔ دودھیا سفید رنگ کی چادر اوڑھے موسم سرما پوری آب و تاب کے ساتھ آچکا تھا۔ اوس میں بھیگے خزاں رسیدہ درختوں پر اترنے والی اس صبح کے دامن میں عجیب سی یاسیت تھی۔

"ہاں جی' اللہ بہت کرم کرے گا۔" اس نے جمیلہ

مائی کا سرد ہاتھ پکڑ کر خلوص دل سے تسلی دینے کی کوشش کی۔
"اللہ جو کرے گا' بہتر کرے گا اور ہمیں اسی بہتر فیصلے کا انتظار ہے۔" جمیلہ مائی کا لہجہ پرسکون تھا۔ عائشہ کو بے اختیار ان پر رشک آیا۔
"یہ بچپن سے ہی بہت باتونی اور بے چین طبیعت کی حامل تھی' اس کا ابا کہتا تھا کہ میری سکینہ کے اندر پارہ دوڑتا ہے۔ اب ایسے لگتا ہے جیسے یہ دوڑ دوڑ کر تھک گئی ہو اب صرف پرسکون نیند سونا چاہ رہی ہو۔" جمیلہ مائی نے آئی سی یو کے شیشوں والی دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دکھی انداز سے عائشہ کو بتایا۔
"مجھے کہتی تھی کہ اماں' تو بھی سوچتی ہو گی کہ اللہ نے ایک اولاد دی اور وہ بھی معذور۔" جمیلہ مائی کسی اور ہی جہان میں پہنچی ہوئی تھیں۔ "اس جھلی کو کیا پتا کہ وہ ہمارے دل کی ٹھنڈ اور آنکھوں کا نور ہے۔" جمیلہ مائی کی آواز بھرا گئی۔
"ڈاکٹر پتر! کوئی ایسا ٹیکا' کوئی ایسی دوائی نہیں' جسے کھاتے ہی میری دھی رانی ایک دفعہ آنکھیں کھول کر اپنی ماں کو دیکھ لے۔" جمیلہ مائی ہونٹ کچلتے دھندلی آنکھوں سے زمین کو گھورتے ہوئے بولیں' ان کے آنسو ڈاکٹر خاور کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہوئے۔
"مجھے کمرہ اس کے بغیر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اس کی سہیلی چڑیاں بھی اداس ہیں۔ کل سے کسی نے بھی سکینہ کی کھڑکی کے پاس آکر شور نہیں کیا' ایسا لگتا ہے جیسے چڑیوں کو بھی پتا چل گیا ہو کہ سکینہ سو رہی ہے اس لیے انہوں نے شور نہیں کرنا۔" جمیلہ مائی کی آنکھیں آئی سی یو کے شیشے کی دیوار کے پار سکینہ کے وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ عائشہ نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسوؤں کو صاف کیا۔
"بھلے لوکے! کیوں' خود کو پریشان کرتی ہے ایسی باتیں سوچ کر۔" اللہ دتے نے جمیلہ مائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک خاموش دلاسا دیا۔
"چلیں۔" عائشہ نے اعصاب شکن ماحول سے نکلنے کے لیے انہیں آنکھ کا اشارہ کیا۔
"کیا ہوا عائشہ ؟" ڈاکٹر خاور نے اپنے آفس میں پہنچتے ہی عائشہ کا زرد چہرہ دیکھا۔ وہ مضطرب انداز سے اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔
"مجھے لگا کہ اگر میں کچھ دیر اور سکینہ کے والدین کے سامنے کھڑی رہی تو میرا دل پھٹ جائے گا۔" اس کے رخساروں پر پے در پے قطرے پھسلے۔
"میں تو کل سے خود اذیت میں مبتلا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جسم کی ہر رگ میں ایک محشر برپا ہے۔" انہوں نے ایک ٹشو عائشہ کی جانب بڑھایا' جسے اس نے فوراً ہی تھام لیا۔
"لیکن یہ سب اچانک کیسے ہوا؟ وہ دو تین دن پہلے تک تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔" عائشہ نے الجھن آمیز انداز سے انہیں دیکھا۔
"دنیا میں کچھ لوگ دوسروں کا دل دکھانے کا پرمٹ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ خود کو خدا سمجھتے ہیں۔ دلوں سے کھیلنا ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ اس کا معصوم سا دل بھی ایسے ہی ایک ظالم کے ہاتھوں پامال ہو گیا' زہر آلود جملوں' تلخ باتوں اور تذلیل کرتی نگاہوں کا سامنا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ دل کسی نہ کسی صورت میں تو احتجاج کرتا ہے نا۔ ایسے میں ہارٹ فیل ہونا یا برین ہیمرج ہو جانا تو بہت معمولی سی بات ہے۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں دکھ کی چبھن تھی۔
"ڈاکٹر خاور! ڈاکٹر زوبیا آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ کسی صورت بھی ٹلنے کا نام نہیں لے رہیں۔" مسز ماریہ نے بہت بیزاری سے آکر اطلاع دی۔ عائشہ چونک گئی۔
"بھیج دو ان کو اندر۔" ڈاکٹر خاور کا چہرہ تناؤ کا شکار ہوا۔
"آئی ایم سوری خاور! آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کتنی اپ سیٹ ہوں۔" ڈاکٹر زوبیا اپنی انگلیوں کو مسلتی ہوئی بے حد پریشان لگ رہی تھی۔ "مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ پلیز آپ مجھے معاف کر دیں۔" وہ واقعی اپنے رویے پر نادم دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ



عائشہ ٹھٹک کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔
"عائشہ! یہ وہی ہیں' جن کا میں کچھ دیر پہلے ذکر کر رہا تھا۔ سکینہ کو اپنی زندگی کی آخری گفتگو کرنے کا شرف ان ہی کے ساتھ حاصل ہوا تھا۔" ڈاکٹر خاور کا تلخ لہجہ عائشہ کو حیران کر گیا۔ اسے تھوڑی بہت سچویشن سمجھ میں آ رہی تھی۔
"ڈاکٹر زوبیا' یہ میری فیانسی ہیں' عائشہ عبدالرحیم۔" ڈاکٹر خاور کے جتاتے ہوئے انداز پر ڈاکٹر زوبیا کا رنگ فق ہوا۔ اس نے ہراساں نظروں سے دونوں کو دیکھا۔
"سکینہ کے ساتھ جو کچھ آپ نے کیا۔ وہ آپ کا اور اللہ کا معاملہ ہے اور اللہ سے بہتر کوئی انصاف نہیں کر سکتا۔ البتہ میری خواہش ہے کہ میں دوبارہ بھی آپ کی شکل اپنے وارڈ' اپنے ہاسپٹل' اپنے شہر اور اپنے ملک میں نہ دیکھوں۔ ڈاکٹر خاور کے سرد اور اجنبی لہجے پر زوبیا کو دھچکا لگا۔ ان کے چہرے پر سختی تھی۔
"چلیں عائشہ' ڈاکٹرز کیفے ٹیریا سے کافی پی کر آتے ہیں' میرے سر میں درد ہے۔" ڈاکٹر خاور ایک دم کھڑے ہوئے۔ عائشہ نے بھی ان کی پیروی کی۔ وہ دونوں کسی سنگی مجسمے کی طرح دروازے میں نصب ڈاکٹر زوبیا کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئے۔
"یہ سب کیا تھا۔" کوریڈور میں آتے ہی عائشہ نے ذرا توقف کے بعد سوال کیا۔
اس کے چہرے پر اتنے سوال تھے کہ ڈاکٹر خاور بڑے بے بس انداز سے وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں سے داستان شروع کریں۔

✡ ✡ ✡

"اگر موحد اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ رشتہ لینے کے لیے آنا چاہتا ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔" تابیہ کو ثنائیلہ کی پریشانی کسی طور بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ دونوں اس وقت جاڑے کی دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لیے چھت پر تھیں۔ تابیہ نے اپنے سامنے ٹوکری میں کافی سارے مالٹے رکھے ہوئے تھے جن سے وہ پورا انصاف کر رہی تھی۔
"یار' امی بہت مشکل سے مانیں گی۔" ثنائیلہ نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔
"ان کو کیا مسئلہ ہے' پہلے کون سا یہاں رشتوں کی کوئی لائن لگی ہوئی ہے۔" تابیہ نے ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا تو ثنائیلہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔
"وہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو' لیکن امی' موحد کی معذوری کی وجہ سے شاید نہ مانیں۔" اس نے اصل بات بتائی۔
"ٹینشن نہ لو' شہیر تو فوراً "ہاں" ہی مان جائے گا۔" تابیہ نے مالٹے کی پھانک پر نمک لگاتے ہوئے مزے سے کہا تو وہ چونک گئی۔ "تم کیسے کہہ سکتی ہو یہ ؟"
"بھئی۔ وہ بہت حسابی کتابی سا بندہ ہے۔ موحد کے گھر میں دولت کی اتنی ریل پیل ہے کہ اسے کوئی اور چیز نظر ہی نہیں آئے گی۔" تابیہ نے بڑے تلخ انداز سے کہا۔
"اور وہ جو ممانی جان نے امی کو کہا ہے' تم نے پوچھا راحس سے۔" ثنائیلہ نے کچھ جھجک کر پوچھا۔
"فکر نہ کرو' میری بات ہو گئی ہے راحس سے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ماما کا اشارہ ثنائیلہ کی طرف نہیں تھا۔" تابیہ کی بات پر وہ کچھ مطمئن ہو گئی۔
"پھر کب آ رہے ہیں وہ لوگ ؟" ثنائیلہ نے کھل کر سانس لیتے ہوئے پوچھا تو تابیہ مسکرا دی۔
"کزن تمہارے ہیں اور پوچھ تم مجھ سے رہی ہو۔"
"حکومت' شرافت سے بتاؤ۔" ثنائیلہ نے بے تکلفی سے اسے چپت رسید کیا تو اس نے گھور کر کہا۔
"آ جائیں گے کچھ دنوں میں' اتنی جلدی کیا ہے۔"
"تمہیں پتا ہے' شہیر کی باہر والی جاب ختم ہو گئی ہے۔" ثنائیلہ نے اس کے چہرے کو جانچتے ہوئے اچانک کہا۔

”مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ اس کی بیگم نے بھی اس سے طلاق لے لی ہے۔“ تابیہ کا انداز برجستہ تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا۔؟“ ثنائیلہ کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا۔

”ظاہر ہے مجھے شہیر کے علاوہ کون بتا سکتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاید میرے دل میں اب بھی اس کے لیے کوئی نرم گوشہ ہوگا' لیکن اسے خبر نہیں کہ جب کسی کی محبت کو ہم ناقدری کی مٹی میں رول دیں تو اس کے بعد پھر دل کی سرزمین پر کوئی اور جذبہ نہیں پنپتا۔“ تابیہ نے ملنے کا چھلکا شرارت سے سامنے بیٹھے کوّے کو مارا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو یار' بعض دفعہ یہ خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کی چھاؤں بہت لمبی ہو جاتی ہے اور انسان کو اس وقت تک ہوش نہیں آتا' جب تک کوئی اسے دھکا دے کر حقیقت کی دھوپ میں پھینک نہیں دیتا۔“ ثنائیلہ کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

”تم بتاؤ' تمہارے اینگری ینگ مین کا کیا حال ہے۔؟“ تابیہ نے موضوع بدلا۔

”وہ ہی' کبھی دھوپ' کبھی چھاؤں۔“ ثنائیلہ تھوڑا سا رنجیدہ ہوئی۔

”ہوں' اس کا مطلب ہے کہ آج کل پھر موصوف کوئی بدگمانی کی چھتری تانے بیٹھے ہیں۔“

”پتا نہیں محبت اتنی زیادہ بدگمان کیوں ہوتی ہے۔؟“ ثنائیلہ نے کہتے ہوئے گہری سانس خارج کی۔

”جس جذبے میں جتنی زیادہ شدت ہو' وہ اپنے اندر اتنی ہی نزاکت بھی رکھتا ہے۔ محبت کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی ہے کہ وہ اندیشوں' واہموں اور خوف کے پردوں میں لپٹی ہوتی ہے۔ ہر لمحہ کچھ ہو جانے کا ڈر انسان کے اندر سے نکل ہی نہیں پاتا۔“ تابیہ نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”لیکن یہ ڈر کبھی کبھی انسان کے حال کے سارے خوشنما لمحوں کو کھا بھی تو جاتا ہے۔“ ثنائیلہ ہنوز رنجیدہ تھی۔

”کوشش کرو کہ وہ مستقبل کے اندیشوں میں اپنے حال کو برباد نہ کرے' اسے اتنا اعتبار دو کہ وہ یقین کی سب سے اونچی منزل پر بیٹھ جائے۔“ تابیہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”یار! اس سے بڑھ کر اعتبار کی کیا بات ہوگی' میں نے اس سے ماہم منصور کے ساتھ تعلق کے بارے میں دوبارہ نہیں پوچھا۔“ وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔

”بعض دفعہ زندگی ہمارے ساتھ اتنا برا کر چکی ہوتی ہے کہ جب کوئی اچھا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو ہمیں یقین ہی نہیں آتا۔ وہ بھی اسی مرحلے سے گزر رہا ہے۔ اسے کچھ مارجن دو پلیز ڈیر۔“ تابیہ کی تمام تر ہمدردیاں موحد کے ساتھ تھیں۔

”اسی مارجن کے سہارے تو ہمارا تعلق قائم ہے۔ ورنہ اس کی بدگمانیوں کی تو کوئی حد نہیں۔“ ثنائیلہ نے منہ بنایا۔

”اچھا اچھا اب اپنے چہرے کے زاویے بگاڑنے کی کوشش نہ کرو' یہ مالٹے کھاؤ' قسم سے مزا آجائے گا۔“ تابیہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں اسے چھیڑا تو وہ مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

”کاش سکینہ! تم صرف ایک دفعہ آنکھیں کھول کر دیکھ لو' میں تمہاری سماعتوں کے سارے قرض ادا کردوں گا۔“ ڈاکٹر خاور آج فجر کی نماز پڑھ کر آئی سی یو کے شیشے کی دیوار کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ سامنے سکینہ آنکھیں بند کیے بہت پرسکون حالت میں ہوش و حواس کی دنیا سے بہت دور پہنچی ہوئی تھی۔

”تم نے تو ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا تھا' پھر اتنی جلدی ہمت کیوں ہار دی۔“

”اس کی شروع سے ہی یہ عادت تھی پتر' جب کسی سے خفا ہوتی تھی تو ایسے ہی آنکھیں بند کرکے لیٹ جاتی تھی۔“ جمیلہ مائی ہاتھ میں تسبیح پکڑے ان کے پاس آکھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر خاور نے چونک کر اپنے بالکل پاس کھڑے اس پُروجاہت کے پیکر کو دیکھا۔

”ہاں جی' پھر آپ کی بیٹی کی ناراضی کتنی دن بعد دور ہوتی تھی۔“ ڈاکٹر خاور کسی اور دنیا میں پہنچے ہوئے تھے۔ جمیلہ مائی چونک گئی۔

”پتر! اس کا دل تو بہت ہی چھوٹا تھا' یہ تو چند ہی گھنٹوں کے بعد سب کچھ بھول بھال کے میرے پیچھے پیچھے پھرنے لگتی تھی۔“ جمیلہ مائی کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”لیکن آج تو پورے پندرہ دن ہوگئے ہیں۔“ ڈاکٹر خاور نے انگلیوں پر حساب کیا۔

”اس دفعہ تو ایسے لگتا ہے جیسے سکینہ نے اپنا دل بہت ہی پکا کرلیا ہے ڈاکٹر صیب' اسے اپنے بڈھے ماں پیو کی بھی فکر نہیں۔“ جمیلہ کا لہجہ بھیگا اور ڈاکٹر خاور کی ساری ہستی تہس نہس ہوگئی۔

”دنیا نے اسے ستایا بھی تو بہت ہے۔“ ڈاکٹر خاور نے اس کی طرف داری کی۔ ”تھوڑا بہت نخرہ کرنا تو اب اس کا بھی حق بنتا ہے ناں۔“ اس سے زیادہ وہاں ٹھہرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے آفس کی طرف چل دیے۔

”الف اللہ چنبے دی بوٹی' مرشد لائی ہو۔“ ڈاکٹر خاور کی سماعتوں سے ایک جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔ ان کے دل میں ایک حشر سا برپا ہوا۔ وہ بے ساختہ مڑے۔ خوف زدہ نگاہوں سے سکینہ کے کمرے کی طرف دیکھا' جہاں سے آنے والی آواز بلاشبہ سکینہ کی ہی تھی۔ دل بے قراری سے تڑپا۔ صبح کی خاموشی میں سکینہ کی آواز پورے کوریڈور میں گونج رہی تھی۔ یہ ان کی سماعتوں کا دھوکا نہیں تھا۔ وہ بے ربط سانسوں کے ساتھ اس کے کمرے تک پہنچے' جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

سامنے اس کے بیڈ پر سسٹر ماریہ بڑے رنجیدہ انداز سے بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس رکھے سیل فون میں سکینہ کی آواز میں ریکارڈ یہ کافی پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔

”سسٹر ماریہ! آپ نے ایک دفعہ تو میرے پیروں کے نیچے سے زمین ہی کھینچ لی۔“ وہ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھے۔ سسٹر ماریہ نے خفت زدہ انداز سے اپنا سیل فون بند کیا۔

”آپ نے سکینہ کی آواز میں کافی کب ریکارڈ کی/؟“

”ڈاکٹر صاحب! سکینہ نے میری فرمائش پر کافی چیزیں مجھے ریکارڈ کرکے دی تھیں۔“ وہ اداسی سے مسکرائیں۔

”وہ ایک دفعہ تو مجھے حقیقتاً ایسا محسوس ہوا جیسے سکینہ حقیقت میں گا رہی ہو۔ آپ سوچ نہیں سکتیں کہ میں ایک لمحے میں کتنی بڑی اذیت سے گزرا ہوں۔“ ڈاکٹر خاور نے بے بسی سے آنکھیں بند کیں۔ سسٹر ماریہ نے ڈاکٹر خاور کو غور سے دیکھا۔ ان کا چہرہ متغیر اور سانسوں کا ربط غیر ہموار تھا۔

”سوری ڈاکٹر صاحب! مجھے اندازہ نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں آج سکینہ کی یاد بہت آرہی تھی۔“

”اس کی یاد بھولتی کس کو۔“ ان کے لہجے میں ایک بے بسی تھی' ایک محسوس کیے جانے والا اضطراب تھا۔ سسٹر ماریہ گنگ ہوگئیں۔

”بہرحال' اس کے والدین کے سامنے ان ریکارڈ کی ہوئی چیزوں کو نہ چلائیے گا۔ یہ ان کے لیے تکلیف کا باعث بنیں گی۔“ ڈاکٹر خاور نے نرمی سے کہا تو سسٹر ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اپنے کلینک میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ ان کے سیل فون پر عائشہ کا نام جگمگایا۔ دل میں کہیں ٹھنڈک کا احساس پیدا ہوا۔

”کیسے ہیں؟“ عائشہ کا لہجہ فکر مند تھا۔

”بہتر ہوں یار' لیکن سچ بتاؤں کہ زندگی میں ایک پھیکا پن سا آگیا ہے۔ کوئی بھی چیز' کوئی بھی منظر' کوئی بھی بات دل کو خوشی نہیں دے رہی۔“ انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے لیکن پریشان نہ ہوں' اللہ بہتر کرے گا۔“ عائشہ نے نرمی سے دلاسا دیا۔

”تم سناؤ کہ کوئی نئی چیز بنائی' پارک میں جا رہی ہو؟ نہیں' میرا تو سارا ہی شیڈول آج کل ڈسٹرب ہو گیا ہے۔“ ڈاکٹر خاور نے ایک ہی سانس میں دو سوال پوچھے۔

”میرا بھی آج کل کچھ موڈ نہیں بن رہا' کوئی بھی کام

کرنے کو۔" عائشہ کے سنجیدہ لہجے پر وہ چونکے۔

"کیوں ؟" انہوں نے فوراً" ہی استفسار کیا۔

"پتا نہیں۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ "شاید اس لیے کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔"

عائشہ کی بات نے انہیں لاجواب کردیا۔ وہ کچھ بھی نہیں بول پائے۔ دونوں کے درمیان اب بس معنی خیز سی خاموشی گفتگو کررہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آخر اس رشتے میں ہرج کیا ہے۔؟" شمیر نے بڑے تیکھے لہجے میں امی کی طرف دیکھا جن کا مزاج خاصا برہم تھا۔ ثنائیلہ کچن کے فرش پر پیڑھی رکھے بڑی بے دلی کے ساتھ مٹر چھیلنے میں مصروف تھی لیکن اس کا سارا دھیان اندر کی گفتگو کی طرف تھا۔ رات موحد کی امی اپنی بہن کے ساتھ اس کے رشتے کے لیے آئی تھیں اور صبح ہی شمیر بھی امی کے ساتھ وہاں کا چکر لگا آیا تھا اور جب سے واپس آیا تھا، سخت متاثر تھا۔

"تمہیں شاید ان کے خوبصورت بنگلے میں رکھی وہیل چیئر نظر نہیں آئی بیٹا۔" والدہ کا لہجہ دکھ میں ڈوبا۔

"کیا ہو گیا ہے امی! کروڑوں کی مالیت کا ان کا گھر تھا۔ سب سے بڑی بات ان کا وہ اکلوتا بیٹا ہے اور اس کی والدہ کہہ تو رہی تھیں کہ وہ اپنے بیٹے کو مصنوعی ٹانگیں لگوانے کے لیے امریکہ بھیجیں گی' ان کے لیے مشکل تھوڑی ہے۔" شمیر ہلکا سا جھنجلایا۔

"پھر بھی بیٹا! اصل اور نقل میں فرق تو بہرحال ہوتا ہے۔" والدہ کی تسلی کسی صورت بھی نہیں ہو پارہی تھی۔

"پھر ایسا کریں امی! آپ آپی کی شادی کا خیال اپنے ذہن سے نکال ہی دیں۔" وہ تلخ ہوا۔ انہوں نے حیرت سے اپنے بیٹے کا ناراض چہرہ دیکھا۔

"برا نہ ماننے گا امی۔ تھوڑا سا حقیقت پسند ہو کر سوچیں' ایک تو آپی کی عمر اتنی کم نہیں' اوپر سے شکل و صورت کے لحاظ سے بھی بس وہ نارمل سی ہیں۔ کون آئے گا انہیں بیاہنے۔؟" شمیر کا دل دکھاتا لہجہ امی کے ساتھ ساتھ ثنائیلہ کو بھی رنجیدہ کر گیا۔

"ایسے چانس روز روز نہیں ملتے۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ "آپی کی قسمت سنور جائے گی۔"

"دیکھ لو بیٹا! جو تمہیں مناسب لگے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" امی نے جلد ہی ہتھیار پھینک دیے۔

"آپ یہ بھی تو سوچیں' آپی کی شادی وہاں ہو گئی تو میرا بھی مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔" شمیر کی بات پر کچن میں بیٹھی ثنائیلہ بری طرح چونکی۔

"وہ کیسے بیٹا۔؟" امی حیران ہوئیں۔ جب کہ شمیر بڑے جوش و خروش کے ساتھ گویا ہوا۔

"دیکھیں نا امی! ان کی ایک بیٹی بھی تو ہے' آپی کی شادی وہاں ہو جائے تو وہ میرے لیے بھی راہ ہموار کر سکتی ہیں۔"

ثنائیلہ کے ہاتھ سے چھری گری۔ وہ دکھ' تاسف اور صدمے سے وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

"لیکن بیٹا! وہ اپنی بیٹی کا رشتہ ہمیں کیوں دینے لگے۔"

"کیوں؟" وہ تھوڑا سا تلخ ہوا۔ "ہم نے بھی تو ان کے معذور بیٹے کے لیے اپنی بالکل ٹھیک ٹھاک بیٹی کا رشتہ دیا ہے۔"

"لیکن ان کی بیٹی معذور نہیں ہے' پھر ہم دونوں خاندانوں کا معاشی لحاظ سے فرق دیکھا ہے تم نے۔" امی نے طنزیہ لہجے میں یاد دلایا۔

"رہنے دیں امی! ان کی بیٹی معذور نہ سہی لیکن ایسی حور پری بھی نہیں۔ جہاں تک اسٹیٹس کی بات ہے تو وہ اتنی خوب صورت ہوتی تو اب تک اس کی شادی ہو چکی ہوتی۔" شمیر کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔

"خیر تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں' لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ ہمیں دیں گے۔" امی نے بھی صاف گوئی سے کہا۔

"یہ تو بعد کی بات ہے۔" وہ بیزار ہوا۔ "ابھی آپی کی شادی تو ہونے دیں۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"



ان کی خوش گمانیوں کی کوئی حد نہیں تھی۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں نابیہ! میرا بھائی بہت حسابی ہے' ہر چیز میں اپنا ہی فائدہ دیکھتا ہے۔" ثنائیلہ کی آنکھ سے نکلنے والا آنسو اس کے لبوں تک پہنچ گیا جسے اس نے بے دردی سے پونچھا اور پھر بے دلی کے ساتھ مٹر چھیلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"اومائی گاڈ' بھائی' ثنائیلہ زبیر جو مشہور و معروف مصنفہ ہیں' آپ کی شادی ان کے ساتھ ہو رہی ہے۔" عائشہ نے حیرت سے کہا۔

"کیوں تمہیں نہیں پتا تھا کیا؟" موحد مسکرایا۔

"کیوں کیسے پتا چلنا تھا' میں نے تو کبھی ان چیزوں میں دلچسپی ہی نہیں لی۔ حالانکہ آپ نے بتایا بھی تھا کہ وہ ماہم کے پاس آتی رہتی تھی' لیکن میرا دھیان ہی نہیں گیا۔" عائشہ اس کے بالکل پاس رکھے صوفے پر آن بیٹھی۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی خوشگوار حیرت کے رنگ نمایاں تھے۔

"کیوں' تم سے ماہم نے اس کا ذکر کیا تھا کیا ؟" موحد نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں' وہ بتا رہی تھی۔" وہ روانی میں بولتے ہوئے یک دم رکی' جیسے اس بات کا فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ وہ اگلی بات بتائے یا نہ بتائے۔

"اس نے یہی بتایا ہو گا کہ ثنائیلہ زبیر کو اپنے لکھے ہوئے ایک کردار سے محبت سے ہو گئی تھی۔" موحد نے اس کی الجھن کو ختم کیا تو وہ جھینپ گئی۔

"اس کو شاید علم نہیں کہ وہ کردار میں ہی تھا۔" وہ بہت مزے سے بولا۔

"واٹ۔؟" عائشہ حیرت سے اچھلی۔ موحد اس کے حیران ہونے پر مسکرایا۔

"مائی گاڈ' آپ دونوں کتنے بڑے چھپے رستم نکلے مجھ سے کتنی باتیں چھپا رکھی تھیں آپ نے۔" عائشہ مصنوعی خفگی سے گویا ہوئی۔

"تم سے کیا شیئر کرتا' تم تو خود ان دنوں جانے کن چکروں میں تھیں' ناک پر مکھی تک تو بیٹھنے نہیں دیتی تھیں۔" موحد نے اسے چھیڑا۔ اس کا موڈ آج خاصا خوشگوار تھا۔

"ہاں' یہ تو ہے۔" اس نے خجالت سے اپنے کان کھجائے۔

"اب تو تمہارے پاس اتنا بھی ٹائم نہیں کہ ثنائیلہ سے ملنے کے لیے ہی چلی جاؤ' پرسوں بھی ماما بے چاری کو خالہ کو ساتھ لے کر جانا پڑا۔" موحد نے ہلکا سا شکوہ کیا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"سوری بھائی' بس آج کل سکینہ کی بیماری نے سب کچھ بھلا رکھا ہے۔ پرسوں بھی' میں اس کے والدین کے پاس تھی۔" عائشہ نے صفائی دی۔

"او ہاں یاد آیا' کیسی طبیعت ہے اس کی ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟" موحد کو بھی یاد آیا۔

"طبیعت تو ویسی کی ویسی ہے اور ڈاکٹرز بھی زیادہ پر امید نہیں۔" عائشہ تھوڑا سا اداس ہو گئی

"اور تمہارے ڈاکٹرز خاور صاحب کا کیا حال ہے؟" موحد کی اگلی بات پر جھینپ سی گئی۔

"ٹھیک ہیں وہ بھی۔" اس نے مختصرا" کہا لیکن اس کے رخساروں پر پھیلنے والی شفق نے موحد کو کئی ان کہی داستانیں سنا دیں۔

"ویسے میرے لیے تو یہ واقعی بہت حیران کن بات تھی کہ وہ رامس علی کے بھائی ہیں۔ تب ہی دونوں میں کافی مشابہت نظر آتی تھی۔" موحد نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو عائشہ مسکرا دی۔

"بھائی! آپ کو پتا ہے' ماہم آج کل ڈاکٹر خاور کے چکروں میں ہے۔" عائشہ کے منہ سے بے اختیار ہی پھسلا۔

"دماغ ٹھیک ہے اس کا۔" موحد کو ایک دم ہی غصہ آیا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟"

"بھائی! وہ میری دوست ہے' مجھے نہیں پتا ہو گا تو اور کسے ہو گا۔"

"نہیں ہے وہ تمہاری دوست۔" موحد نے تلخی سے کہا۔ "خود پسند اور خود پرست لوگ کسی کے

دوست نہیں ہوتے' وہ تو اگر منہ کے بل گریں تو تب بھی اپنے ہی قدموں میں گرنا پسند کرتے ہیں۔" وہ تلخ ہوا۔ عائشہ اس کے چہرے پر تلخی کو دیکھتے ہوئے اچانک بولی۔

"بھائی کیا آپ کو اب بھی اس سے محبت ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے فوراً" بات قطع کی۔ "میری زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی تھی وہ۔ ہم جیسے لوگ کسی کی محبت کے قابل نہیں ہوتے۔ وہ محض "ہمیں" کا تمغہ گلے میں لٹکائے دوسروں کے ضبط کا امتحان لینے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔"

"کتنی حیران کن بات ہے بھائی! وہ میری دوست تھی اور میری ہی جڑیں کاٹتی رہی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" عائشہ دکھی ہوئی۔

"دوست کبھی بھی کسی دوست کی جڑیں نہیں کاٹ سکتا' ایسا بس دوست نما دشمن ہی کرتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھا کرو۔" موحد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں کیوں' مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ وہ ایسی ہو سکتی ہے۔" عائشہ ابھی بھی بے یقین تھی۔

"وہ شروع ہی سے ایسی تھی' بس تمہیں پتا ہی دیر سے چلا۔" موحد نے اس کی تصحیح کی تو وہ زبردستی مسکرا دی۔

"چلیں چھوڑیں' یہ بتائیں' آپ کی شادی کی شاپنگ ہم کب اسٹارٹ کریں گے۔" عائشہ کو اچانک ہی یاد آیا تو وہ پرجوش ہوئی۔

"عائشہ! میری خواہش ہے۔ سب کچھ سادگی سے ہو' میں شائلہ کی فیملی پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔" عائشہ کو اپنے حساس سے بھائی کی یہ بات بہت اچھی لگی تب ہی اس نے فوراً" کہا۔

"ہاں تو ہم ایسا کب کر رہے ہیں' بس ولیمہ ہم البتہ دھوم دھام سے کریں گے۔"

"ہاں ولیمہ پر جو مرضی کر لینا' اجازت ہے۔" موحد نے اسے تسلی دی تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر صاحب! سکینہ آنکھیں کھول کر دیکھتی کیوں نہیں۔" حاجی کا رنجیدہ لہجہ ڈاکٹر خاور کو کرب میں مبتلا کر گیا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے اس نوعمر لڑکے کو دیکھا جس کی لال آنکھیں رتجگوں کی غمازی کر رہی تھیں۔ ملگجا سا حلیہ' بڑھی ہوئی شیو آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے' چہرے پر پھیلی بے بسی نے اسے قابل رحم شخصیت بنا رکھا تھا۔ وہ سکینہ کے والدین کے ساتھ ساتھ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سکینہ کے بجائے وہ ان کا سگا بیٹا ہو۔

"بس دعا کرو اعجاز! اللہ سکینہ پر کرم کرے۔" ڈاکٹر خاور نے اس کی فائل چیک کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب' آپ کو کیا پتا' ایک ایک لمحہ دل کی گہرائیوں سے بس ایک یہی دعا نکل رہی ہے۔" اس نے سکینہ کے چہرے کو محبت سے دیکھا۔

"میں جانتا ہوں اعجاز! لیکن ہم ڈاکٹرز اب سکینہ کے معاملے میں بے بس ہو چکے ہیں۔" ڈاکٹر خاور کی آنکھوں سے بھی رنج چھلکا۔

"سکینہ ہمیشہ مجھ سے لڑتی تھی' اسے میں اچھا نہیں لگتا تھا' لیکن اب میرا دل کرتا ہے کہ وہ بس ایک دفعہ ٹھیک ہو جائے' میں ساری زندگی اسے اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔" اعجاز کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش شامل ہوئی۔

"محبت بھی انسان کو بس زار خوار ہی کرتی ہے۔ میں اس کے پیچھے تھا' جب کہ وہ طلب کا پیالہ اٹھائے کسی اور کے پیچھے تھی۔" اعجاز کی بات پر ڈاکٹر خاور کو جھٹکا سا لگا۔ انہوں نے بے ساختہ نظر اٹھا کر سامنے کھڑے عام سے لڑکے کو دیکھا جو ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

"یہ سب نصیبوں کے کھیل ہیں اعجاز! انسان اس معاملے میں بے بس ہے۔" ڈاکٹر خاور نے دانستہ بات کا رخ موڑ دیا۔



"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہم سب لوگ تقدیر کے ہاتھوں کٹھ پتلیاں ہیں۔ دنیا کے اسٹیج پر ہمارے بس چہرے اور جسم ہوتے ہیں۔ ان کٹھ پتلیوں کو چلانے والا تقدیر کا ہاتھ بڑا ظالم ہے۔ وہ سب کو اپنی مرضی اور خواہش پر چلاتا ہے۔ ہمارے پاس تو انگلی اٹھانے کا بھی اختیار نہیں۔" اعجاز سخت قنوطیت کا شکار تھا۔

"ایسا نہیں کہتے پتر! تقدیر کا ہاتھ کبھی ظالم نہیں ہوتا۔ انسان کی خواہشیں ظالم ہوتی ہیں۔ اپنے دل کو اللہ کی رضا کے آگے ڈھیر کر دے۔ اس کے بعد دیکھ' وہ تیرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کیسے کھولتا ہے۔ پہلے اس رب کا ہونا پڑتا ہے۔ آزمائشوں کی بھٹی میں جلنا پڑتا ہے تب وہ بندے پر نظر کرم ڈالتا ہے۔" اللہ دتا کمہار بڑی دیر کے بعد ان کی گفتگو میں شامل ہوا۔

"پتا نہیں چاچا! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ ہم انسانوں میں اتنی طاقت کہاں' اس کی آزمائشوں کی تاب لا سکیں۔" اعجاز زہرخند لہجے میں بولا۔

"انسانوں میں ہی تو طاقت ہوتی ہے پتر! اللہ نے اسے "ایسے" ہی سب پر فضیلت نہیں دے رکھی۔" اللہ دتا کمہار نے اپنے بھتیجے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا۔

"مجھے لگتا ہے چاچا! اللہ نے تجھے بناتے ہوئے بس صبر اور شکر کی مٹی سے ہی گوندھا ہوگا۔" اعجاز کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیلی۔

"اللہ نے تو سب ہی کو ایک ہی مٹی سے بنایا ہے۔ یہ باقی تو سارے ایویں خود کو بہلانے کے شغل ہیں پتر۔" اللہ دتا کے چہرے پر پھیلے سکون پر ڈاکٹر خاور کو رشک آیا۔

"ماں جی کہاں ہیں؟" ڈاکٹر خاور نے جمیلہ مائی کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تو پوچھ بھی لیا۔

"وہ کملی' آج اپنی دھی کا لوہے کا ٹرنک کھولے بیٹھی ہے' کہتی ہے' سکینہ کو بے ترتیبی سے چڑ ہوتی ہے' جب کمرے میں واپس آئے گی تو اپنی چیزیں بکھری دیکھ کر رولا ڈالے گی۔" اللہ دتا کمہار کی بات پر ڈاکٹر خاور کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ فوراً" ہی آئی سی یو سے نکلے۔ ان کے قدم پرائیویٹ وارڈ میں سکینہ کے کمرے کی طرف تھے۔

"ماں جی! میں اندر آ جاؤں....." انہوں نے ہلکا سا جھانک کر کہا۔

"جی' جی ڈاکٹر صاحب' آئیں نا۔" جمیلہ مائی نے اپنی نم آنکھوں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا۔ یہ منظر ڈاکٹر خاور نگاہوں سے چھپ نہیں سکا تھا۔ انہوں نے سکینہ کے بیڈ پر پھیلی چیزوں کو دیکھا۔ سامنے ہی سیاہ رنگ کی جلد والی ایک ڈائری تھی۔ وہ خود کو اسے کھولنے سے روک نہیں پائے۔ ڈائری میں تاریخ کے لحاظ سے بے شمار شاعری لکھی ہوئی تھی۔ اس کی لکھائی بچگانہ لیکن شاعری کا انتخاب بہت میچور تھا۔ اس کا اندازہ تو ڈاکٹر خاور کو دو چار صفحات پلٹنے پر ہی ہو گیا تھا۔ مختلف صفحات پلٹتے ہوئے انہوں نے اس تاریخ پر نظر دوڑائی۔ جس دن ان کی سکینہ کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں ایک شعر درج تھا۔

کہتے ہیں لوگ تجھ کو مسیحا مگر یہاں
اک شخص مر گیا ہے' تجھے دیکھنے کے بعد

"ڈاکٹر صاحب بیٹھ جائیں نا۔" جمیلہ مائی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئے۔ آج نہ جانے کیوں ان کا دل بہت اداس تھا۔

"سکینہ کو اپنی کتابوں سے بڑا پیار تھا۔ بہت سنبھال سنبھال کر رکھتی تھی انہیں۔" جمیلہ مائی نے اپنے دوپٹے سے "عشق کا عین" کتاب صاف کرتے ہوئے انہیں بتایا۔

ڈاکٹر خاور نے چونک کر جمیلہ مائی کا چہرہ دیکھا۔

انہیں احساس ہوا کہ جمیلہ مائی یہاں کمرے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی رہی ہے اس کی سرخ متورم آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں۔ انہوں نے بے ساختہ نظریں چراتے ہوئے سکینہ کی ڈائری کے اس صفحے پر نظر ڈالی' جہاں اس نے اپنے ہاتھ سے آخری پیراگراف لکھا تھا۔

"اور جب میں مر جاؤں تو مجھے کسی خشک پھول کی مانند محبت کی کسی کتاب میں قید کرلینا' جب زندگی میں کبھی فراغت پاؤ تو اس کتاب کے بوسیدہ اوراق میں بسی اس خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتارتے ہوئے مجھے یاد کرنا۔ یا پھر مجھے ایسی جگہ دفن کرنا' جہاں چاروں طرف پہاڑ ہوں۔ جہاں رات کو جگنوؤں کے قافلے اور دن کے وقت تتلیاں محو رقص ہوں' جہاں کسی منہ زور پہاڑی چشمے کی آواز سماعتوں کو خوب صورت احساس بخشتی ہو۔ جہاں موت کا بدصورت احساس ڈیرے ڈال کرنہ بیٹھا ہو۔ اگر ایسا نہ کرسکو تو مجھے کہیں گھنے جنگلوں میں دفن کر آنا جہاں کسی پیڑ کے نیچے مسافر راستہ بھول کر آن پہنچیں اور میری قبر پر انجانے ہاتھ دعاؤں کے لیے اٹھتے رہیں۔ اگر ایسا بھی نہ کرسکو تو مجھے میرے دوست "محبت کی کسی کہانی میں دفن کر آنا' جس کے کردار مر جائیں لیکن محبت ہمیشہ زندہ رہے۔ اگر ایسا بھی نہ کرسکو تو مجھے بس اپنے دل میں دفن کرلینا کیونکہ تمہارا دل دنیا کی وہ واحد جگہ ہوگی جہاں مرنے کے بعد بھی میں یادوں کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہوں گی۔۔۔!!!"

ڈاکٹر خاور کے اعصاب بوجھل ہوگئے انہوں نے جھٹکے سے ڈائری کو بند کیا۔ ایک وحشت انگیز خیال نے کسی ضدی بچے کی طرح ان کا دامن پکڑا تو وہ گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ جمیلہ مائی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ اتنی برق رفتاری سے کمرے سے نکلے تھے گویا انہوں نے کمرے میں کوئی آسیب دیکھ لیا ہو۔

☼ ☼ ☼

"واٹ؟" ماہم کی نظریں اس خوب صورت انویٹیشن کارڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں موحد رحیم کے ساتھ ثنائیلہ زبیر کا نام جگمگا رہا تھا۔ یہ شادی کارڈ ابھی ابھی عائشہ کا ملازم ان کے ہاں دے کر گیا تھا جسے دیکھ کر ماہم کو کرنٹ لگا۔

"موحد کو شادی کے لیے یہ دو ٹکے کی رائٹر ہی ملی تھی۔" ماہم نے ہاتھ میں پکڑا کارڈ میز پر تمسخرانہ انداز میں اچھالا۔ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھی ثمن آپی چونکیں۔

"تم جانتی ہو اس لڑکی کو؟"

"بہت اچھی طرح۔ ایسا لگتا ہے' دونوں بہن بھائیوں کو نفسیاتی مریضوں کے علاوہ کوئی اور برداشت نہیں کرسکتا تھا۔"

"کیا مطلب؟ یہ لڑکی کیا سائیکک ہے؟" ثمن آپی نے پرائم ٹائم میں چلنے والے اپنے شو سے بمشکل نگاہیں ہٹا کر ماہم کی طرف دیکھا جس کا چہرہ پتا نہیں کیوں تناؤ کا شکار لگ رہا تھا۔

"تھوڑی بہت نہیں' اچھی خاصی۔" اس نے نزاکت سے ناک چڑھائی۔

"تم کیسے جانتی ہو اسے۔" ثمن آپی کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔

"میری پیشنٹ رہی ہے خیر سے' چلو' موحد بھی آدھا پاگل ہے اور یہ بھی۔ گزارا اچھا ہوجائے گا۔" ماہم قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"لیکن وہ لڑکی موحد جیسے معذور شخص سے شادی کے لیے کیسے تیار ہوگئی۔" ثمن آپی الجھن کا شکار ہوئیں۔

"بتایا تو ہے کہ پاگل ہے۔ موحد کا پیسہ دیکھ کر فدا ہوگئی ہوگی۔ ویسے بھی اپنے سیٹ اپ میں تو موحد کو کوئی رشتہ ملنے سے رہا یہ لڑکی مڈل کلاس فیملی سے ہے۔ اس لیے دونوں کا گزارا ہوجائے گا' موحد کو بیوی مل جائے گی اور اسے پیسہ۔" ماہم کے لہجے میں تضحیک تھی۔

"ولیمہ کا فنکشن تو بڑی ٹاپ کلاس جگہ پر کررہے ہیں وہ لوگ۔" ثمن آپی نے کارڈ اٹھا کر دیکھا۔

"سو واٹ۔" ماہم نے ناک چڑھائی۔

"موحد کے ساتھ ساتھ عائشہ کو بھی نمٹا دیتے یہ لوگ۔" ثمن آپی نے بھی تمسخرانہ لہجے میں کہتے ہوئے ٹی وی کا چینل تبدیل کیا۔

"عائشہ تو آج کل رامس کے چکروں میں ہے وہ رامس علی جسے میں نے ریجیکٹ کیا تھا۔" ماہم نے نخوت زدہ لہجے میں انہیں یاد دلایا۔

"رامس تو اچھا خاصا ہینڈسم بندہ تھا تم نے خواہ مخواہ اسے مس کیا۔" ثمن آپی کو ابھی تک یہ دکھ نہیں بھولا تھا۔

"دفع کریں آپی! کون اس کچلھری کے مریض کو دیکھ دیکھ کر اپنی طبیعت خراب کرے' عائشہ کا تو ایسا اسٹیمنا بن چکا ہے۔ اسے عادت ہے ایسے لوگوں میں رہنے کی۔" ماہم کی نزاکت عروج پر تھی۔ ثمن آپی اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"تم جاؤ گی موحد کی شادی پر؟"

"آف کورس۔" اس نے اپنی راج ہنس جیسی گردن اٹھا کر بڑے تفاخر سے کہا۔ "آپ بھی چلیے گا۔ انصر بھائی اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ آئے ہوں گے' اچھا مشغل رہے گا۔"

"ہاں' لیکن اس سے پہلے مجھے اس فنکشن کے لیے خصوصی تیاری کرنا ہوگی۔" ثمن آپی نے ہنستے ہوئے یاد دلایا۔

"وہ تو خیر مجھے بھی کرنا پڑے گی' میں چاہتی ہوں کہ اس فنکشن میں بس لوگ دولہا اور دلہن کو چھوڑ کر ہم دونوں بہنوں کے گرد ہی طواف کرتے رہیں۔" ماہم کی خود پسندی عروج پر تھی۔

"وہ تو ہم بغیر تیاری کے بھی چلے جائیں تو ایسا ہی ہوگا۔" ثمن آپی کی خوش فہمیاں بھی ماہم سے کم نہیں تھیں۔ دونوں بہنیں اب ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ممانی جان کا دماغ ٹھیک ہے جو وہ نابیہ کے لیے منہ اٹھا کر رامس کا رشتہ مانگنے آگئیں۔" شمیر کو نہ جانے کیوں غصہ آرہا تھا۔ جب کہ ثنائیلہ کے دوپٹے پر گوٹا لگاتی امی نے ناگواری سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔

"اس میں دماغ کی خرابی کی کیا بات ہے۔ ان کا بیٹا ہے' جہاں مرضی رشتہ لے کر جائیں۔" ثنائیلہ نے برہمی سے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"ان کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے تھا' نابیہ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے اور ہمارے خاندان کے ساتھ ان کی فیملی کے اچھے تعلقات ہیں۔ اس کے گھر والے کیا سوچیں گے۔" شمیر کی اوٹ پٹانگ منطق پر ثنائیلہ کا دماغ گھوم گیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پڑوس میں رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی نابیہ کے لیے رشتہ ہی نہیں بھیج سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اس کی فیملی کا دماغ خراب ہے جو وہ کچھ غلط سوچیں گے' آخر کار رامس میں برائی ہی کیا ہے۔" وہ اب ماتھے پر بل ڈالے شمیر کو دیکھ رہی تھی۔

"ممانی جان کو آپ تو نظر نہیں آئیں۔ نابیہ میں کون سے ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔" شمیر ایک دم مشتعل ہوا۔

"نابیہ میں وہ ہی ہیرے جڑے ہوئے ہیں جو کسی زمانے میں تمہیں بھی نظر آتے تھے۔" ثنائیلہ نے طنز کیا۔

"مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔" شمیر کے مشکوک انداز پر ثنائیلہ غصے سے کھڑی ہوگئی۔

"تم خود جو دوسروں کو ہر وقت چکر دینے کی کوشش میں رہتے ہو۔ اس لیے تمہارا ذہن ہی گھن چکر بن چکا ہے۔" وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکلی اور چھت کے ذریعے نابیہ کے ہاں پہنچ گئی۔ وہ صحن میں واشنگ مشین لگائے کپڑوں کا ڈھیر دھونے میں مصروف تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی نابیہ کو اندازہ ہوا کہ اس کا مزاج کچھ برہم ہے۔

"کیا ہوا؟ شمیر کے ساتھ منہ ماری ہوگئی کیا؟" اس نے تار پر کپڑے پھیلاتے ہوئے ثنائیلہ کا سرخ چہرہ دلچسپی سے دیکھا۔

"اس کو بکواس کرنے کے علاوہ اور کوئی کام آتا ہی کب ہے۔ جب سے پاکستان آیا ہے۔ کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑتا ہی رہتا ہے۔" ثنائیلہ نے اس کے ساتھ دھلے ہوئے کپڑے تار پر پھیلاتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"دفع کرو' خالی دماغ تو ویسے بھی شیطان کا گھر ہوتا ہے۔" تابیہ نے ہنستے ہوئے کہا اور بالٹی میں سے چادر نکال کر نچوڑنے لگی۔
"کوشش تو بہت کرتی ہوں لیکن اس کی باتوں میں واہیات پن اتنا عروج پر ہوتا ہے کہ ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" ثنائیلہ کی بات پر تابیہ کھلکھلا کر ہنسی۔
"غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا جان من! آج کل تو ویسے بھی تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے' پیا کے گھر جو جانا ہے۔"
"پتہ نہیں کے اللہ جانے کون سے ایسے کام ہیں جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے۔" ثنائیلہ کو آج کل سب ہی پر غصہ تھا۔
"کیوں کیا ہوا؟"
"کل عائشہ مجھے ولیمہ کے ڈریس کی سلیکشن کے لیے لے کر گئی تھی' موصوف پتا نہیں کہاں بزی تھے۔ بندہ کم از کم ساتھ تو چل سکتا ہے نا۔" ثنائیلہ نے اپنی ناراضی کی وجہ بتائی۔
"تمہیں پتا تو ہے کہ وہ پبلک کی جگہوں پر جانے سے دانستہ گریز کرتا ہے اور تم لوگ کہاں اسے مارکیٹ میں لیے لیے پھرتے۔" تابیہ نے فوراً" ہی موحد کی طرف داری کی۔
"بندہ فون پر تو بتا سکتا ہے نا' میرا کتنا دل کر رہا تھا کہ موحد کی پسند سے ولیمہ کا ڈریس لوں۔" ثنائیلہ ناراض تھی۔
"اف... اتم کب بڑی ہو گی۔" تابیہ نے تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورا۔ "تم نے اس کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کیا؟"
"نہیں...! اسے خود سمجھنا چاہیے تھا۔" ثنائیلہ کے بچکانہ انداز پر تابیہ نے ایک جھانپڑ اس کے کندھے پر رسید کیا۔
"اس کو تو شادیوں کا بہت تجربہ ہے نا جو اسے خود سمجھنا چاہیے تھا۔ کچھ خوف خدا کیا کرو لڑکی' کتنی تخیلاتی اور تصوراتی ذہن کی مالک ہو تم' اب پریکٹیکل ہو جاؤ۔"
"جس دن پریکٹیکل ہو گئی' اس دن سب سے زیادہ وہی سر پکڑ کر روتا پھرے گا۔"
"کیا مطلب؟"
"مائی ڈیر! میری ان ہی تصوراتی باتوں پر تو وہ فدا ہوا تھا۔" ثنائیلہ کا موڈ اب خوشگوار ہوا۔ وہ اب سب کچھ بھلائے اس کے ساتھ باقی ماندہ کپڑے دھلوانے میں مصروف ہو گئی۔
"میں نے سنا ہے کہ لوگ مجھ سے خفا ہیں۔" شام کو موحد کی غیر متوقع طور پر آنے والی کال نے اسے حیران کیا۔
"آپ کو کون سا کسی کی پروا ہے۔" ثنائیلہ نے بھی شکوہ کرنے میں دیر نہیں کی۔
دوسری جانب وہ ہنسا۔ "ثنائیلہ! تم نے وہ شعر سنا ہے؟"
"کون سا؟" اس کے فوراً" ہی کان کھڑے ہوئے۔
"وہ جو کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔"
غم زندگی کہاں ہے ابھی وحشتوں سے فرصت
تیرے ناز بھی اٹھا ہی لیں گے' ابھی زندگی پڑی ہے
موحد کا شرارتی لہجہ ثنائیلہ کے اندر ڈھیروں پھول کھلا گیا۔ بدگمانی کے سارے بادل اسے فضاؤں میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ بہت دنوں کے بعد اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھیں زویا! میں آپ سے کسی بھی صورت کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتا' آپ پلیز چلی جائیں یہاں سے۔" ڈاکٹر خاور نے آج بے رخی کے سارے ہی ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ ڈاکٹر زویا ابھی بھی ڈھٹائی سے ان کے سامنے جم کر کھڑی تھی۔
"میں ایسے نہیں جاؤں گی' پہلے آپ مجھے معاف کریں۔" ڈاکٹر زویا نے بے چارگی کے ساتھ اس دشمن جان کو دیکھا۔ جو آج صدیوں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔
"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھ سے

معافی مانگنے کے بجائے اس کے والدین سے معافی مانگیں۔ جن پر آپ کی وجہ سے ایک بڑی قیامت آئی ہے۔" ڈاکٹر خاور نے رکھائی سے کہا۔

"میں ان سے معافی مانگ کر ہی آپ کے پاس آئی ہوں۔" ڈاکٹر زویا کی بات پر انہیں جھٹکا لگا۔

"کیا کہا ہے آپ نے ان سے؟" وہ ایک دم ہی کھڑے ہوئے۔

"میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ اس دن میری ہی باتوں کی وجہ سے سکینہ کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔"

"کوئی اور فضول بات تو نہیں کی آپ نے ان سے؟" وہ ایک دم ہی بے چین ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب میں اتنی بھی ظالم نہیں ہوں ڈاکٹر خاور! مجھے احساس ہے کہ کون سی بات ان کے لیے تکلیف کا باعث بن سکتی ہے۔" ڈاکٹر زویا کا لہجہ عجیب ہوا۔

"کاش تھوڑا سا احساس آپ پہلے بھی کر لیتیں تو کم از کم آج سکینہ اس حالت میں آئی سی یو میں نہ ہوتی۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ کر گئے۔

"آئی ایم سوری ڈاکٹر خاور! میں نے یہ بہت گھٹیا حرکت کی یقین کریں مجھے ساری ساری رات نیند نہیں آتی، سکینہ کا چہرہ میرے ذہن سے ہٹتا ہی نہیں۔" زویا کی آنکھوں سے آنسو نکلے۔

"انسان بہت ظالم اور متکبر ہوتا ہے۔ جب اس کے ہاتھ میں ہلکا سا بھی کسی چیز کا اختیار آجائے تو وہ اس کا استعمال اس بے دردی سے کرتا ہے۔ آپ کو پتا تھا ناکہ سکینہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اس لیے آپ نے سارا زہر اس کے سامنے اگل دیا۔ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو آپ کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔" ڈاکٹر خاور کے لفظوں میں ایک تلخ حقیقت پوشیدہ تھی۔ زویا نے بے اختیار اپنی نگاہیں چرائیں۔

"لیکن میں نے یہ سب آپ کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا ڈاکٹر خاور۔" ڈاکٹر زویا کا یہ جملہ آفس میں قدم رکھتی عائشہ نے سنا تھا۔ وہ پہلے ہی قدم پر ٹھٹک گئی۔ سامنے ہی ڈاکٹر خاور اپنی کرسی کے پاس کھڑے تھے جب کہ ان کے سامنے آنسو بہاتی ڈاکٹر زویا کو دیکھ کر عائشہ کو لگا جیسے وہ کسی غلط موقعے پر یہاں آگئی ہو۔

"سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔" وہ ایک دم ہی مڑی۔

"عائشہ! میری بات تو سنو۔" ڈاکٹر خاور بے تابی سے اس کے پیچھے لپکے۔ ڈاکٹر زویا کو آج پہلی دفعہ لگا کہ وہ ہار گئی ہے۔ وہ وہیں ان کے آفس کی کرسی پر بیٹھ کر دھواں دھار رو پڑی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے آج آنسوؤں پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

"یہاں بیٹھو اور آرام سے بات کرو مجھ سے۔" ڈاکٹر خاور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے استحقاق بھرے انداز سے زبردستی بینچ پر بٹھایا۔ "ہر بات پر ایسے اوور ری ایکٹ نہیں کرتے۔" انہوں نے ہلکی سی جھنجلاہٹ سے اس کا ناراض چہرہ دیکھا۔

"میں نے کچھ کہا آپ سے۔" اس نے اپنے نچلا لب کچلتے ہوئے ڈاکٹر خاور کا پریشان انداز دیکھا۔

"ادھوری باتیں اور ادھورے جملے سن کر اپنی مرضی کی داستانیں تخلیق کرنے والے لوگ ہمیشہ دکھ ہی اٹھاتے ہیں۔" ڈاکٹر خاور نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ساری دنیا کی لڑکیوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے آپ نے، آخر مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ۔" وہ بری طرح چڑ کر بولی۔ ڈاکٹر خاور اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسے۔ قبیح کی دلکشی میں ایکدم ہی اضافہ ہوا۔

"میں نے تھوڑی لگایا ہے، خود آئی ہیں میرے پیچھے۔" انہوں نے چڑایا اور وہ چڑ بھی گئی۔

"ہاں ایسے ہی شہزادہ گلفام ہیں نا آپ۔"

"خیر، اس میں کوئی شک بھی نہیں۔" انہوں نے فرضی — کالر اوپر کیے۔ ان کے غیر سنجیدہ انداز پر عائشہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوئیں۔ ڈاکٹر خاور کے دل کو کچھ ہوا۔

"مائی گاڈ! تم کتنی شکی مزاج لڑکی ہو عائشہ۔" انہوں نے بہت محبت سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "ایک بات اپنے ذہن میں رکھ لو، ساری دنیا کی لڑکیاں بھی اگر میرے پیچھے ہوں تو تمہارے خوش ہونے کے لیے یہ احساس کافی نہیں کہ میں صرف ایک لڑکی کے پیچھے ہوں۔" انہوں نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

"مجھے کیا پتا۔" اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔

"میری طرف دیکھ کر کہو، تمہیں نہیں پتا۔" ڈاکٹر خاور نے شرارت سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ گڑبڑا سی گئی۔ اس کا گلابی ہوتا چہرہ انہیں لطف دے گیا۔

"اب محترمہ کون سی داستان امیر حمزہ سنا رہی تھیں۔ سکون نہیں ہے انہیں؟" عائشہ کی سوئی ابھی بھی ڈاکٹر زویا میں اٹکی ہوئی تھی۔

"ہوں۔ سوال تو خاصا مختصر ہے، لیکن جواب خاصا لمبا ہے۔ اس لیے میرے ساتھ ڈاکٹرز کیفے تک چلو، راستے میں بتاتا ہوں۔" انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھایا، پھر راستے میں وہ اسے آہستہ آہستہ ساری بات بتاتے گئے۔ عائشہ کی آنکھیں کھلتی گئیں۔

"اف یہ خوب صورت چہرے اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں۔" عائشہ کا دکھ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"سب ایسے نہیں ہوتے، ہاں جو ایسے ہوتے ہیں، وہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے انہیں دوسروں کا دل دکھانے کا پرمٹ دے رکھا ہے۔" انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا واقعی ڈاکٹر زویا کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ سکینہ آپ سے محبت کرتی ہے یا حقیقت میں ایسا تھا۔" عائشہ کے سوال پر ان کا کپ پکڑتا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" انہوں نے دانستہ ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔

"ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" عائشہ نے سادگی سے کہا۔

"اچھا فرض کرو، اگر واقعی ایسا ہو تو کیا سکینہ کا یہ قصور اتنا بڑا ہے کہ اس کی تذلیل کی جائے اور اس کی دھجیاں تک اڑا دی جائیں۔" وہ تھوڑا سا تلخ ہوئے۔

"ہرگز نہیں، محبت پر بھلا کب کسی کا زور چلتا ہے اور سکینہ بے چاری تو بہت معصوم سی لڑکی تھی۔" عائشہ کی سادگی ڈاکٹر خاور کے دل کو چھو گئی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتے رہ گئے۔

"ایک بات بتاؤ عائشہ! کیا محبت ظاہری چہروں کو دیکھ کر ہوتی ہے، کیا تم اس بات پر یقین رکھتی ہو؟" انہوں نے کھوجتی نگاہوں سے عائشہ کو دیکھا۔

"ظاہری خوب صورتی کے عکس کو بھی ہم جھٹلا نہیں سکتے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"جس محبت کی میں بات کر رہا ہوں وہ ان چیزوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ جس محبت کی تم بات کر رہی ہو، وہ محبت نہیں ایگری منٹ ہوتا ہے، جس میں ہم اگلے بندے کی شخصیت، اس کا اسٹیٹس، تعلیم، جاب اور بہت سے دوسرے لوازمات دیکھ کر متوجہ ہوتے ہیں۔" ان کی تلخی عائشہ کا دل دکھا گئی۔

"علی! میں بھی ایسی ایگری منٹ ٹائپ محبتوں پر یقین نہیں رکھتی، لیکن افسوس کہ ہم جس معاشرے میں سانس لیتے ہیں، وہاں ان سب چیزوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔" عائشہ نے فوراً ہی صفائی دی تو وہ پھیکے سے انداز سے مسکراتے ہوئے بولے۔

"میں ایسے معاشرے کے دوغلے پن سے نفرت کرتا ہوں، جہاں سکینہ جیسی لڑکی کو اگر مجھ جیسے شخص سے محبت ہو جائے تو معاشرے والے "اوقات" میں رہنے کے درس دینے لگے اور اگر مجھ جیسے شخص کی زندگی میں ایسی معذور لڑکی آجائے تو معاشرے والے قبول ہی نہ کرے۔ کیسا بدبودار معاشرہ ہے ہمارا، ہم لوگوں کو ان چیزوں کی سزا دیتے ہیں، جن میں ان کا کوئی دوش نہیں ہوتا۔" ڈاکٹر خاور کی باتوں پر عائشہ گھبرا گئی۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر پوری قوت سے نمودار ہوئی۔

”مجھے صرف اتنا کہنا ہے‘ عائشہ! تم معاشرے کے عام لوگوں کی طرح مت سوچا کرو‘ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ کم از کم تم سب لوگوں کو جینے کا حق دیا کرو‘ تم دنیا کی واحد لڑکی ہو‘ جو مجھے ایسے ہی سمجھتی ہو جیسا کہ میں ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم میرا ہر تو ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے دنیا اچھی لگتی ہے۔“ ان کی آنکھوں میں عائشہ کے لیے اتنی محبت تھی کہ اس کے سارے خدشے اور واہمے بھاپ بن کر اڑ گئے۔

☼ ☼ ☼

”سخت ناراض ہوں میں آپ سے“ آپ نے تو مجھے ہر معاملے میں سے دودھ سے مکھی کی طرح نکال دیا ہے۔“ رامس اس دن اچانک ہی عائشہ کے گھر چلا آیا اور وہ جو لان میں اپنا کینوس رکھے نئی پینٹنگ پر کام کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی بات پر چونک گئی۔

”بھلا تم کیوں ناراض ہو کر پہاڑ پر چڑھ بیٹھے ہو۔“ عائشہ نے اسے چھیڑا‘ جو منہ پھلائے لان چیئر پر بیٹھا تھا۔

”آپ کے بھائی کی ڈیٹ فکس ہو گئی۔ آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

رامس کے شکوے پر وہ ہنسی۔ ”توبہ ہے کیسے لڑکیوں کی طرح گلے کر رہے ہو‘ میں اور ماما خود جا کر تمہارے ہاں کارڈ دے کر آئے ہیں اور تمہاری ماما کو ساری تفصیل بھی۔“

”لیکن آپ نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ آپ لوگ میری ہی کزن پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔“ رامس کی بات پر وہ ایک دفعہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”اف آج تو تم بہت جلے کٹے الفاظ کا استعمال کر رہے ہو۔“

”جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو پھر ایسے ہی راگ دل سے نکلتے ہیں۔“ اس نے برا سا منہ بنا کر کہا تو عائشہ جھٹ سے بولی۔

”اب ایسی بھی کوئی چوٹ نہیں جتنی دہائی تم دے رہے ہو۔“

”غضب خدا کا‘ میری ہی سگی پھپھو زاد کے ساتھ آپ لوگ رشتہ کر آئے اور کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی۔“ رامس نے روٹھے انداز سے کہا۔

”ہائے گاڈ‘ ہمیں تو خود پتا نہیں تھا‘ وہ تو تمہارے کزن کشمیر نے ذکر کیا تو پتا چلا۔“ عائشہ نے اسے صفائی دینے کی کوشش کی۔

”جانے دیں‘ اب اتنی بھی اوور ایکٹنگ نہ کریں آپ۔“ رامس کو قطعاً ”یقین نہیں آیا۔

”اف... کتنے فضول انسان ہو تم‘ پتا تو ہے تمہیں‘ میری ناک کے نیچے سے بڑے بڑے طوفان گزر جاتے ہیں اور مجھے پتا ہی نہیں چلتا۔“

”فخر کی نہیں بلکہ شرم کی بات ہے۔“ رامس کی بے تکلفی پر اس نے گھور کر اس کو دیکھا۔ جو جوتے کی نوک سے اچھی خاصی لان کی گھاس کا بیڑہ غرق کر رہا تھا۔

”اچھا... انسانوں کی طرح بیٹھو‘ اس معصوم گھاس پر غصہ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ گرم چائے منگواؤں تمہارے لیے۔“ عائشہ نے دلچسپی سے اس کا خفا خفا سا چہرہ دیکھا۔

”ہرگز نہیں پیوں گا۔“ اس نے صاف انکار کیا۔

”اچھا۔ پھر بتاؤ کہ تمہارا موڈ کیسے ٹھیک ہو گا۔“ عائشہ اپنا کام چھوڑ کر اب اس کے سامنے آن بیٹھی۔

”چلو تمہاری خاطر یہ نقصان بھی اٹھا لیتے ہیں ویسے یہ تابیہ وہی ہے نا جس پر تم نظر رکھے بیٹھے ہو۔“

”جی بالکل وہ ہی ہے۔“ اس کا موڈ ایک دم خوشگوار ہوا۔ ”آپ ملی ہیں اس سے؟“ اس نے عجلت بھرے انداز سے پوچھا۔

”ہاں‘ سرسری سی ملاقات تو ہوئی ہے تمہاری کزن کے ہاں۔“ عائشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”پھر کیسی لگی وہ آپ کو؟“ رامس کی بے تابی پر وہ مسکرائی۔

”لڑکی تو اچھی خاصی ٹھیک ہے‘ ذہنی حالت بھی ٹھیک لگ رہی تھی اس کی‘ پتا نہیں تمہارے لیے کیسے مان گئی۔“ عائشہ نے اسے چھیڑا۔

”ذہنی حالت ہی تو ٹھیک نہیں ہے‘ ورنہ بھلا وہ مجھ جیسے ماٹی۔“ اس نے خود اپنا مذاق اڑایا جو عائشہ کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

”کیوں‘ تم میں کس چیز کی کمی ہے؟“

”یہ تو آپ اپنی سائیکو جسٹ فرینڈ سے پوچھیں‘ پوری ایک لسٹ مرتب کر کے آپ کے ہاتھ میں تھما دیں گی۔“ وہ تھوڑا سا سنجیدہ ہوا۔

”تمہارا تو پتا نہیں‘ لیکن اس کے بارے میں مجھے پتا ہے کہ اس میں کس چیز کی کمی ہے۔“

عائشہ نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا۔ جس کے چہرے پر تجسس کے سائے نمایاں تھے۔

”کس چیز کی...؟“ رامس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”عقل کی...“ عائشہ کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ عائشہ بھی مسکرا دی اور اس نے دل ہی دل میں اسے ہمیشہ ہنستے رہنے کی دعا دی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت خوب صورت‘ سرسبز‘ خوشنما اور سرخ گلابوں سے ڈھکی ایک وادی تھی۔ تاحد نگاہ ہریالی اور پس منظر میں سرسبز و شاداب پہاڑوں پر خودرو پھول ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی نے آسمان سے ستارے توڑ کر وہاں ٹانک دیے ہوں....

اس خوب صورت اور دل آویز وادی میں وہ چاندی کے جسم والی لڑکی سفید رنگ کے پریوں کے لباس میں آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔ وہ اس قدر دلکش اور حسین دکھائی دے رہی تھی کہ اس پر نظر ٹھہرنا دشوار تھا۔ وہ اپنے دونوں بازو پھیلائے آسمان سے گرنے والی پھوار کو اپنی ہتھیلیوں پر محسوس کر رہی تھی۔ اسے اچانک کچھ ہوا اور اس نے وادی میں موجود تتلیوں کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے رقص میں کسی پہاڑی چشمے کی سی روانی اور تیزی آ گئی۔ اس کا جسم اس کے اختیار میں نہیں رہا۔ وہ خود کو روئی کے گالوں سے بھی ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ فخر و غرور کی لہریں اس کے پورے وجود کا احاطہ کر چکی تھیں۔

ایک دم ہی منظر بدلا... اس چاندی کے جسم والی لڑکی کا پاؤں پھسلا اور وہ خود کو بہت بلندیوں سے نیچے پستیوں میں گرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس نے سخت خوف زدہ نظروں سے زمین کی پستیوں کو دیکھا جو اس کا مقدر بننے والی تھیں۔ وہ اچانک کیچڑ اور غلاظت سے بھری زمین پر گری۔ وہ اب آنکھیں گھما کر اپنے اردگرد پھیلی تیرگی اور فضا میں پھیلی بدبو کو محسوس کر رہی تھی اسے اپنے کیچڑ زدہ جسم سے گھن آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے جسم کو ٹٹولا تو خوف کی ایک سرد لہر نے اس کے وجود کو لپیٹ میں لے لیا۔

اسے محسوس ہوا کہ بہت سے حشرات الارض اس کے وجود سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس نے سانس روک کر ایک عجب دیوانگی سے ایک چپکتی ہوئی چیز کو کھینچا تو اسے یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ وہ ایک مردہ پتنگا تھا۔ اس کی آنکھیں تیرگی سے مانوس ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ اس کا سارا جسم ان مردہ پتنگوں کے لباس سے ڈھکا ہوا تھا۔ خوف‘ وحشت اور سراسیمگی کے عالم میں اس نے اپنے چہرے کو ٹٹولا تو اس کو خوف سے منجمد کر دینے والی انہونی کا احساس ہوا۔

اس وقت اسے ادراک ہوا کہ وہ کسی گہری کھائی میں گری ہوئی ہے اور اوپر سے آنے والی ہلکی سی روشنی کی لکیر کے ساتھ ہی اس نے سیلن زدہ دیوار کے پاس گرا شیشے کا ٹکڑا دیکھا تو اسے لپک کر اٹھا لیا۔ اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بہت دل خراش اور بے ساختہ تھی۔

اس کے خوب صورت جسم کے اوپر ایک بوڑھی مادہ گدھ کا بدصورت چہرہ سجا ہوا تھا...

بہت ہی خوفناک‘ عجیب اور دل دہلا دینے والے خواب کے زیر اثر اس کی آنکھ کھلی... ماہم نے مضطرب و متوحش نظروں سے اپنے کمرے میں کسی نادیدہ شے کو تلاش کرنا چاہا۔ کمرہ بالکل خالی تھا اور زیرو واٹ کے بلب کی روشنی میں اس نے فوراً“ اٹھ کر سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ دیکھا اور

ایک پر سکون سانس لی تھی۔
اس کے وجود کے اوپر اس کا اپنا ہی چہرہ تھا جو اس وقت پسینے سے تر، دہشت زدہ اور خوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر ایک دفعہ پھر خود کو یقین دلایا۔ وہ اب عجیب دیوانگی کے عالم میں اپنے کپڑوں کو جھٹک رہی تھی۔ اسے لگا تھا کہ کہیں کوئی ایک آدھ مرا ہوا پتنگا اس کے وجود کے ساتھ چمٹا ہوا نہ رہ گیا ہو۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے اور سیاہ رات کے ہولناک سناٹے میں جھینگروں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔
لیکن اسے نہ جانے کیوں یہ وہم لاحق ہو گیا تھا کہ وہ بوڑھی گدھ کہیں آس پاس ہی ہے۔ اس خیال نے اسے ایک دفعہ پھر بے چین کر دیا۔
"بہت ہی عجیب، فضول اور بے تکا سا خواب ہے یہ تو۔" صبح ڈائننگ ٹیبل پر ماہم، ثمن آپی اور ماما کے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی ذکر کر گئی۔ جسے سنتے ہی ثمن آپی نے کھل کر تبصرہ کیا۔
"اچھا، مجھے تو یہ کوئی خبردار کر دینے والا خواب لگ رہا ہے۔ بہت بامعنی سا۔" ماما تھوڑا سا پریشان نظر آئیں۔
"کم آن ماما! آج کل کے دور میں بھلا کون خوابوں پر یقین کرتا ہے۔" ثمن نے مذاق اڑایا۔
"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ خوابوں کی حقیقت کو کوئی بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ کئی دفعہ ایسے خواب، مستقبل کی کئی پریشانیوں سے بچا جاتے ہیں۔ میں کسی عالم سے پوچھوں گی۔" ماما حد درجہ سنجیدہ نظر آرہی تھیں۔
"لو جی۔ تم نے ماما کو اچھے کام پر لگا دیا۔ اچھا ہے بزی رہیں گی۔" ثمن نے طنزیہ نگاہوں سے ماہم کو دیکھا جو آج ۔۔۔ خاصی پژمردہ دکھائی دے رہی تھی۔
"ماما! گدھ تو مردہ جسم کا گوشت کھاتی ہے ناں۔" ماہم کی سوئی ابھی بھی اپنے خواب میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"تم کن چکروں میں پڑ رہی ہو یار۔ جسٹ کول ڈاؤن اینڈ ریلیکس۔" ثمن آپی بیزار ہوئیں۔
"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں آپی! صبح ہونے تک مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ وہ گدھ میرے بیڈ روم میں ہے۔" ماہم حقیقتاً" پریشان تھی۔
"کم آن ماہم، تمہارے بیڈ روم میں صرف تم ہوتی ہو، اب کیا تمہیں خود پر گدھ کا گمان ہوتا رہا، یہ بات بہت مضحکہ خیز ہے۔" ثمن آپی نے پائن ایپل جوس بڑی نزاکت سے پیتے ہوئے ماہم پر طنز کیا جو اسے خاصا ناگوار گزرا لیکن نہ جانے کیوں وہ چپ رہی۔
"بیٹا! تم ٹینشن نہ لو، اللہ بہتر کرے گا۔ میں تمہارا صدقہ بھجوا دیتی ہوں ابھی۔" ماما نے ماہم کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر تسلی دی تو ایک دفعہ پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ ثمن کے چہرے پر پھیل گئی۔ جب کہ ماہم ہنوز الجھن کا شکار نظر آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر علی، آج کل کہاں گم ہیں آپ، کوئی شکل ہی نہیں کروا رہے۔" خاور کو ماہم کی فون کال اس وقت ملی جب وہ سکینہ کے آئی سی یو کے بالکل باہر تھے۔ ان کی نگاہیں سکینہ کے زرد چہرے پر تھیں، جس پر زندگی کے رنگ آہستہ آہستہ مدھم ہوتے جارہے تھے۔
"کہاں جانا ہے، بس زندگی کے جھمیلے، چین کا سانس کہاں لینے دیتے ہیں۔" انہوں نے زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے آپ کہاں گم ہیں آج کل؟"
"میں آج کل معذور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک میوزیکل شو کی تیاریوں میں تھی۔" ماہم کی بات نے ڈاکٹر خاور کو حیران کیا۔
"اٹس امیزنگ، کب ہے فنکشن؟" انہوں نے فوراً" ہی دریافت کیا۔
"یکم جنوری کو۔ نئے سال کا آغاز کسی نیک کام سے کرنا چاہیے ناں۔" دوسری جانب ماہم کی اداکاری عروج پر تھی۔
"ویری گڈ، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے گا۔" انہوں نے فوراً" ہی اپنی خدمات کی پیش کش کی جسے سن کر ماہم کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا۔
"جی ضرور، آپ کی ہیلپ کے بغیر تو میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی۔"
"وہ کیوں بھئی۔۔۔؟"
"بھئی سچ بات کہوں، مجھے ایسے چیریٹی پروگرامز کرنے کا کوئی تجربہ نہیں، اس لیے کہہ رہی ہوں۔" ماہم کی صاف گوئی پر وہ مسکرائے۔
"اپنی دوست عائشہ کی خدمات حاصل کریں ناں۔" انہوں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔ دوسری جانب عائشہ کا نام سن کر ماہم کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔
"وہ تو آج کل اپنے بھائی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے۔" اس نے فوراً" ہی وضاحت کی۔
"اچھا۔۔۔! ویسے ان کی اپنی شادی کب ہے؟" خاور کو اب اس سے بات کرنے میں لطف آنے لگا۔
"اس کی بھی جلد ہی ہو جائے گی۔۔۔" ماہم نے گڑبڑا کر جواب دیا۔
"انگیجمنٹ تو ہو چکی ہے ناں، اس کی، آئی تھنک، آپ کے اسسٹنٹ رامس علی کے ساتھ۔۔؟" خاور کی بات پر وہ ایک دفعہ پھر پٹپٹا سی گئی۔
"جی۔۔۔ جی۔" اس نے مختصراً" جواب دیا۔ پہلی دفعہ احساس ہوا کہ بعض دفعہ بہت چھوٹے چھوٹے اور بے ضرر سے جھوٹ بھی گلے پڑ جاتے ہیں اور ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔۔۔
"آپ کب فارغ ہوں گے، آپ سے ملنے کو دل کر رہا ہے۔" ماہم نے جان بوجھ کر بات پلٹی۔
"میں فارغ ہی ہوں، آپ ہسپتال آجائیں۔ آج سنڈے کی وجہ سے او پی ڈی بند ہے۔ اس لیے کوئی خاص مصروفیت نہیں۔"
ڈاکٹر خاور کی دعوت پر ماہم کے دل میں کئی پھول ایک ساتھ ہی کھل اٹھے ۔۔۔۔۔ وہ ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد مطلوبہ وارڈ میں تھی۔ سیون کلر کے سوٹ میں اس کی شہابی رنگت دمک رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آج اس نے اپنی تیاری میں خصوصی محنت کی ہو یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں جہاں سے بھی گزر رہی تھی۔ لوگ اسے بے اختیار ٹھٹک کر دیکھنے پر مجبور تھے۔ لوگوں کی توصیفی نگاہیں وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔ اس کی راج ہنس جیسی گردن ایسے وقت میں تن سی جاتی اور آنکھوں سے فخر انبساط کی لہریں نکلنے لگتیں۔
"یہ ہم کہاں جارہے ہیں۔۔۔؟" ماہم نے انہیں آئی سی یو کی طرف جاتے دیکھ کر بڑی نزاکت سے ناک چڑھا کر پوچھا۔
"میری ایک پیشنٹ ہے سکینہ، اس کی ہارٹ بیٹ اور پلس ریٹ چیک کرلوں، پھر آپ کو اچھی سی کافی پلاتے ہیں۔" ڈاکٹر خاور کی بات پر ماہم کے چہرے پر مایوسی کے رنگ ۔۔۔ واضح ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس موقعے پر اسے، ان کی فرض شناسی ایک آنکھ نہ بھائی ہو۔
"علی! آپ کیا سنڈے کو بھی آف نہیں کرتے۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بڑے تحمل سے پوچھا۔ وہ ماہم کی بات پر مسکرائے۔
"آپ کو شاید علم نہیں کہ مجھے اپنے پروفیشن سے عشق ہے اور کسی بھی عشق میں کامیابی بغیر خود کو مارے نہیں ملتی۔۔۔" وہ آئی سی یو کا دروازہ کھولتے ہوئے سنجیدگی سے بولے تھے۔ "ویسے میں سنڈے کو آف بھی لے لیتا ہوں کبھی کبھی، لیکن آج کل سکینہ کی وجہ سے میرا زیادہ وقت یہیں گزر رہا ہے۔۔۔"
"سکینہ۔۔۔" ماہم نے الجھ کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ سامنے بیڈ پر وینٹی لیٹر کے سہارے سانس لیتی لڑکی کو بہت عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ماہم کو سخت الجھن کا احساس ہوا۔ سکینہ پر ایک نظر ڈال کر ہی اسے جھرجھری سی آگئی۔
"استغفراللہ۔۔۔" ماہم کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔
ڈاکٹر خاور چونکے۔ "کیا مطلب۔۔۔؟"
"اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کو بناتے ہوئے کتنی نا

انصافی سے کام لیا ہے۔ بے چاری پر دوسری نظر ڈالنے کو بھی دل نہیں کرتا۔" ماہم کی نزاکت' ڈاکٹر خاور کے لیے سخت کوفت کا باعث بنی۔

"کیوں' اس لڑکی میں ایسا کیا ہے جو اس پر دوسری نظر نہیں ڈالی جا سکتی۔" ان کی آنکھوں سے چھلکتی برہمی ماہم کو مضطرب کر گئی۔

"میرا مطلب تھا کہ اللہ' اس بے چاری کو صحت دے دیتا۔" ماہم نے گڑبڑا کر بات سنبھالنے کی کوشش کی لیکن کمان سے نکلا تیر پوری قوت سے اگلے شخص کے دل میں پیوست ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر خاور نے سکینہ کے بالکل پاس کھڑی اس جسمانی طور پر انتہائی خوب صورت لڑکی کی بد صورتی کو پہلی دفعہ محسوس کیا۔

"میری نظر میں یہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے کیونکہ اس کا دل بہت پیارا ہے۔" ڈاکٹر خاور نے سکینہ کے ہاتھ کو چھوا۔ ماہم نے بہت عجیب نگاہوں سے ڈاکٹر خاور کو دیکھا۔ اسے پہلی دفعہ ان کی ذہنی حالت کچھ مشکوک لگی۔

"میرا خیال ہے ماہم! میں شاید آپ کو ٹائم نہ دے سکوں' مجھے ابھی ابھی یاد آیا ہے کہ مجھے ماما کو لے کر اپنی پھپھو کے ہاں جانا ہے۔" ڈاکٹر خاور نے اپنی رسٹ واچ سے ٹائم دیکھتے ہوئے ماہم کو ہری جھنڈی دکھائی۔ ان کا موڈ ایک دم ہی خراب ہوا تھا۔ ان کی بات پر ماہم کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرایا۔

"اٹس او کے۔ علی! مجھے بھی ثمن آپی کو پک کرنا ہے' پھر ملاقات ہوگی۔" ماہم نے خود کو سنبھالتے ہوئے "فوراً" کہا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ "فوراً" ہی کمرے سے نکل گئی۔ ڈاکٹر خاور آئی سی یو میں رکھی۔۔۔ چیئر پر بیٹھ گئے۔ انہیں وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً" آدھا گھنٹہ ہوا تھا جب عائشہ پھولوں کا ایک بکے لیے بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔

"تھینکس گاڈ' آپ یہاں ہیں۔ میں سارا وارڈ چھان آئی ہوں۔" اس نے اپنی سانس بحال کرتے ہوئے ڈاکٹر خاور کے اداس چہرے کی طرف دیکھا۔

"آپ کو کیا ہوا؟ چہرے پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں۔۔۔؟" اس نے بکے' بیڈ کی سائیڈ میز پر رکھتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا تو انہوں نے لمبا سانس لیا۔

"عائشہ! تمہیں سکینہ کیسی لگتی ہے۔۔۔؟" ڈاکٹر خاور نے اچانک پوچھا وہ سادگی سے مسکرائی۔

"کیا مطلب کیسی لگتی ہے۔ سکینہ تو بہت پیاری اور معصوم لڑکی ہے۔ میں جب ۔۔۔ اس سے ملی ہوں' مجھے اس کی معصومیت نے بہت اٹریکٹ کیا ہے۔ اللہ اسے صحت کاملہ عطا فرمائے۔" عائشہ کے لفظوں کی سچائی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔۔۔؟"

"ویسے ہی' آج کسی نے کہا کہ اس کے چہرے پر دوسری نگاہ ڈالنے کو دل نہیں کرتا۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بتا گئے۔

"استغفر اللہ۔۔۔" عائشہ کے لہجے سے خفگی جھلکی۔

"کتنی فضول اور واہیات قسم کی بات کی ہے' جس نے بھی کی ہے۔ جہالت کی انتہا نہیں کہ ہم اللہ کی تخلیق کردہ چیزوں کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔" اس نے صاف گوئی سے بھرپور کیا۔

"پتا نہیں کیوں' مجھے بہت برا لگا۔۔۔"

ڈاکٹر خاور کی بات پر وہ مسکرائی۔ "برا لگنا بھی چاہیے' میں اگر آپ کی جگہ ہوتی تو شاید اس شخص سے لڑ پڑتی۔۔۔" عائشہ کی بات پر ڈاکٹر خاور کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ بہت بے ساختہ تھی۔

"پتا ہے علی! میں آج صبح' سکینہ کے امی ابا کو اپنے گھر لے کر گئی تھی۔۔۔" عائشہ کی اگلی بات نے ڈاکٹر خاور کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا۔ انہیں احساس ہوا کہ واقعی آج صبح سے انہوں نے دونوں میاں بیوی کو نہیں دیکھا۔

"خیریت تھی۔۔۔؟" وہ حیران ہوئے۔

"موحد بھائی کی شادی ہے ناں اگلے ہفتے تو ماما سے میں نے کہا کہ ان دونوں کو بھی بلاتے ہیں۔ ماما نے کہا شادی پر تو بلا لیں گے لیکن آج انہیں گھر ویسے ہی لے آؤ۔"

"اچھا' وہ چلے گئے آرام سے۔۔۔؟"

"آرام سے کہاں' بڑی مشکلوں سے ایک گھنٹے کے لیے لے کر گئی تھی۔ اب بھی میں اور رامس انہیں چھوڑنے آئے تھے۔"

"یہ رامس' کچھ زیادہ ہی تمہارے گھر کے چکر نہیں لگانے لگا ہے۔۔۔" ان کا موڈ ایک دم ہی خوشگوار ہوا۔

"بھئی' موحد کی شادی کے انتظامات اس نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے ہیں۔" عائشہ ہنسی۔

"اللہ ہی خیر کرے۔ اپنا کمرہ تک تو اس سے سیٹ نہیں ہوتا' شادی کا انتظام کیسے سنبھالے گا۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں اپنے چھوٹے بھائی کے لیے محبت تھی۔

"اس کا کمرہ سیٹ کرنے کے لیے بھی ہم نے ایک لڑکی کی خدمات ہمیشہ کے لیے حاصل کرنے کا سوچ لیا ہے۔" عائشہ کی شوخی ڈاکٹر خاور کو اچھی لگ رہی تھی انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے عائشہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں جگنو چمکے۔

"ہے ایک لڑکی' آپ کو پھر بتاؤں گی۔ ابھی جلدی میں ہوں۔۔۔" وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔ "ہاں ایک اور بات۔۔۔" وہ پلٹی' اپنے بیگ سے ایک لنچ باکس نکال کر ان کی جانب بڑھایا۔

"میں نے پہلی دفعہ فرائیڈ رائس بنائے تھے' سوچا آپ کے لیے بھی لے جاؤں۔۔۔"

"تھینک یو۔۔۔" وہ مسکرائے۔

"ہاں' وہ نمک تھوڑا سا تیز ہو گیا ہے' آپ رائتہ ساتھ لے لیجیے گا۔ پھر گزارا ہو جائے گا۔" وہ اپنا کان کھجاتے ہوئے تھوڑا سا جھینپ کر بولی۔

"اٹس او کے' میرا معدہ لکڑ ہضم ہے' آپ کو مستقبل میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" ڈاکٹر خاور کی شرارت پر اس کے رخسار تپ گئے۔ وہ بڑبڑا کر کمرے سے نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج پورے بیس دن ہو گئے ہیں سکینہ کے ابا۔۔۔" جمیلہ مائی کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"نہیں' بیس دن' سات گھنٹے اور پچیس منٹ۔۔۔" اللہ دتا کمہار نے "فوراً" ہی تصحیح کی۔ جمیلہ مائی نے نم آنکھوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ سبز رنگ کے بڑے بڑے خانوں والی تہبند پر سفید رنگ کا کرتا پہنا ہوا تھا اور خاکی رنگ کی گرم چادر اچھی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ دسمبر کی یخ بستگی نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ موسم خزاں اس دفعہ اپنے اندر وحشتیں بھی سمیٹے ہوئے تھا۔

"سکینہ کی کتنی خواہش تھی کہ وہ مارگلہ کی پہاڑیوں پر گرتی ہوئی برف دیکھے۔۔۔" جمیلہ مائی اس وقت ہسپتال کے لان میں رکھے بینچ پر بیٹھی اچانک ہی بولیں۔

"موسم کی پہلی برف باری تو شمالی پہاڑیوں میں ہو بھی چکی ہے۔" اللہ دتے نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"پگلی کہتی تھی' اماں! میری قسمت میں کیا جس کے گرم موسم ہی ہیں۔ اسے پتا ہی نہیں موسم بدل چکا ہے۔۔۔" جمیلہ مائی نے لمبی آہ بھری۔ موسم سرما کی ٹھنڈی ہوا سکھ چین اور املتاس کے درختوں کو چھو کر ان کے جسم سے ٹکرائی تو ایک جھرجھری کا احساس پیدا ہوا۔

"موسم تو لمحے میں بدل جاتے ہیں' چاہے وہ انسان کے اندر کے ہوں یا باہر کے۔۔۔" اللہ دتا نے زرد پتوں کو دیکھتے ہوئے رنج بھرے لہجے میں کہا۔

"تایا! اس سے زیادہ تیزی سے تو لوگ بدل جاتے ہیں۔" جاجی بھی خاموشی سے ان دونوں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"جاجی پتر' تو گھر کیوں نہیں چلا جاتا' تیری بے بے بہت پریشان ہے۔۔۔" اللہ دتے نے بہت محتاط انداز سے کہا تو وہ پھیکے سے انداز سے۔۔۔ مسکرا دیا۔

"پتر ہمارے پاس رب سوہنے کی ذات ہے اور جس کے پاس اس کی ذات کا سہارا ہو' وہ اکیلا تھوڑی ہوتا ہے۔" اللہ دتا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کچھ بھی کہہ لے تایا! لیکن میں تجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا نہ آج' نہ کل۔" جاجی کے لہجے میں جھلکتا عزم جمیلہ مائی کو خوف زدہ کر گیا۔ وہ جانتی تھی کہ جاجی کی بے بے زبان کی کتنی کڑوی ہے۔ اب تک تو اس نے پورے پنڈ میں دہائی ڈال دی ہو گی۔"

"دیکھ پتر! یہاں پتا نہیں کتنے دن لگیں' ڈاکٹر کہتے ہیں! کومے کے مریض چاہے تو دس دنوں میں ہوش میں آجائیں اور نہ آئیں تو دس سال تک نہیں آتے ۔" اللہ دتا فکر مندی سے بولے۔ اسے کل ہی تو اس کی بے بے نے فون کر کے سختی سے اعجاز کو واپس بھجوانے کا کہا تھا۔

"تایا! مجھے کہیں نہیں جانا' میں اب بے سے خود بات کرلوں گا۔ بس تو مجھے دوبارہ نہ کہنا۔" اعجاز کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی در آئی۔

"اچھا چل ٹھیک ہے' نہ جا' پر اپنے کمرے میں رکھا باجرے کا لفافہ تو اٹھ کر لے آ' میں ذرا سکینہ کی چڑیوں کو ڈال دوں۔" جمیلہ مائی نے اسے بہانے سے اندر بھیجا اور پھر اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ایک تو بے چارا ہمارے خیال سے یہاں رکا ہوا ہے' اوپر سے تو اسے زبردستی واپس بھجوا رہا ہے۔ کیا سوچتا ہو گا بے چارا۔۔۔؟"

"بھلیے لوکے' اسی کا خیال کر رہا ہوں۔ خواہ مخواہ ہمارے ساتھ خجل خوار ہو رہا ہے اتنی ٹھنڈ میں۔۔۔" اللہ دتا نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

"ضرور اس کی بے بے نے فون کر کے کوئی نہ کوئی سازڑا نکالا ہو گا کیا کہہ رہی تھی وہ؟"

"کیا کہنا ہے اس بے چاری نے' اپنے پتر کے لیے پریشان ہو رہی تھی بے۔" اللہ دتے نے بات ٹالی لیکن آگے بھی جمیلہ مائی تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ جاجی کی بے بے کی فطرت سے بخوبی واقف تھیں۔

"کچھ نہ کچھ تو کہا ہو گا' اس نے اور بھی۔۔۔" جمیلہ مائی کی کھوجتی نگاہیں ہنوز اپنے میاں پر جمی ہوئی تھیں۔

"ایک گل تو بتا سکینہ کی ماں! جب تجھے پتا ہے' جاجی کی ماں نے کیا کہا ہو گا' پھر دوبارہ اوبارہ پوچھ کر اپنا دل جلانے کا فائدہ۔" اللہ دتے کی صاف گوئی پر ایک رنج کی لہر جمیلہ مائی کے چہرے پر آ گئی۔

"چل اٹھ عصر کا ویلا ہو رہا ہے' اس کے بعد پھر اپنی دمی رانی کو ملنے جائیں گے' ہمیں اڈیک رہی ہو گی ۔۔۔" اللہ دتے نے ہلکے پھلکے انداز میں جمیلہ مائی کو اٹھایا جو آسمان پر پھیلی سرخی کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"سکینہ کے ابا دیکھ' آسمان کتنا سرخ ہو رہا ہے۔۔۔" جمیلہ مائی کی نظروں کے تعاقب میں انہوں نے بھی دیکھا اور وہیں جم کر کھڑا رہ گیا۔ پورے آسمان پر لگتا تھا جیسے ایک حشر برپا ہو۔ ایسا ہی ایک حشر ان کی زندگیوں میں بھی برپا ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک اس سے بے خبر تھے۔

"تایا۔۔۔ سکینہ۔۔۔" کوریڈور کے اختتام پر جاجی کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے جمیلہ مائی اور اللہ دتا کو ایک لمحے میں کسی انہونی کا احساس بخشا۔ وہ دونوں کوریڈور کے آغاز میں ہکا بکا کھڑے سامنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ جاجی' ڈاکٹر خاور کے ساتھ لپٹا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا جب کہ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو کچلتے ہوئے خود بھی ضبط کی انتہا پر تھے۔ جمیلہ مائی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے دل سے نکلنے والی سسکی کو بمشکل دباتے ہوئے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھا۔ جو اس وقت کسی چٹان کی طرح مضبوط اور سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ دونوں کے قدموں سے چلنے کی سکت چھننے لگی۔ جمیلہ مائی نے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا۔

"اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔۔۔" اللہ دتا کمہار نے اپنی بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر قدرے سختی سے کہا۔ جمیلہ مائی کے دل سے نکلنے والی آہیں اندر ہی کہیں دفن ہو گئیں۔ انہیں اپنے پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے غیر دانستہ طور پر اپنے شوہر کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا' جو اسے پکڑے ہوئے کوریڈور کے اختتام پر پہنچ گیا تھا۔ ایک ایک قدم کسی بلڈوزر کی طرح بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

"آئی ایم سوری چاچا جی۔۔۔" ڈاکٹر خاور' اللہ دتا کے گلے سے لگ کر صرف اتنا ہی کہہ سکے۔ ایک تیز رفتار ترین دونوں میاں بیوی کے پرخچے اڑاتی ہوئی گزر گئی۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔۔۔" کلمہ اللہ دتا کے لبوں سے نکلا اور اس نے ایک لمبی سانس فضا میں خارج کی۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر بادل ایک دم ہی چھائے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ میری بات مان لیں گے آپ نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا مقروض کر دیا ہے۔۔۔" سکینہ کی وفات کو تیسرا دن تھا جب ڈاکٹر خاور پرائیوٹ وارڈ کے اس کمرے میں دونوں میاں بیوی کے سامنے بیٹھے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے سکینہ کو ایچ ایٹ اسلام آباد کے اسی قبرستان میں دفن کیا تھا جہاں پہلی دفعہ سکینہ کو موت کا احساس بہت خوب صورت لگا تھا۔ جاجی اس بات کے لیے قطعاً "تیار نہیں تھا۔ اللہ دتا کمہار کے باقی خاندان کے لوگوں نے بھی بہت شور مچایا' لیکن جمیلہ مائی اور اللہ دتا' ڈاکٹر خاور کی بات کو ٹال نہیں سکے۔

"مجھ سے ایک دفعہ سکینہ نے کہا تھا کہ وہ اس شہر سے کبھی بھی نہیں جانا چاہتی۔ یقین مانیں' میں نے صرف اس وجہ سے آپ سے کہا' ورنہ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ کو اس وجہ سے کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔" وہ سر جھکائے بہت خفت زدہ انداز سے بولے۔ کمرے میں گھٹن کا احساس اچانک ہی بڑھ گیا۔ انہوں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ ہر سو خزاں کا حزن و ملال بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ سفیدے اور شیشم کے درختوں پر اداسی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ کولتار کی سیاہ اوس میں بھیگی سڑک پر زرد پتوں کی چادر بچھی ہوئی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب' آپ ایسی باتیں نہ کریں' ہمیں شرمندگی ہوتی ہے۔۔۔" اللہ دتا کمہار کے چہرے پر ایک بے بس مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"مجھے معلوم ہے جاجی میری اس بات پر بہت خفا ہے' لیکن مجھے امید ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی میری بات کو ضرور سمجھ جائے گا۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں رنج صاف جھلک رہا تھا۔ سکینہ کو یہاں دفن کرنے کے فیصلے پر جاجی نے بہت احتجاج کیا' سب کی منتیں کیں اور جب کوئی نہیں مانا تو وہ خفا ہو کر چلا گیا۔

"وہ تو کملا ہے بیٹا! مان جائے گا۔ وقتی غصہ ہے' خود بخود ختم ہو جائے گا۔ ہمیں چھوڑ کر کہاں جائے گا۔" اللہ دتا کمہار کی آنکھوں میں نمی لہرائی۔ سرد ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔ خفیف سی کپکپی کا احساس پیدا ہوا تو ڈاکٹر خاور نے کھڑکی بند کر دی۔

"اماں جی' آپ بھی کچھ بولیں ناں۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے جمیلہ مائی کو دیکھا جو پچھلے تین دن سے بالکل خاموش تھی۔ سکینہ کی میت کو ڈاکٹر خاور کے گھر لے جایا گیا' وہیں سے ان کے سیکٹر کی جامع مسجد میں جنازہ ہوا۔ اس تمام عرصے میں جمیلہ مائی کے لبوں پر ایک سکوت طاری تھا۔ عائشہ پورے دو دن ان کے ساتھ رہی اور انہیں بار بار بولنے پر مجبور کرتی رہی لیکن وہ ہوں' ہاں سے زیادہ کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھیں۔

"ایک بات کہوں ڈاکٹر صیب۔۔۔" جمیلہ مائی کی آنکھوں میں نمی گھلنے لگی۔ ڈاکٹر خاور نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔ آنسو روانی سے جمیلہ مائی کی گالوں پر لڑھکنے لگے۔

"میں سال چھ مہینے بعد کبھی اس ہسپتال میں آؤں تو کیا مجھے وڈے ڈاکٹر اس کمرے میں کچھ ٹیم گزارنے دیں گے۔۔۔" جمیلہ مائی کے لہجے میں اس قدر التجا تھی کہ ڈاکٹر خاور کو لگا جیسے کسی نے ان کا دل آرے سے کاٹ کر رکھ دیا ہو۔

"میری دمی کو اس کمرے سے بہت پیار تھا۔ اس کھڑکی میں بیٹھ کر وہ اپنی سہیلی چڑیوں کو دانہ ڈالتی تھی۔ ہاتھ باہر نکال کر بارش کی کن من کو محسوس کرتی تھی۔ اس چھت کے نیچے اس نے مجھ سے دنیا جہاں کی باتیں کیں' اس کمرے کی ایک ایک اینٹ سے مجھے

سکینہ کی خوشبو آتی ہے۔" آنسوؤں کی وجہ سے وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کرسکیں۔ اللہ دتا کمہار ایک دم ہی اٹھے اور کمرے سے نکل

"دیکھیں اماں جی! جب تک میں اس ہسپتال میں ہوں' میرا آپ سے وعدہ ہے' لیکن اس کے بعد کیا ہو' میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" ڈاکٹر خاور نے صاف گوئی سے جواب دیا تو وہ اثبات میں سرہلا گئیں۔

"پتر' ایک اور بات کہوں تجھ سے' غصہ تو نہیں کرے گا۔" جمیلہ مائی کو آج نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ تین دن کے بعد انہوں نے چپ کا روزہ توڑا تھا۔ ڈاکٹر خاور نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"میری دمی' دل کی بہت سادہ تھی اور سادہ لوگ اپنی سادگی میں وڈی وڈی چیزوں کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ پتر تو اس کی کسی بات کو دل پر نہ لینا تو سمجھ رہا ہے ناں' میں کیا کہہ رہی ہوں۔" جمیلہ مائی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں جو کچھ انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی' وہ ایک لمحے میں سمجھ گئے۔

"اماں جی! کیسی دل کو دکھانے والی باتیں کرتی ہیں' جو ہوا سو ہوا۔ آپ بس سکینہ کے لیے دعا کریں۔" ڈاکٹر خاور نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر خلوص دل سے کہا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر انہیں مزید حیران کر گئیں۔

"اب کیا دعا کروں پتر' اللہ سوہنے کے پاس ہے' یہاں سے بہت اچھی جگہ پر چلی گئی ہے میری دمی' اللہ نے اسے مزید آزمائش سے بچالیا۔ مجھے یقین ہے میری دمی رانی بہت خوش ہوگی وہاں۔"

"ہاں' یہ آپ نے بہت اچھی بات کی ہے۔" ڈاکٹر خاور مسکرائے۔ "اماں جی' آپ سے ایک چیز مانگوں' اگر آپ انکار نہ کریں تو۔"

"میرے پاس تو پتر! ایسی کوئی چیز ہی نہیں۔" جمیلہ مائی نے اپنی گرم چادر سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے انہیں حیرت سے دیکھا۔

"سکینہ کی یہ لوہے کی ڈبی آپ مجھے دے دیں۔" ڈاکٹر خاور کی فرمائش پر جمیلہ مائی ہکا بکا رہ گئیں۔ انہوں نے سخت تعجب سے اس پرانی سی لوہے کی بدرنگی ڈبی کو دیکھا جس میں سکینہ اپنی چیزیں چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔

"میں اسے بہت سنبھال کر رکھوں گا۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں چھپا اصرار اور آنکھوں سے چھلکتا جذبہ جمیلہ مائی کو گنگ کر گیا۔ وہ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے بیٹھے اس اسپائنل سرجن کو دیکھ رہی تھیں جو بڑی مہارت سے ان سے آنکھیں چراتے ہوئے بھی خود کو آشکار کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عائشہ! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے زندگی بس ایک نقطے پر آکر ٹھہر سی گئی ہے۔" سکینہ کی وفات کے کافی دن کے بعد وہ آج عائشہ اور رامس کے ساتھ لنچ پر اکٹھے تھے۔ رامس کو اسی ریسٹورنٹ میں اپنے کچھ دوست مل گئے تھے اس لیے وہ ان سے معذرت کرکے ان کی جانب بڑھ گیا۔

"وہ کیوں۔" وہ حیران ہوئی۔

"کچھ عرصے سے کوئی بھی چیز' دل کو خوشی نہیں دیتی۔" وہ بڑے بے بس انداز سے بولے۔

"لیکن ایسا کیوں ہے' میں نے خود بھی محسوس کیا ہے کہ آپ کے اندر کچھ دنوں سے بڑی واضح تبدیلی آئی ہے۔ موحد کی شادی پر بھی آپ نہیں آئے۔ پتا نہیں کس چیز سے آپ بھاگ رہے ہیں۔" عائشہ نے بہت غور سے ڈاکٹر خاور کا مضطرب انداز دیکھا۔

"یقین کرو میں خود بھی نہیں سمجھ پارہا۔" انہوں نے اعتراف کیا۔

"جب کہ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے سکینہ کی وفات نے آپ کو بہت ڈسٹرب کیا ہے۔" وہ عائشہ کی بات پر چونکے اور کھوجتی نگاہوں سے اس کا سادہ اور بے ریا چہرہ دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر گویا ہوئے۔

"ہاں کہہ سکتی ہو شاید ایسا ہی ہو۔"

"لیکن ایسا کیوں ہے' آپ نے تو اپنی ہمت سے زیادہ اس کے لیے کیا اور اب تک کر رہے ہیں' سکینہ ٹرسٹ قائم کرنے کا ارادہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔"

"سچ بتاؤں' کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے اس کی موت کا ذمے دار میں ہوں۔" ان کی بات پر سوپ کے لیے بڑھتا عائشہ کا ہاتھ فضا میں معلق ہوا۔

"کیا مطلب۔؟" اس نے استعجابیہ نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے بندے کو دیکھا جس کے وجود میں عجیب سی بے چینی آبسی تھی۔

"مجھے لگتا ہے سکینہ کو میری محبت نے مار ڈالا۔ وہ جسمانی معذوری کا دکھ تو برداشت کر گئی لیکن زہر آلود جملوں نے اس کی روح کو داغ دار کر دیا۔ ڈاکٹر زوبیا نے اسے میری وجہ سے اتنا کچھ کہا اور وہ بے چاری کسی سے بھی شکوہ کیے بغیر چلی گئی۔" ڈاکٹر خاور آج اپنا دکھ کہہ ہی گئے۔

"کم آن علی! بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے اور اسے اسی دن آنا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ ڈاکٹر زوبیا نے غلط کیا' لیکن اس کے باوجود سکینہ کی موت اللہ نے ایسے ہی لکھی تھی اور اس نے ایسے ہی مرنا تھا۔" عائشہ نے نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"کتنی حیران کن بات ہے عائشہ! وہ ساری زندگی جس بیماری کے خلاف لڑتی رہی' اس کی وجہ سے اسے کچھ نہیں ہوا۔ موت اس کی برین ہیمبرج کی وجہ سے ہوئی۔ جس کے لیے کبھی اس نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔" ڈاکٹر خاور حقیقتاً اس کی موت کی وجہ سے ذہنی طور پر ڈسٹرب تھے۔ اس کا اندازہ عائشہ کو آج ہی ہوا۔

"علی! یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں' ہم ان سے نہیں لڑسکتے' آپ اس کے والدین کو بھی تو دیکھیں' انہوں نے سکینہ کی موت کو کیسے صبر کرکے قبول کرلیا اور ایک دفعہ بھی اللہ سے شکوہ نہیں کیا۔"

"درد کا احساس تو ہر شخص کو ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ جو اللہ کے پیارے لوگ ہوں' اللہ انہیں صبر بھی جلد دے دیتا ہے جب کہ ہم جیسے لوگ۔ بس شور مچاتے رہ جاتے ہیں۔" انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس سے پہلے کہ عائشہ کوئی جواب دیتی' ماہم کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"ہائے ایوری باڈی۔!" ماہم اچانک ہی اس ریسٹورنٹ میں کہیں سے نکل کر سامنے آئی تھی۔ شاکنگ پنک جینز پر پرپل لونگ سویٹر پہنے وہ دونوں کو بہت عجیب سی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ عائشہ اور ڈاکٹر خاور اسے اچانک ہی اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوئے۔

"ارے ماہم! تم' آؤ ناں بیٹھو۔" عائشہ اسے دیکھ کر ہلکا سا بوکھلائی جب کہ ڈاکٹر خاور کے چہرے کا اطمینان دیدنی تھا۔

"بہت چالاک ہو تم لوگ' تمہاری صلح ہو گئی اور مجھے بتایا ہی نہیں۔" وہ خود کو سنبھال کر اب بڑی ڈھٹائی سے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہماری لڑائی کب ہوئی تھی۔" ڈاکٹر خاور کی بات پر ماہم کو دھچکا سا لگا۔ اس نے الجھن بھری نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو عائشہ کے چہرے کو بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا۔ اشتعال کی ایک لہر ماہم کو اپنے پورے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کیوں' پھر آپ کیا میرے ساتھ ڈرامہ کر رہے تھے۔"

ماہم منصور! ڈرامہ تو آپ سے اچھا کوئی نہیں کرسکتا اس شہر میں اگر بیسٹ ایکٹنگ پر کوئی ایوارڈ ہوتا تو وہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں لے سکتا تھا۔"

رامس بھی اچانک ہی اس منظر کا حصہ بنا۔ اس نے دور ہی سے ماہم کو عائشہ کی ٹیبل کی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ خود کو وہاں آنے سے روک نہیں سکا۔

"تم۔" ماہم کے لہجے میں عجیب سی رعونت در آئی۔

"جی میں' مجھے رامس علی کہتے ہیں۔" اس نے بڑے طنز سے اپنے سر کو جنبش دے کر اپنا تعارف کروایا۔ ماہم نے اپنے شانوں پر بکھرے اپنے ریشمی بالوں کو جھٹکا سا دے کر ڈاکٹر علی کو دیکھا جو بہت دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"ڈاکٹر علی! یہ رامس علی ہے' جس کا میں نے آپ

کو بتایا تھا۔۔۔" اس نے اپنی کاجل بھری آنکھوں میں زمانے بھر کی معنی خیزی سمو کر ڈاکٹر علی کی طرف دیکھا۔

"علی بھائی! یہ وہی سائیکو پیشنٹ ماہم منصور ہیں، جن کا میں نے آپ سے کبھی ذکر نہیں کیا۔۔۔" رامس کے ذومعنی انداز پر ماہم کی سنہری آنکھوں میں ناگواری در آئی اور خوب صورت پیشانی پر بے شمار شکنوں کا ایک جال سا ابھر آیا۔ جب کہ اس کے تعارف کروانے کے انداز پر عائشہ اور ڈاکٹر خاور کھل کر مسکرائے۔

"بائی داوے، آپ نے علی بھائی کو میرے بارے میں کیا بتایا تھا۔۔۔؟" وہ ماہم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طنزاً بولا۔ ماہم کو پہلی دفعہ کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"آپ رامس کو کیسے جانتے ہیں۔۔۔؟" اس نے الجھن بھرے انداز سے علی کو غور سے دیکھا۔

"یہ تو مجھے اس دن سے جانتے ہیں جس دن میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی، لیکن بائی داوے آپ میرے بھائی کو کیسے جانتی ہیں؟ کیا ان کے ساتھ بھی کوئی محبت کا گھٹیا سا کھیل کھیلنے کا ارادہ ہے آپ کا۔۔۔" رامس کی بات پر ماہم کو سو واٹ کا کرنٹ لگا۔ وہ شدید صدمے اور بے یقینی کی کیفیت میں رامس کو دیکھتی رہ گئی۔

"یہ دیکھیں، معاف کردیں ہمیں۔۔۔" رامس نے باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر تلخی سے کہا۔

"پہلی فرصت میں کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے اپنا علاج کروائیں۔ آپ تو خود اچھی خاصی سائیکک ہیں۔ اللہ جانے لوگوں کا علاج کیسے کرتی ہیں۔ یہ جو آپ کے دماغ میں احساس برتری کا خلل بھرا ہوا ہے ناں۔ اس کی وجہ سے آپ کا خوب صورت چہرہ بعض دفعہ حد درجہ مکروہ اور غلیظ لگنے لگتا ہے، لیکن آپ کو اس چیز کا احساس ہی نہیں ہوتا۔" رامس کو آج اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔ عائشہ اور ڈاکٹر خاور بوکھلا گئے۔ دونوں کو ہی اندازہ نہیں تھا کہ رامس اس قدر مشتعل ہو جائے گا۔

"شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ۔۔۔" ماہم چیخی، ڈاکٹر خاور نے بے ساختہ رامس کا بازو پکڑ کر اسے بٹھانے کی کوشش کی۔

"مجھے آج اس گھٹیا لڑکی کو اس کی اوقات بتا لینے دیں۔ یہ جو پوری دنیا کو پاگل اور بے وقوف سمجھتی ہے ناں، اسے آئینہ دکھا لینے دیں۔" رامس ایک دم آپے سے باہر ہوا۔ عائشہ نے خوف زدہ نگاہوں سے ماہم کا غصے کی زیادتی سے سیاہ ہوتا چہرہ دیکھا۔

"ماہم پلیز، تم جاؤ یہاں سے۔۔۔" عائشہ نے اس کا بازو پکڑ کر باہر کی جانب دھکیلا۔

"شٹ اپ، ڈونٹ ٹچ می۔۔۔" وہ حلق پھاڑ کر چیخی ریسٹورنٹ میں موجود کافی سارے لوگ ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اچھی خاصی آکورڈ پوزیشن بن گئی۔

"گھٹیا فطرت کی بدصورت گدھ، جو مردہ جسموں کا گوشت کھاتی ہے۔ کبھی شیشہ دیکھنا، تمہیں اپنے چہرے کے بجائے ایک گدھ کا چہرہ دکھائی دے گا۔" رامس ہذیانی انداز سے چیخ رہا تھا۔ ماہم نے اسے دیکھا وہ وہ اب نفرت سے زمین پر تھوک رہا تھا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے باہر نکلی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنی گاڑی کی طرف بھاگی، اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن رامس کے جملے کسی بھوت کی طرح اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس کی گاڑی پوری قوت سے پٹرول کا ذخیرہ لے کر آتی گاڑی سے ٹکرائی۔ فضا میں گاڑی کے شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز کے بعد ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ماہم کی گاڑی کے پرزے سڑک پر دور تک پھیلتے گئے۔

☼ ☼ ☼

"عائشہ! کیسی طبیعت ہے ماہم کی۔۔۔" وہ ابھی ابھی ہسپتال سے واپس آئی تھی۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے ابھی سانس ہی لیا تھا کہ ماما بڑی تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آئیں۔

"بہت خوفناک حادثہ تھا ماما۔۔۔" عائشہ نے افسردگی سے کہا۔



"ہاں بیٹا! میں نے ٹی وی پر دیکھا، قیامت خیز منظر تھا۔ شکر ہے ماہم کی جان بچ گئی۔۔۔" ماما نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

"امی! کیا فائدہ ایسی جان کا۔۔۔" وہ حد درجہ مضطرب تھی۔

"کیا مطلب بیٹا۔۔۔؟" ماما نے بے چینی سے پہلو بدلا اور عائشہ کی نم آنکھوں کو دیکھا۔

"ماما! وہ اس حادثے میں اپنی دونوں ٹانگیں ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔" عائشہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ماہم کی تکلیف اسے اپنے دل پر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی دوست اور دشمن، سب ہی کے غموں پر پریشان ہونے والی، ماہم کے ایکسیڈنٹ کی خبر نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی۔

"اللہ معاف کرے بیٹا! مکافات عمل ہے۔۔۔" ماما نے قدرے جھجک کر کہا تو عائشہ نے گلہ آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"بہت بری بات ہے ماما، آپ اور موحد بھائی دونوں ہی بہت سخت دل ہیں۔۔۔"

"تمہاری موحد سے بات ہوئی، کب آرہا ہے پاکستان۔۔۔؟" ماما نے نظریں چراتے ہوئے دانستہ موضوع تبدیل کیا۔

"ابھی تو وہ اپنی بیگم کے ساتھ ماشاء اللہ بہت خوش ہیں۔ ان دونوں کا امریکہ سے پیرس جانے کا ارادہ ہے۔۔۔" عائشہ نے انہیں موحد کے بارے میں بتایا اور تھکے تھکے انداز سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں آئی تو سامنے میز پر رکھا اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے چونک کر علی کا نام دیکھا۔

"عائشہ کہاں ہو یار۔۔۔" ڈاکٹر خاور علی کی پریشانی میں ڈوبی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"کیا ہوا علی، خیریت ہے ناں۔۔۔؟" اس نے دوپٹے سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

"یار، رامس نے بہت تنگ کر رکھا ہے سخت ڈسٹرب ہے وہ ماہم کے حادثے سے، میرے اور ماما کے تو کسی صورت بھی قابو نہیں آرہا۔۔۔" ڈاکٹر خاور بڑے عجلت بھرے انداز سے اسے اپنی پریشانی بتا گئے۔

"میں آتی ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔" اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ ڈاکٹر خاور علی کے گھر میں تھی۔

"عائشہ! رامس نے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ پہلے اپنے بابا کی ڈیتھ کے بعد بھی یہ ایسا ڈپریس ہوا تھا، اب کل سے پھر گم صم ہے، میری اور خاور کی تو بالکل بھی نہیں سن رہا۔" ماما اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئیں۔

"آنٹی! آپ پریشان نہ ہوں، میں بات کرتی ہوں اس سے۔۔۔" وہ رامس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی، جہاں پہلے سے بیٹھے ڈاکٹر خاور اسے دیکھ کر فوراً کھڑے ہوئے۔

"ٹمپریچر سے پورا جسم جل رہا ہے اس کا، مگر میڈیسن لینے پر آمادہ نہیں ہو رہا، اتنا بڑا ہو گیا ہے اور عادتیں بالکل بچوں جیسی ہیں اس کی۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے بھی شکایتوں کا رجسٹر کھول لیا۔

"مجھے بہت بھوک لگی ہے، آپ ماما سے کہیں میرے لیے کھانا بھجوائیں۔" اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں ڈاکٹر خاور سے کہا تو وہ ایک دم شرمندہ ہو گئے۔

"آئی ایم سوری عائشہ! ہم لوگ واقعی تمہیں بہت تنگ کرتے ہیں۔۔۔" انہوں نے خفت زدہ انداز سے کہا تو عائشہ نے گھور کر دیکھا۔

"یہ فارمل گفتگو بعد میں کر لیجیے گا بلیوی، مجھے بہت بھوک لگی ہے، آپ نے ہسپتال جانا ہے تو بے شک چلے جائیں، میں رامس کے پاس ہوں۔" عائشہ نے ان کی پریشانی کو کم کیا۔ وہ مشکور نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"کون سی میڈیسن ہے اس کی۔۔۔؟" عائشہ نے سائیڈ میز سے چند ٹیبلٹس اٹھائیں اور اس کی طرف بڑھی۔

"اک دفعہ میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ تم میرے لیے موحد کی طرح ہو۔۔۔" وہ خفا خفا سے انداز سے بیٹھے رامس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے اونچا کرکے

بولی۔وہ چونکا۔
"اگر تم بھی مجھے موحد کی طرح اپنی بہن سمجھتے ہو تو مجھ سے بحث مت کرنا' یہ میڈیسن کھاؤ۔۔۔" اس نے پانی کا گلاس اور چند ٹیبلٹس زبردستی رامس کے ہاتھ میں پکڑائیں۔وہ الجھن کا شکار ہوا۔
"بس بس۔مزید ڈرامے بازی نہیں' ایک دو تین' فورا" کھاؤ۔۔۔" عائشہ نے زبردستی گلاس اس کے منہ سے لگایا اور وہ ایک لمحے میں منہ بناتا ہوا ساری دوائی نگل گیا۔ڈاکٹر خاور نے سکون کا سانس لیا اور کمرے سے نکل گئے۔
"مائے گاڈ عائشہ! میں ایسا بالکل نہیں چاہتا تھا۔۔۔" وہ تین گھنٹے کی کوشش کے بعد اتنا ہی بولا تھا۔اس کے لہجے اور لفظوں میں دکھ اور شرمساری تھی۔جبکہ چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔
"مجھے معلوم ہے رامس' تم ایسا بالکل بھی نہیں چاہتے تھے لیکن ہم چاہتے یا نہ چاہتے' تقدیر اس کی قسمت میں ایسا حادثہ لکھ چکی تھی۔" عائشہ کی بات پر رامس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی۔
"اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے تو بالکل غلط لگ رہا ہے۔ماہم کی زندگی میں یہ حادثہ اس دن کی تاریخ میں ایسے ہی ہونا تھا۔" عائشہ نے تحمل سے جواب دیا۔
"اس نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کے پٹ وا کیے' ٹھنڈی ہوا کا ایک یخ جھونکا رامس کے چہرے سے ٹکرایا۔اس نے جھرجھری سی لی۔
"ہم لوگ اپنی زندگیوں کو ایسی سوچوں سے خوامخواہ مشکل بنا دیتے ہیں۔انسان تو ایک پتا ہلانے پر قادر نہیں۔اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے صرف اور صرف ایک ہی طاقت کار فرما ہے۔محض ہمارے چاہنے یا سوچنے سے اتنے بڑے حادثے کیسے ہو سکتے ہیں؟" عائشہ کی بات پر رامس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔اس کے چہرے پر بڑا واضح تغیر رونما ہوا۔وہ اب آہستہ آہستہ پر سکون ہو رہا تھا۔
"چلو اٹھو' نابیہ سے مل کر آتے ہیں' وہ شائلہ بھابھی کے جانے سے کافی اداس ہے' پھر اچھا سا کھانا کھائیں گے۔" عائشہ نے بازو پکڑ کر اسے اٹھایا۔وہ اب آرام سے بیٹھا اپنے جوگرز کے تسمے باندھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نفسیاتی اور ذہنی امراض کے ہسپتال کے کمرہ نمبر چودہ سے آنے والی یہ چیخیں کسی کا بھی دل دہلانے کو کافی تھیں۔اس کمرے کی مریضہ کو زیادہ تر ادویات کے زیر اثر نیند میں ہی رکھا جاتا تھا' لیکن جیسے ہی وہ مکمل ہوش کی دنیا میں آتی اس کے حلق سے نکلنے والی چیخیں پورے ہسپتال میں گونجنے لگتیں۔حادثے میں اپنی ٹانگیں کھونے کے بعد ماہم کی ذہنی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔اس کا دماغ کسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔
"ہم لوگ سوچ رہے ہیں کہ ماہم کو علاج کے لیے باہر لے جائیں۔۔۔" اس دن ثمن آپی نے عائشہ کو بتایا۔وہ جو ماہم کی عیادت کے لیے بلاناغہ آ رہی تھی۔ان کی بات پر چونک گئی۔ماہم کے حادثے نے ثمن آپی کو بھی بہت تبدیل کر دیا تھا۔ان کے مزاج میں واضح طور پر انکساری' عاجزی اور خوف خدا کے رنگ جھلکنے لگے تھے۔
"انسان کتنا عجیب ہے ناں' نیکی کی طرف بھی کسی حادثے کی وجہ سے ہی مائل ہوتا ہے۔" اس دن ہسپتال سے نکلتے ہوئے عائشہ نے ڈاکٹر خاور سے کہا۔
"اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ انسان خسارے میں ہے۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے عائشہ کی طرف دیکھا۔
"کیا ماہم کا قصور اتنا بڑا تھا کہ اسے اتنی بڑی سزا ملتی۔۔۔؟" عائشہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر خاور سے پوچھا۔
"یہ تو اوپر والی ذات جانتی ہے اور ہمیں کیا پتا کہ یہ



سزا ہے یا کوئی آزمائش۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور مین روڈ پر لے آئے۔"ہاں اس کی حد درجہ حسن پرستی اور اللہ کی مخلوق کا مذاق اڑانے والی عادت سے بعض دفعہ مجھے خوف آتا تھا کہ اللہ کہیں کسی لفظ پر پکڑ نہ لے اور اللہ کی پکڑ بہت شدید ہوتی ہے۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے گاڑی کی رفتار تیز کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
"اس چیز سے تو میں بھی اکثر اسے منع کرتی تھی' خیر چھوڑیں' یہ بتائیں' رامس کیسا ہے۔۔۔؟" عائشہ کو اچانک خیال آیا۔
"رامس ماشاء اللہ بہت بہتر ہے' میں نے امی سے کہا ہے کہ بس فورا" اس کی شادی کریں' نابیہ اچھی لڑکی ہے۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے اس کے گھر کی جانب اپنی گاڑی موڑتے ہوئے اسے بتایا تو وہ مسکرا دی۔
"پھر آنٹی نے کیا کہا۔۔۔؟"
"انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ بڑے کی موجودگی میں چھوٹے بیٹے کی پہلے کیسے کر دوں۔۔۔" ڈاکٹر خاور تھوڑا سا شوخ ہوئے تو عائشہ کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں اور اس نے نگاہیں جھکا لیں۔
"میں نے کہا کہ میرے اکلوتے سالے صاحب کا ہنی مون ٹرپ لمبا ہی ہوتا جا رہا ہے اور ایک اکلوتی سالی کینیڈا میں ہے' یہ دنیا بھر میں پھیلے بہن بھائی اکٹھے ہوں گے تو مجھ غریب کی سنی جائے گی۔" ڈاکٹر خاور کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔
"لیں جناب' آپ کی منزل آ گئی۔۔۔" ڈاکٹر خاور نے اس کے گھر کے گیٹ پر اپنی گاڑی روکی۔
"اندر آئیں ناں' آپ کو اچھی سی چائے پلاتے ہیں۔۔۔" عائشہ نے آفر کی۔
"نہیں جناب' پھر سہی' میرے پیشنٹ میرا ویٹ کر رہے ہوں گے۔۔۔" انہوں نے سلیقے سے منع کیا تو عائشہ بھی لاپروائی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔اس بات کا تو اسے بھی اچھی طرح علم تھا کہ ڈاکٹر خاور اپنے پروفیشن کے معاملے میں کتنے حساس ہیں اس لیے وہ کبھی بھی ان کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی راہ کی رکاوٹ نہیں بنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سکینہ کے ابا' یہ کاکے کو پکڑ' کیسے ٹیوب ویل کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔۔۔" اپنے پنڈ والے گھر کے صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھی جمیلہ مائی نے اللہ دتا کمہار کو ننھے فہد کی طرف متوجہ کیا۔خود وہ بڑی توجہ سے ساگ کاٹنے میں مصروف تھیں۔
"اوئے' شرجا' کیسے خرگوش کی طرح بھاگا جا رہا ہے۔۔۔" اللہ دتا کمہار نے حاجی کے چھوٹے بیٹے کو پیار سے ڈانٹا اور اپنا حقہ چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگے۔
"دیکھ سکینہ کی ماں! یہ کتنا شوخا ہے' قابو ہی نہیں آتا۔۔۔" اللہ دتا کمہار پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس ڈھائی سالہ بچے کو بمشکل پکڑ کر لائے' جو ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی میں نہانے کو مچل رہا تھا۔
"اماں! اس کو بھی سنبھال لے' میں جلدی جلدی چولہے میں لکڑی جلالوں' حاجی کے آنے کا ویلا ہو رہا ہے' ہانڈی ابھی پکی نہیں۔۔۔" حاجی کی بیوی نے چار سالہ سکینہ کو اپنی ساس کی گود میں زبردستی بٹھایا۔
"پتر' سکینہ کو تو بخار لگ رہا ہے۔۔۔" جمیلہ مائی نے اپنی چار سالہ پوتی کا گرم ماتھا چھو کر فکر مندی سے کہا تو وہ لاپروائی سے بولی۔
"ہاں ناں اماں' سارا دن تو کھیتوں میں ننگے پاؤں پھرتی ہے اتنی ٹھنڈ میں' تاپ نہیں چڑھے گا تو اور کیا ہو گا۔۔۔" حاجی کی بیوی سوکھی لکڑیاں چولہے میں رکھ کر آگ جلاتے ہوئے بولی۔
"پتر تو ہانڈی پکا' میں سکینہ کے دادے کے ساتھ جا کر حکیم سے دوائی لے آؤں' میری دھی رانی کا متھا کسی تندور کی طرح تپ رہا ہے۔۔۔" جمیلہ مائی نے جھٹ سے اپنی چادر اٹھائی۔سکینہ کو اللہ دتا نے اٹھایا اور دونوں باہر نکل آئے
"دیکھ بھلے لوکے' اللہ سوہنے نے تیرا خواب سچا کر دیا' تو نے پنج (پانچ) سال پہلے خواب دیکھا تھا ناں کہ ہمارے پنڈ والے ویہڑے میں بچے ہیں پر سکینہ نہیں

___ "پنڈلی پچی گلیوں سے گزرتے ہوئے اللہ دتا کمہار کو پانچ سال پہلے کی بات یاد آئی۔
"لیکن ہمارے ویہڑے میں تو ہماری سکینہ بھی ہے ___" جمیلہ مائی نے ہنس کر یاد دلایا تو اپنے کندھے پر چار سالہ سکینہ کو اٹھائے اللہ دتا اپنی بیوی کی معصوم سی خوشی پر ہنس دیے۔
"اللہ ہمارے جاجی کو زندگی اور صحت دے' اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ ہمارے لیے اپنی بے بے کے سامنے ڈٹ گیا۔ جب سے سکینہ فوت ہوئی ہے' اس نے ایک دن بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آخر کار اس کی محبت کے آگے اس کی بے بے کو بھی گھٹنے ٹیکنے پڑے ___" اللہ دتا کمہار حکیم کی دکان کی طرف بڑھتے ہوئے بڑے فخر سے مسکرائے۔
"یہ سب اللہ سوہنے کا کرم ہے' وہ اپنے بندے کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔" جمیلہ مائی کا اللہ پر یقین اور بڑھ گیا تھا۔ جاجی نے اپنی بیٹی کا نام سکینہ کے نام پر رکھ کر انہیں اپنی محبت کا ہمیشہ کے لیے مقروض کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی بیوی بھی اچھی تھی اور وہ دونوں میاں بیوی کی دل سے عزت کرتی تھی۔
"ہاں بھلیے لوکے' مجھے یاد آیا' ڈاکٹر خاور کا فون آیا تھا' اس نے اپنی ومی کے نام پر جو معذور بچوں کا ادارہ بنایا ہے' اس کی چوتھی سالگرہ ہے' ہمیں خصوصی طور پر بلوایا ہے' کہتا ہے کہ ایک اور وارڈ بنایا ہے' اس کا فیتہ ہم سے کٹوائے گا۔" اللہ دتا کی بات نے جمیلہ مائی کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا۔ اگلے دو دن وہ اسی بات کو سوچ کر مسکراتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"بہت تھک گیا ہوں یار' اچھی سی چائے تو بنوا کر بھیجو ___" اپنے اسٹڈی روم کی طرف جاتے ہوئے ڈاکٹر خاور نے عائشہ سے فرمائش کی تو وہ مسکرا دی۔
"میں چائے بھجواتی ہوں' اس کے بعد مجھے امی کی طرف جانا ہے' موحد بھائی کے بیٹے کی سالگرہ ہے آج ___" عائشہ نے اپنے اوپر پرفیوم کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے معروف انداز سے کہا۔ موحد اور نائیلہ اپنے بیٹے کے ساتھ بہت خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔
"میری طرف سے بھی وش کر دینا ___" ڈاکٹر خاور کے معروف انداز پر وہ مسکرائی اور کمرے سے نکل گئی۔ ان دونوں کی شادی کو ساڑھے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ساڑھے تین سالہ ابتاج اور ایک سال کی انوشے نے ان کی فیملی کو مکمل کر دیا تھا وہ دونوں ایک بھرپور ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ رامس' نابیہ سے شادی کے بعد دوبئی شفٹ ہو گیا تھا۔ ماہم پچھلے چھ سال سے مختلف ہسپتالوں میں تھی۔ اس کی ذہنی حالت بگڑ گئی تھی۔
"آج پھر اکتیس دسمبر ہے ___" انہوں نے کیلنڈر پر اکتیس دسمبر کے گرد سرخ حاشیہ غور سے دیکھا۔ ایک ایسا ہی حاشیہ ان کے دل کے گرد بھی لگا ہوا تھا۔ وہ چائے کا کپ اٹھائے اسٹور روم میں چلے آئے جہاں وارڈ روب کے ایک خانے میں لوہے کی وہ ڈری آج بھی محفوظ تھی۔ انہوں نے اسٹور کا دروازہ بند کیا اور وارڈ روب سے وہ گرد آلود چھوٹی سی ڈری باہر نکالی اس پر تالے کی چابی بھی انہوں نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ عائشہ کی ایک اچھی عادت تھی کہ وہ خوامخواہ تجسس میں نہیں پڑتی تھی۔ اس نے ایک آدھ دفعہ اس کے بارے میں پوچھا لیکن ڈاکٹر خاور ٹال گئے اور اس کے بعد اس نے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔
انہوں نے ڈری کھولی اور اس کے اندر موجود اشیا کو بڑی عقیدت کے ساتھ باہر نکالنے لگے۔ یہ وہ ساری اشیا تھیں جنہیں سکینہ اللہ دتا اپنی زندگی میں بہت سنبھال سنبھال کر رکھتی تھی۔ ان اشیا میں ڈاکٹر خاور کا ایک چشمہ' تین چار بال پوائنٹس' ایک رومال کی چین اور کچھ خشک پھول تھے۔ ایک ڈائری جس میں ڈاکٹر خاور کی ایک پاسپورٹ سائز تصویر جو اللہ جانے اس نے کہاں سے لی تھی۔ کچھ کتابیں جو ڈاکٹر خاور نے اسے وقتاً "فوقتاً" گفٹ کی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی اپنی ایک خشک پڑی کریم ٹیوب' سستی سی لپ اسٹک' کاجل' چوڑیاں اور ہار سنگار کی چند معمولی سی اشیا جو اس لڑکی کی زندگی میں ایک قیمتی متاع کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن کو ہر سال اکتیس دسمبر کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر خاور کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتیں۔ وہ کئی گھنٹے اس اسٹور میں ان پرانی یادوں کا سوگ مناتے اور پھر اگلے سال کے لیے اسے سنبھال کر رکھ دیتے۔ ڈاکٹر خاور کی نگاہیں سکینہ کی ڈائری پر تحریر اس نظم پر پھسلنے لگیں۔

محبت ایک دیمک ہے' جو کھا جاتی ہے سب کچھ
یوں کہ
جیسے شب سیاہ ہو کوئی' جو روشنیوں کو نگل جائے
محبت ایک دیمک ہے' یہ جس دل میں اتر جائے'
اسے خار دیتی ہے
کسی صحرا میں لے جا کر پیاسا مار دیتی ہے
خبر اس کی نہیں ہوتی
کہ کب گھیر لے یہ کس کو
اسے نہ زندگی سمجھو کہ سفر دشوار ہے اس کا
سراب زندگی سمجھو
محبت ایک دیمک ہے
مجھے بھی یہ لگی تھی جب
اسے دل میں بسایا تھا
حیات جاوداں سمجھا' جب اپنا اسے بنایا تھا
کہ اب تو یوں یہ جیتی ہے
مجھے مردہ بنا کر بس
جگر کا خون پیتی ہے
جگر کا خون پیتی ہے

☼ ☼ ☼

وہ فیصل مسجد سے جمعہ کی نماز پڑھ کر باہر نکلے تو مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایک سیاہ بدلی نے بسیرا کر رکھا تھا۔ موسم زبردست تھا اور اسی لمحے ٹھنڈی ہوا کا نم آلود جھونکا ان کے چہرے سے ٹکرایا لیکن دل میں اداسی کا ڈیرہ تھا اس لیے کسی قسم کی خوشگواریت کا کوئی احساس نہیں جاگا تھا۔ چہرے پر رہنے والی دھیمی مسکراہٹ آج ناپید تھی۔ شفاف پیشانی پر تفکر کی لہریں' آنکھوں میں رنج اور لبوں پر خاموشی کا راج تھا۔ چلتے ہوئے ان کے قدموں میں محسوس کی جانے والی شکستگی کا احساس نمایاں تھا۔
انہوں نے اپنی سیاہ ہنڈا سوک کا دروازہ ابھی کھولا ہی تھا کہ اچانک ایک بوڑھی عورت نے اپنا ہاتھ ان کے آگے پھیلایا۔ انہوں نے بوسیدہ خاکی سے رنگ کی چادر میں اس بوڑھی بھکارن کو دیکھا۔ آج جمعے کی وجہ سے فیصل مسجد کے باہر فقیروں کی تعداد میں خاصا اضافہ تھا۔ ان کے سامنے کھڑی خاتون کی رنگت سیاہی مائل' جسم میں کمر کے مقام پر اچھا خاصا خم اور آنکھوں کے نیچے حلقے تھے۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں زمانے کی سختی کے نقش ثبت تھے۔
"بیٹا! اللہ سائیں دل کا سکون دے' اس کے صدقے اس بڑھیا کی کچھ مدد کرتا جا۔"
اس دعا پر ان کے دل کو جھٹکا لگا۔ وہ ایک دم ساکت رہ گئے۔ بدن کے ہر مسام سے گویا پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ ایسے لگا جیسے ان کا دل کسی نے مٹھی میں پکڑ کر بھینچ دیا

ہو یا پھر کوئی ٹرین تیز رفتاری سے ان کے وجود سے گزر کر ان کے پرخچے اڑا گئی ہو۔ ان کے تنفس کی رفتار یکبارگی بڑھ گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے اپنا والٹ نکالا اور بغیر دیکھے ایک نیلا نوٹ باہر کھینچا اور اس بھکارن کی طرف بڑھا دیا۔ لیکن اس نے لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔

"صاحب! کھلے پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔" وہ سانس روکے ہزار کے نوٹ کو دیکھ رہی تھی۔

"دل کا سکون اتنی آسانی سے اور اتنا سستا تو نہیں ملتا۔" انہوں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ پیسے اسے پکڑائے اور پلٹ کر تیزی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کے چہرے پر پھیلی تاریکی صاف دکھائی دے رہی تھی جبکہ اس عورت کو لگا تھا کسی غیر مرئی طاقت نے جکڑ لیا تھا۔ ان کی گاڑی اب بڑی سرعت سے اسلام آباد کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ کچھ ہی منٹوں کے بعد وہ اسلام آباد کے سیکٹر ایچ ایٹ کی طرف گامزن تھے۔

ان کی گاڑی ایچ ایٹ سیکٹر کے قبرستان کے سامنے آکر رک گئی تھی۔ یہ وہ شہر خموشاں تھا جہاں ادب کے کئی نامور ستارے .... قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور پروین شاکر وغیرہ مٹی اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے یہ وہ نام تھے جن کی تحریروں میں کبھی زندگی کا دل دھڑکتا تھا۔ اب وہ صرف لفظوں میں زندہ تھے۔ ان سب خاص لوگوں کے پاس سفید ماربل کی ایک عام سی قبر تھی۔ جس میں کسی زندہ شخص کا سارا سکون دفن تھا۔

اس قبر پر کیکر کے درخت کی چھاؤں تھی اور کیکر کے پتے پوری قبر پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پچھلے چھ سال سے سکینہ کی برسی پر یہاں آتے تھے۔ لیکن ان کی شریک حیات اس بات سے بے خبر تھی۔ "سکینہ ٹرسٹ" کو مسز ماریہ بہت کامیابی سے چلا رہی تھیں۔ جمیلہ مائی کے علاوہ وہ واحد خاتون تھیں جو جانتی تھیں کہ اس ٹرسٹ کو بنانے کے پیچھے کون سا جذبہ کار فرما ہے۔ ڈاکٹر خاور چاہنے کے باوجود کبھی بھی عائشہ کے ساتھ یہ راز شیئر نہیں کر سکے اور ویسے بھی وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ بعض باتیں دل کے نہاں خانوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ دل کی ہر بات بتانے کے لیے تھوڑی ہوتی ہے۔

واپس آکر وہ گاڑی میں بیٹھے تو ان کی نظر سامنے ڈیش بورڈ پر پڑے سیل فون پر پڑی۔ انہوں نے فون اٹھا کر دیکھا اس پر پوری بیس مسڈ کالز تھیں۔ اور وہ دیکھے بغیر جانتے تھے کہ یہ کالز صرف ایک ہی نمبر سے آئی ہوں گی اور اس نمبر سے وہ بخوبی واقف تھے۔ یہ نمبر ان کی شریک حیات عائشہ خاور کا تھا جس نے انہیں گزشتہ ساڑھے پانچ سالوں میں ازدواجی زندگی کی ڈھیروں خوشیاں دیں، لیکن ان تمام خوشیوں کے باوجود ڈاکٹر خاور کے دل کا ایک کونا ہمیشہ اداس ہی رہا۔ وہاں کسی کی یاد کا جلتا چراغ ایک کسک کا باعث بنتا رہا۔ وہاں ایک ایسی لڑکی کی یادیں دفن تھیں جسے زمانے کی تلخ اور بے رحم حقیقتوں کی دیمک کھا گئی تھی۔

جی ہاں.... مشہور و معروف، غیر معمولی پرکشش شخصیت کے حامل ڈاکٹر خاور علی جن کے قدموں میں کئی لڑکیوں کے دل دھڑکتے تھے۔ جنہیں مسیحائی سے عشق تھا۔ جن کی فہم و فراست اور قابلیت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ انہیں کبڑے پن کی بیماری کا شکار سکینہ اللہ دتا سے اس کی موت کے بعد محبت ہو گئی تھی۔



جب جب اس کو سوچا ہے
دل اندر سے مہکا ہے !

صحرا پر موقوف نہیں
دریا بھی تو پیاسا ہے

سجنی تیرے روپ کا سایہ
سیدھا دل پر پڑتا ہے

سب سے اُس کی باتیں کرنا
کتنا اچھا لگتا ہے !

چوٹ لگے اک عمر ہوئی
زخم ابھی تک رِستا ہے

شام کی بانہوں میں نعمان
کس کو سوچتا رہتا ہے

نعمان فاروق

مجھے کیا غرض کہیں سے، یہ تیرا آستانا
نہ مجھے یہاں سے اُٹھنا، نہ کہیں یہاں سے جانا

کبھی بارشِ ملامت، کبھی ٹھوکروں کی آفت
سرِ عاشقی سلامت، کبھی کچھ بُرا نہ مانا

نہیں تم سے کوئی شکوہ مگر ایک التجا ہے
جو بنا رہے ہو حالت، کبھی آ کے دیکھ جانا

مجھے حق ہے ان کے
مجھے حق ہے ان کے دل پر یوں ہی فرض کر لیا تھا
مگر اب رضا ہے مشکل، یہ خیال آ کے جانا

سید آل رضا

وہ شعلہ بجھ گیا ہے کہ فرصت نہیں رہی
یوں بھی نہیں کہ دل میں محبت نہیں رہی

گپ شپ ہے اپنے ساتھ ہی اب' رات ہو کہ دن
ہو کوئی ہم سخن بھی، یہ حاجت نہیں رہی

آدھی بھی کہہ سکیں تو غنیمت ہے آج کل
کھل کر وہ بات کرنے کی عادت نہیں رہی

یوں ہو چکا ہے صاف حساب و کتابِ دل
اک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں رہی

مصروف کر رکھا ہے ظفر زندگی نے یوں
مرجائیں اس قدر بھی فراغت نہیں رہی

ظفر اقبال

## دسمبر آگیا ہے

یہ بھیگی شام کا منظر بہت دل گیر ہوتا ہے
عجب ہے آبلہ پائی
مرے آنگن میں بکھرے زرد پتے بھی
تمہیں آواز دیتے ہیں
یہ کالی شام میں لپٹا ہوا معصوم سا چہرہ
کہ ہونٹوں پہ بھی پیاس برسوں سے
ہوائے سرد کے جھونکے جو یہ تن من جلاتے ہیں
تو پھر یاد کرتے ہیں تمہیں ہم یاد کرتے ہیں
ہمیں تم یوں ستاؤ نا
کہ اب تم لوٹ آؤ نا
دسمبر آگیا ہے

عزالہ جلیل راؤ



## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

سیدنا ابوہریرہؓ کہتے ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں' اگر کوئی میرا مال (ناحق) لینے کو آئے تو؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنا مال اس کو نہ دے۔"

پھر اس نے کہا۔ "اگر وہ مجھ سے لڑے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تو بھی اس سے لڑ۔"
پھر اس نے کہا۔ "اگر وہ مجھ کو مار ڈالے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تو شہید ہے۔"
پھر اس نے کہا۔ "اگر میں اس کو مار ڈالوں؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ جہنم میں جائے گا۔"

(صحیح مسلم)

## امن کے لیے

برنارڈ شا کہتا ہے۔
"اجڑ اجڑ کر بسنے والی دنیا امن چاہتی ہے تو اسے یقیناً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت پڑے گی۔ انسان چاند پر پہنچ چکا ہے۔ سمندر کی تہیں کھنگال ڈالیں۔ خلا میں قلعے تعمیر کرنے کے لیے کوشاں ہے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ حیات کا بدل پیش نہ کر سکا۔"

## امیر المومنین اور یہ مفلوک الحالی

سیدنا علیؓ فرماتے ہیں۔
"میں نے عمر ابن خطابؓ کے ازار میں اکتیس پیوند چمڑے اور ایک پیوند کپڑے کا دیکھا۔"

سیدنا انسؓ نے بیان کیا ہے۔ "میں ایک دن ملنے کے لیے سیدنا عمرؓ کے پاس گیا۔ آپ گدھے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ سیدنا عمر ایک قمیص اور ایک تہہ بند پہنے ہوئے تھے۔ تہہ بند کا یہ حال تھا کہ وہ پنڈلیوں سے اوپر جا رہا تھا۔ میں اسے ایک طرف سے ٹھیک کرتا تو وہ دوسری جانب سے اوپر چلا جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ مسکرائے اور کہا۔

"اسے چھوڑ دو، یہ تمہاری بات ماننے والا نہیں۔"

بینش مدثر۔ فیصل آباد

## ایک گناہ

حضرت نوریؒ فرماتے ہیں۔ "میں نے ایک گناہ کیا جس کے باعث میں پانچ ماہ تک رات کے قیام سے محروم رہا۔"

لوگوں نے پوچھا۔ "وہ کون سا گناہ ہے؟"
فرمایا۔ "ایک شخص کو روتے دیکھ کر میں نے کہہ دیا تھا۔ "یہ ریا سے رو رہا ہے۔"

(غنیۃ الطالبین۔ امام غزالیؒ)

## تنگی کے بعد اللہ تعالیٰ کا انعام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب ۸ھ میں سمندر کے کنارے ایک لشکر تین سو آدمیوں کا، جن پر حضرت ابوعبیدہؓ امیر بنائے گئے تھے بھیجا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تھیلی میں کھجوروں کا توشہ بھی ان کو دیا۔

پندرہ روز ان حضرات کا وہاں قیام رہا اور توشہ ختم ہو گیا۔ حضرت قیسؓ نے جو اس قافلے میں تھے، مدینہ منورہ میں قیمت ادا کرنے کے وعدہ پر قافلہ والوں سے اونٹ خرید کر ذبح کرنا شروع کیے وہ تین اونٹ

روزانہ ذبح کرتے۔ مگر تیسرے دن امیر قافلہ نے اس خیال سے کہ سواریاں ختم ہوگئیں تو واپسی بھی مشکل ہو جائے گی۔ ذبح کی ممانعت کی اور سب لوگوں کے پاس اپنی اپنی جو کچھ کھجوریں موجود تھیں، جمع کر کے ایک تھیلی میں رکھ لیں۔ اور یک ایک کھجور روزانہ تقسیم فرما دیا کرتے۔ جس کو چوس کر یہ حضرات پانی پی لیتے اور رات تک کے لیے یہی کھانا تھا۔ کہنے کو مختصر سی بات ہے مگر لڑائی کے موقع پر جب کہ قوت اور طاقت کی بھی ضرورت ہو، ایک کھجور پر دن بھر گزار دینا دل و جگر کی بات ہے۔

چنانچہ جابر رضی نے جب یہ قصہ لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سنایا تو یک شاگرد نے عرض کیا کہ حضرت ایک کھجور کیا کام دیتی ہو گی۔"

آپ رضی نے فرمایا۔ "اس کی قدر جب معلوم ہوئی جب وہ بھی نہ رہی اب بجز فاقہ کے کچھ نہ تھا۔ درخت کے خشک پتے جھاڑتے اور پانی میں بھگو کر کھا لیتے۔"

مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے اور ہر تنگی کے بعد اللہ تعالیٰ کے یہاں سے سہولت آتی ہے۔ حق تعالیٰ نے ان تکالیف اور مشقتوں کے بعد سمندر میں سے ایک مچھلی ان لوگوں کو پہنچائی جس کو عنبر کہتے ہیں، یہ اتنی بڑی تھی کہ اٹھارہ روز تک یہ حضرات اس میں سے کھاتے رہے اور مدینہ منورہ پہنچنے تک اس کا گوشت توشوں میں ساتھ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب سفر کا مفصل قصہ سنایا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کا ایک رزق تھا جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔ اس مچھلی کے نام کی مناسبت سے اس لڑائی کو سریہ العنبر بھی کہا جاتا ہے۔

(فضائل اعمال)
شمائلہ عنایت چغتائی ملہ ٹاؤن

## اقوالِ واصف علی واصف

- اگر کیفیت یا یکسوئی نہ بھی میسر ہو تو بھی نماز ادا کرنی چاہیے نماز فرض ہے کیفیت نہیں۔
- شکر کرو نعمت محفوظ ہو جائے گی۔ دسترخوان کشادہ کر دو رزق بڑھ جائے گا۔ سجدہ کرو تقرب نصیب ہو گا۔
- عزت کرو عزت ملے گی۔ صدقہ دو، بلا ٹل جائے گی۔ توبہ کرو گناہ معاف ہو جائیں گے۔
- انسان جس کیفیت، عقیدے میں مرے گا، اسی میں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ دعا کریں کہ وقتِ رخصت کلمہ نصیب ہو۔
- ریاکار اس عابد کو کہتے ہیں جو دنیا کو اپنی عبادت سے مرعوب کرنا چاہے۔

(واصف علی واصف)
نوال افضل تمس۔ گجرات

## ضمیر

- یہ انسان کے اندر خدا کی دھیمی لیکن واضح آواز ہے۔
(ینگ)
- ضمیر ہمارے جسم میں ایسی مقدس آواز ہے جو ہم سے کہتی ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ، کوئی ہستی تمہیں دیکھ رہی ہے۔
(میکلن)
- ضمیر کی اندرونی چیخ نہ تو کان سن سکتے ہیں اور نہ زبان اس کے کرب کو ظاہر کر سکتی ہے۔
(چیمبرز)
- کوئی تکیہ اتنا ملائم نہیں ہوتا، جتنا صاف ضمیر۔
(فرانسیسی کہاوت)
- ضمیر انسانی روح کی پاکیزہ پکار کا نام ہے۔
(موزلی)
حرا قریشی۔ ملتان

## شہادت حسین رضی

جوش صاحب سے ایک انٹرویو میں سوال کیا گیا کہ آپ نے کیا سوچ کر مرثیہ کے میدان میں قدم رکھا؟ تو انہوں نے کہا۔

"ایک دن ایک بہت بڑے انگریز افسر نے جو بہت بڑے عہدے پر فائز تھا، عربی اور فارسی بھی جانتا تھا، مجھ سے کہا۔

"جوش صاحب! آج محرم کی ساتویں تاریخ ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"



کہنے لگا۔ "آپ محرم سے واقف ہیں؟"

میں نے اس سے کہا۔ "صاحب! آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟"

کہنے لگا۔ "ہاں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے حسین رضی کی شہادت سے کیا فائدہ اٹھایا؟ آپ صرف آنسو بہاتے ہیں۔ جوش صاحب! اگر مٹھی بھر مسلمان بھی حسین رضی کی اسپرٹ سمجھ لیں تو برٹش ایمپائر تین مہینے میں ختم ہو جائے۔"

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

## بے وقوف کی صحبت

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک پہاڑ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک آدمی نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔

"اے اللہ کے رسول علیہ السلام! آپ اس وقت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ آپ کے پیچھے کوئی دشمن بھی تو نظر نہیں آتا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "میں ایک احمق آدمی سے بھاگ رہا ہوں، تو میرے بھاگنے میں خلل مت ڈال۔"

اس آدمی نے کہا۔ "یا حضرت! آپ کیا وہ مسیحا علیہ السلام نہیں ہیں جن کی برکت سے اندھا اور بہرا شفایاب ہو جاتا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "ہاں۔"

اس آدمی نے کہا۔ "کیا آپ وہ بادشاہ نہیں ہیں جو مردے پر کلام الٰہی پڑھتے ہیں اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔"

آپ علیہ السلام نے فرمایا۔ "ہاں۔"

اس آدمی نے کہا۔

"کیا آپ (علیہ السلام) وہی نہیں ہیں کہ مٹی کے پرندے بنا کر ان پر دم کر دیں تو وہ اسی وقت ہوا میں اڑنے لگتے ہیں۔"

آپ (علیہ السلام) نے کہا۔

"بے شک میں وہی ہوں۔"

پھر اس شخص نے حیرانگی سے پوچھا۔ "اللہ تعالیٰ نے آپ (علیہ السلام) کو اس قدر قوت عطا کر رکھی ہے تو پھر آپ (علیہ السلام) کو کس کا خوف ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "اس رب العزت کی قسم کہ جس کے اسم اعظم کو میں نے اندھوں اور بہروں پر پڑھا تو وہ شفایاب ہو گئے، پہاڑوں پر پڑھا، وہ ہٹ گئے، مردوں پر پڑھا وہ بھی اٹھے، لیکن وہی اسم اعظم میں نے احمق پر لاکھوں بار پڑھا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "یا حضرت (علیہ السلام) یہ کیا ہے کہ اسم اعظم اندھوں، بہروں اور مردوں پر تو اثر کرے لیکن احمق پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ حالانکہ حماقت بھی ایک مرض ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ "حماقت کی بیماری خدائی قہر ہے۔"

اس حکایت میں انسانوں کے لیے یہ سبق ہے کہ بے وقوف کی صحبت سے تنہائی بہتر ہے۔

(حکایت رومی)

## جواہر پارے

- زندگی ارادے سے کم اور یقین سے زیادہ گزرے تو اچھی لگتی ہے ورنہ دوسرے ہی گزارتے ہیں۔ اور انسان پٹری بنا ان کو گزرنے دیتا ہے۔ گزرتے دیکھتا رہتا ہے۔
- ہر نیا سال عمر کی سڑک پر لگا ہوا خطرے کا نشان ہے جو زندگی کا نہیں دنوں کا رشتہ بھی توڑ دیتا ہے۔ کبھی روکتا ہے کبھی ٹوکتا ہے اور آنے والے دنوں کی تلخیوں، توقعات اور امیدوں کے ٹوٹتے موڑوں اور اسپیڈ بریکروں سے باخبر کرتا ہے۔
- کہتے ہیں کبھی کبھی کوئی ایک کسی شخص کی منزل ہو جاتا ہے نہ دولت نہ طاقت وہی ایک وجود مرکز بن جاتا ہے۔ سوچوں کا محور بن جاتا ہے۔

(اختر عباس)
فوزیہ ثمرین۔ گجرات

## وجہ شہرت

اسکول کے طلبا عجائب گھر کی سیر کر رہے تھے۔ گائیڈ نے انہیں ایک مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "دوستو! یہ مزوا نامی دیوی کا مجسمہ ہے۔"

طالب علموں نے اس مجسمے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر ایک طالب علم نے اپنی دانست میں بڑا عقلمندانہ سوال کیا۔ "کیا مزوا دیوی شادی شدہ تھی؟"

"نہیں، نہیں۔" گائیڈ نے حیرت سے فوراً جواب دیا۔ "وہ تو ذہانت کی دیوی کہلاتی تھی۔"

الماس تنویر۔۔۔ ہزارہ

## گھنٹی

ایک صاحب نے ماہر نفسیات سے اپنی پریشانی بیان کرتے ہوئے کہا۔ "سب سے بڑی مصیبت میرے خواب ہیں۔ میں خواب میں ہمیشہ ایک ہی منظر دیکھتا ہوں کہ ایک اسکول میں بہت ساری لڑکیاں ادھر سے ادھر بھاگتی پھرتی ہیں۔ کچھ کھیلنے میں مصروف ہو جاتی ہیں اور کچھ باتیں کرنے میں، پھر اچانک اسکول کی گھنٹی بج اٹھتی ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

"ہوں۔۔۔ تو آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے علاج سے آپ کو یہ خواب دیکھنے سے روکوں؟" ماہر نفسیات نے ان صاحب کی الجھن سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی نہیں۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔ آپ اسکول کی گھنٹی بجوانا بند کر دیں۔" ان صاحب نے قدرے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

رشیدہ بتول۔۔۔ اورنگی ٹاؤن

## تفریح

ایک سفری سیلزمین کاروباری دورے پر گیا۔ راستے میں اسے ایک گاؤں میں رکنا پڑا۔ کام سے فارغ ہو کر شام کو اس نے سوچا کہ کچھ تفریح کی جائے۔ اس نے مقامی شخص سے پوچھا۔

"یہاں کوئی سینما ہے؟"

"نہیں۔" دیہاتی نے جواب دیا۔

"کوئی تھیٹر ہال وغیرہ؟"

"جی نہیں۔" دیہاتی نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"حیرت ہے، پھر تم لوگ تفریح کیسے کرتے ہو؟" سیلزمین نے حیرانی سے پوچھا۔

"بس جی۔۔۔ وہ بازار میں ایک چائے خانہ ہے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں اکثر ہی کوئی شہری بابو آکر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم اسے دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں ایک دوسرے کے کان میں باتیں کرتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ یہی ہماری تفریح ہے۔" دیہاتی نے سادگی سے جواب دیا۔

شگفتہ فیض۔۔۔ مشی گن امریکہ

## اسپیشلسٹ

"میں نے سنا ہے، تمہاری بیٹی کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔ کیا بات ہو گئی تھی؟" ایک خاتون نے ازراہ ہمدردی دوسری خاتون سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں بہن! ہمارے ساتھ تو بڑا دھوکا ہوا۔" دوسری خاتون نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بتایا گیا تھا کہ لڑکا گردوں، پھیپھڑوں اور جگر کا اسپیشلسٹ ہے۔"

"اوہ! یہ تو ان لوگوں نے واقعی بہت بڑا جھوٹ بولا۔ کوئی بھی ڈاکٹر تینوں چیزوں کا ایک ساتھ اسپیشلسٹ



نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی ایک چیز کا ہی اسپیشلسٹ ہو گا۔" پہلی خاتون نے متاسف ہو کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ارے بہن! ایسا ہوتا تب بھی غنیمت تھا۔ ہم ہرگز منگنی نہ توڑتے۔ مگر ہمیں بہت بعد میں پتا چلا کہ لڑکا کم بخت مارا قصاب تھا۔" خاتون نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

بینا صدیقی۔۔۔ کورنگی

## اظہار حیرت

اصلاحی کاموں میں حصہ لینے والی ایک خاتون نے ایک صاحب کو شراب خانے سے نکلتے دیکھا تو تاسف سے بولیں۔

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسے اچھے انسان کو ایسی جگہ سے باہر آتے دیکھ رہی ہوں۔"

"خاتون! آپ کا کیا خیال تھا، میں ساری رات اندر ہی بیٹھا رہتا۔" آدمی نے حیرت سے پوچھا۔

زینت لیانہ۔۔۔ پاپوش نگر

## غلطی

"ایسا کرتے ہیں، ہم ذہنی ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے ایک ساتھ رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہم نے محسوس کیا کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے تو ہم خوشی خوشی الگ ہو جائیں گے۔" ایک ماڈرن لڑکے نے اپنی محبوبہ سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس غلطی کو پالے گا کون؟" محبوبہ نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

## دلیل

"وحید سے شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دو بیٹی! تم اس کے ساتھ اچھی زندگی نہیں گزار سکو گی۔ وہ صرف پندرہ ہزار روپے مہینہ کماتا ہے۔" ماں نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن امی! آپ یہ بھی تو سوچیں۔ میاں، بیوی میں محبت ہو تو مہینہ کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔" بیٹی نے پرسوچ انداز میں جواب دیا۔

انشاں غلام۔۔۔ سرجانی ٹاؤن

## نسبت

"اگر یہ کلاک چند منٹ پہلے گرتا تو میرا سر پھٹ جاتا۔" بیوی نے ہراساں ہو کر شوہر سے کہا۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا، یہ کم بخت بہت سست ہے۔" شوہر نے جل کر جواب دیا۔

صائمہ عمران۔۔۔ جوہر ٹاؤن

## واپسی

"ڈارلنگ! میں ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا اور اگر نہ آسکا تو شام تک ضرور آجاؤں اور اگر شام کو بھی نہ آسکا تو سمجھ لینا میں شہر سے باہر چلا گیا ہوں اور اگر میں باہر چلا گیا تو چپراسی کے ہاتھ رقعہ لکھ کر بھجوا دوں گا۔" شوہر نے مسکراتے ہوئے بہت پیار سے اپنی بیگم سے کہا۔

"چپراسی کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے وہ رقعہ آپ کے کوٹ کی جیب سے نکال لیا ہے۔" بیوی نے بھی اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عائشہ غلام۔۔۔ سرجانی ٹاؤن

## زبان سخن

جوش ملیح آبادی نے پاکستان میں ایک بہت بڑے وزیر کو اردو میں خط لکھا۔ وزیر صاحب نے اس کا جواب انگریزی میں ارسال فرمایا۔ جوش نے انہیں جواب الجواب لکھا۔

"جناب والا! میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا تھا لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا۔"

بجی عابد۔۔۔ شادمان ٹاؤن

تنصیر نشاط

## انتہا... ہوگئی

"انتہا" سے اپنے فلمی کیریر کا آغاز کرنے والے ہمایوں سعید نے پچھلے دنوں پھر "انتہا" کردی۔ ایک ماہانہ جریدے کی ٹیم نے ان سے انٹرویو کرنا چاہا۔ وقت مقررہ پر ٹیم تو پہنچ گئی مگر ہمایوں کہیں غائب ہوگئے۔ ناچار ان کی بیگم کو مہمان نوازی کرنی پڑی۔ (مگر کیا پتا ان کی دلی مراد بر آئی ہو۔) اچھا خاصا انٹرویو تو بیگم نے ہی ان کی طرف سے دے ڈالا۔ ساتھ ہی تصویروں کا البم بھی تھما دیا کہ جتنی، جیسی اور جو بھی تصویر چاہیے لے لیں۔ ٹیم نے خوشی خوشی تصویریں سمیٹیں اور اللہ حافظ کہہ کر نکلنے لگے تو بالکل فلمی سین ہوگیا۔ یعنی عین ٹائم پر ہیرو آگیا۔ "ہیرو" نے انٹرویو کرنے والے صاحبان کو "ولن" اور تصویروں کو اپنی "ہیروئن" سمجھا جسے ولن دن دہاڑے "اغوا" کرلے جارہے تھے۔ ہیرو آگے بڑھا۔ تصویریں چھینیں — فائٹنگ (زبانی) کی اور اندر چلے گئے۔ انٹرویو کی خواہاں ٹیم منہ لٹکا کر واپس ہولی۔

ہمایوں سعید کا یہ ری ایکشن ٹیم بھی سمجھنے سے قاصر ہے اور ہم بھی کہ یہ روز بروز بڑھتی شہرت کا خمار تھا یا کوئی خوف۔ مگر کہنا ضروری ہے کہ ہمایوں سعید! آپ کی فلم کا نام "انتہا" تھا "بے انتہا" نہیں۔ ہر عروج کو زوال ہوتا ہے اور آپ نے تو ویسے بھی "صفر" سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ آپ کو تو شہرت بڑی سنبھال کر رکھنی چاہیے اور اگر کوئی ڈر تھا تو جناب! یہ تو "کچھ" کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا نا! ہنثر کہہ خیر!

## کبھی پائل باجے چھن تو کبھی...؟

نزاکت صرف حسن کی وجہ سے ہی نہیں آتی، کبھی کبھی مقبولیت کی وجہ سے بھی آجاتی ہے اور مقبولیت بھی وہ، جسے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی ہوئے ہوں؟ فائزہ حسن کو پہچانتے تو ہوں گے آپ۔ بے باک ڈراموں کی سیریز میں ایک بے باک ڈرامے میں لیڈنگ رول کیا تھا انہوں نے، مگر اس ڈرامے میں لوگوں نے انہیں رحیم شاہ کے گانے کی ماڈل کے طور پر پہچانا تھا۔ اس کے بعد ان کی ڈیمانڈ تو شاید اتنی نہ بڑھی، جتنی انہوں نے اپنی ڈیمانڈ بڑھادی۔ اب سال بھر بعد اسی ڈرامہ ٹیم نے ان سے اپنے نئے پروجیکٹ کے لیے بات کی تو پہلے تو وقت کی قلت کا عذر تراشا۔ پھر پہلے اسکرپٹ میں اپنا رول دیکھنے کی شرط داغ دی۔ نتیجہ... انہوں نے



دوسری "نیلوفر" ڈھونڈلی۔

فائزہ حسن! وہ شعر تو سنا ہوگا آپ نے!

زندگی یوں ہی نہیں آجائے گی بانہوں میں
غم دوراں کے ذرا ناز اٹھاؤ یارو!

سو پہلے اپنی نومولود شہرت کو بلوغت تک پہنچنے تو دیتیں آپ۔ کیونکہ پائل ہمیشہ "چھن چھن" نہیں کرتی، کبھی کبھی گھنگرو ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔

## ٹرینڈ

پچھلے دنوں چست پاجاموں کا فیشن تھا۔ آج کل ڈھیلے پاجاموں کا ہے۔ پچھلے دنوں لہنگے کی ڈیمانڈ تھی۔ آج کل رائٹرز شدید مطلوب ہیں۔ پچھلے دنوں "ضرورت رشتہ" کا اشتہار اخبارات میں دیا جاتا تھا۔ (خاطر خواہ نتائج دیکھے گئے) آج کل یہ اشتہارات ٹی وی پر باقاعدہ پروگراموں کی صورت چلتے ہیں۔ (اس کے نتائج...) پچھلے دنوں... پتا نہیں کیا ہورہا تھا مگر آج کل امریکہ میں شادی کا ٹرینڈ ہے۔ ریما کے میاں بھی پاکستانی نژاد امریکی، بندیا کے بھی۔ ریما کے میاں بھی ڈاکٹر، بندیا کے بھی... نہیں نہیں! الٹا سیدھا مت سوچیں۔ کچھ کچھ مشابہت کے باوجود، کچھ کچھ مختلف بھی ہے۔ ریما کے میاں کا نام طارق شہاب ہے۔ بندیا کے میاں کا نام ظفر ابراہیم۔ ریما کی پہلی شادی ہے۔ بندیا کی دوسری۔ ریما نے اپنی شادی خود کی ہے۔ بندیا کی شادی ان کے اکلوتے شادی شدہ فرزند نے کروائی ہے مگر ایک مطابقت پھر ہوگئی۔ ریما بھی شادی کے بعد شوبز میں ہیں۔ بندیا کے میاں نے بھی ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ لہٰذا امریکی میاؤں کی پاکستانی بیویوں کو آپ ٹی وی پر وقتاً "فوقتاً" دیکھتے رہیں گے۔ یہ سہاگنیں مکمل طور پر پیا دیس نہیں سدھاری ہیں۔

## سی کلاس؟

اکثر بچوں کو کہتے سنا ہے۔ (جب ہم خود بچے تھے، ہم بھی کہتے تھے) "جو کہتا ہے، وہ خود ہوتا ہے۔" تو اس کا مطلب ہے میرا نے جو وینا ملک کو "سی کلاس" اداکارہ کہا ہے تو وہ... انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا ہے۔ انہیں وینا ملک نہ سمجھا جائے۔ (ہم تو وینا کو بھی وینا ملک نہیں سمجھتے۔ وہ تو زاہدہ بی بی ہیں نا۔) وہ انڈیا کی سی کلاس فلموں میں کام کرتی ہے۔ جبکہ یہ اچھی فلموں میں کام کررہی ہیں۔ (اچھی؟ کلاس بتایئے)

"میں ہوں شاہد آفریدی" میں دو منٹ کا آئٹم سونگ کرنے والی منیرا نے کہا ہے کہ میں آئٹم گرل نہیں ہوں۔ میں چھ سال سے شوبز میں ہوں۔ تیزی سے ترقی کی ہے اور میں اپنا مستقبل خود بناتی ہوں۔"

منیرا صاحبہ! اگر آپ اپنا مستقبل خود بناتی ہیں تو "میں ہوں شاہد آفریدی" میں لیڈنگ رول کیوں نہیں کیا؟ صرف آئٹم سونگ کیا' وہ بھی دو منٹ کا؟ جس میں ماہ نور بلوچ بھی شامل ہو گئیں؟ اب پلیز آپ یہ مت کہیے گا کہ "میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں نے معذرت کرلی۔" مزید یہ کہ آپ ماہ نور سے تو ناراض ہو گئیں نہیں جنہوں نے فلم میں لیڈ کرنے کے باوجود آپ کے آئٹم سونگ میں بھی شراکت کرلی۔ ورنہ بے چاری کو بلاوجہ گھسیٹ لیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ماہ نور سے بنا کر رکھنا چاہتی ہوں؟ مگر کچھ بعید نہیں کہ اب ماہ نور بھی بھارت چلی جائیں۔ پھر انہیں وہاں کون سی کلاس ملے گی کسی کو کیا پتا؟ ہمارا خیال ہے یہ "کلاس بندیاں" عوام کو کرنے دیں۔ وہ زیادہ اچھے گریڈ دیتے ہیں۔ آپ صرف "پڑھائی" کریں۔

## اِدھر اُدھر سے

پرویز مشرف نے اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری خود لینے کے بجائے اپنے ماتحتوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مشرف کم از کم اپنے جنرل ہونے کا ہی پاس رکھیں۔ جو کیا ہے سینہ تان کر اسے قبول کریں۔ وہ ہمیشہ کہتے رہے ہیں۔ "کسی سے نہیں ڈرتا۔" اس جملے کا تو احترام کریں۔

(ڈاکٹر ضیاء الدین خان)

اگر آپ مشرف کو سزا نہیں دے سکتے تو پھر طالبان کو دہشت گرد کہنا چھوڑ دیں۔ پھر تو سب کو آئین توڑنے کا حق ہے۔ اگلے چند ماہ بہت اہم ہیں۔ بلوچستان میں آپس میں لڑایا جائے گا۔ کراچی میں قتل و غارت گری بڑھے گی۔ میڈیا کو میڈیا سے لڑایا جائے گا۔

(حامد میر۔ قلم کمان)

ڈی رینجرز ٹارگٹ کلر اور بھتہ خوروں سے متعلق رپورٹ سپریم کورٹ میں جمع کراتے ہوئے عدالت سے درخواست کی کہ اس رپورٹ کو شائع نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس رپورٹ میں ٹارگٹ کلر' بھتہ مافیا اور لینڈ مافیا سے متعلق ان شخصیات کے نام ہیں جو سیاسی وابستگی رکھتے ہیں۔

(بی بی سی نیوز)

کہا جاتا ہے کہ کراچی میں ساری لڑائی اس پر قبضہ کی ہے۔ میرا ایک دوست کہتا ہے کہ قبضے کی تو ہے۔ کراچی وہ مکان ہے جس کے کرایہ دار تو آپس میں خونی لڑائی لڑ رہے ہیں' لیکن مالکان تحیر' تجسس اور دہشت سے گنگ اسے دیکھ رہے ہیں۔

(حسن مجتبیٰ۔ جنگ)

☆



مہوش ڈوگر ـــــــ گوجرانوالہ

ہیں کتنی سازگار زمانے کی تلخیاں
تو ہے تو پُربہار زمانے کی تلخیاں
تم ساتھ ہو تو جانِ وفا میرے واسطے
پھولوں کی رہگزار زمانے کی تلخیاں

سحرش خان ـــــــ بھکر

ملنے آئے ہو چھوڑنے کے لیے
اس تکلف کی کیا ضرورت تھی

بیگم ظفر چوہدری ـــــــ خانیوال

اسے بچا لیا آوارگانِ شام نے آج
وگرنہ صبح کا بھولا تو گھر چلا جاتا

ثمینہ عطاری ـــــــ ڈوگہ گجرات

نہ سنتے ہیں، نہ کہیں دیکھنے میں آیا ہے
جو ہجر و وصل مرے تجربے میں آیا ہے
نئے سرے سے جل اٹھی ہے پھر پرانی آگ
عجیب لطف تجھے بھولنے میں آیا ہے

مسز شازیہ اعجاز ـــــــ ڈوگہ گجرات

نہ سوچتے تھے جو دیوار و در بدلنے تک
وہ لوگ ہو گئے تیار گھر بدلنے تک
کمال اس نے کیا اور میں نے حد کر دی
کہ خود بدل گیا اس کی نظر بدلنے تک

عذرا ناصر ـــــــ کراچی

ستارہ خوبصورت ہے کہ ذرہ خوبصورت ہے
ابھی یہ فیصلہ ہونے کو ہے کیا خوبصورت ہے
یہ مانا عشق کی تقدیر میں ہجرت نہیں کوئی
مگر یہ بھی تو دیکھو، کام کتنا خوبصورت ہے

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

ان سے ملنے کا کیا سوال عدم
وہ سدا میرے پاس ہوتے ہیں

نمرہ اقرا ـــــــ کراچی

مسافر کو جو جنگل سے نکالے
وہ پگڈنڈی، وہ رستہ چاہیے ہے
شعور ابھی تک اسی شے کی کمی ہے
وہ جو چاہیے تھا، وہ چاہیے ہے

آمنہ اُجالا ـــــــ ڈہرکی

اسے کہنا سدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
سبھی پتے بکھرتے ہیں ہوا جب رقص کرتی ہے

رضوانہ شکیل راؤ ـــــــ لودھراں

خوش مزاجی بھی مشہور تھی اب سادگی بھی کہاں ہے
ہم شریر بھی انتہا کے تھے اب سنجیدگی بھی کمال ہے

نوشابہ منظور ـــــــ بھیر یارو ڈ

یہ عجیب ہے محبت، زمانہ جانتا ہے
نہ میں اس کی مانتا ہوں نہ وہ میری مانتا ہے
کوئی جا کے اس سے پوچھے اسے کیا ملا بچھڑ کے
میں بھی خاک چھانتا ہوں وہ بھی خاک چھانتا ہے

عائشہ رانجھا ـــــــ ڈسکہ

نہ زمیں ہے میری قرار گاہ، نہ فلک ہے منزلِ جذب و دل
بڑی دیر سے ہے سفر میرا، تیری یاد سے تیری یاد تک

صفیہ کوکب گوندل ـــــــ اسلام آباد

تم وہ نہیں ہو جن سے وفا کی امید ہے
تم سے میری مراد زمانہ ہے اور نہیں
نیند کا رتجگوں سے الجھنا یونہی نہیں
اک خوابِ رائیگاں کو بچانا ہے اور بس

کوثر خالد ـــــــ جڑانوالہ

ہمت نہ ہار ایک ہی قدم کا فرق ہے
کانٹوں کی وادیوں سے گلوں کے دیار تک

# دستک دستک دستک

شاہین رشید

## مشی خان

"کیسی ہیں؟"

"الحمدللہ"

"آپ نے کافی ڈراموں میں کام کیا ہے مگر لوگ ابھی تک آپ کو "عروسہ" کے حوالے سے ہی جانتے ہیں۔ وجہ؟"

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم، لیکن واقعی یہ حقیقت ہے کہ لوگ آج تک مجھے عروسہ کے حوالے سے ہی جانتے ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ اس وقت ایک ہی ٹی وی چینل ہوتا تھا اور جو راتوں رات شہرت حاصل کرتا تھا پھر وہی کردار اس کی شناخت بن جاتا تھا؟"

"جی میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس زمانے میں بجیا اور حسینہ معین دونوں کے ہی مرکزی کردار بہت شہرت حاصل کرتے تھے۔"

"اور آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس دو تین سیریلز ہیں جن پر کام ہو رہا ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ کب مکمل ہوں گے۔ بس جب مکمل ہوں گے سب کو پتا چل جائے گا۔"

"پہلے زمانے میں شہرت آسانی سے ملتی تھی یا اب؟"

"میرے خیال میں شہرت حاصل کرنا کسی زمانے میں بھی آسان نہیں رہا۔ اچھا کام آج کے دور میں بھی ناظرین کو فوری طور پر کلک کرتا ہے اور اس زمانے میں بھی۔ بس کام اچھا ہو۔ پرفارمنس میں جان ہو تو لوگ فوراً ریسپانس دیتے ہیں۔"

"عروسہ کے بعد شاید ایک دو ڈراموں میں کام کیا اور پھر غائب۔ وجہ؟"

"وجہ یہ تھی کہ میں اپنی شہرت کو برقرار رکھنا چاہتی تھی اور گیپ دینا چاہتی تھی اس لیے میں نے ایرلائن جوائن کر لی تھی بس جب وہاں سے دل بھر گیا تو واپس فیلڈ میں آگئی۔"

"گزشتہ دنوں آپ کے دو سیریلز "جنت سے نکالی گئی عورت اور سات پردوں میں" دیکھا۔ آپ بہت دبلی ہو گئی ہیں۔ وجہ؟"

"ہاں۔ میں واقعی بہت دبلی ہو گئی ہوں کیونکہ میں نے اسمارٹ رہنے کے لیے کافی ایکسرسائز اور ڈائٹنگ کی ہے اور میرے خیال میں ایک آرٹسٹ کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسمارٹ اور فٹ رکھے۔"

"فیلڈ کون سی اچھی لگی۔ شوبز کی یا ایرلائن کی؟"

"ایرلائن کی فیلڈ نے مجھے بچپن سے ہی بہت متاثر کیا ہے، جب کم سن تھی اور پھر جب طالبہ تھی تو خواب دیکھا کرتی تھی کہ میں پائلٹ بنوں، دنیا بھر کی سیر کروں اور جہاز بھی اڑاؤں مگر ایسا ہو نہیں ہو سکا۔ تو پھر بحیثیت ایئر ہوسٹس کے ایرلائن جوائن کی۔ جہاز اڑانے کی خواہش تو پوری نہیں ہوئی۔ مگر دنیا دیکھنے کی خواہش ضرور پوری ہو گئی۔"

"کتنی دنیا دیکھی۔ کون سا ملک بہت پسند آیا؟"

"تقریباً" آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ چکی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ سیر و سیاحت سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ہر ملک کے طور طریقے اور رہن سہن کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یوں تو پوری دنیا ہی ماشاءاللہ بہت خوب صورت ہے مگر مجھے اٹلی کا شہر روم بہت پسند آیا۔"

"سوال ادھورا رہ گیا کہ فیلڈ کون سی اچھی ہے؟"

"تو۔ ہاں۔ اداکاری نے مجھے شہرت دی اور دے رہی ہے اس لیے شوبز میری پسندیدہ فیلڈ ہے اور اسے چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ حالانکہ میں بغیر کسی ارادے کے اس فیلڈ میں آئی ہوں۔"

"گلوکاری کہاں تک پہنچی؟"

"ابھی تو رکی ہوئی ہے۔ اس گاڑی کو بھی ان شاءاللہ آگے لے کر جانا ہے اور ابھی تو اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائے تو سب کام ہو جائیں گے۔"

"گلوکاری بھی کر لی، ہوسٹنگ بھی کر لی، ایرلائن میں بھی کام کر لیا، اداکاری جاری ہے۔ ایک اور کام بھی تو ہے جو لڑکیوں کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے؟"

قہقہہ۔ "وہ کام۔ بلکہ سب کام اوپر والا کرتا ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں، زمین پر ملتے ہیں تو جب نصیب میں ہو گا ہو جائے گی۔"

"اکیلے پن کا احساس ہوتا ہے؟"

"نہیں۔ کیونکہ میں بہت خوش ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت سی نعمتوں سے نوازا ہوا ہے جس کا جتنا شکر ادا کروں اتنا کم ہے۔"

"کچھ اپنے مشہور ڈراموں کے نام بتائیں؟"

"عروسہ تو ہے ہی۔ "تنہا" "عجائب خانہ" "بارش کے بعد" "سات پردوں میں" "جنت سے نکالی گئی عورت" "خالہ خیرن" "سمندر ہے درمیان" "زہر" "شہر دل" "برت اور سون سون" زیادہ قابل ذکر ہیں۔"

"شکریہ مشی! اتنا ٹائم دینے کا۔"

## محمد علی سومرو

"کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"ریڈیو ٹی وی کی مصروفیات جاری ہیں؟"

"جی بالکل جاری ہیں۔"

"ماشاء اللہ بیک وقت کئی زبانیں بول لیتے ہیں۔ لوگوں سے کمیونیکیٹ کرنے میں مشکل تو پیش نہیں آتی ہوگی؟"

"نہیں جی۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ جس زبان کا جو بندہ ملتا ہے اس سے اسی زبان میں بات کرتا ہوں۔"

"زبان سیکھنے سے آتی ہے یا بولنے سے آتی ہے؟"

"میرا اپنا تجربہ تو یہ کہتا ہے کہ زبان بولنے سے آتی ہے اور پھر ماحول مل جائے تو اور بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ کالج میں میرے دو عدد پنجابی دوست تھے ان سے پنجابی سیکھی اور شروع سے ہی میری عادت رہی کہ جو بھی جس زبان کا دوست ہوتا ہے اس سے میری گزارش ہوتی ہے کہ آپ اپنی زبان میں بات کریں اور میں کوشش کروں گا کہ آپ کی زبان میں بات کر دں اور اگر میں اردو میں بھی جواب دوں تو آپ اپنی ہی زبان میں گفتگو کریں۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ آپ سیکھتے جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ آپ نشست لگائیں اور باقاعدہ کاغذ قلم لے کر بیٹھیں کہ جی مجھے سکھائیں۔ میرے نزدیک یہ مشکل کام ہے۔"

"اور یہ جو لینگویج سینٹر کھلے ہوتے ہیں کہ اتنے مہینے میں فر فر انگریزی بولنا سیکھیں۔ کیا فائدہ مند ہیں؟"

"میرا نہیں خیال کہ ان کا کوئی بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہوگا' میں جب انگریزی پڑھاتا تھا تو میں اپنے طالب علموں سے کہتا تھا کہ دو کتابیں میں آپ کو دے دوں گا۔ اس سے آپ زندگی بھر انگریزی سیکھتے رہیں گے۔ مگر یہ دو کتابیں کبھی بھی آپ کو زبان کی روانی نہیں سکھائیں گی۔ زبان کی روانی کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایک دوسرے سے انہی کی زبان میں بات کریں۔"

"آپ سندھی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں تو گھر میں سندھی ہی بولتے ہوں گے؟"

"جی بالکل! گھر میں سندھی ہی بولی جاتی ہے۔ آپس میں ہم اردو بالکل بھی نہیں بولتے۔ لیکن گھر سے باہر کوشش کرتا ہوں کہ اردو ہی بولوں اور بہتر اردو بولوں۔ ویسے صرف زبانوں سے ہی لگاؤ نہیں ہے بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میوزک سے لگاؤ تھا۔ کالج میں مختلف سوسائٹیز بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ جیسے اسپورٹس سوسائٹی' ادبی سوسائٹی۔ ان سب کو جوائن کیا۔ شطرنج کھیلنا اچھا لگا اور ابھی بھی کھیلتا ہوں۔ ساری بات ماحول کی ہوتی ہے اور ماحول ایسا ہو تو آگے بڑھنے کے چانس بھی ملتے رہتے ہیں۔"

"بے شک' مگر انسان کے اندر کی صلاحیت اسے اکساتی ہے ایسا کرنے پر اور یہ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن اگر ہم بچوں کے لیے ان کے بچپن سے ہی ایسا ماحول سیٹ کر دیں تو میرا خیال ہے کہ بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور کچھ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ بچوں کے رجحان پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ جس فیلڈ میں ان کا رجحان ہو اس میں انہیں آگے دیا جانا چاہیے۔"

"آپ ریڈیو ایف ایم اپنا کراچی 107 سے وابستہ ہیں۔ ہج نیوز میں بھی لوگ آپ کو دیکھتے ہوں گے اور پہچان بھی لیتے ہوں گے۔ یہ سب کچھ کیسا لگتا ہے شہرت اچھی لگتی ہے؟"

"جی بالکل۔۔۔ شہرت کس کو اچھی نہیں لگتی اور بالکل پہچان لیتے ہیں لوگ' میرا ایک مخصوص حلقہ احباب ہے اور میں ان کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے یہ شوق نہیں ہے کہ میں مارکیٹ اس لیے جاؤں کہ لوگ مجھے دیکھیں اور پہچان لیں اور میری تعریف کریں۔ میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اتنی عزت دی ورنہ میں تو اس لائق نہیں تھا۔"

"نیوز چینل میں اور ایف ایم 107 میں اب کیا ذمہ داریاں ہیں آپ کی؟"

"ہج ٹی وی میں اگر مجھے اپنی صلاحیتیں دکھانے کا بھرپور موقع ملا اور شکر الحمد اللہ کہ مجھے قدر کرنے والے لوگ ملے۔ جنہوں نے میری صلاحیتوں کو سمجھا اور اسی لیے انہوں نے مجھے انٹرنیشنل ہیڈ کوارٹر کی ذمہ داریاں سونپ دی ہیں' جس پر میں ہج ٹی وی والوں کا انتہائی مشکور ہوں اور جہاں تک ایف ایم 107 کی بات ہے تو میں تقریباً" ڈیڑھ سال سے اسلام آباد میں ہوں تو ریڈیو براڈ کاسٹنگ سے دور ہو گیا ہوں۔ جس کی مجھے خود بھی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ ایف ایم 107 سے میرا رشتہ تقریباً" دس سال پرانا ہے اور جو ماحول ایف ایم 107 کا ہے میں سمجھتا ہوں کہ کسی ریڈیو اسٹیشن کا ایسا اچھا ماحول نہیں ہے۔"

"آپ ایف ایم 107 سے دور ہیں تو آپ نے کسی اور ایف ایم کو جوائن کرنے کا سوچا؟"

"نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ایف ایم کے دوستوں اور استادوں خاص طور پر میرے محسن "اجنبی" کے کہ آج بھی میں ایف ایم 107 کا حصہ ہوں۔ جس کی وجہ سے میرے قدم کسی اور ایف ایم کی طرف اٹھتے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے سوچا بھی ہے کہ جب بھی کراچی گیا' ضرور پروگرام کروں گا ان شاء اللہ۔"

"یقیناً"۔ یہ بتائیں کہ شادی کب کر رہے ہیں؟"

"شادی؟ بس جی جلدی ہو جائے گی۔ منگنی ہو گئی ہے۔ شادی ان شاء اللہ 2014ء میں ہو جائے گی۔"

"اچھا گڈ۔۔۔ آپ کی پسند سے ہوئی ہے منگنی؟"

"آپ کو یاد ہو گا کہ ایک بار میں نے آپ سے کہا تھا کہ شادی والدین کی مرضی سے کروں گا۔ یہ شعبہ مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں رہا ہوا ہے۔ تو میری منگنی میری پھپھو کی بیٹی سے ہوئی ہے' تو ظاہر ہے جانتا تو ہوں۔ اکثر ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔"

"او۔۔۔ اچھا۔۔۔ اب تو راستہ مزید صاف ہو گیا ہو گا؟"

"یہی تو ایک دلچسپ بات ہے۔ جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جب تک منگنی نہیں ہوئی تھی' بحیثیت کزن' اکثر بات چیت ہو جاتی تھی لیکن جب سے منگنی ہوئی ہے' نہ ہماری بات چیت ہوتی ہے اور نہ ہی ملاقات۔"

"کیوں؟"

"ہمارے یہاں مشرقی روایات کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ بس ان ہی روایات کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے اور میں کبھی پھپھو کے گھر جاؤں تو وہ مجھ سے پردہ کر لیتی ہے۔"

"آپ کو اچھا لگتا ہے یہ سب کچھ؟"

"بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت لطیف سا احساس ہوتا ہے۔ شادی تو ہونی ہی ہے۔ اگر مشرقی روایات کے ساتھ ہو تو کیا کہنے۔"

"واہ کیا بات ہے۔ آپ آج ایک کامیاب انسان ہیں۔ اپنے جیسے نوجوانوں کو کچھ کہنا چاہیں گے کامیابی کے لیے کچھ کر بتانا چاہیں گے؟"

"بالکل۔۔۔ میں اپنے ساتھی نوجوانوں سے کہنا چاہوں گا کہ اگر راستہ صحیح ہو اور ہمت اور لگن ہو تو منزل خود بخود قریب ہو جاتی ہے مگر چور راستے سے یا شارٹ کٹ کرنے والے ہمیشہ منزل سے دور ہو جاتے ہیں اور میں نے کبھی بھی اپنی ہمت اور لگن کو تھکنے نہیں دیا۔ اسی لیے مجھ پر میرے رب کا بہت کرم ہے کہ آج میں ایک کامیاب زندگی گزر رہا ہوں۔"

سرورق کی شخصیت

| | |
|---|---|
| ماڈل | شیزا |
| میک اپ | روز بیوٹی پارلر |
| فوٹو گرافر | موسیٰ رضا |

امتہ المصور

## حضرت سلیمانؑ اور بلقیس کا واقعہ

جب حضرت سلیمانؑ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بیت المقدس سے یمن جارہے تھے تو آپ کا راستے میں وادی نمل یعنی چیونٹیوں کے لشکر پر سے گزر ہوا۔ حضرت سلیمان کے لشکر کو پیاس لگی اور انہوں نے آپ سے پانی مانگا۔ آپ نے پانی کا پتا پوچھنے کے لیے ہدہد کو بلایا۔ اس وقت پرندوں کا بادشاہ کلنگ موجود تھا۔ حضرت سلیمان نے اس سے ہدہد کے بارے میں پوچھا۔ کلنگ نے عرض کیا۔

"معلوم نہیں ہدہد کہاں گیا اور مجھ کو بتا کر بھی نہیں گیا۔"

پانی کا نشان بتانا ہدہد کے ذمے تھا۔ پانی خواہ زمین کی تہ میں کسی بھی جگہ پر ہوتا۔ ہدہد اپنی چونچ زمین پر رکھ دیتا جس سے حضرت سلیمان کو پتا چل جاتا کہ یہاں پانی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ پانی نکالنے کے لیے زمین کو کس قدر کھودنا پڑے گا۔ ہدہد اس علم کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرے پرندے اس سے واقف نہ تھے۔ جب حضرت سلیمان ہدہد سے پانی کا پتا پوچھتے تھے تو وہ پہلے ہوا میں بلند اڑتا پھر یہ معلوم کرکے کہ پانی فلاں جگہ ہے۔ اس جگہ نیچے اترتا اور اپنی چونچ کی نوک زمین پر لگا دیتا۔ تب حضرت سلیمان جنوں کو حکم دیتے اور وہ اس جگہ کو کھود کر پانی نکال لیتے' یہاں تک کہ حوض اور چشمے اس سے بھر لیتے' مشکیں بھی بھری جاتیں' جن' آدمی' چوپائے غرض جو بھی لشکر میں ہوتا سیر ہو کر پانی پی لیتا پھر یہ سب کوچ کر دیتے۔

جب سلیمان علیہ السلام کے لشکر کو پیاس لگی اور ہدہد کا پتہ پوچھنے پر اس کی کچھ خبر نہ ملی تو سلیمان علیہ السلام کو اس پر سخت غصہ آیا اور آپ نے فرمایا۔

"میں اسے سخت سزا دوں گا۔ یعنی میں اس کے پر اکھاڑ دوں گا۔ وہ ایک سال تک نہ اڑ سکے گا' یا اسے ذبح کر دوں گا۔"

آپ نے اپنی قسم میں استثنا بھی کر دیا۔ (یعنی معافی کی گنجائش بھی رکھ دی) اور فرمایا۔

"اگر ہدہد نے اپنی غیر حاضری کے بارے میں کوئی معقول وجہ بیان نہ کی تو اس کا جرم ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔"

حضرت سلیمان کا یہ طریقہ تھا کہ جب کسی پرندے کو سزا دینا چاہتے تھے تو اس کے پر اکھاڑ دیتے۔

ہدہد تھوڑی دیر بعد آگیا تو اس کے ساتھیوں نے اسے بتایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس پر سخت ناراض ہیں اور اسے سخت عذاب دینے کا حکم دیا ہے۔

تب ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں دعا کی "اللہ آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے اور دیر تک بادشاہی قائم رکھے۔" پھر اس نے اپنی چونچ زمین پر رکھ کر اسے کریدنا شروع کیا۔ ساتھ ہی سر سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتا رہا پھر عرض کیا۔

"میں نے ایک ایسی جگہ کی سیر کی ہے جہاں آپ ابھی تک نہیں گئے۔ میں نے وہاں ایک ایسی چیز دیکھی ہے جس کا آپ کو بھی علم نہیں۔" ہدہد کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک ایسی خبر لایا ہوں جو آپ کو جنوں نے بھی نہیں دی۔ انسانوں کو بھی اس کا کچھ علم نہیں۔ میں آپ کے پاس شہر سبا سے ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا "وہ کیا خبر ہے؟" ہدہد نے کہا۔

"میں نے وہاں ایک عورت کو دیکھا جو سبا پر حکومت کرتی ہے اس کا نام بلقیس ہے اور وہ سراح حمیریہ کی لڑکی ہے۔ اسے ہر چیز میسر ہے یمن اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں پر حکومت کرتی ہے۔ بڑے جاہ و جلال کی مالک ہے۔ اس کے پاس بے شمار فوج اور گھوڑے ہیں۔ اس کے جلوس کا تخت عظیم الشان ہے۔ تیس گز اور بعض بیانات کے بموجب اسی گز اونچا ہے۔ اسی گز ہی چوڑا ہے۔ جواہرات' مروارید اور موتیوں سے مرصع ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ بلقیس اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کی پرستش کرتی ہے' جو مجوسیوں کا دین ہے۔ بلقیس اور اس کے لشکر کو شیطان مردود نے گمراہ کر رکھا ہے۔ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے' حالانکہ پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنے والا وہی ہے' وہی زمین و آسمان کے بھید جانتا ہے' ہر پوشیدہ بات سے باخبر ہے' جو کچھ زبان سے کہا جاتا ہے کہ سکتا ہے' آسمان معظم پر رہنے والے اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔"

یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے کہا "تم پانی کا پتا بتاؤ" اس اثنا میں میں تمہاری بات کا سچ جھوٹ معلوم کرتا ہوں۔"

ہدہد نے پانی کا پتا بتایا۔ جب سب نے سیر ہو کر پانی پی لیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو بلا کر بلقیس کے نام ایک خط اسے دیا۔ اس پر مہر لگی تھی اور ہدہد کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"اسے بلقیس کے پاس لے جاؤ' اس کے سامنے پھینک کر انتظار کرو کہ وہ کیا جواب دیتی ہے۔" اس خط میں حضرت سلیمان نے لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ حکم نامہ داؤد کے بیٹے سلیمان کی طرف سے ہے۔

میرے مقابلہ میں اپنے آپ کو تم بڑا نہ سمجھو۔ مسلمان ہو کر میرے پاس آجاؤ اور میری اطاعت کرو۔ اگر تم جن ہو تو میری غلام بن جاؤ اور اگر انسان ہو تو میری فرماں برداری کرو! میرے حکم کی بجا آوری اپنے اوپر لازم کر لو۔"

جب ہدہد یہ فرمان لے کر بلقیس کے شہر سبا میں گیا تو دوپہر کا وقت تھا۔ بلقیس اپنے محل کے تمام دروازے بند کیے خواب استراحت کر رہی تھی۔ کوئی شے اس تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ دروازوں اور محل کے ارد گرد پاسبان مقرر تھے۔ اس کی قوم میں بارہ ہزار جنگ جو افسر اور سپہ سالار تھے۔ ہر افسر کے ماتحت ایک لاکھ فوج تھی۔ یہ فوج ان کی عورتوں اور اولادوں کے علاوہ تھی۔

بلقیس کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو ایک دن کے لیے باہر آتی۔ اپنے مرصع تخت پر بیٹھ کر قوم کے سارے معاملات کا خود فیصلہ کرتی۔ اس کا تخت سونے کے چار ستونوں پر بنایا گیا تھا۔ وہ اس پر اس طرح بیٹھتی کہ سب کو دیکھ سکتی تھی۔ مگر اسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ جو شخص عرض کرنا چاہتا' وہ تخت کے سامنے آکر سجدہ کرتا۔ تعظیم کی یہ کیفیت تھی کہ جب تک بلقیس خود سر اٹھانے کی اجازت نہ دیتی' وہ سر نہ اٹھا سکتا۔ جب اس کی دادرسی ہو جاتی تو بعد میں ملکی امور کے بارے میں احکام صادر کرتی پھر محل میں واپس چلی جاتی اور اس تمام وقت میں کوئی اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ ایک وسیع مملکت اس کے قبضہ میں تھی۔

چنانچہ ہدہد جب وہاں پہنچا تو سارے دروازے بند پائے۔ محل کے ارد گرد پہرے دار تھے ــــــ وہ اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک سوراخ نظر آیا' اس میں سے گزر کر ایک دور جہ طے کیا' اسی طرح سات درجے طے کرنے کے بعد بلقیس کے تخت کے پاس پہنچا۔ جو تیس گز اونچا تھا۔ وہ اس پر چت لیٹی تھی۔ صرف ایک چادر نے اس کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے سونے کا یہی معمول تھا۔

ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے فرمان کو تخت کے کنارے پر رکھ دیا اور خود سوراخ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ تاکہ جواب لے جائے۔ خاصی دیر انتظار کرتا رہا۔ مگر بلقیس بیدار نہ ہوئی۔ آخر ہدہد آگے بڑھا اور اپنی نوک سے جگایا۔

جاگنے پر اس نے پہلو میں رکھا خط دیکھا۔ آنکھیں ملیں اور اسے پڑھنے لگی۔ پھر غور کرنے لگی کہ یہ کس طرح یہاں پہنچا۔

کیونکہ سب دروازے بند تھے اور محل کے ارد گرد پہرہ تھا۔ باہر آکر دیکھا تو پہرے دار محل کے گرد ہوشیار موجود تھے۔ اس نے ان سے پوچھا۔

"تم نے کسی شخص کو میرا خاص دروازہ کھولتے یا

اندر آنے دو کہا؟"

انہوں نے جواب دیا "کہ ہم بہ دستور پہرہ دیتے رہے ہیں۔ محل کے تمام دروازے بند ہیں۔"

بلقیس پڑھی لکھی تھی۔ چنانچہ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا حکم نامہ پڑھا۔ اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تھا۔ فرمان پڑھنے کے بعد اس نے اپنی قوم کے بزرگوں اور امیروں کو بلایا اور کہا۔

"میرے پاس ایک بزرگ کا خط پھینکا گیا ہے۔ جس پر مہر لگی ہے۔ یہ نامہ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے آیا ہے اور اس پر بسم اللہ لکھی ہے تم مجھ سے سرکشی نہ کرو' میری فرماں برداری کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس چلے آؤ۔ تم لوگ میری قوم کے معزز اور بزرگ ہو' مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔ جب تک تم مشورہ نہ دو گے میں کوئی اور کام نہ کروں گی۔"

انہوں نے جواب دیا "ہم لوگ بڑے بہادر اور عزت دار ہیں۔ کوئی دشمن ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا جہاں تک رائے کا تعلق ہے آپ خود دانا ہیں ہم تو حکم کے بندے ہیں جو آپ کا حکم ہوگا۔ ہم حاضر ہیں۔"

بلقیس نے اس بارے میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کے بعد کہا۔

"جب بادشاہ مخالفت کے باعث کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس ملک کو برباد کر دیتے ہیں۔ ملک کے معززین اور شرفا کو ذلیل کرتے ہیں۔ لڑائی کے بعد اگر فتح پائیں تو لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ مقابلہ کرنے والوں کو قتل کر دیتے ہیں' ان کی اولاد کو قیدی بنا لیتے ہیں۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ تحفے تحائف دے کر اپنے آدمی سلیمان کے پاس بھیجوں اور دیکھوں کہ وہ کس طرح واپس آتے ہیں۔ اور کیا خبر لاتے ہیں۔"

بلقیس نے تحفے دے کر قاصدوں کو سلیمانؑ کے پاس بھیج دیا۔ تحفوں کی تفصیل یہ تھی۔

بارہ غلام بھیجے گئے جو سب بے ریش تھے۔ اور ان میں عورتوں کی سی صفات پائی جاتی تھیں۔ ان کی آواز بھی عورتوں جیسی تھی۔ ان کے اعضا نرم تھے۔ عورتوں کی طرح ہاتھوں میں مہندی لگائی تھی۔ عورتوں کی طرح مانگ نکالے اور کنگھی پٹی کیے ہوئے تھے۔ پوشاک بھی عورتوں کی سی تھی۔

بلقیس نے انہیں ہدایت کر دی تھی کہ جو کچھ پوچھا جائے اس کا جواب عورتوں ہی کی مانند دینا۔

غلاموں کے علاوہ بارہ کنیزیں بھی تھیں۔ جن کی آواز مردوں کی طرح بھاری' اعضاء قوی' سروں کے بال تراشے ہوئے اور مردوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ انہیں بھی تاکید کر دی گئی تھی کہ سلیمان کے دربار میں جو بات پوچھی جائے' اس کا جواب بے خوف ہو کر دینا خدمت گاروں کے ہاتھ میں مشک عود اور عنبر سے بھرے ہوئے طباق تھے۔ دودھ دینے والی بارہ اونٹنیاں تھیں۔ دو عدد خرمہرے یعنی کوڑیاں تھیں۔ ان میں ایک کوڑی میں پیچ در پیچ سوراخ تھا۔ ایک خالی پیالہ بھی روانہ کیا۔

ایک ایسی عورت بھی ساتھ کر دی' جسے سمجھا دیا گیا کہ سلیمان علیہ السلام سے جو بات چیت ہو گی اسے اچھی طرح یاد کر لینا۔ پھر آ کر مجھ سے بیان کرنا۔

غلام اور لونڈیوں کو حکم دیا کہ سلیمان کے حضور مودب ہو کر کھڑے رہنا۔ جب وہ بیٹھنے کے لیے حکم دیں تب بیٹھنا۔ اگر وہ جابر بادشاہ ہوں گے تو تمہیں بیٹھنے کا حکم نہیں دیں گے۔ تب ہم مال دے کر ان کو راضی کر لیں گے۔ پھر وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ اگر بردبار' دانا اور عالم ہوں گے تو تم کو بیٹھنے کا حکم دیں گے۔

قافلہ کی امیر عورت کو ہدایت کر دی تھی۔

"تم سلیمان علیہ السلام سے کہنا سوراخ دار کوڑی میں دھاگہ پرو دیں اور اس مقصد کے لیے کسی جن یا آدمی کی مدد نہ لیں اور جو بے سوراخ ہے۔ اس میں لوہے جن یا انسان کی مدد کے بغیر سوراخ کریں۔ ان سے یہ بھی کہنا کہ لونڈیوں اور غلاموں میں تمیز کر کے بتائیں اور خالی پیالہ کو ایسے کف دار پانی سے بھر دیں جو زمین کا ہو نہ آسمان کا۔" ان امور کے علاوہ بلقیس نے سلیمانؑ کے نام ایک خط بھی روانہ کیا جس میں کئی سوال بھی لکھے تھے۔



قاصد یہ تحفے لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔ تحفے پیش کر کے سب با ادب کھڑے ہو گئے۔ حضرت سلیمان نے ان تحفوں کو دیکھا۔ مگر اپنی جگہ سے مطلق جنبش نہ کی نہ ہاتھ پاؤں ہلائے۔ یعنی اس ہدیہ کی کوئی پروا نہ کی نہ اس کے بارے میں خوشی کا اظہار کیا نہ انہیں خفیف یا حقیر ظاہر کیا۔

قاصدوں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ تحفے دیکھ کر سلیمان کو نہ خوشی محسوس ہوئی اور نہ انہوں نے حقارت ظاہر کی ہے نہ ہی کوئی توجہ دی ہے' جس سے ظاہر ہو کہ انہوں نے تحفے قبول کر لیے یا نہیں۔

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے سر اٹھایا اور قاصدوں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

"زمین اور آسمان سب اللہ کا ملک ہے۔ اللہ نے آسمانوں کو بلند کیا اور زمین کو بچھایا۔ تاکہ جو اس پر کھڑا ہونا چاہے کھڑا ہو جائے جو بیٹھنا چاہے بیٹھ جائے۔"

اس کے بعد قافلہ کی امیر عورت آگے بڑھی اور دونوں کوڑیاں جو ساتھ لائی تھی ان کی خدمت میں پیش کر کے عرض کی کہ آدمیوں اور جنوں کی مدد کے بغیر سوراخ دار کوڑی میں دھاگہ پرو دیں کہ وہ دوسری طرف نکل جائے اور دوسری کوڑی میں جو سوراخ کے بغیر ہے کسی آدمیوں' جنوں اور کسی لوہے کے آلہ کے بغیر آر پار سوراخ کر دیں۔"

پھر اس نے پیالہ پیش کیا اور کہا کہ بلقیس کی درخواست ہے۔ اس پیالہ کو کف دار میٹھے پانی سے بھر دیجیے۔ مگر وہ پانی جو نہ آسمان کا ہو نہ زمین کا۔

بعد ازاں غلاموں اور لونڈیوں کو پیش کیا اور عرض کیا کہ بلقیس نے کہا ہے کہ ان لونڈیوں اور غلاموں کو الگ الگ کر دیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملک کے بزرگوں کو بلایا اور پوچھا "تم میں کوئی ہے جو اس کوڑی میں دھاگہ پرو دے کہ وہ دائیں سے ہو کر بائیں طرف نکل جائے۔"

ایک کیڑا جو رطب میں رہتا ہے اور اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے' بولا "میں اس کام کو کر سکتا ہوں' بشرطیکہ آپ میرے لیے روزی مقرر کر دیں۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ "کر دوں گا چنانچہ کیڑے نے دھاگہ اپنے سر سے لپیٹ لیا اور کوڑی میں سوراخ کرتا ہوا گھسا اور اسے کرید کر بائیں طرف نکل آیا۔

اس خدمت کے عوض حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی روزی مقرر کر دی۔

پھر آپ نے دوسری کوڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ "لوہے کے آلہ کے بغیر اس میں کون سوراخ کر سکتا ہے" ایک سفید رنگ کے کیڑے نے جو لکڑی میں رہتا ہے۔ سر اٹھایا اور کہا۔

"اے بادشاہ! اس خدمت کو میں سر انجام کروں گا بشرطیکہ آپ لکڑی میں میری روزی مقرر کر دیں۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا "مجھے منظور ہے" چنانچہ وہ کیڑا کوڑی سے لپٹ گیا اور برمے کی طرح اس میں سوراخ کرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے عوض اس کی روزی لکڑی میں ہی مقرر کر دی۔

تب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے عربی گھوڑے منگوائے اور حکم دیا انہیں میدان میں دوڑاؤ۔ جب وہ دوڑتے دوڑتے تھک گئے اور پسینہ پسینہ ہو گئے تو آپ نے فرمایا۔ "اس خالی پیالہ کو ان گھوڑوں کے پسینہ سے بھر دو۔" چنانچہ وہ پیالہ ان گھوڑوں کے پسینہ سے بھر دیا گیا۔ آپ نے فرمایا۔

"کف دار میٹھا پانی جو نہ زمین کا ہے نہ آسمان کا' وہ یہ ہے۔"

پھر فرمایا۔ "پانی لاؤ اور خدمت گاروں سے کہو کہ وضو کریں تاکہ غلام اور لونڈی میں تمیز ہو جائے۔"

پانی لایا گیا۔ پہلے عورتوں نے ہاتھ دھونے شروع کیے' ہر ایک اپنے بائیں ہاتھ میں پانی کا برتن پکڑتی اور اس میں سے اپنی دائیں ہتھیلی پر پانی ڈال کر اپنا بایاں بازو دھوتی۔ پھر اسی طرح داہنے ہاتھ میں پکڑ کر داہنا بازو دھوتی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ لونڈیاں ہیں۔ انہیں آپ نے ایک طرف کر دیا۔

اس کے بعد خدمت گار اپنے ہاتھ دھونے لگے۔ انہوں نے پہلے داہنا ہاتھ دھویا اس کے بعد بایاں۔ جس سے پتا چل گیا کہ یہ غلام ہیں۔ آپ نے ان کو بھی الگ کردیا۔ وہ سب تعداد میں بارہ تھے۔

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے سوالات پر غور و فکر کرکے ان کے ایک ہزار جواب لکھ دیے۔ یہ جوابات اور ہدیے قاصدوں کو واپس دیے اور کہا۔

"کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو یاد رکھو جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے یعنی بادشاہی اور پیغمبری یہ نعمتیں تمہارے مال سے کئی درجہ بہتر ہیں۔ تمہارے ہدیے تمہیں خوش کرسکتے ہیں مجھے نہیں۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے نام خط لکھ کر ہدہد کو دیا کہ اسے پہنچا دے۔ اور کہہ دے کہ "ہمارے پاس زبردست لشکر موجود ہیں۔ ہم ان ہی کے ساتھ تم پر چڑھائی کریں گے اور تمہارے آدمی ہرگز ہمارے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیں گے۔ ہم انہیں ملک سے نکال کر ذلیل و خوار کریں گے اور وہ ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں گے۔"

ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا نامہ بلقیس کو پہنچا دیا۔ اس اثنا میں قاصد بھی واپس پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے جو کچھ وہاں دیکھا بلقیس سے بیان کردیا۔ سلیمان علیہ السلام کا جواب بھی بلقیس کو نکال کر دکھا دیا۔ تب بلقیس نے اپنے آدمیوں کو بلا کر سمجھایا۔

"کہ یہ آسمانی معاملہ ہے اس سے مخالفت اچھی نہیں اور ہم میں سلیمان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔"

پھر بلقیس اپنے تخت کے پاس آئی اور اسے ساتویں کوٹھڑی میں بند کرکے اس پر پہرے دار مقرر کردیے کہ اس کی حفاظت کریں اور خود حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب روانہ ہوئی۔

ہدہد پہلے ہی سلیمان علیہ السلام کے پاس واپس آگیا تھا اور انہیں اطلاع کردی تھی کہ بلقیس خود آرہی ہے۔ یہ سن کر حضرت سلیمان نے ملک کے آدمیوں کو جمع کرکے کہا۔

"اے سردارو! تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو بلقیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس کے تخت کو میرے پاس پہنچا دے۔"

اس موقع پر ایک جن حاضر ہوا جس کا نام عمرو تھا' وہ جنوں میں بہت سخت اور ہیبت ناک تھا۔ کہنے لگا۔

"پیشتر اس کے کہ آپ عدالت برخاست کریں اور یہاں سے اٹھیں' میں تخت لاکر آپ کی خدمت میں حاضر کردوں گا۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام کو دوپہر تک عدالت لگانی تھی۔

جن نے کہا "کہ آپ میری دیانت داری کا یقین کریں۔ تخت میں جو جواہرات' موتی' زمرد اور سونا چاندی جڑا ہوگا' اسے پوری احتیاط کے ساتھ کسی قسم کی بددیانتی کے بغیر آپ کی خدمت میں پہنچا دوں گا۔"

جن کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک ایک قدم اتنا تھا جہاں تک اس کی نظر پہنچتی تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جواب دیا "کہ میں جانتا ہوں تم بہت تیز رفتار ہو مگر میں تم سے بھی زیادہ تیز رفتار شخص چاہتا ہوں۔" اس موقع پر کتاب اللہ کا ایک عالم کھڑا ہوا' جو اسم اعظم جانتا تھا کہنے لگا "میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے بعد ارادہ کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنے کے بعد میں اس تخت کو اس جن سے بھی پہلے لاسکتا ہوں۔ اتنی جلدی جتنی دیر آپ کی نظر واپس آتی ہے۔ اس شخص کا نام آصف بن برخیا بن شمعا تھا۔

یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ اسلام نے فرمایا۔

"اگر تو ایسا کرے تو تو غالب آیا۔ ورنہ تو مجھے جنوں میں رسوا کرے گا۔ حالانکہ میں انسانوں اور جنوں دونوں کا بادشاہ ہوں۔"

آصف اٹھا' وضو کیا' سجدہ میں گیا' اسم اعظم پڑھ کر دعا کی۔

بلقیس کا تخت جس جگہ رکھا تھا وہاں سے وہ زمین کے اندر دھنس کر غائب ہوگیا اور حضرت سلیمان علیہ



السلام کی کرسی کے پاس سے باہر آگیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ بڑی کرسی پر حضرت سلیمان علیہ السلام بیٹھا کرتے تھے اور برابر ایک چھوٹی کرسی پر اپنے پاؤں رکھا کرتے تھے۔ بلقیس کا تخت اسی چھوٹی کرسی کے نیچے سے ظاہر ہوا۔

جب جنوں نے دیکھا کہ تخت پہنچ گیا ہے تو انہوں نے سلیمان علیہ السلام سے کہا۔

"آصف! تخت کو تو لے آیا ہے مگر اسے بلقیس کو یہاں لانے کی قدرت حاصل نہیں۔"

آصف نے کہا "کہ میں یہ بھی کرسکتا ہوں۔"

حضرت سلیمان نے حکم دیا کہ ایک محل تیار کیا جائے! جس میں ایک دیوان خانہ ہو۔ اس کے سامنے شیشے کا ایک صحن بنایا جائے جو ایسا شفاف معلوم ہو' جیسے پانی جاری ہے۔ اس میں مچھلیاں بھی دکھائی دیں۔ یعنی دیکھنے والے کو ایک شفاف چشمہ نظر آئے جس میں مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ دیوان خانہ کے وسط میں میری کرسی ہو اور گرد مصاحبوں کی کرسیاں قرینے سے لگی ہوں۔ چنانچہ ان تمام احکام کی اسی طرح تعمیل کی گئی۔

جب تمام کام مکمل ہو گیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے مصاحبوں اور مشیروں سمیت وہاں پہنچے اپنی کرسی پر بیٹھے۔ دوسرے ساتھی بھی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد جناب کی قوم کے لوگ اپنے اپنے مقام پر آئے۔

آپ کا یہ معمول تھا کہ جب دنیا کے شہروں کی سیر مقصود ہوتی تو آپ خود اور آپ کے تمام مصاحب اسی طرح نشستوں میں بیٹھ جاتے' پھر ہوا کو حکم ہوتا کہ محفل کو ہوا میں اٹھالے۔ چنانچہ ہوا ان سب کو زمین اور آسمان کے درمیان فضا میں لے کر اڑتی اور محفل کے سب آدمیوں کو سیر کرائی جاتی پھر آپ کا حکم ملنے پر محفل کو اتار دیا جاتا۔

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے دربار سجالیا۔ سب لوگ قرینے سے بیٹھ گئے تو آصف برخیا آپ کی خدمت میں آئے۔ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں سجدہ کیا۔ اسم اعظم پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی جس کے ساتھ ہی اچانک بلقیس بھی دربار میں حاضر ہوگئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ادب سے کھڑی ہوگئی۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے' جو اسم اعظم جانتے تھے (آصف برخیانہ تھے) بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت سلیمان کے گھوڑوں کا داروغہ حنبد بن عاد تھا۔

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اپنے سامنے حاضر دیکھا تو فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے آزمایا اور ملک اور دولت جو مجھے عطا ہوئی۔ اس کے لیے اس کا شکر ادا کرتا رہوں اور جب میں ایسے شخص کو دیکھوں جو علم و فضل میں مجھ سے زیادہ ہے۔ خواہ رتبہ میں مجھ سے کم ہی ہو میں اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤں' جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں اس کا اپنا ہی فائدہ ہے اور اگر کوئی شخص ناشکری اور کفران نعمت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے اور بخشنے والا ہے' وہ جلد عذاب نہیں دیتا۔"

**بلقیس کون تھی:** جب جنوں نے بلقیس کو دیکھا اور اس کی کیفیت کا انہیں پتا چلا تو انہیں خیال آیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کہیں بلقیس سے نکاح نہ کرلیں۔ یہ خدشہ انہیں اس لیے تھا کہ بلقیس جنات کے حالات سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس واقفیت کی وجہ یہ تھی کہ بلقیس کی ماں جنوں کی قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا نام عمیرہ تھا اور وہ عمرو کی بیٹی تھی۔ بعض اس کی والدہ کا نام رواحہ بیان کرتے ہیں جو سکن کی بیٹی تھی اور سکن جنوں کا بادشاہ تھا۔

**بلقیس کا امتحان:** اس خدشہ کے تحت جنوں نے حضرت سلیمان کی خدمت میں عرض کیا۔

"بلقیس دانا نہیں بلکہ ناقص العقل ہے۔ اس کے پاؤں گدھے کے سموں جیسے ہیں۔" یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے چاہا کہ اس کی تصدیق کریں اور

[illegible] اور ان سے بہتر ہی بیٹھی ہیں۔

آپ نے اسی غرض سے محل کے صحن میں شیشے کا فرش بنایا تھا۔ کاریگروں نے اس میں آب رواں کا ایسا نقشہ بنایا تھا۔ دیکھنے والوں کو یہ دھوکہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی گہری نہر ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ بھی حکم دیا کہ بلقیس کا جو تخت منگوایا گیا ہے اس میں بھی کچھ کمی بیشی کرکے اس کی ہیئت بدل دی جائے۔ یہ کام بھی بلقیس کی عقل کو پرکھنے کے لیے کیا گیا کہ وہ اسے پہچانتی ہے یا نہیں۔

جب بلقیس محل میں داخل ہوئی تو حضرت سلیمان نے اسے محل کے دیوان خانے میں لے جانے کا حکم دیا جہاں ان کی کرسی بچھی تھی۔ دیوان خانے میں جانے کے لیے مذکورہ بالا صحن سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ جب بلقیس وہاں سے گزرنے لگی تو اس نے دیکھا کہ ایک گہرا دریا پانی سے بھرا ہے۔ دل میں کہنے لگی کہ سلیمان مجھے ڈبونا چاہتے ہیں۔

اس نے اپنے پائنچے اٹھا کر اسے عبور کرنے کے لیے قدم بڑھایا۔ جب صاف اور شفاف صحن سے گزرنے لگی تو اس کی چمک دار پنڈلی پر بال بھی نظر آگئے۔ اگرچہ اس کی پنڈلی پر بال تھے مگر وہ بڑی حسین، خوب صورت اور پری جمال عورت تھی، مخالفوں نے اس کے متعلق جو جھوٹ بات کہی تھی اور اس پر جو تہمت لگائی تھی وہ جھوٹی تھی۔ بعد ازاں بلقیس کو بتایا گیا کہ آئینہ بندی کا یہ محل اور اس قسم کا یہ صحن جو گرد وغیرہ سے بالکل پاک ہے اسی لیے بنایا گیا ہے۔

بلقیس بے خوف ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آگئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے پوچھا۔ ”کہ یہ جو تخت رکھا ہے۔ کیا تمہارا تخت بھی ایسا ہی ہے۔“

بلقیس نے اپنے دل میں کہا کہ میرا یہ تخت یہاں کیسے آگیا۔ میں تو اسے ساتویں گھر میں چھپا آئی تھی اور اس پر نگہبان مقرر کر دیے تھے۔ بالآخر اس نے پہچان لیا کہ یہ وہی تخت ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ ”ہمیں پہلے ہی یقین تھا کہ یہ اسے پہچان لے گی۔“

بلقیس مجوسی دین سے تعلق رکھتی تھی۔ بلقیس نے سوچ کر دل میں کہا کہ میں نے جو یہ سمجھا کہ سلیمان مجھے ڈبونے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب تھا کہ میں نے بڑی غلطی کی ہے کہ اب تک سورج کی پرستش کرتی رہی۔ اب اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری کروں گی۔ میں اب مسلمان ہو گئی ہوں۔

اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے اور عذاب کا مستحق ہونے سے بچالیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے نکاح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بلقیس حاملہ ہوئی، جب ایام حمل پورے ہوئے تو بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام داؤد رکھا گیا۔ مگر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی میں ہی اس دار فانی دنیا سے کوچ کر گیا۔ کچھ مدت کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی وفات پائی اور ان کے ایک ماہ بعد بلقیس کا بھی انتقال ہو گیا۔

ایک روایت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے نکاح کے بعد بلقیس کو ایک شہر عطا فرمایا جس کے خراج سے وہ اپنا گزارا کرتی تھی۔ جب وہ حاملہ ہوئی تو انہوں نے اسے اس شہر میں بھیج دیا۔ وہ اس شہر کی حکمران بنی رہی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام مہینہ میں ایک مرتبہ اس کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے۔



# شعاع کے ساتھ

ادارہ

## در شہوار۔ لکی مروت

1۔ ہم سب گھر والوں کو ہی مطالعے کا شوق ہے، اس وجہ سے مجھے بھی بچپن سے کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادت ہے۔

شعاع اور خواتین ڈائجسٹ دونوں ہمیں بہت ہی پسند ہیں۔۔۔ لیکن شعاع کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ میری سسٹرز بھی بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ میری سسٹر کی ایک سویٹ سی فرینڈ ہے وہ ہمیں ڈائجسٹ بھیجتی ہے۔ (اسے۔۔۔ اسے کچھ اور نہ سمجھنا۔۔۔ وہ ہے ہی بہت سویٹ) اور میری چھوٹی کزنز بے چاریاں اس کے گھر چکر لگا لگا کے تھک جاتی ہیں۔ پٹھان ہیں اس وجہ سے پردہ کرتے ہیں تو چھوٹے بچوں کو بھیجنا پڑتا ہے۔

خاص واقعات تو بہت سے پیش آتے ہیں (خاص نہیں بلکہ خاص الخاص) چونکہ میرے بابا جانی کو ہمارا ڈائجسٹ پڑھنا پسند نہیں ہے تو اس وجہ سے چپکے چپکے پڑھتے ہیں۔

ایک بار میں کمرے میں ناول پڑھ رہی تھی۔ بہت سنسنی خیز سین پر تھی ناول میں کہ یک دم لائٹ چلی گئی۔ میں موبائل کی روشنی میں پڑھنے لگی گرمی کا موسم تھا اور میرا گرمی سے برا حال تھا لیکن سامنے شعاع تھا تو کچھ خبر نہیں تھی کہ گرمی ہمارا کیا حشر کر چکی ہے۔ بابا جانی باہر صحن میں لیٹے تھے وہیں سے بولے ”کمرے میں کون ہے؟“ اور میں موبائل اور سانس بند کرکے اندھیرے میں الو کی طرح ادھر ادھر نظریں گھما رہی تھی کہ اچانک کوئی چیز میرے سامنے میز سے گری، مجھے دکھائی نہیں دی لیکن آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی میں اچھل کے کھڑی ہو گئی اور اپنے گلے کا فل لاؤڈ اسپیکر آن کرکے چیخ ماری۔

بابا جانی نے وہیں سے ٹارچ کی روشنی کمرے کی طرف کی اور میں نے دوسرے دروازے کی طرف دوڑ لگادی۔ زور سے سر دروازے سے ٹکرایا۔ دروازے سے باہر نکل کر ابھی سانس بھی درست نہیں کی تھی کہ سامنے نظر پڑی۔۔۔ بابا جانی غصے سے گھور رہے تھے۔۔۔ اس کے بعد جو حال ہوا مت پوچھیں۔

بابا جانی! اب کچھ نہیں کہتے۔ لیکن اپنی دوڑ یاد کرکے اب بھی بہت ہنسی آتی ہے۔

2۔ روز مرہ کی مصروفیات کچھ خاص نہیں کیونکہ گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے آزاد ہوں کام سب آتا ہے۔ ضرورت ہو تو کبھی کبھی کرتی ہوں کام۔۔۔ لیکن زیادہ تر فارغ ہوتی ہوں۔ اس لیے شعاع کے لیے ٹائم ہی ٹائم۔

3۔ پسندیدہ ناول تو بہت سے ہے لیکن مجھے کردار کا نام یاد ہوتا ہے زیادہ تر۔۔۔ ناول کا نہیں لیکن سب سے فیورٹ ناول عمیرہ احمد کا ”پیر کامل“ ہے بہت ہی خوب صورت ناول تھا۔ شعاع کی زیادہ تر قارئین کو یہ ناول بہت پسند ہوتا ہے کیونکہ یہ ہے ہی لاجواب۔ اور نمرہ احمد کا ”سانس ساکن تھی“ اور فائزہ افتخار کا ”داسی دھڑکن یار دی“

4۔ خوبیاں اور خامیاں۔۔۔ جس جس سے بھی پوچھا ساری خامیاں ہی اکٹھی ہوئیں۔ خیر خوبیاں دو تین خود ہی لکھ دوں گی۔۔۔ (آخر عزت کا سوال ہے)

بے حد حساس ہوں۔ کسی کو دکھی دیکھوں تو آنسو فوراً گرنے کے لیے تیار۔۔۔ مخلص ہوں، دوستی میں خود غرضی پسند نہیں۔ دل بہت بڑا ہے۔ تنقید آسانی سے برداشت کر لیتی ہوں۔

خامیاں بہت ہیں۔ غصے کی تیز ہوں' بدتمیز ہوں' بقول مائی فرینڈ چھوٹی سی بات کو بھی طول دیتی ہو' عام الفاظ میں بکواس کہتے ہیں اسے۔
مسکان (سسٹر) سے پوچھا تو کہا "انسان کو زچ بہت کرتی ہو۔ موڈی ہو۔ دل چاہے تو بات سنتی ہو نہ چاہے تو پروا ہی نہیں کرتیں۔"
تعریفی جملے بھی کبھی کبھی کانوں میں پڑتے ہیں "ایک بار بھائی نے کہا تھا "تم دل میں کسی کے لیے کینہ نہیں رکھتی ہو بہت صاف دل کی ہو۔"
اکثر اوقات امی یہ بات بہت کہتی ہیں۔ "تم کام کرتی نہیں ہو مگر جب کرتی ہو تو شکایت کا موقع نہیں دیتیں۔" اور میرے لیے یہی جملہ بہت ہے۔
5۔ ساون کا موسم تو ہر کسی کو بھاتا ہے' مجھے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے لیکن گرج چمک سے بہت ڈر لگتا ہے' جب تک ہلکی سی بھی گرج چمک ہو میں کانوں سے ہاتھ نہیں ہٹاتی۔
ایک مرتبہ شام کے وقت بارش ہو رہی تھی' سردی کا موسم تھا' خوب گرج چمک جاری تھی۔ جس نالے سے بارش کا پانی گھر سے نکلتا ہے وہ بند ہو گیا گھر میں پانی جمع ہو رہا تھا۔ میں نے کہا میں جاتی ہوں۔ لیکن امی اکیلے بھیجنے پہ تیار نہ تھیں' مسکان نے کہا ٹھیک ہے میں جاتی ہوں ساتھ۔ مجھے بہت بخار تھا اس لیے ہم نے چھتری لے لی۔ ابھی ہم نالے سے تھوڑا دور ہی تھے کہ تیز ہوا آئی اور چھتری مسکان کے ہاتھوں سے نکل کر پتا نہیں کہاں چلی گئی اور آدھے ہی منٹ میں ہم دونوں بری طرح بھیگ گئے کیونکہ بارش بہت تیز تھی۔ میں نالے کے پاس گئی۔ نالے کے پاس خوب پانی جمع تھا۔ مسکان میرے ساتھ تھی ہم دونوں کے دانت خوب بج رہے تھے۔ میں نے نالے میں سے کلی سی لمبی سی چیز برآمد کی۔ بجلی چمکی تو ہم نے دیکھا کہ وہ بڑے بھائی کا شکار کا بوٹ تھا۔
دو دن تیز بخار میں گزارے۔ آج بھی وہ دن یاد ہے۔
6۔ پسندیدہ اشعار بہت سے ہیں۔

تم کو پانے کے لیے کتنی دعائیں مانگیں
پھر بھی حیرت ہے کہ تم آج کسی اور کی ہو
بات طاقت کی' وجاہت کی' ذہانت کی نہیں
یہ تو قسمت ہے کہ تم آج کسی اور کی ہو

پسندیدہ کتاب۔ نشان منزل
پسندیدہ اقتباس۔۔۔ زیرو پوائنٹ 2 سے۔ آر تھر آش
"اے دنیا کے لوگو! اللہ کو کبھی یہ نہ بتاؤ کہ تمہاری مصیبت کتنی بڑی ہے' تم ہمیشہ اپنی مصیبت کو یہ بتاؤ کہ تمہارا اللہ کتنا بڑا ہے' تم دکھ اور تکلیف سے رہائی پاؤ گے۔"

## ثمینہ نورین۔۔۔ چیچہ وطنی

1۔ شعاع کے ساتھ جڑے اس ناتے کو آٹھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے اور ان شاء اللہ تا زندگی رہے گا۔ شعاع کو میں نے اپنی پھوپھو کے گھر میں پایا تھا۔ میری کزن' دوست پڑھتی تھی تو میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی ذرا ورق گردانی کر لوں تو جناب اس دن سے آج کا دن آ گیا۔ مگر شعاع اور خواتین کا چسکا نہیں چھوٹا۔ جہاں تک بات کسی دلچسپ واقعہ کی ہے تو جناب وہ تو ہر مہینہ ہی ہوتے ہیں۔ کہاں تک سنو گے' کہاں تک سناؤں۔ اس سوال کو تو گول مول کرنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اب میں اپنی بے عزتی خود ہی بتاتی ہوئی ذرا بھی اچھی نہیں لگوں گی۔
2۔ دن کا آغاز تو جناب نماز سے ہوتا ہے۔ نماز کے بعد آٹا گوندھتی ہوں اور چائے بناتی ہوں۔ جب تک ایک کپ چائے خالی پیٹ نہ پی لوں۔ صبح ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ پراٹھے امی ہی کے ہاتھ کے بنے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ ناشتے کے بعد برتن دھونا' جھاڑو لگانا' کپڑے دھونا اور خود کو کپڑے بدلنے پر اکسانا' پھر جناب دوپہر کے لیے سالن اور روٹیاں بنانا' پھر وقت سارا اپنا ہوتا



ہے۔ جب تک دونوں بھائی اسکول اور کالج سے واپس نہیں آتے' اس وقت تک سارا شعاع چٹ کر جاتی ہوں اور پھر سارا مہینہ اگلا مہینہ آنے کا انتظار کرتی ہوں۔
گھر میں صرف امی اور میں ہوتے ہیں۔ بھائی اسکول اور کالج چلے جاتے ہیں۔ باجی کی شادی دو مہینے پہلے ہو گئی ہے تو جناب اب سارا گھر مجھ اکیلی کے سپرد ہے۔ جب بھائی آ جاتے ہیں تو ان کو کھانا دے کر (کھانے کی تیاری ہمارے ہاں رات کا کھانا جلدی کھا لیا جاتا ہے) امی کو دباتی ہوں اور ساتھ ساتھ نیا یا پرانا شعاع یا خواتین ٹی وی کی روشنی میں پڑھتی ہوں۔ بس اسی طرح دن رات گزر جاتے ہیں۔
3۔ شعاع میں جس تحریر کو پڑھ کر میں اداس رہی اور بے اختیار آنسو بھی نکل آئے وہ تحریر تھی۔ "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر" ماہا ملک کی "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" پر بھی کافی دن اداسی اپنے ڈیرے جمائے بیٹھی رہی تھی۔ سمیرا احمد کا "پیر کامل" بھی بہت پسند آیا۔ رخسانہ نگار عدنان کا "زندگی ایک روشنی" واقعی زندگی کے لیے ایک روشنی ہی تھا۔ راحت جبیں کا "زرد موسم" نادان لڑکیوں کے لیے ایک نصیحت تھا اور آمنہ ریاض کا ناول جو آج کل خواتین میں آ رہا ہے بہت اچھی کاوش ہے۔ جہاں تک کسی کردار میں اپنی جھلک کی بات ہے تو جناب ابھی تک کوئی اپنے جیسا نظر نہیں آیا۔ جی ہاں جناب ابھی تک تو اپنی جھلک نظر نہیں آئی کسی کردار میں۔
4۔ خوبیاں تو خیر دو یا چار ہی ہوں گی' ہاں خامیاں تو کافی ہیں تو جناب سب سے پہلی خامی تو یہ ہے کہ بولتی بہت ہوں۔ مستقل مزاج تو میں بالکل نہیں ہوں۔ جلد باز بہت ہوں' خیر جلد بازی تو عدم صاحب نے خلوص والوں کی خامی کو کہا ہے تو جناب اسی بہانے ایک خوبی بھی مل گئی۔ یعنی خلوص والی ہوں۔ ہنسی اور ہنسانے والی ہوں۔ غصہ بہت جلد آ جاتا ہے۔ کسی سے کچھ کہنا ہوتا ہے تو کہہ دیتی ہوں دل میں نہیں رکھتی یعنی کہ منہ پھٹ کہہ سکتے ہیں اور اعتبار کرتی ہوں' ہر کسی پہ جس کی وجہ سے بہت دفعہ نقصان بھی اٹھایا ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ جذباتی بہت ہوں' مخلص ہوں' یہی ایک خوبی ہے۔
بہت زیادہ تعریفی کلمات تو سننے کو نہیں ملتے مجھے۔ ہاں ایک بار پھوپھو کے گھر گئی تھی تو وہاں ایک بزرگ خاتون نے کہا تھا سب کے درمیان کہ ثمینہ نے دوپٹا کتنی خوب صورتی سے لیا ہوا ہے۔ میں نے آج تک تم میں سے کسی کو اس طرح لیے ہوئے نہیں دیکھا اور چھوٹی عید پر اپنی بھابھی کے گھر گئی تھی تو وہاں ایک لڑکی نے کہا تھا کہ۔۔۔
"اس کی آنکھیں بہت پیاری ہیں۔" اور باجی ماجدہ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "ہر بات کا جواب ثمینہ کے پاس ہوتا ہے۔" چاچو اشرف نے کہا تھا کہ "ثمینہ اکھڑ کے منہ پر سچ بولتی ہے' چاہے کسی کو اچھا لگے یا برا۔"
5۔ ساون کے حوالے سے کیا کہوں جناب' جب بھی ساون آتا ہے تو بہت ساری پریشانیاں لے کر۔ مجھے تو یہ فکر لگی رہتی ہے کہ اگر بارش ہو گئی تو گھاس کیسے کٹے گی۔ ہمارے ہاں ایک تو بارش بھی کافی ہوتی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ ساون میں اور ساون تو بہت نقصان کر کے جاتا ہے ملک کا۔ اللہ رحیم کرے ہمارے حالوں پر اور ہمارے ملک پہ۔ (آمین)
6۔ ایک ناول کے یہ الفاظ پڑھے تو مان گئی کہ واقعی رزق صرف دولت نہیں۔ بلکہ۔۔۔
"رزق صرف یہی نہیں کہ جیب میں مال ہو' بلکہ آنکھوں کی بینائی بھی رزق ہے' دماغ میں سوچ بھی رزق ہے' دل میں احساس رزق ہے' رگوں میں خون رزق ہے' یہ زندگی رزق ہے' سب سے بڑھ کر ایمان ہے اور آپ کو اتنا یقین تو ہے ناکہ یہ سارا رزق آپ کے پاس موجود ہے تو پھر محرومی کس بات کی۔"
پسندیدہ شعر!

بے فائدہ ہے زیست میں احباب کا ہجوم
ہو پیکر خلوص تو کافی ہے اک شخص

# موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

## چکن ویجی ٹیبل سوپ

اجزا :

| | |
|---|---|
| ابلا ہوا چکن | ایک کپ |
| بند گوبھی | ایک کپ |
| گاجر اور شملہ مرچ | آدھا آدھا کپ |
| ہری پیاز | ایک چوتھائی کپ |
| چکن یخنی | پانچ کپ |
| انڈا | ایک عدد |
| سویا ساس | تین کھانے کے چمچے |
| کارن فلو | دو کھانے کے چمچے |
| نمک | حسب ذائقہ |

ترکیب :

یخنی میں ساری سبزیاں ڈال کر پکائیں۔ چکن کی ایک انچ کی بوٹیاں کر کے نمک، سویا ساس اور پسی سیاہ مرچ کے ساتھ یخنی میں ڈال دیں۔ تین چمچے پانی میں کارن فلور گھول کر شامل کردیں۔ گاڑھا ہونے لگے تو انڈے کی سفیدی اچھی طرح پھینٹ کر مکس کردیں۔ ایک ابال آجائے تو چولہا بند کردیں۔ چلی گارلک ساس کے ساتھ پیش کریں۔

## لیمن چکن

اجزا :

| | |
|---|---|
| چکن بریسٹ | آدھا کلو |
| ڈبل روٹی | آٹھ سلائس |
| کارن فلور | دو کھانے کے چمچے |
| میدہ | دو کھانے کے چمچے |
| بند گوبھی | ایک کپ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل | حسب ضرورت |

ترکیب :

چکن میں ایک لیموں کا رس، ایک کھانے کا چمچہ سویا ساس، نمک اور پسی سیاہ مرچ لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ میدہ اور ایک چمچہ کارن فلور مکس کرلیں۔ چکن کے ٹکڑوں کو اس پاؤڈر میں کوٹ کر گولڈن فرائی کرلیں۔ ایک ساس پین میں ایک چمچہ سویا ساس، ایک کھانے کا چمچہ چینی، ایک کھانے کا چمچہ کارن فلور، ایک چمچہ لیموں کا رس اور ایک کھانے کا چمچہ تیل ملا کر اتنا پکائیں کہ گاڑھا سا آمیزہ بن جائے۔ الگ پیالے میں نمک اور دو کھانے کے چمچے سرکے میں بند گوبھی ملالیں ڈبل روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے فرائی کرلیں۔ سرونگ ڈش میں چکن، گوبھی کا سلاد اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے ہلکے ہاتھ سے مکس کریں۔ اوپر سے سویا ساس ڈالیں اور ایک منفرد ڈش ٹیسٹ کریں۔

## ایپل جیلی

اجزا :

| | |
|---|---|
| سیب | ایک کلو |
| پانی | تین کپ |
| چینی | ایک کلو |
| پکٹن | ایک کھانے کا چمچہ |

ترکیب :

سیبوں کو اچھی طرح دھو کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔ چھیلنے اور بیج نکالنے کی ضرورت نہیں۔ پھر پتیلی میں تین کپ پانی شامل کرکے پکنے کے لیے رکھ دیں۔ آنچ ہلکی رکھیں اور ڈھکن ڈھک دیں۔ سیب نرم ہوجائیں تو انہیں خوب مسل لیں۔ پھر ململ کے کپڑے میں باندھ کر پوٹلی بنالیں اور اس طرح لٹکا دیں کہ اس کا پانی ایک برتن میں جمع ہوتا رہے۔ تمام پانی اچھی طرح نکل جائے تو (ناپ لیں یہ تین پیالی ہی ہوگا) یہ پانی پھر چولہے پر چڑھا دیں۔ ساری چینی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ وقفے وقفے سے چمچہ بھی چلاتی رہیں۔ جب چینی گھل جائے تو آنچ تیز کرکے پانچ منٹ تک پکائیں۔ چولہے سے ہٹا کر پکٹن (گاڑھا کرنے والا) ڈالیں اور دوبارہ چولہے پر رکھ دیں۔ دو منٹ مزید پکائیں پھر اتار لیں۔ چینی کی کوئی تہہ سی اوپر جم گئی ہے تو اسے نکال دیں۔ مزے دار ایپل جیلی تیار ہے۔ جار میں بھر کر محفوظ کرلیں۔

## فش نگٹس

اجزا :

| | |
|---|---|
| بغیر کانٹے کی مچھلی | آدھا کلو |
| میدہ | دو کھانے کے چمچے |
| انڈے | دو عدد |
| ڈبل روٹی کا چورا | ایک کپ |
| سیاہ و سرخ مرچ | ایک ایک چائے کا چمچہ |
| ہلدی | آدھا چائے کا چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل | حسب ضرورت |

ترکیب :

مچھلی کو چوپر میں ڈال کر پیس لیں۔ میدے میں نمک، مرچیں، ہلدی اور لیموں کا رس ملا کر پیسٹ بنالیں۔ مچھلی کے آمیزے میں اچھی طرح مکس کرکے حسب پسند شیپ دیں۔ دس منٹ رکھ کر انڈے میں ڈبوئیں۔ پھر بریڈ کرمبز میں لپیٹ کر گہرے تیل میں تل لیں۔ ٹشو پیپر پر نکالیں تاکہ اضافی تیل جذب ہوجائے۔ پھر کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

## گجریلا

اجزا :

| | |
|---|---|
| گاجر | ایک پاؤ |
| دودھ | ڈیڑھ لیٹر |
| چاول | آدھی پیالی |
| کنڈینسڈ ملک | آدھا کپ |
| چینی | ایک پاؤ |
| کھوپرا | آدھی پیالی |

چاول کو ایک گھنٹہ بھگونے کے بعد گاجر اور آدھا لیٹر دودھ کے ساتھ بلینڈ کرلیں۔ باقی دودھ ابال لیں۔ ابلتے ہوئے دودھ میں گاجر، چاول کا آمیزہ ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ پھر چینی شامل کردیں۔ گاڑھا ہوجائے تو کھوپرا اور کینڈینسڈ ملک بھی ڈال دیں۔ ڈش میں نکال کر بادام پستے کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

موسم بدل رہا ہے۔ گرمیاں رخصت ہو رہی ہیں۔ سردیوں کی آمد آمد ہے۔ سردیوں میں جلد کی دیکھ بھال ایک اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ جلد بہت زیادہ خشک ہو کر پھٹنے لگتی ہے۔ چہرے کے ساتھ ساتھ پیروں اور ایڑیوں کی جلد بھی خراب ہو جاتی ہے۔

سردیوں میں منہ دھونے کے بعد موئسچرائزر کا استعمال ضرور کریں اور باہر جاتے ہوئے سن بلاک لگانا نہ بھولیں۔ یہ نہ صرف گرمی بلکہ سردی کی دھوپ سے بھی محفوظ رکھے گا۔ جلد کا خیال رکھنے کے لیے مہنگی کریموں اور لوشن کا استعمال ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے آپ دیسی ٹوٹکے اور سبزی فروٹ سے بھی مدد لے سکتی ہیں جیسے۔

سردیوں کی خاص سوغات گاجر جس کا نہ صرف حلوہ بنایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا رس پینے کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے رنگت نکھرتی ہے۔

ٹماٹر کا رس چہرے کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس سے بلیک ہیڈز بھی ختم ہو جاتے ہیں اور رنگت بھی صاف ہو جاتی ہے۔

چہرے اور جسم کی خشکی کے لیے زیتون کے تیل کی مالش کی جا سکتی ہے۔ زیتون کے تیل کے مستقل استعمال سے جھریوں کی آمد ست پڑ جاتی ہے۔

صندل وڈ پاؤڈر اور ملتانی مٹی میں عرق گلاب ملا کر پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے پر صاف پانی سے دھولیں۔ یہ ماسک آپ کے چہرے سے اضافی چکنائی جذب کرے گا۔ گرد و غبار اور میل صاف کر کے ملائمت بخشے گا۔

روغن بادام سے چہرے پر روزانہ ہلکے ہاتھ سے مساج کریں۔ اس سے جھریاں ختم ہوتی ہیں۔ جلد ملائم ہوتی ہے اور رنگت بھی نکھرتی ہے۔

ایک چمچہ بیسن میں ایک چمچہ دہی ملا کر پیسٹ بنائیں۔ مساج کر کے تھوڑی دیر تک لگے رہنے دیں۔ خشک ہونے پر سادہ پانی سے دھولیں۔ (گرمیوں میں صرف بیسن ہی کافی ہوگا۔) اس سے کیل مہاسے ختم ہوتے ہیں۔

دودھ میں لیموں کا رس ملا کر روزانہ رات کو مساج کرنے سے جلد نرم و ملائم ہوتی ہے۔

دودھ میں تھوڑے سے بادام پیس کر اسکرب بنائیں۔ ہلکے ہاتھ سے مساج کریں۔ پھر دھولیں۔

پھٹے ہوئے ہونٹوں پر بالائی کا مساج کریں، پھر ہلکا نیم گرم کپڑا یا تولیہ ہونٹوں پر رکھ کر ہلکے ہلکے رگڑیں۔ اس سے ہونٹوں کی ساری مردہ کھال صاف ہو جائے گی اور ہونٹ نرم ہو جائیں گے۔

لیموں کے رس میں ذرا سی چینی گھول کر ہونٹوں پر مساج کریں۔ اس سے ہونٹ گلابی ہوتے ہیں۔

گلیسرین اور عرق گلاب کا خوب اچھی طرح ایڑیوں پر مساج کریں، پھر موزے پہن لیں۔

نیم گرم پانی میں ایک چمچہ شیمپو ڈال کر پاؤں ڈبوئیں۔ اس سے قبل کسی تیل سے مساج کر لیں تو زیادہ بہتر ہو جائے گا۔ پھر جھانویں سے ایڑیاں رگڑیں۔ یہ عمل ہفتے میں کم از کم تین بار کریں۔

نہانے یا منہ دھونے کے لیے زیادہ گرم پانی نہ استعمال کریں۔ باہر نکلتے ہوئے سن گلاسز اور ہاتھوں میں دستانے پہن لیں۔

بیرونی طور پر جلد کی حفاظت کے ساتھ اپنی غذا کا بھی خیال رکھیں۔ سبزیوں اور پھلوں کی مناسب مقدار کو اپنی خوراک کا لازمی حصہ بنائیں۔ پانی خوب پئیں۔ ہلکی پھلکی ورزش بھی کریں۔ ان باتوں پر عمل کر کے آپ یقیناً سرد اور خشک موسم میں بھی خوب صورت نظر آئیں گی۔